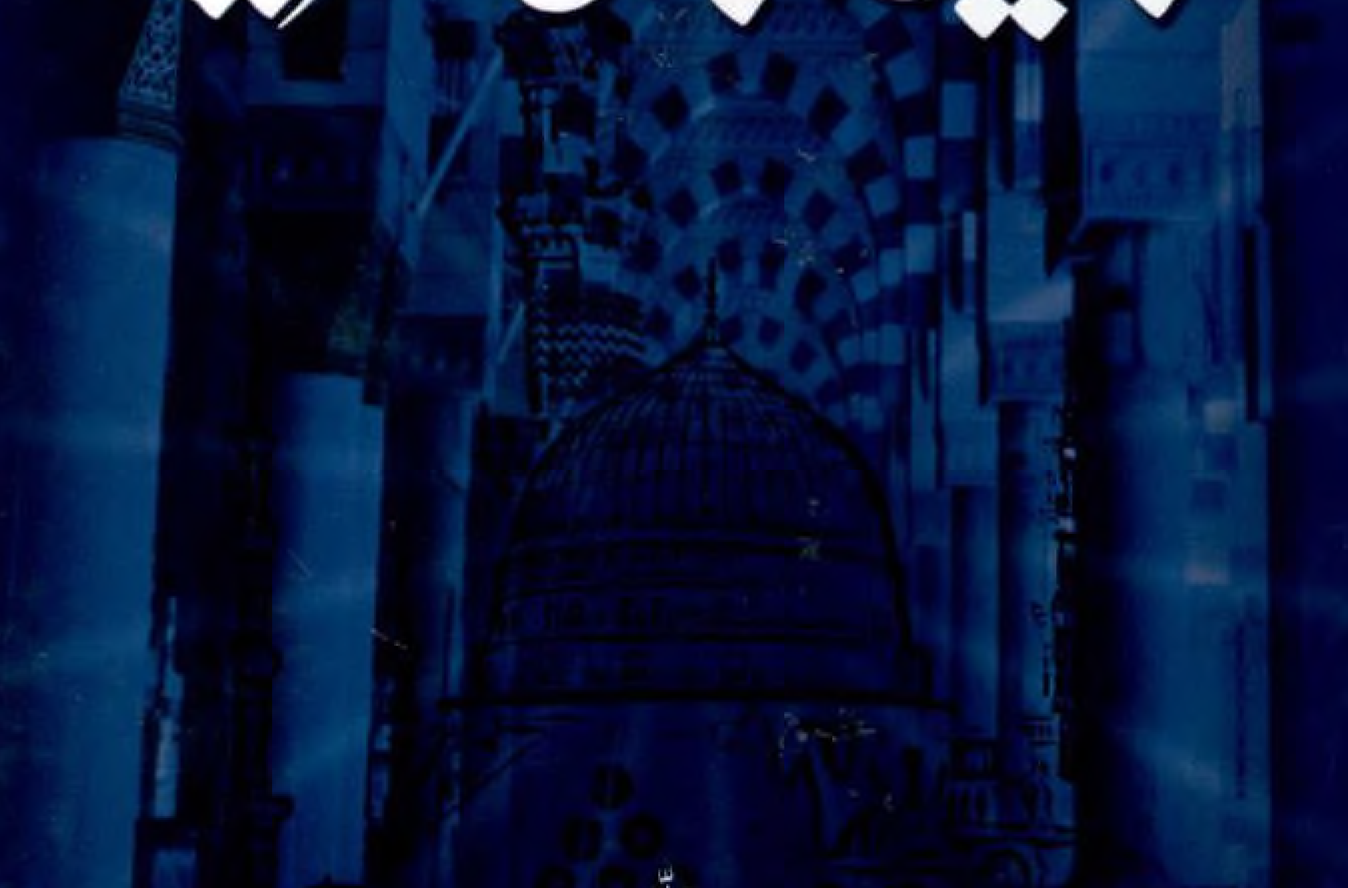
لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

عصر حاضر میں
غلبہ دین کا نبوی طریقہ کار



مؤلف
مولانا محمد زاہد اقبال مدظلہ

ادارہ نشریات محمود حسن

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

عصرِ حاضر میں
غلبہ دین کا نبوی طریقہ کار

مؤلف

مولانا محمد زاہد اقبال مدظلہ

اِدارہ نشریاتِ محمود حسن

رحمٰن پلازہ مچھلی منڈی اردو بازار لاہور Ph:0322-5823877

نام کتاب	.....	عصر حاضر میں غلبۂ دین کا نبوی طریقۂ کار
نام مؤلف	.....	مولانا محمد زاہد اقبال
تعداد صفحات	.....	496
تعداد	.....	1100
تاریخ اشاعت اول	.....	مئی 2008ء
ناشر	.....	ادارہ نشریات محمود حسنؒ
		سیکنڈ فلور، رحمن پلازہ، مچھلی منڈی، اُردو بازار لاہور
قیمت	.....	

فہرست

باب سوم 181

پیش لفظ

دسمبر 2006ء میں راقم کی تالیف ''اسلامی نظام خلافت اور ہماری ذمہ داری'' منظر عام پر آئی تو اس سے استفادہ کرنے والے حضرات کی طرف سے یہ سوال اٹھایا گیا (جس کی پہلے سے قوی توقع کی جا رہی تھی) کہ یہ بجا ہے کہ اسلامی نظام خلافت کا قیام اور احیاء تمام مسلمانوں کا بنیادی فریضہ ہے لیکن موجودہ دور میں اس کا طریقہء کار کیا ہوگا؟ اگرچہ مذکورہ کتاب کے حصہ اول میں احیاء خلافت کے نبوی طریقہء کار کا خلاصہ پیش کر دیا گیا تھا تاہم اجمال کی وجہ سے ذہنوں میں پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات نہ مل پائے۔ چونکہ ''اسلامی نظام کے نفاذ کا طریقہء کار'' ایک وسیع اور اہم موضوع ہے جو مستقل کتاب کا متقاضی ہے اس لیے ''اسلامی نظام خلافت ہماری ذمہ داری'' میں اس سے زیادہ بحث نہیں کی گئی، دوسری بات یہ کہ چونکہ مذکورہ کتاب کی اشاعت کے بعد ''عصر حاضر میں غلبۂ دین کا نبوی طریقہء کار'' کو بھی منظرِ عام پر لایا جانا تھا اس لئے ''اسلامی نظامِ خلافت اور ہماری ذمہ داری'' میں اشارات پر اکتفا کیا گیا۔

عصر حاضر میں اُمت مسلمہ کو درپیش مسائل کے حل اور غلبہء دینِ اسلام کے لیے طریقہء کار کیا ہونا چاہیے؟ ہمارے خیال میں ایک صحیح العقیدہ، قرآن وسنت سے کچھ نہ کچھ شد بد رکھنے والے، دین سے وابستگی رکھنے والے اور ادنیٰ سا عقل وفہم رکھنے والے مسلمان کے لئے اس سوال کا جواب مشکل نہیں ہونا چاہیئے اور اس کے ذہن میں اس طریقہء کار کا تصور واضح ہونا چاہیئے لیکن افسوس صد افسوس! ہماری حالت یہ ہے کہ مسلمان عوام اور خواص کی غالب اکثریت کے اذہان امت مسلمہ کے مسائل کے حل اور غلبۂ دین کے طریق کار کے واضح اور درست تصور سے خالی ہیں یا طریقہء کار تو معلوم ہے لیکن اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات ومصائب کے پیشِ نظر دیگر طریقوں کو اپنایا ہوا ہے۔

زیرنظر کتاب کے بنیادی خاکے کی ترتیب تو راقم نے ربیع الآخر 1425ھ بمطابق 2004 میں تدریس کے ساتھ ساتھ مکمل کر لی تھی لیکن ''اسلامی نظامِ خلافت اور ہماری ذمہ داری'' کے شائع ہونے کے بعد زیرنظر کتاب کو بھی منظر عام پر لانے کا تقاضا بڑھ گیا تو جب ساڑھے تین سال قبل مرتب کیا گیا مسودہ اٹھا کر دیکھا گیا تو اس پر نئے سرے سے کام کرنے کی شدید ضرورت محسوس کی گئی۔ چنانچہ گذشتہ سال 1428ھ بمطابق جون، جولائی 2007ء میں راقم نے اپنا پورا وقت اس مبارک کام کے لیے وقف کر دیا، پھر ترمیم واضافہ اور تصحیح کا سلسلہ جاری رہا، بالآخر آج اس مبارک کام سے عہدہ برآء ہو رہا ہوں۔ وللہ الحمد۔

کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں احیاء اسلام کے لیے مختلف ممالک میں

کی جانے والی کوششوں کا تعارف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے اختیار کردہ طریقۂ ہائے کار پر بھی تبصرہ و تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اختیار کردہ منہج سے معلوم ہونے والے بنیادی اصولوں کو واضح کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں سیرت کو بیان کیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ اس سے نہ تو پوری سیرت کا احاطہ کرنا مقصود ہے اور نہ اس کتاب کا موضوع اس کا متقاضی ہے بلکہ ان اہم اور بنیادی حالات و واقعات کو لیا گیا ہے جو آپ کے اختیار کردہ منہج کی ترتیب اور بنیادی اصولوں کو واضح کرتے ہیں اور ان میں احیائے خلافت اور غلبۂ دین کے لئے باقاعدہ دعوت وتحریک کی شکل میں جدوجہد کرنے والوں کے لئے دروس وعبر ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ کی مجموعی زندگی کے حوالے سے بعض اہم اور تاریخی واقعات ذکر نہیں کئے گئے جبکہ بعض جگہ معمولی اہمیت کے حامل واقعات کو زیادہ اہمیت دیتے ہوئے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

چوتھے اور آخری حصے میں نبوی طریقۂ کار کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں عصر حاضر میں کام کی ترتیب اور طریقۂ کار کے بنیادی اصول بیان کئے گئے ہیں۔ جزئیات اور تفصیل سے گریز کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ ایک تو کتاب کی ضخامت اس کی متحمل نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ جزئیات میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی آتی رہتی ہے جس کی وجہ سے کام کی ترتیب اور پالیسی میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔

راقم اس بات کا اعتراف ضروری سمجھتا ہے کہ وہ کوئی مفکر ہے اور نہ باقاعدہ مصنف بلکہ علمی وعملی حوالے سے اس بات کا بالکل اہل نہیں ہے کہ عصر حاضر میں غلبۂ دین کے نبوی طریقۂ کار جیسے اہم اور حساس موضوع پر خامہ فرسائی کرے لیکن احیاء خلافت کے لیے جاری دعوت اور تعلیم وتربیت کے حوالے سے اس پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی تھی اس لیے قلم اٹھایا گیا۔ چونکہ اکابر واسلاف کی طرف سے اس حوالے سے کام کیا جا چکا تھا، جس سے راقم کا کام آسان ہوگیا، چنانچہ اسی کی روشنی میں جو اور جیسا بن پڑا ہے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس لیے اس بات کا دعوی ہرگز نہیں کہ اس مجموعے میں لکھی جانے والی ہر بات قطعی اور حرفِ آخر ہے۔ البتہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس مجموعے کو بالاستیعاب پڑھنے والا یہ ضرور محسوس کرے گا کہ سیرت کو سمجھنے اور بیان کرنے کی کوشش ضرور کی گئی ہے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کو احیاء خلافت اور غلبۂ دین کے لئے سیرت کو پڑھنے، سمجھنے اور بنیادی اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین

محمد زاہد اقبال

۲۱ صفر ۱۴۲۹ھ

28-02-2008

بعد صلوٰۃ الجمعۃ

مقدمہ

اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظیم الشان ذات نے اپنی صفات جمال وجلال کے ظہور کے لئے اس کائنات کو تخلیق کیا اور اس میں بسانے کے لئے جن وانس پیدا کیے۔ کائنات کی مختلف اور متعدد چیزوں کو ان دونوں کے لئے مسخر کر دیا تاکہ وہ ان سے فائدہ اٹھا کر ایام حیات کو بسہولت گزار سکیں۔ جن وانس کی تخلیق کے بنیادی مقصد کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے واضح الفاظ میں بیان فرمادیا ہے:

﴿ وما خلقتُ الْجنّ و الْانس إلّا ليَعْبُدُوْن ﴾ (الذریات: ۵۶)

''اور میں نے جن وانس کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں۔''

اس مقصد کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اصول وقوانین عطا فرمائے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر انسان اپنے رب کی رضا وخوشنودی حاصل کرسکتا اور اس کے دربار میں سرخرو ہوسکتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ اور نائب بنایا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إنّیْ جاعلٌ فی الْأرْض خلیْفةً ﴾ (البقرة)

''ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب۔''

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک مکمل ضابطۂ حیات عطا فرمایا کہ وہ ان اصول وقوانین پر خود بھی عمل کرے اور دوسروں کو بھی اس پر عمل کرنے کے لئے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے، لیکن چونکہ انسان اس فانی دنیا اور مظاہر زندگی سے متاثر ہو کر مقصدِ زندگی کو بھلا دیتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی یاد دہانی اور انذار وتبشیر کے لئے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا۔

جن اقوام نے انبیاء کرام کی دعوت کو قبول کیا اور ان کے لائے ہوئے نظامِ زندگی کو اپنایا وہ دنیا و آخرت میں کامیاب وکامران ہوئیں اور جنہوں نے انبیاء کے پیش کردہ عقائد وافکار کو ماننے سے انکار کر دیا اور ان کے لائے ہوئے ضابطۂ حیات سے انحراف کیا وہ ہمیشہ کے لئے ناکام ونامراد ٹھہریں۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے نہ صرف اصول وقوانین بتائے بلکہ خود ان پر عمل پیرا ہو کر لوگوں کو دکھایا کہ کس طرح ان کے مطابق زندگی گزارنی ہے۔ آخر میں خاتم الانبیاء اور امام الرسل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت تک آنے والی پوری انسانیت کی ہدایت وراہنمائی کے لئے ایک

کامل و مکمل نظامِ حیات عطا فرما کر مبعوث فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے معاشرے میں مبعوث ہوئے جہاں ہر طرف کفر و شرک پھیلا ہوا تھا۔ ربِ واحد کی بجائے پتھر، سورج، چاند اور ستاروں جیسے مظاہرِ قدرت کو معبود کا درجہ دے دیا گیا تھا، وحی الٰہی پر مبنی نظامِ حیات کا وجود مٹا دیا گیا تھا اور انسانوں کے بنائے ہوئے غیر فطری نظام مروّج تھے۔ متمدن دنیا پر توحید پر مبنی نظام کی بجائے ظالمانہ و جابرانہ نظاموں کی حکومت تھی اور آسمانی تعلیمات فراموش کی جا چکی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مبعوث ہونے کے بعد ایسی مؤثر اور زوردار دعوت شروع کی کہ کفر و شرک کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوؤں کی زندگیوں میں انقلاب آ گیا۔

آپ نے جاہلی معاشرے کے خاتمے، مروج باطل نظامِ حیات کے انہدام، اسلامی معاشرے کی تشکیل اور حکومت الٰہیہ کے قیام کے لیے جو طریقۂ کار اور ترتیب اختیار کی وہ روزِ روشن کی طرح واضح ہے اور اس میں کسی قسم کا ابہام نہیں ہے۔ محدثین اور سیرت نگاروں نے بڑی محنت و کاوش سے آپ کی زندگی کے ایک ایک پہلو کو محفوظ کر دیا ہے۔ لہٰذا جب سیرت کا مطالعہ اس سوچ اور فکر کے ساتھ کیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم نے صالح معاشرے کی تشکیل اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے کیا طریقۂ کار اختیار کیا تھا تو مطالعہ کرنے والوں پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ:

1۔ سب سے پہلے آپ نے دعوت شروع کی۔

2۔ جن حضرات نے دعوت قبول کی ان کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع فرمایا۔

3۔ عمومی دعوت شروع کرنے کے بعد مشرکین مکہ کی طرف سے مخالفت، ابتلاء اور آزمائش کا سامنا کرنا پڑا تو آپ نے صحابہ کرام کو ہجرت کی اجازت دے دی۔

4۔ پھر آپ نے نصرت طلب کرنا شروع کی جس کی ابتداء طائف سے کی۔ آخر کار مدینہ کے لوگوں نے نصرت کی تو آپ نے صحابہ کرام سمیت مدینہ کا رخ کیا اور وہاں اسلامی تعلیمات و قوانین کو عملی شکل دی۔

5۔ جماعت کی تیاری اور مدینہ میں ایک حد تک استحکام حاصل ہونے کے بعد قریش مکہ اور عرب کے دیگر قبائل کے ساتھ جہاد شروع کیا اور بالآخر مکہ فتح کر کے جزیرہ عرب کے مذہبی، سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی مرکز (دارالحکومت) پر اسلامی حکومت کا جھنڈا گاڑ دیا۔ پھر غزوۂ تبوک اور جیشِ اسامہؓ کے ذریعے اسلامی حکومت کی عالمی سطح پر توسیع و

تشکیل کی بنیاد رکھی جس کی تکمیل خلفائے راشدین ؓ نے کی۔

ان پانچ مراحل کو دعوت، تعلیم وتربیت، ہجرت، نصرت اور عسکریت کا نام دیا جا سکتا ہے۔

یہ بات ذہن نشین رہنا ضروری ہے کہ مذکورہ پانچ مراحل کی ترتیب اس طرح نہیں ہے کہ ایک مرحلے کے خاتمے کے بعد دوسرا مرحلہ شروع کیا گیا اور جب تک پہلا مرحلے کی تکمیل نہ ہوئی تب تک دوسرا مرحلہ شروع نہ کیا گیا ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مراحل ایک دوسرے میں ضم رہے اور ان کی ترتیب کچھ یوں تھی کہ دعوت شروع ہوئی تو جو حضرات دعوت میں شمولیت اختیار کرتے گئے ان کی تعلیم وتربیت شروع کر دی گئی اور دعوت اور تعلیم وتربیت دونوں امور ساتھ ساتھ جاری رہے بلکہ جہاد کے زمانے میں بھی ان کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی طرح دعوت وتعلیم وتربیت جاری تھی کہ قریش کی طرف سے مخالفت اور ظلم وستم اور جبر وتشدد کی کارروائیاں شروع ہوگئیں اور جب یہ حد سے تجاوز کرنے لگیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو ہجرت کی اجازت دے دی اور خود مکہ میں مقیم رہ کر دعوت اور تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رکھا اور مسائل ومشکلات اور آزمائشوں کا سامنا کرتے رہے، پھر نصرت طلب کرنا شروع کی۔ ایام حج اور مختلف ایام میں مختلف جگہوں پر لگنے والے بازاروں میں جا جا کر دعوت دیتے اور نصرت طلب کرتے۔ نبوت کے گیارہویں سال مدینہ کے چھ افراد نے اسلام قبول کیا۔ اگلے سال بارہ افراد نے دعوت میں شمولیت اختیار کی تو آپ نے ان کی درخواست پر دعوت اور تعلیم وتربیت کے لئے حضرت معصب بن عمیر ؓ کو مدینہ روانہ کیا۔ چنانچہ نبوت کے تیرہویں سال انصار نے نصرت کی بیعت کی تو آپ صحابہ کرام ؓ سمیت مدینہ پہنچے اور وہاں اسلامی تعلیمات اور قوانین کو عملی شکل دی۔ چونکہ مکہ میں دعوت اور تعلیم وتربیت کا سلسلہ جاری رہا اور اس دوران کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ اور عفو ودرگذر کا حکم تھا، اس لیے اقدام نہیں کیا، لیکن جب مدینہ میں ایک حد تک استحکام حاصل ہوگیا تو جہاد شروع کیا اور نبوت کے اکیسویں جبکہ ہجرت مدینہ کے آٹھویں سال مکہ فتح کر کے پورے جزیرۂ عرب میں اسلامی نظام نافذ کر دیا۔

زیر نظر کتاب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اختیار کردہ اسی منہج اور طریقۂ کار کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں نبوی طریقہ کار کے بنیادی اصولوں کو بیان کیا گیا ہے، یہ اس لیے تاکہ تیسرے حصے میں بیان کی جانے والی سیرت کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے پاس نہ تو وسائل کی کمی ہے اور نہ امت مسلمہ کو زوال و

پستی سے نکالنے والے باصلاحیت وذی استعداد اور دردِ دل رکھنے والے رجالِ کار کا فقدان ہے، لیکن صد افسوس! آج ہماری حالت یہ ہے کہ مسلمان عوام اور خواص کی غالب اکثریت کے اذہان غلبۂ دین کے نبوی طریقہء کار کے واضح اور درست تصور سے خالی ہیں یا طریقہء کار تو معلوم ہے لیکن اس راہ میں حائل ہونے والے سنگِ گراں اور ہر طرف بکھرے ہوئے کانٹوں کے پیشِ نظر دیگر طریقوں کو اپنایا ہوا ہے۔ لہذا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کفر کے غلبے کے خاتمے، باطل نظاموں کی بیخ کنی اور دین اسلام کے غلبے اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے نبوی طریقۂ کار کو کامل طور پر اختیار نہیں کیا جا رہا۔ جب اور جہاں منہجِ نبوی کو کامل طور پر اختیار کیا جائے گا کامیابیوں اور کامرانیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جائے گا اور غلبۂ دین کی منزل قریب ہوتی جائے گی۔ رب ذوالجلال تمام مسلمانوں کو سنت وسیرت پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین

حصہ اوّل

احیائی تحریکوں کا تعارف
اور
تبصرہ و تجزیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ
اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ
لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا
ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

(التوبہ: ۱۰۰)

''جن لوگوں نے سبقت کی (یعنی سب سے) پہلے (ایمان لائے) مہاجرین میں سے بھی اور انصار میں سے بھی اور جنہوں نے نیکوکاری کے ساتھ ان کی پیروی کی، خدا ان سے خوش ہے اور وہ خدا سے خوش ہیں اور اس نے اُن کے لئے باغات تیار کئے ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں اور ہمیشہ اُن میں رہیں گے۔

☆☆☆

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و حجاز

☆☆☆

فصل اوّل:

عروج کے بعد انحطاط وزوال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد پورے جزیرۂ عرب پر اسلام کے نظامِ حیات کو عملاً نافذ کردیا۔اس نظام کی جزیرۂ عرب سے باہر توسیع کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک سے اس کا آغاز کیا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے خلیفہ حضرت ابوبکرصدیقؓ نے جیش اسامہ کی روانگی اور فتنۂ ارتداد کے بارے میں انتہائی مدبرانہ فیصلے کر کے دین اسلام کو محفوظ کرنے کا عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا۔ایک سال سے کم مدت میں پورے جزیرۂ عرب سے فتنۂ ارتداد کا کلی طور پر خاتمہ کردیا۔پھر فارس اور روم کے علاقوں کو فتح کرنے کے لیے لشکر بھیجے۔چنانچہ دونوں جگہ لشکرِ اسلام نے زبردست معرکے لڑکر بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔حضرت ابوبکرصدیقؓ کی وفات کے بعد حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ بنے۔آپ کا دورِخلافت ہر لحاظ سے تاریخی اور مثالی ہے۔دورِفاروقی میں دنیا کی دو بڑی طاقتوں روم وفارس پر اسلامی پرچم لہرادیا گیا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں جس طرح ملکی نظم ونسق کو مدبرانہ انداز سے چلایا اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

حضرت الفاروقؓ کی شہادت کے بعد سیدنا عثمان بن عفانؓ خلیفہ بنائے گئے۔آپ کے دورِ خلافت میں اسکندریہ، افریقہ، قبرص، روڈس، طبرستان اور دیگر کئی بڑے شہر فتح ہو کر اسلامی سلطنت میں شامل ہوئے۔حضرت عثمان غنیؓ کے بعد سیدنا علی بن ابی طالبؓ چوتھے خلیفہ منتخب ہوئے۔آپ کے دور میں نئے علاقے فتح نہ ہوسکے اور مسلمانوں کی آپس میں کشمکش اور لڑائیاں جاری رہیں۔

امیرالمومنین سیدنا معاویہؓ کے زمانہ میں ہند، افریقہ اور دیگر علاقوں میں فتوحات ہوئیں اور ایک وسیع رقبہ اسلامی سلطنت میں شامل ہوا۔اموی خلفاء نے ملکی نظم ونسق، امن وامان، جہاد اور نئی فتوحات کے ذریعے اشاعتِ اسلام جیسے شاندار کارنامے سرانجام دیئے۔امویوں کے بعد متعدد عباسی حکمرانوں نے حکومت کی لیکن جہاد اور توسیع سلطنت سے محروم رہے۔ان کی آپس میں کشمکش اور خانہ جنگی جاری رہی۔جب عباسی سلطنت انتہائی زوال کو پہنچی تو اس دوران منگولیا سے تاتاریوں کا طوفان اٹھا اور بغداد

کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ۶۵۶ھ میں بغداد سے خلافت کا وجود ختم ہو گیا۔

مجموعی طور پر آٹھ صدیوں تک مسلمان خلفاء اور امراء نے اندلس میں حکومت کی، لیکن مسلمان بادشاہوں کی عیش کوشی، دین سے دوری، خانہ جنگی اور شمشیر و سناں سے لاتعلقی کی وجہ سے عیسائی مختلف علاقوں پر قبضہ کرتے کرتے آخر کار ربیع الاوّل ۸۹۷ھ میں اندلس کے آخری شہر غرناطہ پر بھی قابض ہو گئے۔

سلطان عثمان دولتِ عثمانیہ کا پہلا تاجدار تھا۔ سلطان عثمان نے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور اپنی سلطنت کو وسعت دینا شروع کی۔ گیلی پولی کی فتح کے ساتھ ہی یورپ میں عثمانی فتوحات کا آغاز ہوا۔ پھر عظیم عثمانی جرنیل اور مجاہد سلطان محمد فاتحؒ نے 29 /مئی 1453ء کو قسطنطنیہ بھی فتح کرلیا۔ اس طرح گیارہ صدیوں سے قائم شدہ بازنطینی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ جنوری 1517ء میں سلطان سلیم اوّل نے مصر کے مملوکوں کو قاہرہ کے قریب رضوانیہ کے مقام پر فیصلہ کن شکست دے کر برائے نام عباسی خلیفہ سے خلافت اپنے نام منتقل کرالی۔ اس طرح اب خلافت کا مرکز بغداد اور قاہرہ کی بجائے قسطنطنیہ بن گیا۔ ستمبر 1566ء تک خلافتِ عثمانیہ مصر، شمالی افریقہ، ایشیائے کوچک، فلسطین، شام، ریاستہائے بلقان اور ہنگری تک پھیلی ہوئی تھی۔ ۔ 1914ء میں پہلی جنگِ عظیم میں اتحادیوں نے جرمنی اور ترکی کو شکست دے کر تین براعظموں پر پھیلی ہوئی خلافتِ عثمانیہ کے تمام علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ جنگ کے بعد 29 /اکتوبر 1923ء میں مصطفیٰ کمال پاشا کی صدارت میں جمہوری حکومت قائم ہوئی، جس نے 2 / مارچ 1924ء کو منصبِ خلافت ختم کرنے کا اعلان کردیا اور ترکی کو سیکولر اسٹیٹ قرار دیا۔

ولید بن عبدالملک کے زمانہ خلافت میں حجاج بن یوسف کے حکم سے محمد بن قاسمؒ نے سندھ کو فتح کیا اور پورے مغربی ہندوستان کو اسلامی سلطنت میں شامل کرلیا۔ ۔ شہاب الدین غوری نے شمالی ہند کو فتح کر کے باقاعدہ حکومت قائم کی۔ غلام خاندان کے بعد خلجی خاندان اور ان کے بعد تغلق، پھر لودھیوں نے ہندوستان پر حکومت کی۔ لودھیوں کے بعد ظہیر الدین بابر نے مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی جو کہ انیسویں صدی کے پہلے نصفِ اوّل تک کسی نہ کسی صورت میں برقرار رہی۔

فصل دوم:

مسلم ممالک میں احیائی تحریکیں

اسلامی سلطنتوں کے زوال اور کفریہ طاقتوں کی جارحیت اور ان کے قبضے کے بعد اہل اسلام نے سامراجی طاقتوں کے اخراج، ان سے آزادی حاصل کرنے اور دوبارہ نئے سرے سے اسلامی نظام کے احیاء اور نفاذ کے لیے تحاریک کا آغاز کر دیا۔ جن میں سب سے اہم کردار علماءِ کرام نے ادا کیا۔ آخر کار مسلم ممالک نے آزادی حاصل کر لی۔ ہم یہاں چند تحاریک کا اجمالی تعارف پیش کرتے ہیں۔

برِ صغیر (پاک و ہند)

جب سلطنتِ مغلیہ انحطاط پذیر ہونے لگی اور انگریزوں کی آمد شروع ہوئی تو اس وقت کے علماء نے انگریزوں کے اخراج، ملک کے اندر موجود بغاوتوں کے سدِ باب، سلطنتِ مغلیہ کی مضبوطی اور اسلامی نظام کے ازسرِ نو قیام کے لئے علم جہاد بلند کیا۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے بذریعہ خط و کتابت مغلیہ سلاطین کو ملکی اصلاحِ احوال کی ترغیب و تاکید کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سیلاب کو روکنے کے لئے سلطان حیدر علیؒ اور فتح علی ٹیپوؒ جیسے مجاہد جرنیل سامنے آئے لیکن اپنوں کی غداری اور انگریزوں کی سازشوں کی وجہ سے سلطان حیدر علی کے بعد شیرِ میسور سلطان فتح علی ٹیپو بھی لڑتے لڑتے جامِ شہادت نوش کر گئے۔

تحریکِ جہاد

شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ نے دعوت و جہاد کی سنت کا احیاء کرتے ہوئے اسلامی نظام کے احیاء کے لئے تحریکِ جہاد کو آگے بڑھاتے ہوئے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ دینے کے ساتھ ساتھ سید احمد شہید رحمہ اللہ کی زیرِ قیادت انگریزی سامراج کے اخراج اور اسلامی نظامِ حکومت کے قیام کے لئے مجاہدین کا لشکر تشکیل دیا۔ حضرت سید احمد شہید اور سید اسماعیل شہید رحمہما اللہ نے اپنی جہادی مہم کا آغاز سرحدی علاقے سے کیا۔ جذبہ جہاد اور نصرتِ الٰہی کے ساتھ فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تحریک جہاد جاری تھی کہ علاقائی خوانین سازش کا شکار ہو گئے اور بغاوت شروع ہو گئی، چنانچہ سید احمد شہید اور

سید اسماعیل شہید رحمہما اللہ اپنے رفقاء سمیت بالا کوٹ کے میدانوں میں شہادت کے عظیم رتبے پر فائز ہوئے۔ بعد میں باقی ماندہ مجاہدین نے لڑائی جاری رکھی اور یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ 1857ء میں فیصلہ کن معرکہ ہوا، جس میں انگریزوں نے دہلی پر مکمل تسلط حاصل کر لیا اور برائے نام مغلیہ بادشاہت ختم کر دی گئی۔

تحریک دارالعلوم دیوبند

جنگِ آزادی کے بعد دیوبند کے قصبہ میں ۱۵/محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق 1867ء کو مدرسہ قائم ہوا، جس کا مقصد اس مدرسہ کے اولین طالب علم حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ اس طرح بیان فرماتے ہیں:

''حضرت الاستاذ (مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ) نے اس مدرسہ کو کیا درس و تدریس، تعلیم و تعلم کے لئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں 1857ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے، جس کے زیرِ اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تا کہ 1857ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔''

(احاطۂ دارالعلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن: ص ۱۷۰)

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے مدرسہ کے قیام کا مقصد ہمیشہ پیشِ نظر رکھا، چنانچہ ۱۲۹۷ھ میں ''ثمرۃ التربیت'' کے نام سے ایک جمعیت قائم کی، پھر جمعیت الانصار کے نام سے ایک جماعت تشکیل دی۔ 1912ء میں بلقان اور ترکی کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ 1915ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ کو کابل بھیجا۔ ادھر آپ اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مکہ معظمہ پہنچ کر گورنرِ مکہ غالب پاشا، ترکی وزیرِ جنگ انور پاشا اور جنوبی و مغربی محاذ کے کمانڈر جمال پاشا سے ملاقات کر کے انہیں اپنے پروگرام کا نقشہ سمجھایا۔ اس خفیہ تحریک کا راز فاش ہونے پر صفر ۱۳۳۵ھ میں آپ اپنے رفقاء سمیت گرفتار کر لئے گئے۔ دسمبر 1919ء کو جمعیۃ علماءِ ہند کا قیام عمل میں آیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد آپ کے جانشین شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے تحریکِ آزادی میں سرگرم حصہ لیا۔ آپ نے مارچ ۱۹۴۲ء میں جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے ہندوستان کی آزادی اور مسلمانوں کے مستقبل کے لیے فارمولا پیش کیا۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا حالات و واقعات کے پیشِ نظر یہ خیال تھا کہ اب ہندو اور مسلمانوں کا اکٹھے رہنا مشکل ہے اور جو جماعت مسلمانوں کے لئے علیحدہ مملکت کا مطالبہ کرے

گی اسے کامیابی حاصل ہو جائے گی، اس لئے آپ نے مسلم لیگ کی قیادت کو تبلیغ کرنے کے لیے دسمبر 1938ء میں تبلیغی وفد روانہ کیا۔ حضرت حکیم الامتؒ نے مسلم لیگ کی جدو جہد کو ہی ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کے لئے مفید سمجھا، اس لئے جون ۱۹۳۹ء میں مسلم لیگ کی حمایت میں فتویٰ جاری کیا۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے بعد ان کے خلفاء حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے تحریکِ پاکستان کی حمایت کی۔ نومبر 1945ء میں کلکتہ میں ''جمعیت علماء اسلام'' تشکیل دی گئی، جس نے مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان کرتے ہوئے مسلمانوں سے مسلم لیگ کے امیدواروں کو ووٹ دینے کی اپیل کی۔ 3/ جون 1947ء کو تقسیم ہند کا اعلان ہو گیا۔

علماء کرام نے تحریک پاکستان کی حمایت ونصرت اس بنا پر کی تھی کہ قیام پاکستان کے بعد اس میں اسلامی نظام نافذ کیا جائے گا۔ بانی پاکستان محمد علی جناح کی وفات کے بعد اربابِ اقتدار نے مقصدِ پاکستان سے یکسر انحراف کرنا شروع کر دیا اور اسلامی نظام کے مخالفین نے سیکولر یعنی لا دینی نظامِ حکومت کے قیام کے لئے ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ قراردادِ مقاصد پاس ہونے کے بعد مخالفین اسلام نے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ اسلام کا کوئی دستور مملکت نہیں۔ حکومت کے اس پروپیگنڈے کا جواب دینے کے لئے جنوری 1951ء کو کراچی میں تمام مسالک کے 31 جید علماء کرام کا اجتماع منعقد ہوا، جس میں متفقہ طور پر اسلامی مملکت کے بنیادی اصولوں پر مشتمل 22 نکات پیش کئے گئے۔ 14/ اگست 1973ء کو نیا متفقہ آئین نافذ ہوا۔ جس میں اسلامی دفعات شامل کی گئیں۔ 6/ اکتوبر 1989ء کو آٹھ سیاسی جماعتوں پر مشتمل اتحاد ''اسلامی جمہوری اتحاد'' قائم ہوا جس میں دینی سیاسی جماعتیں بھی شامل تھیں۔ 1990ء کے انتخابات میں اس اتحاد نے اکثریت حاصل کرنے کے بعد دینی جماعتوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے۔ 2002ء میں مذہبی سیاسی جماعتوں کے اتحاد ''متحدہ مجلس عمل'' کا قیام عمل میں آیا۔ اکتوبر 2002ء کے عام انتخابات میں مجلس عمل کو بلوچستان میں جزوی کامیابی اور سرحد میں اکثریت حاصل ہوئی۔ مجلس عمل نے سرحد میں حکومت تشکیل دی اور سرحد اسمبلی میں اسلامی اصلاحات کے حوالے سے حسبہ بل منظور کیا جسے مرکزی حکومت نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ صوبائی سطح پر مکمل اقتدار کے باوجود مجلس عمل مختلف رکاوٹوں کی وجہ سے اسلامی قوانین نافذ نہیں کر سکی۔ فروری 2008ء کے انتخابات میں متحدہ مجلس عمل کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

ترکی

خلافت کے سقوط کے بعد نئے سیکولر ترکی میں مذہبی تعلیم کو ممنوع قرار دیا گیا۔ صوفیاء کی خانقاہوں کو بند کر دیا گیا، عربی رسم الخط کو سرکاری حکم کے ذریعے ترک کر دیا گیا اور اذان، نماز وغیرہ عربی زبان میں پڑھنے پر پابندی لگا دی گئی۔ مصطفیٰ کمال اور اس کے رفقاء نے یہود و نصاریٰ کی دیرینہ خواہش کے عین مطابق ترکی کی اسلامی حیثیت کو ہر لحاظ سے ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اسلامی تہذیب وثقافت کے تمام آثار و علامات کو مٹانے کی ہر ممکن سعی کی۔ جس ملک میں صدیوں تک اسلامی نظام خلافت قائم رہا اور اسلامی تہذیب وتمدن اور ثقافت کا مرکز رہا، تھوڑے ہی عرصے میں مغربی تہذیب وثقافت کے آثار و مظاہر کا ظہور شروع ہو گیا۔ تاہم ترک مسلمانوں کی اسلام پسندی، مذہبی حمیت، جذبہ ایمانی اور اسلامی غیرت کو فنا نہ کیا جا سکا۔

سیکولرازم کے خلاف جہاد

مصطفیٰ کمال کے سیکولر نظریات اور اعمال کے سیلاب کے آگے درد دل رکھنے والے علماء نے بند باندھنے کی حسبِ استطاعت کوشش کی اور ترکوں کے ایمان وعقیدہ اور اسلامی تعلیمات واحکام سے وابستگی کو باقی رکھنے اور اسے مضبوط کرنے کے لئے بھرپور جدوجہد کی۔ علماء کرام نے مختلف طریقوں سے دعوتی واصلاحی خطبات، دروس قرآن اور مواعظ کے ذریعے ترک مسلمانوں کے تزکیہ وتربیت کا کام جاری رکھا۔ جس کا یہ فائدہ ہوا کہ کمالی سیکولر افکار ونظریات پوری ترک قوم پر حاوی نہ ہو سکے۔ انہیں علماء کرام میں ایک عظیم شخصیت شیخ بدیع الزمان سعید نورسیؒ (1873 تا 1940) کی ہے، جنہوں نے ترک مسلمانوں میں دعوتی واصلاحی تحریک چلا کر ان کے ایمان واسلام کی حفاظت کر کے اسے پروان چڑھایا۔

ترک فوج کو ترکی کے سیکولر تشخص کا محافظ قرار دیا گیا چنانچہ کوئی جماعت بھی ترکی میں اسلامی تعلیمات کی ترویج اور قوانین کے نفاذ کے لئے کامیاب نہ ہو سکی اگر کوئی گروہ یا جماعت ایسا کرنے کی کوشش کرتی تو فوج آئین کی خلاف ورزی کے نام پر اس کے خلاف کارروائی کرتی اور اس طرح کی کوشش کرنے والی مقتدر جماعت کی حکومت کو ختم کر کے اقتدار پر اپنا تسلط قائم کرتی ہے۔ چنانچہ یہ سلسلہ آج تک بدستور جاری ہے۔ 1941ء میں ترمیم شدہ دستور میں چند اسلامی سرگرمیوں کی

اجازت دی گئی، جس سے ملک کے سیکولر کردار اور تشخص پر کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔

احیاءِ اسلام کے لئے جمہوری جدوجہد

پروفیسر نجم الدین اربکان نے اعلیٰ تعلیم ٹیکنیکل یونیورسٹی استنبول سے حاصل کرنے کے بعد جرمن کی یونیورسٹی آف اآچن سے میکینکل انجینئرنگ کے ایک شعبہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ۔ 1969ء میں ترکی میں ہونے والے عام انتخابات میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا اور تاریخ ساز کامیابی حاصل کی پھر پارلیمنٹ میں اپنے ہم خیال احباب کا ایک محاذ قائم کر کے 26/ جنوری 1970ء کو ملی نظام پارٹی کے نام سے اپنی پارٹی تشکیل دی۔ جس کے منشور کا اہم نکتہ ''اسلامی فکر اور نظریات کی بالادستی'' تھا۔

یہ چیز ترکی کے سیکولر طبقے اور مغرب کے لئے قابل قبول نہ تھی چنانچہ اس پارٹی کو مئی 1971ء خلافِ قانون قرار دے دیا گیا۔ 11/ اکتوبر 1972ء کو ''ملی سلامت پارٹی'' کے نام سے نئی جماعت تشکیل دی گئی جس نے 1973ء کے پارلیمانی انتخابات میں شرکت کر کے 11 فیصد ووٹ حاصل کئے اور 74 نمائندے منتخب ہوئے۔ پیپلز ریپبلکن پارٹی کے ساتھ اشتراک کیا گیا اور پروفیسر اربکان ڈپٹی وزیراعظم بنے، آپ نے اس منصب کے ذریعے ترک معاشرہ میں اسلامی فکر کے احیاء، اسلامی شعائر اور اپنے تاریخی ورثے سے محبت اور جہاد کے جذبے کو پروان چڑھایا۔ تمام فوجی مراکز اور اداروں میں اسلامی تعلیمات کو لازم قرار دیا گیا۔ ان اقدامات سے گھبرا کر فوج نے 14/ ستمبر 1980ء کو پارلیمنٹ تحلیل کر دی اور تمام سیاسی جماعتوں کو ملی سلامت پارٹی سمیت خلافِ قانون قرار دیا۔ اس کے بعد اس کی جگہ ''ملی رفاہ پارٹی''، تشکیل دی گئی جس کے منشور کی اہم شق ''اسلامی نظریہ حکومت کا قیام'' تھی۔

رفاہ پارٹی نے 1987، 1991ء اور 1994ء کے عام انتخابات میں شرکت کی 1996ء کے عام انتخابات میں 21 فیصد ووٹوں کی حمایت سے قومی اسمبلی کی 153 نشستیں حاصل کر کے ترکی کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی کے طور پر سامنے آئی۔ پروفیسر نجم الدین اربکان پہلے اسلام پسند وزیراعظم منتخب ہوئے۔ خارجی و بیرونی سازشوں کی وجہ سے حکومت بمشکل گیارہ ماہ چل سکی۔ 18/ جون 1997ء کو وزیراعظم اربکان کو مستعفی ہونا پڑا۔ اس کے بعد دسمبر 1997ء میں رفاہ کو خلافِ قانون قرار دے کر سیاست میں حصہ لینے سے روک دیا گیا۔

نومبر 2002ء میں پارلیمانی انتخابات ہوئے جونئی سیاسی جماعت ''جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ

پارٹی'' نے جیت لیے تاہم مذہبی جذبات اور ایجنڈا رکھنے کے باعث اس کے رہنما طیب اردگان کو فوج نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ تاہم بعد میں مفاہمت ہوگئی اور طیب اردگان ترکی کے نئے وزیراعظم بن گئے۔ مارچ 2003ء میں امریکہ کو عراق پر حملہ کرنے کی غرض سے فوجی اڈوں کی ضرورت تھی۔ میں ترکی کی پارلیمنٹ نے امریکہ کو اپنے ملک کے ہوائی اڈے استعمال کرنے کا بل مسترد کر دیا۔ اس پر امریکہ اور ترکی کے تعلقات سخت خراب ہوگئے۔ ایک جائزے سے پتا چلا کہ 90 فی صد ترک امریکی حملے کے خلاف تھے۔ 2007ء میں پارلیمانی انتخابات ہوئے جو حکمران جماعت'' جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی'' نے جیت لیے۔ اسی پارٹی سے تعلق رکھنے والے وزیرخارجہ عبداللہ گل کو صدارتی انتخاب میں صدارتی امیدوار نامزد کیا گیا جس کی سیکولر حلقوں نے مخالفت کی تاہم وہ صدر منتخب ہوگئے۔

انڈونیشیا

انڈونیشیا میں اسلام کی اشاعت عرب مبلغین کے ذریعہ ہوئی اور مقامی نومسلموں نے اہم کردار ادا کیا۔ انڈونیشیا میں مسلمانوں کی پہلی سلطنت سماٹرا میں 1205ء میں قائم ہوئی۔ اس کے بعد آچے، پالم نگ، جاوا، بورینو، سلادیسی اور مالوکا میں مسلمانوں نے سلطنتیں قائم کیں جو کسی نہ کسی طرح 1755ء تک برقرار رہیں۔ 1511ء میں پرتگال نے جزائر انڈونیشیا پر قبضہ کر لیا۔ پھر ولندیزیوں نے آہستہ آہستہ ان علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ 1816ء میں برطانوی حکومت نے یہاں اقتدار حاصل کر لیا اور ہالینڈ سے ایک معاہدے کے تحت انڈونیشیا کے جزائر کو آپس میں بانٹ لیا۔ جنگ عظیم دوم کے دوران ایک مختصر وقفے کے لئے جاپانیوں نے اقتدار حاصل کر لیا۔ اس کے بعد اتحادیوں نے دوبارہ اس پر قبضہ کر لیا۔

استعماری طاقتوں کے خلاف جہاد

انیسویں صدی کے اوائل میں ولندیزیوں کے خلاف مختلف سیاسی اور مذہبی تحریکات کا آغاز ہوا۔ آچے کے ایک عالم امام ابوالنجول نے غاصب ولندیزیوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ اس کے لئے انہوں نے مجاہدین کی ایک باقاعدہ فوج تیار کی۔ چنانچہ یہ تحریکِ جہاد ان کی وفات 1864ء تک جاری رہی۔ اس تحریک سے دیگر جزائر کے عوام بھی متاثر ہوئے اور وہاں بھی مختلف تحاریکِ آزادی کا آغاز ہوا، جنہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی، رفاہی، معاشی، معاشرتی سطح پر بہت خدمت کی اور عوام کے اندر آزادی اور حریت

کا شعور اور بیداری پیدا کی۔ 1912ء میں حاجی عمر سعید نے ایک تحریک ''شرکت اسلام'' کی بنیاد رکھی۔ جس نے قومی بیداری میں اہم کردار ادا کیا۔ 1926ء میں ''نہضۃ العلماء'' کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے پہلے صدر ہاشم اشعری منتخب ہوئے۔ 1937ء میں اسلامی تنظیموں کا اتحاد M.I.A وجود میں آیا۔ جنگِ عظیم دوم کے دوران 1942ء سے 1945ء تک مختصر وقفے کے لئے جاپان انڈونیشیا پر قابض ہو گیا اور اس نے سیاسی تنظیموں پر پابندی عائد کر دی جو کہ جلد اٹھا لی گئی۔ اسی دوران M.I.A کی جگہ ماشومی تحریک نے لی جس نے اپنا عسکری بازو حزب اللہ کے نام سے تشکیل دیا۔ آزادی کی تحریک روز بروز زور پکڑتی گئی۔ 1945ء میں جاپانیوں کی شکست کے بعد ڈچ حکمرانوں نے دوبارہ انڈونیشیا پر قبضہ کرنا چاہا لیکن ان کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔

دیگر جماعتوں سے اتحاد اور اسلامی دستور میں رکاوٹ

قوم پرستوں اور کمیونسٹوں کے ساتھ اسلامی تحریکیں بھی جنگ آزادی میں پیش پیش تھیں اور انڈونیشیا کے لئے دستور سازی میں شریک ہوئیں۔ اسلام پسندوں کا زور اس بات پر تھا کہ دستور میں انڈونیشیا کو ایک اسلامی ریاست قرار دے کر دستور کی بنیاد شریعت اسلامیہ پر رکھی جائے، لیکن قوم پرستوں اور کمیونسٹوں کی مخالفت کی وجہ سے انہیں ایک ایسے پانچ ستونی فارمولے پر اتفاق کرنا پڑا جس میں خدائے واحد کو اوّل درجے پر رکھا گیا تھا۔ یہ دستور 18 / اگست 1945ء کو انڈونیشیا کی آزادی کے اعلان کے ساتھ ہی نافذ کیا گیا۔ انڈونیشیا کی آزادی کے اعلان کو ڈچ حکمرانوں نے تسلیم نہ کیا تو 1945ء تا 1949ء تک جنگ آزادی جاری رہی، جس میں حزب اللہ کے رضا کاروں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ حزب اللہ میں شامل نہضۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے علماء نے اکتوبر 1945ء میں یہ فتویٰ جاری کیا کہ جنگِ آزادی ''جہاد فی سبیل اللہ'' ہے اور تمام انڈونیشیائی مسلمانوں پر اس میں شرکت لازم ہے۔ اس فتوے نے جہادِ آزادی میں ایک نئی روح پھونک دی اور تحریک ایک نئے مرحلے میں داخل ہو گئی۔ آخر کار 28 / دسمبر 1949ء میں ڈچ حکمرانوں نے انڈونیشیا کی آزادی کو تسلیم کر لیا۔ ماشومی تحریک میں شامل نہضۃ العلماء کے اس مطالبہ کو کہ ''اس اتحاد میں علماء کی کونسل کو حتمی فیصلہ کرنے کی مخصوص پوزیشن دی جائے'' ماشومی تحریک میں شامل دیگر جماعتوں نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس کی بناء پر نہضۃ العلماء نے ماشومی اتحاد سے 1952ء میں علیحدگی اختیار کر لی۔ نہضۃ العلماء 1955ء میں دستور ساز اسمبلی اور پہلے پارلیمانی انتخابات میں 18.4 فیصد ووٹ حاصل کر کے

چار بڑی سیاسی جماعتوں میں سے ایک رہی جبکہ مجموعی طور پر اسلامی پارٹیوں کو 43.9 فیصد ووٹ ملے۔ دستور ساز اسمبلی میں تمام اسلامی پارٹیوں نے انڈونیشیا کو اسلامی ریاست قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ جس کی کمیونسٹ، نیشنلسٹ، علاقائی پارٹیوں اور عیسائیوں نے مخالفت کی جس کی وجہ سے دستور پر اتفاق نہ ہوسکا۔ 1958ء میں سوکارنو نے دستور ساز اسمبلی تحلیل کردی اور 1945ء کا دستور نافذ کردیا۔ 1971ء کے انتخابات میں نہضۃ العلماء نے حزب اللہ کی قیادت میں 18.3 فیصد ووٹ حاصل کئے اور اکثریتی پارٹی گولکر پارٹی کو 63 فیصد ووٹ حاصل ہوئے۔ انتخابات کے بعد نہضۃ العلماء کو حکومت میں حصہ دینے سے انکار کردیا گیا۔ 1985ء میں سوہارتو نے ''پانکشیلا'' نامی قانون عوام پر مسلط کردیا۔ جس کی زیادہ تر اسلام پسند جماعتوں نے مخالفت کی۔

سوڈان

1820ء میں مصر نے سوڈان پر قبضہ کرلیا پھر انگریز بھی اس علاقے پر قابض ہونا شروع ہوئے۔ سید محمد احمد جو کہ مہدی سوڈانی (1831ء تا 1885ء) کے نام سے معروف ہیں، نے تحریکِ جہاد کی بنیاد رکھی اور چار سال 1881ء تا 1884ء میں انگریزوں اور مصریوں کے خلاف جہاد کر کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ ان کی وفات کے بعد بھی یہ تحریک جاری رہی اور ان کے مریدوں نے 1898ء تک انگریزوں سے جہاد کیا۔ 1898ء، 1899ء میں مہدی کے مریدوں نے ''ام درمان'' کی جنگ میں شکست کھائی اور انگریزوں نے سوڈان کو مکمل طور پر اپنے قبضے میں لے لیا۔

تحریکِ آزادی

1928ء میں مصر میں اخوان المسلمین کی بنیاد رکھی گئی۔ 1930ء کے عشرے میں سوڈان میں بھی اخوان کی دعوت پہنچی اور یہاں بھی اخوان منظم ہونا شروع ہوگئے۔ طلبہ کی ایک تنظیم ''اسلامک لبریشن موومنٹ'' قائم کی گئی جس نے 1948ء میں سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کو خرطوم یونیورسٹی کے انتخابات میں شکست دی۔ اخوان نے 1955ء میں ''اسلامی دستور فرنٹ'' کے نام سے مختلف جماعتوں پر مشتمل ایک اتحاد تشکیل دیا، جس میں شامل جماعتوں کو اس بات پر متفق کیا گیا کہ 1956ء میں سوڈان کی متوقع آزادی کے بعد ملک کا دستور اسلامی اصولوں پر مبنی ہوگا، لیکن آزادی کے بعد اسلامی دستور کے لئے کوئی اقدام نہ کیا گیا۔ 1958ء میں اخوان نے ملک کے پہلے انتخابات میں براہِ راست حصہ لینے

کی بجائے اسلامی دستور کے لئے کام کرنے والے افراد کو کامیاب کرانے کی حکمت عملی اختیار کی اور نیشنل فرنٹ تشکیل دیا۔

نفاذِ اسلام کی جدوجہد اور فوجی آمریت

1958ء میں ہی جنرل ابراہیم عبود نے اقتدار پر قبضہ کرلیا اور سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کر دی۔ اسی دوران اخوان نے البلاغ کے نام سے کام جاری رکھا اور 1959ء میں امہ پارٹی اور نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کے ساتھ مل کر فوجی حکومت کو ختم کرنے کی کوشش کی جو کہ کامیاب نہ ہوسکی۔ 1964ء میں اخوان نے ''اسلامی چارٹر فرنٹ'' کے نام سے مختلف جماعتوں کا اتحاد تشکیل دیا۔ جس کا سیکریٹری جنرل ڈاکٹر حسن عبداللہ ترابی کو بنایا گیا۔ فرنٹ نے 1965ء کے انتخابات میں حصہ لیا اور سات نشستیں حاصل کیں۔ فرنٹ نے یہ منشور پیش کیا:

1-اسلامی نظام کا نفاذ 2- معیشت کی اصلاح 3-بدعنوانی سے پاک حکومت کا قیام

1967ء میں دوبارہ انتخابات ہوئے تو فرنٹ کو صرف پانچ نشستوں پر کامیابی ہوئی۔ 1969ء کو میجر جنرل جعفر نمیری نے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ فرنٹ نے امہ پارٹی کے ساتھ مل کر نیشنل فرنٹ بنایا اور فوجی حکومت کے خلاف مزاحمت کی جسے فوجی حکومت نے بہت برے طریقے سے کچل دیا، جس میں سینکڑوں افراد کو ہلاک کیا گیا۔ فرنٹ 1973ء، 1975ء اور 1976ء کی فوجی حکومت کے خلاف مزاحمت میں شامل رہا۔ 1971ء میں جعفر نمیری ملک کے پہلے صدر منتخب ہوئے اور 1973ء میں نیا آئین نافذ کیا گیا۔

اسلامی قوانین کا نفاذ

1983ء میں نمیری دوبارہ صدر منتخب ہوئے اور ملک میں اسلامی نظام متعارف کرانے کا اعلان کیا۔ اسلامی جماعتوں نے اس کا خیر مقدم کیا اور حکومت کی اس بارے میں کھلی حمایت کی۔ فرنٹ نے اسلامی قوانین کے نفاذ کے ایک سال بعد بین الاقوامی کانفرنس برائے نفاذِ شریعت منعقد کی، جس میں دنیا بھر سے دو سو سے زائد نمایندوں نے شرکت کی اور دس لاکھ افراد نے ڈاکٹر حسن عبداللہ ترابی کی اپیل پر خرطوم کی سڑکوں پر مارچ کیا۔ جون 1989ء میں جنرل عمر حسن احمد البشیر نے اقتدار سنبھال لیا اور پورے مملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا اعلان کر دیا۔ 1990ء میں امریکہ نے سوڈان کی امداد بند کر دی۔ 1993ء میں جنرل عمر بشیر سرکاری طور پر سوڈان کے صدر بن گئے۔ 1996ء

میں ملک میں صدارتی انتخابات ہوئے جو صدر عمر بشیر جیت گئے ،اگر چہ حزب اختلاف کے کئی گروہوں نے انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔

20 / اگست 1998ء کو امریکہ نے خرطوم میں ''الشفا فارسیوٹیکل فیکٹری'' کو 20 سے زائد کروز میزائلوں کا نشانہ بنایا۔ یہ حملہ اس الزام کی بنا پر کیا گیا تھا کہ یہ فیکٹری جہادی تنظیم القاعدہ کے سربراہ اسامہ بن لادن کی ہے جس میں کیمیائی ہتھیار تیار ہوتے ہیں ، یہ جھوٹ ثابت ہوا کیونکہ اس فیکٹری میں اینٹی ملیریا اور اینٹی بائیوٹک دوائیں تیار ہوتی تھیں۔ 1999ء میں ملک میں کثیر جماعتی نظام دوبارہ قائم کردیا گیا۔ حسن عبداللہ الترابی کو نظر بند کردیا گیا ، کیونکہ وہ پارلیمنٹ کے ذریعے صدر عمر البشیر کے اختیارات کم کرنا چاہتے تھے۔ 2004ء میں دارفور میں باغیوں نے حکومت کے خلاف لڑائی جاری رکھی۔ چونکہ وہ عیسائی ہیں ،اس لیے امریکہ اور دوسری مغربی طاقتوں نے سوڈانی حکومت پر زور دیا کہ وہ باغیوں کے خلاف فوجی کارروائی بند کرے ،ورنہ سوڈان پر حملہ کردیا جائے گا۔

الجزائر

پہلی صدی ہجری مطابق ساتویں صدی عیسوی میں حضرت عقبہ بن نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے الجزائر کو فتح کیا۔ اسلامی مبلغین کی کوششوں سے اہل الجزائر نے اسلام قبول کیا۔ یہاں مسلمانوں کی حکومت رہی۔ سولہویں صدی عیسوی میں اسپین نے الجزائر پر قبضہ کیا۔ الجزائری باشندوں کی درخواست پر خلافتِ عثمانیہ کے امیر البحر خیر الدین باربروسہ نے الجزائر کو آزاد کرادیا اور یہاں خلافتِ عثمانیہ کی عملداری قائم ہوئی۔ 1835ء میں فرانس نے الجزائر پر قبضہ کرلیا۔

تحریکِ جہاد

فرانسیسی قبضہ کے خلاف امیر عبد القادر الجزائری نے تحریکِ جہاد شروع کی اور وقفے وقفے سے فرانسیسی سامراج کے خلاف الجزائری مجاہدین لڑتے رہے۔ لیکن 1847ء میں فرانس نے الجزائر پر مکمل کنٹرول حاصل کرلیا۔ تحاریکِ آزادی تسلسل سے جاری رہیں البتہ جدوجہد آزادی کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی کے آغاز میں ہوا، الجزائر کے ممتاز عالم دین شیخ عبد الحمید بن بادیسؒ نے 1922ء میں جمعیۃ علماء الجزائر نامی جماعت قائم کی۔ جمعیۃ نے اپنے قیام کے بعد سب سے زیادہ زور دینی اور معاشرتی اصلاح پر دیا اور فرانسیسی ثقافتی یلغار کے آگے بند باندھنے کی بھرپور کوشش کی۔ 1951ء میں ''

الجزائری محاذ برائے دفاع حریت'' قائم ہوا جس میں ''جمعیۃ علماء الجزائر'' جمہوری آزادیوں کی فتح کی تحریک (M.L.T.D) جمہوری اتحاد اور دیگر سیاسی تنظیمیں شامل تھیں۔ 1954ء میں جب آزادی کی تحریک مسلح جدوجہد کے دور میں داخل ہوئی تو اسے مشترکہ محاذ کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ سات سال کی جدوجہد کے بعد 3/ جولائی 1962ء میں فرانس نے اقتدار ''قومی محاذِ آزادی'' کے راہنماؤں کے حوالے کر دیا جس میں سوشلسٹ راہنماؤں کی اکثریت اور غلبہ تھا۔ چنانچہ نئی حکومت میں سرکاری مذہب اسلام کو قرار دیا گیا اور مذہبی امور کی نگرانی کے لئے ایک وزارت اور مستقل محکمہ بھی قائم کیا گیا لیکن اسلامی نظام کو روکنے اور اس کے حامیوں کو دبانے کی ہر ممکن کوشش جاری رہی۔ 1989ء میں نیا آئین نافذ ہوا۔ 20/ اپریل 1990ء کو اسلامی محاذ نجات نے دارالحکومت میں صدارتی محل کے سامنے مظاہرہ کیا اور محاذ کے صدر ڈاکٹر عباسی مدنی نے اسلامی شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کیا۔

نفاذِ اسلام کے لئے جمہوری جدوجہد اور فوجی آمریت

1990ء میں پہلے صوبائی بلدیاتی کونسلوں کے انتخابات میں اسلامی محاذ نجات (اسلامک سالویشن فرنٹ) کو اکثریت حاصل ہوئی اور حکمران جماعت ''قومی محاذ آزادی'' کو بری طرح شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ صوبائی اور بلدیاتی اداروں میں محدود اختیارات کے باوجود اسلامی محاذ نے متعدد اصلاحات نافذ کیں۔ حکومت نے جون 1990ء میں پارلیمانی انتخابات کروانے کا اعلان کیا۔ اسلامی محاذ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے اسلام مخالف قوتیں پریشان ہوگئیں۔ فرانس نے فوج کے ذریعے اسے اقتدار تک پہنچنے سے روکنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ 28/ مئی 1991ء کو اسلامی محاذ کے 40 ہزار مظاہرین نے دارالحکومت میں مظاہرہ کیا۔ 5 جون کو حکومت نے ایمرجنسی نافذ کر دی اور انتخابات ملتوی کر دیے۔ اسلامی محاذ کے سینکڑوں ارکان محاذ کے صدر 60 سالہ ڈاکٹر عباسی مدنی سمیت گرفتار کر لئے گئے۔ اسلامی محاذ کے نئے قائد عبد القادر حشانی نے انتخاباتی بائیکاٹ ختم کرتے ہوئے 26/ دسمبر 1991ء کو ہونے والے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اور عوام کے سامنے منشور پیش کیا جس کا اہم نکتہ ''شرعی قوانین کا نفاذ'' تھا۔

انتخابات کے پہلے راؤنڈ میں محاذ نے قانون ساز اسمبلی کی 430 نشستوں میں سے 188 نشستیں جیت کر اکثریت حاصل کر لی۔ مغربی پڑوسی مسلم ممالک تیونس، مراکش، مصر، لیبیا کی حکومتیں اور الجزائر کے اسلام مخالف عناصر پریشان ہو گئے۔ چنانچہ فوج نے صدر سے استعفیٰ لے کر

اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ انتخابات کا اگلا راؤنڈ جو 16 / فروری 1992ء کو ہونا تھا معطل کر دیا گیا۔ اس طرح جمہوریت کے راستے سے آنے والے انقلاب کا راستہ روک دیا گیا اور دینی سیاسی قوتوں کو کچلنے کی کارروائیاں شروع کر دی گئیں۔

مصر

اخوان المسلمین کی تشکیل

ذی قعدہ ۱۳۴۷ھ مطابق مارچ 1928ء میں حسن البنا نے اپنے چھ ساتھیوں کے ساتھ مل کر تحریک اخوان المسلمین کی بنیاد رکھی اور خاموشی کے ساتھ اسلامی نظام کے احیاء کے لئے دعوت شروع کر دی۔ آپ نے شہر، گاؤں، قصبے الغرض ہر جگہ جا کر دعوت دی۔ آپ چونکہ سرکاری اسکول میں مدرس تھے اس لئے باہر کے سفر ہفتہ وار اور سالانہ گرمی کی تعطیلات میں کرتے تھے۔ یعنی ہفتہ وار میں قریب کے شہر اور بڑی چھٹیوں میں دور کے شہروں میں دعوت کے لئے جاتے تھے۔ لوگ آپ کی مؤثر تقریر سے متاثر ہو کر جوق در جوق اس تحریک میں شامل ہونے لگے۔ 1934ء میں شیخ کا تبادلہ قاہرہ کر دیا گیا۔ یہاں آپ نے دعوت کو مزید وسعت دی۔ 1934ء میں مصر کے پچاس سے زائد شہروں میں دعوت کا کام پھیل چکا تھا۔ 1936ء میں شیخ البناء نے شاہ فاروق اور وزیر اعظم مصطفیٰ النحاس، عرب ممالک کے فرمانرواؤں، حکام اور متعدد دینی اور سیاسی راہنماؤں کے نام ایک خط لکھا جس میں اسلامی نظام، اس کے دستور اور اسلامی تہذیب وتمدن کی طرف ان کو دعوت دی اور مغربی و اسلامی نظامہائے حیات میں فرق واضح کر کے اسلامی نظام کی ترجیح کو ثابت کیا۔ 1939ء اور 1940ء کے درمیانی عرصے میں اخوان سیاسی جدوجہد میں شریک ہونا شروع ہوئی۔ قاہرہ یونیورسٹی اور ازہر یونیورسٹی کے نوجوانوں کا ایک گروہ اس میں شامل ہوا۔ اس کے علاوہ مختلف پیشوں اور طبقوں کے لوگ بھی جماعت میں شامل ہونے لگے۔

حسین سری کی وزارتِ عظمٰی کے دور میں اخوان کے ہفت روزہ رسالے ''تعارف''، ''شجاع'' اور ماہنامہ ''المنار'' پر پابندی لگا دی گئی۔ رسائل اور کتابیں ممنوع قرار دی گئیں، پریس بند کر دیا گیا اور مرکزی راہنماؤں کو گرفتار کر کے دور دور کے شہروں میں لے جایا گیا۔ وزیر اعظم نحاس کے دور میں یہ پابندیاں ختم ہوگئیں لیکن برطانوی سفارت خانے کے دباؤ پر مرکز کے علاوہ ان کے تمام شعبوں پر

پابندی لگا دی گئی۔ اس کے بعد احمد ماہر کی وزارت میں پھر سختی شروع ہوئی۔

جمہوری سیاست میں شرکت

حسن البناء اور دوسرے راہنماؤں نے انتخابات میں حصہ لیا۔ شیخ البناء کامیاب ہو گئے لیکن انگریزوں اور اخوان مخالف حلقوں کی طرف سے سازش کے ذریعے دوبارہ انتخابات کرا کر شیخ البناء اور دیگر اخوانی امیدواروں کو ہرا دیا گیا۔ 5/مئی 1946ء کو اخوان نے پہلا روزنامہ اخبار نکالا۔ اس زمانے میں جماعت کے باقاعدہ ممبروں کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ گئی۔ منسوب ممبران اور ہمدردان کی تعداد اس سے کئی گنا زائد تھی۔ 15/مئی 1948ء کو عرب فوجیں فلسطین میں اتریں تو اخوان نے یہود کے خلاف جہاد میں بھرپور شرکت کی اور جرأت و بہادری کی لازوال مثال قائم کی۔ وزیراعظم نقراشی نے 8/دسمبر 1948ء کو اخوان کو خلاف قانون قرار دیا کیونکہ امریکہ و یورپ اور مصری حکومت اخوان کے نظم وضبط، عوام بالخصوص نوجوانوں میں مقبولیت اور اس کی عسکری طاقت سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ نقراشی کے قتل کے بعد ابراہیم عبدالہادی کی وزارت عظمیٰ میں بھی اخوان پر پابندی برقرار رکھی گئی اور ان پر سختیاں کی گئیں۔ 12/فروری 1949ء کو شیخ حسن البناء کو ایک خفیہ سازش کے ذریعے شہید کر دیا گیا۔

شیخ حسن البناء کے بعد حسن بن اسماعیل الہضیبی مرشدِ عام (امیر) بنائے گئے، جو 1973ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ 23/جولائی 1952ء کو فوج نے شاہِ فاروق کا تختہ الٹ دیا۔ بادشاہت ختم کر دی گئی اور کمانڈر انچیف جنرل نجیب وزیراعظم مقرر ہوئے۔ 1953ء میں اخوان کے شعبوں کی تعداد 1500 تک پہنچ چکی تھی اور صرف دارالحکومت قاہرہ میں ارکان کی تعداد دس لاکھ تھی۔ 13/جنوری 1951ء کو اخوان کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا۔ 4/اپریل 1954ء کو جمال عبدالناصر نے جنرل نجیب کو ہٹا کر خود اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

اخوان پر آزمائش

26/اکتوبر 1954ء کو جمال عبدالناصر پر قاتلانہ حملے کا ڈرامہ رچایا گیا جس کا الزام اخوان پر لگایا گیا اور گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ ایک ہفتے کے اندر 50 ہزار کارکن گرفتار کئے گئے۔ 7/نومبر 1954ء کو چھ ممتاز اخوانی راہنماؤں کو سزائے موت کی سزا سنائی گئی اور مرشدِ عام شیخ الہضیبی کی درازیٔ عمر کی وجہ سے یہ سزا عمر قید میں تبدیل کر دی گئی۔ جولائی 1965ء میں مصری حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کے الزام میں 20 سے 50 ہزار ارکان قید کئے گئے۔ جن میں 800 کے قریب خواتین بھی

شامل تھیں۔ مرشد عام کو تین سال قید با مشقت کی سزا سنادی گئی۔ 25 / اگست 1966ء کو اخوان کے مرکزی راہنما اور مشہور مصنف و مفسر سید قطب شہیدؒ کو پھانسی کی سزا دے دی گئی۔ 1970ء میں صدر ناصر کے بعد انور السادات صدر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1973ء میں مرشد عام شیخ حسن الہیضمی وفات پا گئے۔ ان کے بعد السید عمر تلمسانی تیسرے مرشد عام مقرر ہوئے جو کہ 1954ء تا 1971ء 17 سال جیل میں قید رہے تھے۔ ان کے دور میں 1974ء میں اخوان کا رسالہ ''الدعوۃ'' دوبارہ جاری ہوا اور بہت سے اخوانی ارکان رہا ہوئے۔

جمہوری جدوجہد اور سیاسی جماعتوں سے اتحاد

جون 1979ء میں اخوان نے دوسری سیاسی پارٹیوں کے ساتھ اتحاد قائم کر کے انتخابات میں حصہ لیا اور پارلیمنٹ میں اسلامی اقدار کے لئے آواز بلند کرنا چاہی۔ 1977ء میں صدر السادات نے اسرائیل کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور اکتوبر 1981ء میں فوجی پریڈ کے دوران قتل کر دیے گئے۔ 1986ء میں مرشدِ عام السید عمر تلمسانی انتقال کر گئے جن کے بعد استاذ محمد حامد ابو النصر مرشد عام قرار پائے جو کہ 1954 تا 1974ء 25 سال جیل میں گزارنے کے بعد رہا ہوئے تھے۔ ان کے عہد میں اخوان نے دوبارہ مصری معاشرے میں کام شروع کیا۔ اپریل 1987ء میں اخوان نے دو نئی مصری پارٹیوں حزب العمل اور حزب الاحرار کے ساتھ اتحاد کر کے انتخابات میں حصہ لیا۔ جس کے نتیجے میں پہلی بار اخوان کے 36 امیدوار پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے اور اپوزیشن کا کردار ادا کیا۔ اخوان نے 1990ء کے عام انتخابات کا دوسری اپوزیشن پارٹیوں کے ساتھ مل کر بائیکاٹ کیا۔ البتہ 1992ء کے لوکل باڈیز کے انتخابات میں حصہ لیا۔ 1993ء میں حسنی مبارک کے تیسری مرتبہ صدر بننے پر مخالفت کے نتیجے میں اخوان کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ 82 قائدین کو 1995ء میں فوجی عدالت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے 54 افراد کو جیل کی سزا سنائی گئی۔ اخوان نے مجلس الشعب (پارلیمنٹ) کے انتخابات میں حصہ لیا۔ مرشدِ عام حامد ابو النصر نے 1988ء میں اسلام آباد میں منعقدہ اسلامک کونسل آف یورپ کے جلسے میں شرکت کی۔ انہوں نے افغان مجاہدین کی قیادت سے ملاقات کی اور درۂ خیبر کا دورہ کیا۔ جنوری 1996ء میں مرشد عام کی وفات ہوگئی۔ جن کے بعد ان کے نائب اوّل استاذ مصطفیٰ مشہور کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔ استاذ مصطفیٰ مشہور نے مجموعی طور پر 19 سال قید میں گزارے اور ملک بدری کی زندگی اختیار کرنے پر بھی مجبور ہوئے تھے۔ 1986ء میں ان کی وطن واپسی ہوئی تھی۔

فصل سوم:

اسلامی تحاریک میں قدرِ مشترک

احیاء اسلام کے لیے برپا ہونے والی مختلف تحاریک کے مختصر تعارف کے بعد ہم ان میں پائی جانے والی قدرِ مشترک کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ مسلم سلطنتوں اور اسلامی نظامِ حیات کے انہدام کے بعد مختلف مسلم علاقوں میں استعماری طاقتوں سے آزادی حاصل کرنے اور حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لئے تحاریک شروع ہوگئیں جیسا کہ ہم چند ممالک میں برپا ہونے والی تحریکوں کا اجمالی تذکرہ کر چکے ہیں۔ احیاءِ اسلام کے لئے جدو جہد کرنے والے حضرات خصوصاً علماء کرام بہت اخلاص، محنت اور جذبے کے ساتھ حتی الوسع تمام وسائل بروئے کار لائے لیکن جزوی کامیابیوں سے قطع نظر احیاءِ خلافت اور اسلامی معاشرے کی تشکیل کا خواب آج تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا ہے۔ اس کی وجہ جہاں احیاءِ خلافت کے راستے میں حائل رکاوٹیں ہیں وہاں ان تحریکوں میں پائی جانے والی کچھ کمزوریاں بھی اس کا باعث ہیں۔ ہم یہاں پہلے ایک اہم رکاوٹ، پھر ان تحریکوں میں پائی جانے والی مشترک کمزوریوں کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) ایک اہم رکاوٹ

استعماری طاقتوں سے آزادی حاصل کرنے والے مسلم ممالک میں اسلامی تحریکوں کی اسلامی نظام اور آئین شریعت کے نفاذ کے لئے جدو جہد میں سب سے بڑی رکاوٹ فوج رہی ہے۔ جب بھی یہ تحریکیں احتجاجی ومطالباتی یا جمہوری طریقے سے کامیابی کے قریب پہنچنے لگتیں تو فوج اقتدار پر قابض ہوکر ان جماعتوں کو خلافِ قانون قرار دیتی یا اپنا اثر ورسوخ اور طاقت استعمال کرتے ہوئے دستور ساز اسمبلیاں تحلیل کروادیتی اور جمہوری طریقے سے انتخابات کے ذریعے اسمبلیوں تک پہنچنے والی جماعتوں اور ان کو ملنے والی عوامی حمایت کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا جاتا۔

احیاءِ اسلام کے لئے باقاعدہ جدو جہد کرنے والے حضرات کے لئے یہ بات قابل غور ہے کہ استعماری طاقتوں سے آزادی حاصل کرنے والے تمام مسلم ممالک میں اسلامی تحریکوں کے خلاف

آخر فوج نے یہ کردار کیوں ادا کیا؟ اگر گہری نظر سے تحقیق وتجزیہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے استعماری طاقتوں کا ہاتھ ہے۔ استعماری طاقتوں نے نوآبادیاتی دور میں مقامی لوگوں کو فوج میں بھرتی کیا، ان کی مخصوص نظریاتی تربیت کر کے جہاں اپنے اقتدار کو طول دیا اور انہیں اپنے ہم وطن مجاہدین آزادی کے خلاف استعمال کیا وہاں جاتے جاتے ایسے لوگوں کو جانشین بنایا جو نہ صرف ان طاقتوں کے دیئے ہوئے نظام، افکار ونظریات، طرزِ معاشرت اور آئین کے محافظ تھے بلکہ نفاذِ اسلام کے لئے ہونے والی ہر کوشش کو بھی انہوں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ناکام کیا۔ انہی استعماری طاقتوں نے سول بیوروکریسی کا جو طبقہ تیار کیا تھا، اس نے بھی اس میں کردار ادا کیا۔ یہ دونوں طبقے (فوج اور سول بیوروکریسی) آج تک ان سامراجی طاقتوں کے ایجنڈے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے نظامِ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ مذکورہ دونوں طبقوں کی اعلیٰ مناصب پر تقرریاں اور ترقیاں بھی اسی وعدہ پر ہوتی ہیں کہ وہ اسلام پسندوں کو کبھی آگے آنے دیں گے اور نہ اسلامی نظام کو نافذ ہونے دیں گے۔ نائن الیون کے بعد پاکستانی افواج سے اسلام پسندوں کی چھانٹی اس کی واضح دلیل ہے۔ لہٰذا احیاءِ خلافت کے لئے جدوجہد کرنے والوں کو اس پہلو پر غور وفکر کر کے اس بڑی رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے لائحہ عمل اختیار کرنا ہوگا۔

(۲) لادینی سیاسی جماعتوں کے ساتھ اتحاد

اسلامی تحریکوں میں دوسری قدر مشترک یہ ہے کہ اربابِ تحریک نے آزادی سے پہلے یا اس کے بعد غیر اسلامی بلکہ لادینی تحریکوں کے ساتھ اتحاد قائم کیا۔ اتحاد میں شریک مختلف نظریات ومقاصد کی حامل جماعتوں کے اپنے اپنے مفادات ہوتے ہیں۔ اگرچہ وقتی طور پر ایک خاص ایشو پر اتحاد ہو جاتا ہے لیکن کوئی بھی جماعت اپنے اساسی اصول ونظریات ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ غیر اسلامی اور لادینی جماعتوں کے ساتھ اتحاد (ممکن ہے اس وقت یہی چیز وقت کا تقاضا یا مجبوری ہو) کا بڑا نقصان یہ ہوا کہ یہی جماعتیں اسلامی نظام کے نفاذ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن کر سامنے آئیں اور انہوں نے اسلامی دستور اور آئین کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دینی جماعتوں کو لادینی جماعتوں کے ساتھ اتحاد کی بجائے ٹھوس بنیادوں پر مبنی ایسا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے تھا، جس میں اگرچہ وقت زیادہ لگتا لیکن منزل تک پہنچنے میں کامیابی حاصل ہوتی۔ لادینی جماعتوں کے ساتھ اتحاد سے اسلامی نظام کا نفاذ تو ممکن نہ ہوا لیکن ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان جماعتوں کی بعض ظاہری اور باطنی کمزوریاں، خامیاں

بلکہ برائیاں دینی جماعتوں کے نظم میں بھی در آئیں۔

(۳) انتخابی سیاست میں شرکت

دینی سیاسی جماعتوں میں ایک قدر مشترک یہ بھی ہے کہ انہوں نے احیاءِ اسلام کے لئے اسوۂ رسولِ اکرم اور منہجِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار کرنے کی بجائے باطل نظامِ جمہوریت کا انتخابی راستہ منتخب کیا۔ نام نہاد مغربی جمہوریت کی بنیاد سرمایہ دارانہ نظام ہے اور جمہوریت کا ڈھانچہ ہی ایسا ہے کہ اس میں جاگیردار، تاجر، سرمایہ دار، صنعت کار، امراء، وڈیرے، سردار، سابق بیوروکریٹ وغیرہ ہی ایوانِ اقتدار تک پہنچ سکتے ہیں۔ عام آدمی اور دولت کے انبار سے محروم شخص انتخابات میں شرکت کے لئے کاغذاتِ نامزدگی جمع کرانے کی فیس ادا کرنے کی استطاعت بھی نہیں رکھتا۔ چنانچہ مذکورہ طبقے کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اسمبلیوں میں کیونکر پہنچ سکتا ہے (اگرچہ بعض دفعہ عوامی طبقے میں سے بھی چند افراد سامنے آجاتے ہیں لیکن ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے) کوئی قانون یا بل پاس کرانے کے لئے کم از کم دو تہائی اکثریت کی حمایت ضروری ہے۔ سامراجی طاقتوں سے آزادی کے بعد سے آج تک جن مسلم ممالک میں جمہوری نظام ہے، دینی جماعتوں کو مرکز میں دو تہائی اکثریت کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ اگر حاصل بھی ہوئی تو ان کا مینڈیٹ تسلیم کرنے سے انکار کر کے حکومت تشکیل دینے پر پابندی لگا دی گئی یا اسمبلیاں برخاست کر دی گئیں۔ متعدد مسلم ممالک میں دینی جماعتیں کئی دہائیوں سے انتخابات میں شریک ہو رہی ہیں جس کے نتیجے میں چند امیدوار منتخب ہو جاتے ہیں۔ اسلامی نظام کا خواب تو شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا البتہ مسلسل انتخابی راستے کو اختیار کئے رکھنے اور منہجِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ اپنانے کی وجہ سے حکومتِ الٰہیہ کی منزل دور ہوتی جارہی ہے۔

دینی جماعتوں کا مقصد اسلامی نظام کا احیاء ہے۔ ہمارے اکابر اور اسلاف رحمہم اللہ نے اسی مقصد کے پیشِ نظر جماعتیں تشکیل دی تھیں۔ استعماری طاقتوں سے آزادی کے بعد بعض حضرات نے یہ سمجھا کہ چونکہ ملک میں جمہوری نظام رائج ہے اور دیگر سیاسی جماعتیں انتخابی راستے سے اسمبلیوں میں پہنچ کر اپنے مقاصد اور پالیسیوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتی ہیں اور لادینی جماعتیں خلافِ اسلام قوانین اور پالیسیاں منظور کرانے اور ملک کو سیکولر بنانے کے لئے کوشاں ہیں، لہٰذا ہمیں بھی اسی راستے سے اسلامی نظام کے نفاذ اور خلافِ اسلام سازشوں کی روک تھام کے لئے کوشش کرنی چاہیے، چنانچہ انہوں نے اسلامی نظام کے نفاذ کے مقصد کے پیشِ نظر انتخابی راستہ منتخب کیا جو نسبتاً آسان اور مختصر تھا،

لیکن یہی حضرات اس بات پر یقین رکھتے اور اس کا برملا اعتراف اور اظہار بھی کرتے تھے کہ اسلامی نظام کے نفاذ کا یہ اصل راستہ نہیں ہے اور اصل راستہ ''اسلامی انقلابی جدوجہد'' ہے۔

یہ بات مسلم ہے کہ مقاصد اور ذرائع میں فرق ہوتا ہے۔ مقصد کے حصول کے لئے مختلف ذرائع اور طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ ہمارے اکابر و اسلاف نے اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے جمہوری سیاست کو اضطراراً بطور ایک ذریعے اور راستے کے اختیار کیا تھا۔ انتخابی سیاست میں شرکت ان کا مقصد تھا اور نہ منزل۔ انہوں نے اس راستے کو مُنزل من اللہ قرار دیا اور نہ اسے مستقل طور پر اختیار کئے رکھنے کا کہا۔ لیکن افسوس! بعد میں آنے والوں نے مقصد اور ذریعہ کے اس فرق کو فراموش کرتے ہوئے انتخابی راستے کو مستقل طور پر اپنا لیا اور اسی کو حصولِ مقصد کا واحد ذریعہ باور کیا جانے لگا۔

دراصل سالہا سال کے تجربے اور مقصد کے حاصل نہ ہونے کی وجہ سے دینی جمہوری جماعتوں کی قیادت انتخابی سیاست سے خود بھی مطمئن نہیں ہے جس کا ان کی طرف سے وقتاً فوقتاً اظہار ہوتا رہتا ہے اور مرکزی رہنما بھی اپنی نجی مجلسوں میں اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ انتخابی سیاست اسلامی نظام کے نفاذ کا اصل راستہ نہیں ہے بلکہ اس کے لیے انقلابی جدوجہد ناگزیر ہے۔ بعض حضرات اس راستے کو ترک کرنا چاہتے ہیں لیکن کچھ بے جا اور من گھڑت مصلحتیں آڑے آ جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انتخابی سیاست نظامِ اسلام کے نفاذ کی راہ میں حائل ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ کفریہ طاقتیں جمہوری نظام اور انتخابی سیاست کے ذریعے نظامِ اسلام کا راستہ روکے ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پوری کوشش ہے کہ مسلم ممالک میں نام نہاد جمہوری جماعتوں کو انتخابی سیاست کے جھمیلوں میں پھنسا کر انقلابی جدوجہد کو پروان چڑھنے سے روکا جائے۔ جب یہی صورت حال ہے تو ایسے میں کیا یہ دانشمندی نہ ہوگی کہ جب اس سے بہتر اور مناسب راستہ موجود ہے تو اسے اختیار کر کے دشمن کی سازشوں سے بچ کر منزلِ مقصود تک پہنچا جائے؟ چاہیے تو یہ تھا کہ جب بار بار کے تجربے کے بعد بھی مقصد حاصل نہیں ہو رہا بلکہ اس راہ میں حیران و سرگراں رہنے کی وجہ سے منزل دور ہوتی جا رہی ہے تو اس راستے کو ترک کر کے کوئی دوسرا ایسا راستہ اپنایا جاتا جس سے حصولِ مقصد ممکن ہوتا۔

جمہوری راستے کو انقلابی راستے کی بنسبت آسان اور مختصر سمجھا جاتا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انقلابی راستے کو محض اس لئے ترک کیا جائے کہ وہ انتخابی راستے کی بنسبت مشکل، کٹھن اور طویل ہے اور جمہوری راستے کو محض آسان اور مختصر ہونے کی وجہ سے اختیار کیا جائے، چاہے یہ منزل تک نہ

پہنچتا ہو بلکہ اس کی وجہ سے قافلہ اصل راستے سے بھٹک کر ''وادی تیہ'' میں حیران و سرگردان پھرتا رہے؟

ہمیں چاہیے کہ ہم ایسے راستے کو ترک کر دیں جو بظاہر سیدھا، آسان اور مختصر معلوم ہوتا ہے جبکہ در حقیقت یہ راستہ منزل کو جاتا ہی نہیں اور ایسی راہ منتخب کریں جو اگرچہ نسبتاً طویل، کٹھن اور مصائب و آلام سے بھری ہو لیکن آخر کار اس کے ذریعے قافلہ منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہو۔ جس راستے پر کئی دہائیوں تک چلنے کے باوجود ہم آج بھی نقطۂ آغاز پر کھڑے ہیں بلکہ ہمارے دشمن ہمیں اس سے بھی دور لے جانا چاہتے ہیں تو کیا ہم اس کی بجائے ایسا راستہ منتخب نہ کریں جس کے ذریعے ہم گرتے پڑتے منزلِ مقصود کو پالیں؟

(٤) جامع منصوبہ بندی کا فقدان

بیشتر احیائی تحریکوں میں ایک قدر مشترک یہ بھی ہے کہ انہوں نے نظام اسلام کی منزل کے لئے ٹھوس بنیادوں پر مبنی کوئی لائحہ عمل اور جامع منصوبہ بندی نہیں کی۔ مطالباتی، احتجاجی، ہڑتالی سیاست اور جلسے جلوس کی راہ اپنائی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ نظامِ اسلام کے نفاذ کے لئے نبوی منہج کو ترک کیا گیا۔ جس نہج پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا سلسلہ شروع کیا اور صحابہ کرامؓ کی اعتقادی، نظریاتی وفکری اور روحانی تربیت کی، ان کی معاشرتی زندگی کو تبدیل کیا، انہیں جان، مال اور وقت کی قربانی کا خوگر بنایا، ان میں دشمنانِ دین کے ظلم و ستم کو صبر و استقامت کے ساتھ جھیلنے کا مادّہ پیدا کیا، انہیں باقاعدہ جماعت کی شکل دی، جماعتی نظم و نسق اور اصولوں کا پابند بنایا اور انہیں کو لے کر پہلے مدینہ پھر پورے جزیرۂ عرب میں حکومتِ الٰہیہ تشکیل دی۔ افسوس! آج اس نہج کے مطابق نہ رجال کار کو تیار کیا گیا اور نہ ان کی تعلیم و تربیت کا باقاعدہ نظم قائم کیا گیا بلکہ اس نہج کو ترک کر کے جمہوری انتخابی سیاست کو اپنا لیا گیا ہے۔ اگر احیائی تحریکیں دعوت، تعلیم و تربیت اور جہاد کے نبوی منہج کے اصولوں کی روشنی میں عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق ٹھوس لائحہ عمل ترتیب دے کر عزمِ مصمم، اخلاص، جذبے اور محنت کے ساتھ اقامتِ خلافت کے لئے جدوجہد کرتیں تو اس کے مثبت نتائج ضرور سامنے آتے اور حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی منزل تک پہنچا جا سکتا تھا۔

فصل چہارم:

احیاءِ اسلام کیلئے عملی جدو جہد، تبصرہ و تجزیہ

امتِ مسلمہ کے زوال کے بعد مختلف دینی جماعتیں احیاءِ اسلام کے لئے جدو جہد کرتی رہی ہیں اور آج بھی اس کے لئے کوشاں ہیں جن میں سے کچھ کا اجمالی تذکرہ و تعارف ہم پیش کر چکے ہیں۔ جس سے قارئین کو ان کے مقاصد، طریقہ کار اور عملی جدو جہد میں ان کی کوششوں اور قربانیوں سے ایک حد تک واقفیت ہو چکی ہوگی۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے اسلاف اور اکابر نے احیاءِ اسلام کے لئے ہمیشہ جدو جہد جاری رکھی اور کبھی بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ گئے اور نہ انہوں نے حالات کی ناسازگاری و سنگینی کا عذر پیش کر کے اس جدو جہد سے کنارہ کشی اختیار کی بلکہ وہ لگاتار اس مقدس مقصد کے لئے زندگی بھر شب و روز کام کرتے رہے۔ اپنی جان، مال اور وقت اس میں صرف کیا اور کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ الغرض ہر جماعت اپنے نقطہ نظر اور طریقے کے مطابق اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے مصروفِ کار رہے۔ اسلامی نظام کے قیام کے لئے نبوی طریقہء کار کو واضح کرنے کے لئے ان جماعتوں کے طریق کار کا تجزیہ ضروری ہے، اس لئے ہم اجمالی طور پر ان جماعتوں کے طریقہء کار پر تبصرہ اور ان کا تجزیہ ضروری سمجھتے ہیں۔

عصرِ حاضر میں کام کرنے والی جماعتوں کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم ان جماعتوں یا گروہوں کی ہے جن کا اسلامی نظام کے قیام کے لئے عملی جدو جہد سے سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ جماعتیں یا گروہ غیر سیاسی ہیں۔

مذکورہ غیر سیاسی جماعتیں تین طرح کی ہیں:

فلاحی ادارے

وہ جماعتیں جو اعمالِ خیر (عوام الناس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی) کے لئے قائم ہوتی ہیں جیسے مدارس و اسکولز اور ہسپتالوں کا قیام، فقراء، مساکین اور حاجت مندوں کی مالی امداد کرنا، مذکورہ امور کے لئے باقاعدہ ادارے قائم کرنا جیسے موجودہ دور میں وقف (ٹرسٹ) کثیر تعداد میں کام کر رہے ہیں،

جنہیں مروّجہ زبان میں غیر سرکاری ادارے (N.G.O) کہا جاتا ہے۔ یہ وہ امور ہیں جن پر عمل پیرا ہونے کی اسلام میں بہت زیادہ ترغیب دی گئی ہے اور نظامِ خلافت میں کئی صدیوں تک اس پر اس طرح عمل ہوتا رہا ہے کہ دوسرے قدیم وجدید نظامہائے باطلہ میں اس کی نظیر نہیں ملتی، لیکن عصرِ حاضر میں نظامِ خلافت کے قیام کے لئے جدوجہد کے ساتھ مذکورہ اداروں کا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی محض ان امور کو سرانجام دینے سے نظامِ خلافت کا قیام ہوسکتا ہے، کیونکہ نظامِ خلافت کا قیام نہ تو ان اداروں کے مقاصد میں شامل ہے اور نہ اس کے لئے عملی جدوجہد کی جارہی ہے۔ درحقیقت رعایا کو بنیادی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنا حکومت وریاست کا کام ہے نہ کہ مذکورہ اداروں کا، کیونکہ یہ ادارے تب وجود میں آتے ہیں جب ریاست ان امور کو سرانجام دینے میں ناکام وناہل ثابت ہوتی ہے۔ یادرہے کہ عوام الناس کی خدمت اور فلاحی کاموں کے لئے ان اداروں کی افادیت سے انکار نہیں بلکہ یہ ادارے احیاءِ خلافت کے لیے معاون اور پیش خیمہ ثابت ہو سکتے ہیں (جیسا کہ دارالعلوم دیوبند کا ذکر کیا جاچکا ہے) لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ادارے اس مقصد کے پیش نظر قائم نہیں کیے گئے اور ان کے بانی وانتظامیہ کی طرف سے اس بات کی صراحت کی جاتی ہے کہ خدمتِ خلق کے علاوہ ہمارا کوئی دوسرا مقصد نہیں ہے، لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان اداروں کا قیام نظامِ خلافت کے قیام کا منہج نہیں ہے۔

اصلاحی دعوت

وہ جماعتیں جو عوام الناس کو عبادات کی طرف دعوت دینے کے لئے قائم ہیں۔ لوگوں کو عبادات کی ترغیب دینا اسلام کا حکم ہے اور اسلامی تعلیمات میں ان کی بہت زیادہ تاکید کی گئی اور ترغیب دی گئی ہے۔ عبادات، اسلامی نظامِ حیات کا جز ہیں اور ان کی دعوت جزءِ اسلام کی دعوت ہے۔ بالفاظِ دیگر عبادات کی دعوت، دین کے ایک جز کی دعوت ہے۔ حالانکہ دعوت پورے اسلام (مجموعۂ اسلام) کی دینی چاہیے۔ یعنی عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، نظامِ حکومت، اقتصاد، معاشرت، تعلیم، سیاستِ خارجہ وغیرہا۔ محض عبادات کی دعوت، نظامِ خلافت کے قیام کی جدوجہد کے ساتھ اس کا تعلق نہیں ہے، نہ ہی اس کے ذریعے نظامِ خلافت کا قیام ممکن ہے۔ محض عبادات کی دعوت کے ساتھ لوگوں کی انفرادی زندگی میں تو تبدیلی لائی جاسکتی ہے جو کہ ضروری اور مفید ہے لیکن اس سے پورے معاشرے میں تبدیلی نہیں لائی جاسکتی ہے کیونکہ دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ انفرادی اصلاح کے بعد پورے معاشرے میں

اصلاح اور تبدیلی کی ذہن سازی اور تربیت نہیں کی جاتی۔ ظاہر ہے نظام خلافت کا تعلق اجتماعی امور سے ہے اور اجتماعی امور میں تبدیلی ریاستی نظام کی تبدیلی سے ہی لائی جا سکتی ہے۔ محض عبادات کی دعوت ریاستی نظام میں تبدیلی نہیں لا سکتی۔ عبادات کی دعوت کی ضرورت واہمیت اور اس کی جزوی افادیت سے انکار نہیں ہے لیکن ہمارا مقصود یہ ہے کہ یہ جزوی دعوت نظامِ خلافت کے قیام کا منہج نہیں ہے۔

تصنیف وتالیف

وہ جماعتیں یا تنظیمیں جو مختلف اسلامی موضوعات پر تحقیقی و تصنیفی کام کرنے کے لئے باقاعدہ ادارے، اکیڈمیاں وغیرہ قائم کرتی ہیں۔ ان کی مختلف اقسام ہیں:

ایک وہ افراد یا ادارے جو فروعی اور مسلکی اختلافی مسائل پر تحقیق وتصنیف کا کام کرتے ہیں، ان کا اسلامی نظامِ خلافت کے احیاء کی جدوجہد سے سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ ان میں سے بعض افراد یا اداروں کے ان فروعی مسائل کو ضرورت سے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرنے سے مختلف مسالک کے درمیان پائی جانے والی خلیج بڑھتی اور اختلافات کو ہوا ملتی ہے جو کہ امتِ مسلمہ میں انتشار کا باعث ہے۔ اس سے وحدت و مرکزیت اور اتحاد و اتفاق کے امکانات کم ہوتے جاتے ہیں اور اختلافات کی خلیج بڑھتی جاتی ہے۔

دوسرے وہ ادارے ہیں جو جدید طرز پر تحقیقی کام کرتے ہیں اور جدید معاشرتی و معاشی اور اجتماعی مسائل کا اسلام کی روشنی میں حل پیش کرتے ہیں۔ بلاشبہ اس طرح کے تحقیقی کام سے اہل اسلام کے ایمان و یقین میں پختگی واضافہ ہوتا ہے اور غیر مسلموں کو اسلام کے فطری نظامِ حیات کی طرف راغب کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس کے ساتھ مغرب کے پھیلائے ہوئے پروپیگنڈہ کا بھی رد ہو جاتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ احیاءِ خلافت کے لئے یہ ادارے زیادہ کارآمد نہیں اور نہ احیاءِ خلافت کی عملی جدوجہد ان کا مقصود ہے۔

تیسرے وہ افراد یا ادارے ہیں جو اسلامی نظام کے حوالے سے تصنیف وتالیف کا کام انجام دیتے ہیں اور دنیا کے سامنے اسلام کو بطور ایک کامل ومکمل نظام کے پیش کرتے ہیں۔ بلاشبہ ایسے ادارے احیاءِ خلافت کے لئے بنیاد واساس فراہم کر رہے ہیں لیکن یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ خلافت کا عملی قیام محض تصنیف وتالیف سے ممکن نہیں۔ جب تک تصنیف وتالیف کے ساتھ آگے بڑھ کر احیاءِ خلافت

کے لئے عملی جدو جہد میں شرکت و راہنمائی نہ ہوگی تب تک خلافت کا احیاء ممکن نہیں ہے۔

احیاءِ اسلام کی جدو جہد میں کوشاں دوسری قسم کی وہ جماعتیں ہیں جو عملاً اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے جدو جہد کر رہی ہیں۔ بالفاظِ دیگر سیاسی جماعتیں۔ یہ دو طرح کی ہیں:

مذہبی جمہوری جدو جہد

پہلی قسم کی وہ جماعتیں ہیں جو جمہوری طریقے سے اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے مصروفِ کار ہیں۔ یعنی یہ جماعتیں جمہوری نظام کا حصہ بن کر انتخابات میں شریک ہوتی ہیں۔ ان کے ارکان دوسری لادینی سیاسی جماعتوں کی طرح باقاعدہ انتخابی مہم چلا کر اسلامی نظام کے نفاذ کے نام پر ووٹ مانگتے ہیں۔ ان دینی سیاسی جماعتوں کو انتخابات میں کامیابی کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، یہ خارج از بحث ہے، کیونکہ مسلم ممالک کے عوام ان دینی سیاسی جماعتوں کی ''دینی سیاست'' سے بخوبی واقف ہیں۔ موضوعِ بحث یہ ہے کہ جمہوری طریقہ نظامِ خلافت کے قیام کا منہج ہے یا نہیں؟ جمہوری طریقہ یعنی انتخابات، نظامِ خلافت کے قیام کا منہج نہیں ہے کیونکہ

(ا) جمہوری نظام کا بنیادی فکر ''عوام کی حکومت، عوام کے ذریعے، عوام کے لئے'' اسلامی فکر سے متصادم ہے۔ اسلامی نظام کے نفاذ کے نام پر عوام سے ووٹ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ عوام کے قانون سازی اور حکومت کے حق کو تسلیم کیا جا رہا ہے اور انہیں یہ اختیار دیا جا رہا ہے کہ وہ اسلام کو قبول کریں یا اس کے بالمقابل و متصادم باطل نظام کو۔ عوام کو اس بات کا حق دینا اور ان کے اس حق کو تسلیم کرنا اسلامی فکر و نظریہ کے صریح خلاف ہے۔

(ب) پارلیمنٹ میں اکثریت رکھنے والی سیاسی جماعت کو قانون سازی کا حق ہوتا ہے۔ جب تک دینی سیاسی جماعت کو اکثریت حاصل نہیں ہوتی، تب تک وہ قانون سازی نہیں کر سکتی۔ جب تک دینی سیاسی جماعت اقلیت میں ہے، اس وقت تک مقابل اکثریت کے قانون سازی کے حق کو تسلیم کیا جا رہا ہے کہ وہ چاہے تو اسلام سے متصادم قانون سازی کر سکتی اور پالیسیاں بنا سکتی ہے (کیونکہ انتخابات میں اکثریت حاصل کرنے والی جماعت کو عوام کی طرف سے دیے جانے والے مینڈیٹ کو تسلیم کرنا جمہوری سیاست کا حصہ ولازمہ ہے) حالانکہ ان کا یہ حق تسلیم کرنا سراسر خلافِ اسلام ہے۔

(ج) اقتدار تک پہنچنے کے لئے جمہوری نظام کے باطل دستور پر حلف اٹھانا لازم ہے کیونکہ حلف اٹھائے بغیر کوئی جماعت حکومت نہیں بنا سکتی، جمہوری دستور پر حلف اٹھانا خلافِ شریعت ہے۔

(د) انتخابات میں اکثریت حاصل کر کے اقتدار میں آنے والی جماعت کو پانچ سال تک حکومت کرنے کا حق ہے۔ مقتدر جماعت کو یہ شرط قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا لازم ہے کیونکہ یہ جمہوری نظام کا بنیادی اصول ہے۔ بالفرض اگر جمہوری طریقے سے کسی دینی سیاسی جماعت کا اقتدار قائم ہو جاتا ہے اور وہ اسلامی نظام بھی نافذ کر دیتی ہے تو اسلامی نظام کا نفاذ پانچ سال تک کے لئے ہو گا، جس کے بعد مقتدر جماعت کو اقتدار سے دستبردار ہونا پڑے گا جو کہ اجماع کے خلاف ہے کیونکہ خلیفہ (جب تک اہل ہے) تاحیات حکمران ہوتا ہے، نیز یہ نص کے بھی خلاف ہے کیونکہ شریعت کی بالادستی اسلامی نظام کا بنیادی اصول ہے۔ پانچ سال بعد اقتدار سے دستبردار ہونے کا مطلب عوام کو پھر سے نظام اسلام یا باطل نظام کے انتخاب کا حق دینا ہے۔ نیز یہ کہ باطل نظام اور اس کی حامل سیکولر جماعتوں کو دوبارہ سے برسرِ اقتدار آنے کا موقع فراہم کرنا ہے۔

(س) اسلامی نظامِ خلافت اور جمہوریت دو متوازی نظام ہیں۔ دینی سیاسی جماعتوں کی جمہوری سیاست میں شرکت سے باطل جمہوری نظام کی تائید وتوثیق ہوتی ہے۔ عوام یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ جب علماء اس جمہوری سیاست کا حصہ بن رہے ہیں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ نظام حق ہے او ر اسلام سے متصادم نہیں، ورنہ علماءِ اسلام اس میں شرکت نہ کرتے۔ دینی سیاسی جماعتوں کے رہنما لاکھ تاویلیں کریں کہ ہم اس نظام کو نہیں مانتے اور مجبوراً اس میں شریک ہیں لیکن عوام ایسی باتیں سمجھنے سے قاصر ہیں اور معروضی حقائق بھی ان تاویلات کی تصدیق نہیں کرتے، کیونکہ انتخابات میں کامیابی کے بعد پارلیمنٹ اور سیاسی عمل میں سیکولر اور دینی سیاسی جماعتوں کے طرزِ عمل میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہوتا ہے۔

(ط) ہر نظام کی ایک اساسی فکر ہے۔ اس نظام تک پہنچنے کے لئے طریقہء کار اسی فکر سے ماخوذ ہوتا ہے جو اس فکر کے ساتھ خاص ہوتا ہے۔ جمہوری نظام کا اساسی فکر سیکولرازم ہے اور اس فکر سے ماخوذ طریقہ انتخابات ہیں، جو اسی فکر کے ساتھ خاص ہے۔ اسی طرح نظامِ خلافت کا اساسی فکر اسلام ہے۔ اس نظام تک پہنچنے کا طریقہ بھی اسلام نے بتا دیا ہے جو اس فکر یعنی اسلام کے ساتھ خاص ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر واضح ہو جائے گا۔ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ انتخابات کے ذریعے نظامِ جمہوریت تک پہنچا جا سکتا ہے نہ کہ نظامِ خلافت تک۔ لہٰذا جس طرح اسلامی نظام کے ساتھ دوسرے نظامہائے باطلہ جمہوریت، سوشلزم وغیرہ کی پیوندکاری نہیں ہو سکتی اسی طرح نظامِ خلافت کے قیام کے لئے دوسرے

نظاموں کے طریقہء کار بھی کارگر ثابت نہیں ہو سکتے ،یعنی اسلامی نظام ،اسلام کے نام یعنی اپنی اصل اور مکمل شکل وصورت کے ساتھ اور اسلامی طریقہ سے ہی آسکتا ہے۔اس میں دوسرے باطل نظاموں کی پیوند کاری کرنا اور انہی باطل نظاموں کے باطل طریقوں سے قائم کرنے کی کوشش کرنا غیر شرعی ،غیر فطری اور خلافِ عقل ہے۔

(ظ) جمہوریت سرمایہ دارانہ نظام کی فرع ہے۔اس لئے جمہوری سیاست میں شرکت سے نہ صرف جمہوری نظام کی تایید وتوثیق ہوتی ہے بلکہ درحقیقت سرمایہ دارانہ نظام کی تایید ہوتی ہے، سرمایہ دارانہ نظام جمہوریت میں ہی پنپ اور پروان چڑھ سکتا ہے۔اسلامی نظام اور سرمایہ دارانہ نظام دو متوازی نظام ہیں۔لہٰذا اسلام میں براستہ جمہوریت ،سرمایہ دارانہ نظام کی پیوند کاری نہیں کی جا سکتی۔ اگر بالفرض دینی قیادت جمہوری طریقے سے برسرِ اقتدار آتی بھی ہے تو وہ آہستہ آہستہ سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ بن جائے گی ،جس سے سرمایہ دارانہ نظام کو ہی تقویت ملے گی۔

(ع) جمہوری سیاست ایک ایسی دلدل ہے جس میں ایک دفعہ داخل ہونے کے بعد نکلنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔دینی جماعتوں کی جمہوری سیاست میں شرکت سے اسلامی نظامِ خلافت کے قیام کے لئے انقلابی جدوجہد پس منظر میں چلی جاتی ہے۔دینی جماعتیں اس سے کنارہ کشی اختیار کر کے جمہوری سیاست پہ تکیہ کر لیتی ہیں اور جمہوری سیاست سے یہ امیدیں وابستہ کر لی جاتی ہیں کہ اس کے ذریعے اسلامی نظام کا نفاذ ہو جائے گا، نیز وہ یہ یقین کر لیتے ہیں کہ اس طرح اسلامی نظام کے احیاء کا فریضہ سرانجام دیا جا رہا ہے،لہٰذا علیحدہ سے اسلامی انقلاب کے لئے عملی جدوجہد کی ضرورت نہیں ہے۔یہ خطرناک سوچ اسلامی انقلاب کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے،جس کو دور کیے بغیر اسلامی انقلاب ممکن نظر نہیں آتا۔

(ف) برطانوی سامراج سے آزادی کے بعد مختلف مسلم ممالک میں مختلف دینی جماعتوں نے نظامِ اسلام کے نفاذ کے لئے جمہوری راستہ اپنایا۔(جن میں سے کچھ کا تذکرہ ہم ماقبل میں کر چکے ہیں)وہ اس پر بڑے جوش وخروش سے عمل پیرا ہیں اور آج بھی اسی نہج پر چل رہی ہیں۔لیکن آج تک کسی مسلم ملک میں یہ جماعتیں مکمل اسلامی نظام نہیں لا سکی ہیں،لہٰذا تاریخ نے بھی یہ بات ثابت کر دی ہے کہ جمہوری انتخاباتی راستہ نظامِ خلافت کے قیام کا منہج نہیں ہے، کیونکہ جمہوریت ایسا نظام ہے،جس کے اندر رہتے ہوئے دینی جماعتوں کو اکثریت نہیں مل سکتی یعنی دین اسلام کو سیاسی غلبہ حاصل نہیں ہو

سکتا۔ دراصل جمہوریت کی ساخت اور ڈھانچہ ہی ایسا ہے کہ اس کے ذریعے امراء، جاگیردار، سردار، وڈیرے، سرمایہ دار، صنعت کار، سابقہ بیوروکریٹ اور ایسے کرپٹ افراد منتخب ہو سکتے اور ہوتے ہیں جن کے پاس رشوت، دھوکہ، فراڈ، ٹیکس چوری اور لوٹ مار سے جمع شدہ دولت کے ڈھیر ہوتے ہیں۔

(ق) انتخابی مہم چلانے کے لئے لاکھوں، کروڑوں روپے درکار ہوتے ہیں اور اتنی بڑی رقم مذکورہ طبقے ہی فراہم کر سکتے ہیں۔ ایک عام آدمی جس کے گھر کا نان نفقہ ہی مشکل سے پورا ہوتا ہو بھلا وہ کیسے انتخابات میں حصہ لے سکتا ہے؟ انتخابات میں شرکت تو درکنار اسے انتخابات سے کوئی دلچسپی یا سروکار نہیں ہوتا۔ اسے تو بس یہی فکر لاحق ہوتی ہے کہ وہ شام کو گھر کا چولہا کیسے جلا پائے گا؟ اسی طرح وہ افراد یا گروہ جن کا تعلق مذکورہ طبقے سے نہیں ہے وہ انتخابات میں شرکت کی احمقانہ سوچ سے بھی دور رہتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی جمہوریت کے خوش کن نعروں سے متاثر ہو کر مذکورہ طبقے کے مقابلے میں اٹھ کھڑا ہوتا بھی ہے تو اس کا جو حشر ہوتا ہے، وہ کم از کم پاکستانی عوام سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ایسا آدمی تو اپنی آیندہ آنے والی نسل کے لئے بھی وصیت کر کے جاتا ہے کہ وہ ان چکروں میں پڑنے کی حماقت کبھی نہ کریں۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری دینی سیاسی جماعتوں کے لئے انتخابی سیاست میں شرکت کس قدر مشکل ہے۔ کیا وہ انتخابی سیاست میں مذکورہ طبقے کا مقابلہ کر سکتی اور انتخابی مہم چلانے کے لئے مطلوبہ فنڈز فراہم کر سکتی ہیں؟ اگر فراہم ہو بھی جائیں تو شرعاً و اخلاقاً ان کی کیا حیثیت ہو گی؟ کیا اس پر بھی کبھی غور کیا گیا ہے؟

(ل) انتخابی مہم کے دوران امیدوار انتخاب جیتنے کے لئے ہر جائز و ناجائز طریقے اور ذرائع کے استعمال کو روا رکھتے ہیں۔ دھوکہ، فراڈ، دھاندلی، فریق مخالف پر جھوٹے الزامات، خلافِ حقیقت پروپیگنڈہ اور ووٹروں کو جھوٹے وعدے کرنا انتخابی سیاست کا حصۂ لازمہ ہے، الغرض اخلاقیات کا اس میں جنازہ نکال دیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے دینی سیاسی رہنما ایسی جمہوری روایات کو اپنا سکتے ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو کیا ان روایات کو اپنائے بغیر وہ انتخابات میں کامیابی حاصل کر سکیں گے؟ یاد رہے کہ ہماری بحث من حیث المجموع ہے وگرنہ انفرادی اور ذاتی شخصیت کے حوالے سے چند ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ان روایات کے برخلاف انتخاب میں کامیابی حاصل ہوئی، لیکن ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے کیونکہ ایسے چند افراد اسمبلیوں میں پہنچ کر بھی کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکتے اور نہ ان کے لئے ایسا کرنا ممکن ہوتا ہے۔ ان کی نحیف اور کمزور آواز اکثریت کے شور کی نذر ہو

جاتی ہے۔

(م) اگر تمام رکاوٹیں ختم ہو جائیں اور دینی جماعتیں انتخابات کے ذریعے اکثریت حاصل کر کے برسرِ اقتدار آ جائیں تو وہ متعلقہ ملک کے جمہوری دستور و آئین کی پابند ہوں گی کیونکہ وہ خود جمہوری راستے سے ایوانِ اقتدار تک پہنچی ہیں۔ اس صورت میں دینی سیاسی مقتدرہ کس قدر اسلامی نظام نافذ کر سکے گی؟ حالانکہ دستور و آئین کی بیڑی اس کے پاؤں میں ہے جو اسے ادھر ادھر ہلنے نہیں دیتی۔ اگر وہ دستور و آئین سے بالاتر ہو کر اسلامی نظام نافذ کرنا چاہے گی تو اپوزیشن اسے ایسا کرنے کی اجازت نہ دے گی، دوسری بات یہ کہ جمہوری قوتوں کے نزدیک ایسا کرنے سے دینی مقتدرہ کے اقتدار میں رہنے کا کوئی جواز باقی نہ رہ جائے گا کیونکہ یہ تو جمہوریت کے بنیادی اصولوں کی صریح خلاف ورزی ہے۔

(ی) جمہوری طریقے سے برسرِ اقتدار آنے والی دینی مقتدرہ اگر اسلامی نظام نافذ بھی کر دے تو کیا وہ ایک خالص اسلامی ریاست کے تقاضے پورے کرے گی، جمہوری طریقے سے اقتدار پر براجمان ہونے والی اور جمہوری اصول وضوابط کی نہ صرف قائل بلکہ اس پر عمل پیرا ہونے والی دینی مقتدرہ کیا اسلامی ریاست کے سب سے اہم فریضہ دعوت اور اقدامی جہاد کو سرانجام دے گی؟ حالانکہ بین الاقوامی طور پر مسلمہ جمہوری اصول اس بات کی قطعاً اجازت نہیں دیتے بلکہ ان کی رُو سے اپنی ریاست تک محدود رہنا اور پڑوسی (مسلم وغیر مسلم) ممالک کے ساتھ امن وسلامتی اور تعاونِ باہمی پر مبنی خوشگوار تعلقات قائم رکھنا ضروری ہے۔

اسلامی انقلابی جدوجہد

اسلامی نظام کے احیاء کے لئے کوشاں دوسری قسم کی وہ جماعتیں ہیں جو جمہوریت کی بجائے اپنے اپنے نظریے اور نہج کے مطابق انقلابی طریقے سے اسلامی نظام لانا چاہتی ہیں۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جو اسلام کے نام پر اشتراکیت وکمیونزم کی دعوت دیتی ہیں اور اسلام کو محض ایک معاشی نظام تصور کرتی ہیں، جس کا مقصد لوگوں کو محض بنیادی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنا اور معاشی مساوات قائم کرنا ہے۔ یہ بہت ہی خطرناک اور گمراہ کن نظریہ ہے جیسا کہ آج کل حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے افکار ونظریات کے نام پر یہ باور کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اسلام محض ایک معاشی واقتصادی نظام ہے۔ حالانکہ یہ دونوں حضرات اسلام کو ایک مکمل دین اور کامل نظامِ حیات سمجھتے

ہیں۔

بعض جماعتیں وہ ہیں جن کے قائدین (جن کی اکثریت پروفیسر اور ڈاکٹر حضرات پر مشتمل ہے) اسلامی نظام کی بنیادی تعلیمات سے کما حقہٗ آگاہ نہیں ہیں۔ انہیں اسلامی تعلیمات کے اصل مآخذ قرآن وسنت تک رسائی حاصل نہیں، انہوں نے ملکی وقومی زبان میں اسلام کا مطالعہ کیا ہے، جس کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ اسلام کی عجیب وغریب تشریح کرتے ہیں۔ اسلامی نظام کو موجودہ زمانے سے ہم آہنگ کرنے کے نام پر اس کی غلط تصویر پیش کرتے ہیں نیز اسلامی نظامِ حیات کے بنیادی مسلمہ اصولوں میں تبدیلی کو لازمی یقین کرتے ہیں بلکہ اس کے لئے باقاعدہ ایک ترتیب بھی پیش کرتے ہیں۔ یہ نظریہ بھی اسلامی نظام کے بنیادی اصولوں سے متصادم ہے۔

☆☆☆

''حصہ اول میں اسلامی احیائی تحریکوں کے مختصر تعارف اور ان کے اِختیار کردہ طریق ہائے کار پر تبصرے کے بعد خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار کردہ منہج کے بنیادی اصولوں کو بیان کیا جاتا ہے۔''

حصہ دوم

غلبۂ دین کے نبوی طریقہ کار
کے
بنیادی اصول

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَمَا اٰتٰـکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ
عَنْـہُ فَـانْتَھُوْا وَاتَّـقُوا اللّٰـہَ اِنَّ اللّٰـہَ
شَدِیْدُ الْعِقَابِ

(الحشر: ۷)

’’اور جو کچھ تم کو رسول دے اس کو لے لو اور جس
سے منع کرے اس سے باز رہو اور اللہ سے ڈرو
کیونکہ اللہ کی سخت سزا ہے۔‘‘

فصل اوّل:

جاہلیتِ قدیمہ

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الرسل بن کر مبعوث ہوئے، دعوتِ توحید شروع کی اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ضابطۂ حیات کو اپنانے کی دعوت دی تو اس وقت پوری دنیا میں جاہلی معاشرہ رائج تھا، لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور توحید سے ناآشنا تھے، شرک ہر سو پھیلا ہوا تھا، تمام معاشرہ کفر کی تاریک وادیوں میں سرگردان تھا۔ عقائد، رسوم و رواج، معاملات اور ریاستی نظاموں کی بنیاد عقیدۂ توحید کی بجائے شرک پر تھی۔ رب العالمین کی بجائے لکڑی، پتھر، پانی، آگ اور موروثی بادشاہوں کو سجدے کئے جاتے، زمین میں انہی کی حکمرانی تسلیم کی جاتی اور اقتدار اور قانون سازی ان کا موروثی وخاندانی حق تسلیم کیا جاتا تھا۔

توحید کی بجائے شرک اختیار کرنے کی وجہ سے انسانی احساسات وجذبات اور افکار ونظریات کی بنیاد بھی باطل پر تھی، ان کی زندگی کا کوئی پہلو اور گوشہ ایسا نہ تھا جس میں بگاڑ نہ آچکا ہو، ہر چیز فاسد ہو چکی تھی، اخلاق واطوار، رسوم وعادات بگڑ چکی تھیں، آسمانی تعلیمات انسانوں کی زندگیوں سے نکل چکی تھیں اور وہ اپنی زندگی کے تمام معاملات اپنی سوچ، فکر اور خیال سے بنائے ہوئے اصول وضوابط کے مطابق انجام دیا کرتے تھے، جس کی وجہ سے روحانی، اخلاقی، مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی طور پر معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا تھا۔

قانونِ الٰہی اور آسمانی تعلیمات کو نظر انداز کرنے اور ان پر عمل پیرا نہ ہونے کی وجہ سے زندگی کے ہر شعبے میں خرابیاں جنم لے چکی تھیں اور ہر شعبہ زوال پذیر تھا۔ اخلاقیات کا جنازہ نکل چکا تھا، مادی فکر و جذبہ روحانی افکار ونظریات پر غالب تھا، ہر شخص مادی وشخصی مفادات کے حصول کو ترجیح دیتا تھا اور ہر ممکن ذریعہ سے مادی وسائل زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہتا تھا اور وہ اسی زاویے سے ہر چیز کو دیکھتا اور دوسروں سے معاملات طے کرتا تھا۔ آدمی کی اہمیت اور حیثیت ومرتبے کا معیار بھی یہی تھا کہ اس کے پاس کس قدر مال ودولت ہے، انسانی اوصاف وخصائل

کو کوئی اہمیت نہ دی جاتی تھی بلکہ اخلاق سے گرے ہوئے امور انجام دینے کو کمال سمجھا جاتا اور ایسا کرنے والوں کی تحسین کی جاتی تھی۔ الغرض ہر طرف تاریکی، جہالت، ظلم اور فساد پھیلا ہوا تھا، پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے معاشرے میں بھرپور دعوت کے ذریعے قرآنی تعلیمات اور وحی پر مبنی احکامات کی طرف بلایا اور دعوت قبول کرنے والے یعنی صحابہ کرامؓ کا تزکیہ کر کے ایک صالح اور پاکیزہ معاشرہ تشکیل دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی پہلی حالت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ (آل عمران:۱۰۴)

''اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے تو خدا نے تم کو اس سے بچا لیا۔''

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

یعنی اوس وخزرج وعرب معدیہ ویمنیہ وعرب وعجم با یک دیگر دشمنی داشتند (فتح الرحمٰن)

''مطلب یہ ہے کہ اوس اور خزرج، عرب معدیہ اور یمنیہ اور عرب اور عجم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔''

اللہ تعالیٰ نے مذکورہ جاہلی معاشرے کو موت اور اس معاشرے میں رہنے والے افراد کو مردہ قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا

﴿اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ﴾ (الانعام:۱۵)

''بھلا جو (پہلے) مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لیے روشنی کر دی جس کے ذریعہ سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے۔''

اسلام سے قبل انسانیت روحانی موت مر چکی تھی، اسلام نے اسے نئی زندگی دی۔ اسلام سے قبل انسانیت جاہلیت وتاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی، اسلام نے اسے اس سے نکالا اور روشنی عطا کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جاہلی معاشرے کو اسلامی معاشرے میں تبدیل کرنے

اور پوری دنیا میں رائج باطل نظاموں کی جگہ اسلام کے مکمل و کامل نظام کے قیام کیلئے دعوت شروع کی، دعوت قبول کرنے والوں کی تعلیم و تربیت کر کے انہیں منظّم کیا۔ پھر ہجرت و نصرت کے مراحل طے کرتے ہوئے آخرکار ۲۳ سالہ محنت کے نتیجے میں آپ اس جاہلی معاشرے کو اسلامی معاشرے میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اسلام کے اجتماعی نظام کو عملاً نافذ کر دیا۔

جاہلیت جدیدہ

ماضی کی طرح آج بھی اسلامی معاشرہ موجود نہیں ہے اور جاہلی معاشرہ اپنی جدید شکل و صورت کے ساتھ رائج ہے۔ اسی طرح باطل افکار و نظریات کی بنیاد پر قائم ہونے والے اور انسانیت کی دنیا و آخرت کو تباہ و برباد کرنے کا باعث بننے والے نظاموں کا غلبہ ہے جبکہ نوع انسان کی فلاح و بہبود کے ضامن نظامِ خلافت کا پوری دنیا میں کہیں بھی عملی طور پر وجود نہیں ہے۔ آج کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے جاہلی معاشرے اور نظاموں میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔ اگرچہ عصر حاضر میں غالب جدید جاہلی معاشرے اور نظامہائے باطلہ بظاہر ترقی یافتہ اور بڑے ٹیکنیکل ہیں لیکن ان کے باطل اور فاسد ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، کیونکہ ان کی وجہ سے آج انسانیت جدید جاہلیت کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی ہے اور ہدایت اور صراطِ مستقیم کی بجائے گمراہی و ضلالت کے راستے پر چل رہی ہے جس کا انجام دنیا میں بھی ناکامی و نامرادی اور آخرت میں جہنم اور ہمیشہ کی ذلت اور رسوائی ہے۔

اسلامی معاشرہ اور نظام

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے یعنی اس کی معرفت حاصل کرے، اس کے دیے ہوئے احکام اور بتلائے ہوئے قوانین اور اصولوں کے مطابق زندگی گزارے، جب انسان اللہ تبارک وتعالیٰ کے عطا کردہ ضابطۂ حیات کے مطابق زندگی گزارتے ہیں تو اس سے ایک صالح معاشرہ اور نظام وجود میں آتا ہے، اس کے برعکس جب انسان اللہ تبارک وتعالیٰ کے دیے ہوئے قوانین اور ضوابط سے انحراف کرتے ہوئے اپنی سوچ، فکر اور خیال کے تحت قوانین اور اصول بناتے اور ان پر عمل درآمد کرتے ہیں تو اس سے ایک فاسد معاشرہ اور نظام وجود میں آتا ہے جسے قرآن وسنت میں ''جاہلیت'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جاہلیت انسان کے دنیوی اور اخروی خسارے اور ناکامیوں اور نامرادیوں کا باعث ہے۔ اسلامی معاشرے کے علاوہ ہر معاشرہ

جاہلی معاشرہ ہے، اسی طرح اسلامی نظام کے علاوہ ہر نظام باطل ہے۔ کیونکہ اسلامی معاشرے اور نظام کی بنیاد وحی الٰہی اور قرآنی تعلیمات ہوتی ہیں جس کا عکس تمام شعبۂ ہائے زندگی میں نظر آتا ہے اور اسلامی معاشرے اور نظام کے تحت رہنے والے مسلم افراد کی روزمرہ زندگی سے اس کا ظہور ہوتا ہے۔ پوری اجتماعی زندگی کی اساس عقیدۂ توحید ہوتا ہے، خواہ یہ سیاسی نظام ہو یا عدالتی، معاشرتی ہو یا معاشی و اقتصادی، داخلی ہو یا خارجی، عبادات کا نظام ہو یا تہذیب و ثقافت کا، الغرض ہر جگہ عقیدۂ توحید اور قرآنی تعلیمات کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس لحاظ سے ہر وہ معاشرہ اور نظام جو عقیدۂ توحید اور قرآنی تعلیمات کی اساس پر قائم نہیں ہے جاہلی معاشرہ اور باطل نظام ہے کیونکہ جاہلی معاشرے اور باطل نظاموں کی بنیاد وحی کی بجائے عقل ہے، چنانچہ انسان اپنی عقل وفہم کے مطابق معاشرے اور نظام کی تشکیل کرتے ہیں، چونکہ انسانی عقل وفہم محدود اور ناقص ہے اور وہ کائنات کے تکوینی اور تشریعی نظام کو سمجھنے سے قاصر ہے، لہٰذا یہ چیز غیر فطری اور قوانینِ الٰہیہ کے خلاف ہے اس لیے ایسا معاشرہ اور نظام فساد فی الارض کا باعث بنتا ہے اور یوں انسانوں کی دنیا و آخرت تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

جاہلی معاشرے اور نظامہائے باطلہ کا راج

آج پوری دنیا میں جاہلی معاشرے اور نظامہائے باطلہ قائم ہیں اور کہیں بھی اسلامی معاشرے اور نظام کا وجود نہیں ہے۔ چاہے یہ معاشرے اور نظام، اشتراکیت کی بنیاد پر قائم ہوں یا سرمایہ دارانہ نظریہ کی بنیاد پر، بت پرستی اور ہندومت کی اساس پر قائم ہوں یا یہودیت و نصرانیت کی بنیاد پر، سیکولرازم کی اساس پر قائم ہوں یا جمہوریت کی بنیاد پر۔ بہرصورت یہ معاشرے اور نظام جاہلی اور باطل ہیں۔ اسی طرح نام نہاد مسلم ممالک میں اسلامی معاشرے اور نظام کی بجائے جاہلی معاشروں اور باطل نظاموں کا دور دورہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلم ممالک میں اسلام کو ماننے والے رہتے بستے ہیں، وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اقتدار بھی بظاہر مسلمانوں کو ہی حاصل ہے اور وہ انفرادی حیثیت میں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے میں آزاد ہیں لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ یہ مسلمان اسلامی معاشرے اور نظام کے تحت اپنی زندگی گزارنے کی بجائے جاہلی معاشرہ میں رہ رہے ہیں، یعنی عوام تو مسلمان ہیں لیکن اسلامی معاشرے اور نظام کا وجود نہیں ہے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ وہ جاہلی معاشرے کے تحت زندگی گزار رہے ہیں۔

الغرض آج پوری دنیا میں خواہ وہ کفریہ ممالک ہوں یا نام نہاد اسلامی ممالک کہیں بھی اسلامی تعلیمات پر مبنی معاشرہ قائم نہیں ہے۔ اشتراکی نظریہ پر قائم معاشرہ تو خدا کی ہستی سے ہی انکاری ہے اور ان کے نزدیک کائنات کا خالق خدائے واحد کی ذات نہیں بلکہ مادہ اور نیچر ہے۔

سرمایہ دارانہ نظریہ کی اساس پر قائم معاشرے اور نظام میں خدا کا تصور ایک حد تک تو موجود ہے لیکن وہ دین و سیاست میں تفریق کے قائل ہیں اور دنیاوی اجتماعی امور خواہ سیاست ہو یا عدالت، معاشرت ہو یا معیشت وغیرھا، میں مذہب کی مداخلت کو قبول نہیں کرتے بلکہ وہ ان امور کو دین ومذہب کے دائرہ کار سے باہر سمجھتے ہیں اور وہ انہیں اپنی سوچ ،فکر اور تجربات کی روشنی میں انجام دیتے ہیں۔

کسی بھی ملک میں عملاً اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اقتدارِ اعلیٰ کا وجود نہیں ہے، بلکہ اقتدارِ اعلیٰ کا سرچشمہ عوام اور عوامی نمائندوں کو سمجھا جاتا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت واقتدار اور اس کے قانون کو جگہ دینے کیلئے کوئی تیار نہیں ہے۔ ان کے نزدیک ان امور میں انسان دینی ومذہبی پابندیوں اور قیود سے آزاد ہے اور خود اصول وقوانین بنانے کا استحقاق رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ساری دنیا میں سیکولرازم اور جمہوریت کا راج ہے۔ مثلاً دنیا کے کسی بھی ملک کے دستور وآئین کی بنیاد وحی الٰہی اور قرآنی تعلیمات پر نہیں ہے۔ ریاست کے تمام ادارے اور شعبے انسانوں کے من گھڑت قوانین کے مطابق چل رہے ہیں۔ یہی صورت حال اسلامی ممالک میں ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی بجائے عملاً انسانوں کو حاصل ہے۔ ان کے آئین ودستور کی اساس شریعت اور قرآن وسنت نہیں بلکہ یورپ سے درآمد کردہ جمہوریت ہے جبکہ ان کے ریاستی ڈھانچے کی بنیاد جمہوریت، آمریت، بادشاہت اور مطلق العنانیت ہے۔ مسلم ممالک کے سیاسی، عدالتی، خارجی، اقتصادی اور معاشرتی نظاموں سے شریعت کو بے دخل کر کے کفریہ نظام کا نفاذ کیا گیا ہے۔

الحاصل یہ کہ دنیا میں کہیں بھی اسلامی معاشرے اور نظام کا وجود نہیں بلکہ جاہلی معاشرہ اپنی نئی اور ترقی یافتہ شکل وصورت کے ساتھ رائج ہے جو انسانیت کو دنیوی اور اخروی طور پر ناکام ونامراد بنا رہا اور اسے جہنم کی طرف دھکیل رہا ہے۔ اس جاہلی معاشرے اور نظامہائے باطلہ کو جڑ سے ختم کر کے اس کی جگہ اسلامی معاشرے اور اسلام کے پیش کردہ کامل ومکمل نظامِ خلافت کا قیام وقت کا تقاضا اور امتِ مسلمہ کے ہر فرد کا بنیادی فریضہ ہے چونکہ باطل نظامہائے حیات انسانوں کی دنیا وآخرت کی تباہی

وبربادی کا سامان کر رہے ہیں اس لیے۔ اگر مسلمان اب بھی اسلامی معاشرے کی تشکیل اور نظام خلافت کے قیام کے لئے نہ اٹھے اور اس کے لئے ہر ممکن جدوجہد نہ کی تو غیر مسلم اقوام کے ساتھ امت مسلمہ خود بھی دنیوی واخروی ناکامی کا شکار ہو سکتی ہے بلکہ ہو رہی ہے۔ لہٰذا دیگر اقوام کے ساتھ ساتھ خود اہل اسلام کی بقا اور بھلائی اسی میں ہے کہ اسلامی نظام کے قیام کے لئے بھرپور انداز میں اور سرتوڑ کوشش کی جائے۔

فصل دوم:

سنت وسیرت

اسلام ایک کامل ومکمل نظام ہے، اللہ تعالیٰ نے جو ضابطہ حیات عطا کیا اور جو احکامات جاری فرمائے ہیں ان پرعمل کرنے کا طریقۂ کار بھی بتا دیا ہے۔ اس حکم کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے، انفرادی زندگی سے ہو یا اجتماعی سے۔ غرض ہر ہر حکم پرعمل کرنے کا طریقہ بھی واضح کر دیا گیا ہے اور یہ طریقہ محض زبانی یا تحریری صورت میں نہیں بتلایا بلکہ اس کا عملی نمونہ بھی پیش کر دیا گیا ہے تا کہ ہر آدمی اپنی عقل وفہم کے مطابق عمل پیرا نہ ہو، کیونکہ زبانی اور تحریری کلام کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں اور ہر آدمی علیحدہ علیحدہ مفہوم مراد لے سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں احکامات وقوانین کے مجموعے ''کتب'' اور ''صحف'' نازل فرمائے، ان کے ساتھ اصحابِ کتب یعنی انبیاء ورسل علیہم الصلوۃ والسلام بھی مبعوث فرمائے تا کہ وہ اپنی اپنی امت کو احکامات الٰہیہ کا معنیٰ ومفہوم سمجھائیں اور ان پرعمل کرنے کا طریقۂ کار بتائیں بلکہ بذات خود ان پرعمل کر کے ان قوانین کا عملی نمونہ پیش کر سکیں، چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ. (البقرۃ : ۲۱۳)

''ابتدا میں سب لوگ ایک ہی گروہ کے تھے تو خدا نے نبی بھیجے جو خوشخبری دیتے اور ڈراتے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق بھی نازل کی تا کہ اختلافی باتوں میں لوگوں کیلئے فیصلہ کر دیا کرے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جہاں انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی بعثت کی وجہ بیان فرما دی ہے، وہاں ان کے ساتھ کتابیں نازل کرنے کا مقصد بھی واضح کر دیا ہے۔ دیگر انبیاء کرام کی طرح خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم عطا کیا گیا جو تا قیامت آنے والے تمام انسانوں کے لئے کتاب ہدایت ہے۔ اس میں اسلام کے بنیادی احکام اور قوانین بیان کئے گئے ہیں، پھر آپ کی سنت کے ذریعے ان کی تفصیل وتشریح بیان کی گئی ہے اور ان کے طریقۂ کار کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

فرائض واحکام اوران کا طریقہ ٔکار

اسلام کے بنیادی فرائض کا حکم دینے کے ساتھ ان کا طریقۂ کار بھی بتلایا گیا ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور دیگر احکام پر عمل درآمد کرنے کا طریقۂ کار بھی واضح کردیا گیا ہے، بلکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے بذاتِ خود ان احکام پر عمل کیا اور صحابہ کرام کو بھی باقاعدہ طور پر سکھلایا۔ اللہ نے نماز فرض فرمائی تو اس کا عملی نمونہ بھی پیش کردیا گیا۔ روزہ فرض فرمایا تو اس کا عملی نمونہ بھی پیش کردیا گیا۔ حج فرض قرار دیا گیا تو اس کا عملی نمونہ بھی پیش کردیا گیا۔ اسی طرح اسلامی نظام حیات یعنی خلافت اسلامیہ کا قیام مسلمانوں پر فرض ہے اور یہ فرضیت قرآن وسنت اور اجماع سے ثابت ہے جس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں تو کیا اس کا منہج اور طریقۂ کار نہیں بتایا گیا ہوگا؟ جی ہاں خلافت کی فرضیت کے ساتھ ساتھ اس کے قیام کا منہج اور طریقۂ کار بھی واضح کردیا گیا ہے، جس کا عملی نمونہ خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کردیا ہے۔

ہر حکم پر عمل کرنے کیلئے اس کا طریقہ معلوم کرنے کیلئے قرآن وسنت کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے قرآن میں دیکھا جاتا ہے۔ اگر موجود ہے تو ٹھیک ورنہ سنت کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ خلافت کا قیام فرض قرار دیا گیا ہے تو اس کی فرضیت کے ساتھ اس کا منہج اور طریقۂ کار بھی واضح کردیا گیا ہے، جس کا ثبوت سنت سے ملتا ہے، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوجائے گا کہ کس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفریہ نظام کے خاتمے اور اسلامی نظام کے قیام کے لئے جدوجہد کی، آپ کی دعوت باقاعدہ ترتیب وتنظیم کے ساتھ تھی اور کئی مراحل سے گزر کر ایسے موڑ پر آئی جہاں پہنچ کر آپ نے اسلامی نظام قائم کیا اور جزیرۂ عرب میں اسے غالب کرنے کے بعد دنیا کے دیگر علاقوں میں اس کی توسیع کے لیے اور اسے ادیان باطلہ پر غالب کرنے کی راہ ہموار کی، پھر آپ کے تربیت یافتہ جانشین خلفاء راشدین نے آپ کے مشن کی تکمیل کی۔ الغرض آپ نے اسلامی نظام کے قیام کے لئے ایک ترتیب اور منہج اختیار کیا جس کے ذریعے آپ اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، لہٰذا احیاء خلافت کے لیے سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع فرض ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (آل عمران: ۳۱)

''اے نبی کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تا کہ خدا بھی تم سے محبت

کرے اور تمہارے گناہ بھی معاف کردے اور اللہ تو بخش دینے والا مہربان ہے۔''

امام ابن کثیر مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ھذہ الآیة الکریمة حاکمة علی من ادعی محبة اللّٰہ ولیس ھو علی الطریقة المحمدیة فانه کاذب فی دعواہ فی نفس الامر حتی یتبع الشرع المحمدی والدین النبوی فی جمیع اقواله وافعاله. (تفسیر ابن کثیر، تفسیر سورة آل عمران)

''جو آدمی اللہ کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے لیکن محمدی طریقے پر عمل پیرا نہیں یہ آیت اس پر یہ حکم لگا رہی ہے کہ ایسا آدمی درحقیقت اپنے دعوے میں جھوٹا ہے جب تک کہ وہ اپنے تمام اقوال اور افعال میں شریعت محمدیہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین پر عمل پیرا نہیں ہوتا۔''

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یعنی اگر دنیا میں آج کسی کو اپنے مالک حقیقی کی محبت کا دعویٰ ہو تو لازم ہے کہ اس کو اتباع محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لے، سب کھرا کھوٹا معلوم ہو جائے گا۔ جو شخص جس قدر حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ چلتا اور آپ کی لائی ہوئی روشنی کو مشعلِ راہ بناتا ہے، اسی قدر سمجھنا چاہئے کہ خدا کی محبت کے دعوے میں سچا اور کھرا ہے اور جتنا اس دعوے میں سچا ہوگا اتنا ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں مضبوط و مستعد پایا جائے گا۔'' (تفسیر عثمانی، سورۃ آل عمران)

مذکورہ بالا آیت کی تفسیر سے واضح ہوگیا کہ جب تک سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار نہیں کیا جاتا تب تک اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ مبنی برحقیقت نہیں ہے۔ لہٰذا شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار کیے بغیر چارہ کار نہیں ہے، چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے دین اسلام کے علاوہ دیگر تمام مذاہب کی اتباع کی نفی فرمادی ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰهِ الْاِسْلَام﴾ (آل عمران:۱۹)

''بے شک دین جو ہے اللہ کے ہاں سو یہی مسلمانی حکمبرداری ہے۔''

اس آیت کی تفسیر میں امام ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

اخبار منه تعالیٰ بانه لادین عندہ یقبله من احد سوی الاسلام.

(تفسیر ابن کثیر تفسیر آل عمران)

''اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بتلایا جارہا ہے کہ وہ اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کو قبول نہ کرے گا۔''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿ وَمَآ اٰتٰـكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾. (الحشر: ۷)

''اور جو کچھ تم کو رسول دے اس کو لے لو اور جس سے منع کرے اس سے باز رہو اور اللہ سے ڈرو کیونکہ اللہ کی سخت سزا ہے۔''

اسوۂ حسنہ

چونکہ رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ قرآن کی عملی صورت تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے ہر حکم پر عمل پیرا ہونے کے لیے آپ کی حیات مبارکہ کو اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے، فرمانِ الٰہی ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْراً (الاحزاب: ۲۱)

''البتہ تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے، اس کے لیے جو اللہ اور قیامت کی امید رکھتا اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہے۔''

امام ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

هذه الآية الكريمة اصل كبير فى التأسى برسول الله صلى الله عليه وسلم فى اقواله وافعاله واحواله ولهذا امر تبارك وتعالىٰ الناس التأسى بالنبى صلى الله عليه وسلم يوم الاحزاب فى صبره ومصابرته ومرابطته ومجاهدته وانتظاره الفرج من ربه عزوجل صلوات الله وسلامه عليه دائماً الى يوم الدين. (تفسير ابن كثير، تفسير سورة الاحزاب)

''یہ آیت کریمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور احوال کی پیروی کرنے کے بارے میں ایک بڑے اصول کا درجہ رکھتی ہے، اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے لوگوں کو غزوہ احزاب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ثابت قدمی پر ابھارنے، خود ڈٹے رہنے، مجاہدہ کرنے اور اللہ کی طرف سے تنگی کے خاتمے کا انتظار کرنے کے امور میں آپ کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے۔''

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر حکم میں اپنی سیرت پر عمل کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ ارشادِ نبوت ہے:

صَلّوا كَمَا راء يتمونى اُصَلّى. (مسند الحميدى رقم الحديث ۲۱۳ ص ۸۴)

''اسی طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتا ہوا دیکھ رہے ہو۔''

اسی طرح حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا:

لتاخذوا مناسککم.(صحیح مسلم کتاب الحج باب استحباب رمی الجمرۃ العقبۃ)

''مجھ سے مناسک (سیکھ کر) لے لو۔''

امام نووی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے:

هذه الامور التی اتیت بها فی حجتی من الاقوال والافعال والهیات هی امور الحج وصفته وهی مناسکم فخذوها عنی واقبلوها واحفظوها واعملوا بها وعلموا بها الناس.(شرح النووی لصحیح المسلم کتاب الحج باب استحباب رمی الجمرة العقبة)

''جو اقوال، افعال اور ہیأت میں نے حج میں انجام دیے ہیں یہی حج کے امور اور صفت ہیں اور یہی تمہارے مناسک ہیں، ان کو مجھ سے (سیکھ کر) لے لو، انہیں قبول کرو، انہیں یاد رکھو، ان پر خود بھی عمل درآمد کرو اور لوگوں کو بھی ان کی تعلیم دو۔''

یعنی جو اقوال اور افعال جن ہیئتوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیے انہیں نہ صرف خود یاد رکھنا اور ان پر عمل پیرا ہونا ہے بلکہ دوسروں کو بھی یہی امور سکھانے ہیں۔ معلوم ہوا کہ آپ کے طریقہء کار سے ہٹنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ یہ آپ کی سنت اور سیرت کی خلاف ورزی ہوگی۔

مندرجہ بالا آیات و احادیث مبارکہ سے واضح ہوگیا کہ ہر عمل میں رسول ﷺ کی اتباع لازم ہے۔ جس طرح رسول ﷺ نے نماز پڑھ کر دکھائی ہے اسی طرح نماز پڑھنا فرض ہے۔ جس طرح حج کر کے دکھایا ہے، اسی طرح حج کرنا فرض ہے۔ یہی حال غلبہء دین یعنی خلافت کے نظام کے قیام کا ہے کہ جس منہج اور طریقۂ کار کے ذریعے رسول ﷺ نے بھرپور جدوجہد کر کے اسلامی معاشرہ اور ریاست قائم فرمائی، امت پر بھی لازم ہے کہ وہ آپ کی اتباع کرتے ہوئے اسی منہج اور طریقۂ کار کے بنیادی اصولوں کے مطابق اسلامی نظام قائم کرے، امام ابوبکر الجصاص الحنفی لکھتے ہیں:

فاذا وجدنا النبی صلی الله علیه وسلم قد فعل فعلاً فعلینا اتباعه فیه علی الوجه

الـذی فـعـلـهٔ الاتـری انّ قوله " خُذُ مِنُ اَمُوَالِهِمُ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمُ " (التوبة: ١٠٣) لم يـوجـب كـون النبی صلی الله عليه وسلم مخصوصاً به دون غيره من الأئمة بعده و كـذلک قوله " اِذَا جَاءَ کَ الُمُؤُمِنَاتُ يُبَايِعُنَکَ" (الممتحنة: ١٢) و كذلک قوله "واَن احُکُـمُ بَيُـنَهُـمُ بِـمَـا اَنُـزَلَ اللّٰهُ" (المائده: ٤٩) وقوله "فَاِنُ جَاؤُوُکَ فَاحُکُمُ بَيُـنَهُمُ" (المائده: ٤٢) فيه تخصيص النبی صلی الله عليه وسلم بالمخاطبة والأئمة بعدهٔ مرادون بالحكم معه (احكام القرآن للجصاص ج ٢ ص ٣٢٨، ٣٢٩)

''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کام کیا تو ہم پر لازم ہے کہ ان کی اتباع کرتے ہوئے اسی طرح انجام دیں جس طرح آپ نے انجام دیا ہے، ارشادِ خداوندی ملاحظہ ہو کہ ''ان کے اموال میں سے صدقہ لیجئے جو ان کے اموال کو پاکیزہ کردے گا'' یہاں اس سے یہ مراد نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس حکم میں مخصوص ہیں اور آپ کے بعد آنے والے امت کے امام (خلیفہ) مراد نہیں ہیں۔ اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''جب آپ کے پاس مؤمن عورتیں آئیں تو ان سے بیعت لیجئے'' اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''آپ ان کے مابین اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ کیجئے۔'' ان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی طور پر مخاطب کیا گیا ہے اور آپ کے بعد آنے والے امام بھی آپ کے ساتھ اس حکم میں مراد ہیں۔''

یعنی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنائے ہوئے طریقے پر چلنا اور آپ کی سیرت کی پیروی کرنا لازم ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی حکم پر عمل کرنے کا جو طریقہ بتایا ہے، آپ کے بعد آنے والے لوگوں کو بھی یہی طریقہ اپنانا ہوگا۔ گویا جن آیات میں آپ کو مخاطب کیا گیا ہے، بعد میں آنے والے لوگ بھی اس کے مخاطب ہے، لہٰذا انہیں بھی آپ کے طریقے پر ہی چلنا ہوگا۔ اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب آپ کی سنت کی بعینہٖ اقتداء کی جائے اور اس سے سرمو انحراف نہ کیا جائے، تب یہ کہا جائے گا کہ آپ کی سنت وشریعت پر کامل طور پر عمل درآمد کیا گیا ہے۔ چنانچہ علامہ علی بن برھان الدین الحلبی الشافعی ''ولیٔ کامل'' سے متعلق الشیخ محی الدین بن عربی کا قول نقل کرتے ہیں:

فـالولی الكامل يجب عليه متابعة العمل بالشريعة المطهرة حتی يفتح الله له فی قـلـبـه عـيـن الـفـهـم عـنـه فـيـلـهـم مـعانی القرآن ويكون من المحدّثين بفتح الدال ثم

یصیر الی ارشاد الخلق. (السیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۲۲۷)

''ولی کامل پر شریعت مطہرہ پر مسلسل عمل پیرا ہونا لازم ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے دل کو اس کے بعینہٖ فہم کیلئے کھول دے اور اسے قرآن کے معانی الہام کیے جائیں اور وہ محدّ ثین (جنہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف الہام کیا جاتا ہےاوران کے سینے حق کے لئے کھول دیے جاتے ہیں) کے درجہ تک پہنچ جائے، اس کے بعد وہ مخلوق کی رہنمائی کرے۔''

حقیقت یہ ہے کہ شریعتِ مطہرہ (جس کا دوسرا نام سنتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے) پرعمل پیرا ہوئے بغیر ولایت کا کامل درجہ حاصل کیا جا سکتا ہے اور نہ دین وشریعت اورقرآنی تعلیمات کا فہم وادراک حاصل ہوسکتا ہے۔ پھرمخلوق کی اصلاح اور معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں اور منکرات کے خاتمے کی جدوجہد اس وقت تک انجام نہیں دی جا سکتی جب تک آدمی خود سنت وسیرت کا علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان پرعمل نہ کرتا ہو، جب آدمی خودعلم وعمل کا جامع اور ظاہری وباطنی طور پر دین وشریعت کو اپنائے ہوئے ہوتو تب وہ اصلاح وتبدیلی، تحفظ وغلبۂ دین اور انقلاب جیسی عظیم الشان ذمہ داری سے صحیح طور پرعہدہ برآ ہوسکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جدید جاہلیت کے دور میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت وسیرت کی پیروی کرنے کے ساتھ ہی حقیقی انقلاب برپا کیا جا ہوسکتا اوراسی صورت میں غلبۂ دین کی جدوجہد میں کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔

فصل سوم:

نبوی طریقہء کار ہی ''منزل من اللہ'' ہے

رسول اکرم ﷺ نے اسلامی نظام کے قیام کیلئے جو طریق کار اختیار کیا، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ اور وحی پر مبنی تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اختیار کردہ منہج (نعوذ باللہ) من گھڑت، ذاتی اختراع یا ذہنی کاوش کا نتیجہ نہ تھا بلکہ جیسے اسلامی نظام ''منزل من اللہ'' (اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ) اور وحی پر مبنی ہے، اسی طرح اس کے قیام کا منہج وطریقۂ کار بھی منزل من اللہ اور وحی پر مبنی ہے کیونکہ آپ خود اس طریقۂ کار سے بعثت سے پہلے واقف نہ تھے۔

(۱) مکہ کے جاہلی معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں اور شرک پر مبنی عقائد اور رسوم وعادات کے خاتمے اور صالح معاشرے کے قیام کی فکر تو آپ کرتے تھے لیکن جاہلیت کا خاتمہ اور صالح معاشرے کا قیام کیونکر ہوسکتا ہے اس سے آپ قطعاً آگاہ نہ تھے، ارشادِ ربانی ہے:

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ. (الضحیٰ:۷)

''آپ کو گم کردہ راہ پایا تو رہنمائی کی۔''

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

یعنی شریعت نمید انستی تو واللہ اعلم (فتح الرحمٰن)

''یعنی آپ کو شریعت کا علم نہ تھا۔''

امام ابن جوزی مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ضالاً عن معالم النبوة واحكام الشريعة فهداك اليها قالهٔ الجمهور منهم الحسن والضحاک (زاد المیسر جزء ۸، ص ۲۸۱)

''جمہور جن میں حسن اور ضحاک شامل ہیں، فرماتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ آپ نبوت اور شریعت سے ناواقف تھے پھر اللہ نے اس طرف آپ کی رہنمائی کی۔''

امام قرطبی اسی آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

قال قوم وَوَجَدَکَ ضَالًّا ای فی قوم ضلالٍ فھدا ھم اللہ بک ھذا قول الکلبی والفراء وعن السدی نحوہٗ ای ووجد قومک فی ضلالٍ فھداک الیٰ ارشادھم
(الجامع الاحکام القرآن جز ۲۰، ص ۸۵)

''کچھ لوگ جن میں کلبی اور فراء شامل ہیں، کے مطابق اس سے مراد ہے آپ کو ایک گمراہ قوم میں پایا تو انہیں آپ کے ذریعے ہدایت دی، سدی کا کہنا بھی یہی ہے کہ اس سے مراد ہے کہ آپ کو گمراہ قوم میں پایا تو انہیں راہ راست پر لانے کے لئے آپ کی رہنمائی کی''۔

یعنی آپ کو کفر وشرک اور گمراہی میں غرق قوم میں مبعوث کیا گیا، پھر ان کی ہدایت کے لیے آپ کو طریقۂ کار بتایا گیا، چنانچہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثانی زیر بحث آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

''جب حضرتؐ جوان ہوئے، قوم کے مشرکانہ اطوار اور بیہودہ رسم وراہ سے سخت بیزار تھے اور قلب میں خدائے واحد کی عبادت کا جذبہ پورے زور کے ساتھ موجزن تھا، عشق الٰہی کی آگ سینۂ مبارک میں بڑی تیزی سے بھڑک رہی تھی، وصول الی اللہ اور ہدایت خلق کی اس اکمل ترین استعداد کا چشمہ جو تمام عالم سے بڑھ کر نفسِ قدسی میں ودیعت کیا گیا تھا، اندر ہی اندر جوش مارتا تھا لیکن کوئی صاف کھلا ہوا راستہ اور مفصل راستہ اور مفصل دستور العمل بظاہر دکھائی نہ دیتا تھا جس سے اس عرش وکرسی سے زیادہ وسیع قلب کو تسکین ہوتی، اسی جوشِ طلب اور فرطِ محبت میں آپ بے قرار اور سرگرداں پھرتے اور غاروں اور پہاڑوں میں جا کر مالک کو یاد کرتے اور محبوب حقیقی کو پکارتے، آخر اللہ تعالیٰ نے غار حرا میں فرشتہ کو وحی دے کر بھیجا اور وصول الی اللہ اور اصلاح خلق کی تفصیلی راہیں آپ پر کھول دیں۔'' (تفسیر عثانی، سورۃ الضحیٰ)

یعنی آپ ایک گمراہ قوم میں مبعوث ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کی اصلاح کے لیے اور ان کو راہِ راست پر لانے کے لئے طریقۂ کار بتایا جس کے ذریعے آپ انہیں گمراہی وضلالت سے نکال کر صراطِ مستقیم پر لائے۔

(۲) قرآن پاک میں یہ واضح بیان کیا گیا ہے کہ منہج نبوی منزل من اللہ ہے۔

وَمَا كُنتَ تَتْلُوْ مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّا رْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ .
(العنکبوت: ۴۷۔ ۴۹)

''اور تو پڑھتا نہ تھا اس سے پہلے کوئی کتاب اور نہ لکھتا تھا اپنے داہنے ہاتھ سے، تب تو البتہ شبہ میں

پڑتے یہ جھوٹے۔‘‘(ترجمہ شیخ الہند)

امام ابن جوزی وَما کُنْتَ تَتلُوْ مِنْ قَبْلِه مِنْ كِتٰبٍ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ماکنت قارياً قبل الوحی ولا كاتباً وهكذا كانت صفته فی التوراة والانجيل انه امّی لايقرأ ولا يكتب وهذا يدلّ علیٰ انّ الذی جاء به من عندالله تعالیٰ.
(زادالمیسر جز ۶، ۱۳۱)

’’آپ وحی کے نزول سے پہلے پڑھ سکتے تھے اور نہ لکھ سکتے تھے۔تورات اور انجیل میں آپ کی صفات اسی طرح بیان کی گئی ہیں کہ’’آپ اُمّی ہیں نہ پڑھ سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں‘‘یہ(آپ کا پڑھا لکھا نہ ہونا)اس بات کی دلیل ہے کہ آپ جو احکام لائے ہیں وہ من جانب اللہ ہیں۔‘‘

یعنی امی ہونے کے باوجود آپ اتنا عظیم کلام لائے اوراس کے ذریعے معاشرے میں انقلاب برپا کیا تو یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ آپ کو یہ تمام اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہیں۔

امام بغوی اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

یعنی لاتكتبه يعنی لم تكن تقراء ولا تكتب قبل الوحی. اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ يعنی لوكنت تقرأ او تكتب قبل الوحی لشک المبطلون المشركون من اهل مكة وقالوا انه يقرؤهٗ من كتب الاوّلين وينسخه منها. (بغوی ج۳،ص ۴۷۱)

’’یعنی آپ وحی سے پہلے نہ پڑھتے تھے اور نہ لکھتے تھے،اگر ایسا ہوتا تب اہل باطل شک کرتے یعنی اگر آپ وحی سے پہلے پڑھتے یا لکھتے ہوتے تو اہلِ باطل یعنی مشرکین مکہ ضرور شک کا اظہار کرتے اور کہتے کہ یہ پہلے لوگوں کی کتابوں سے پڑھتا ہے اوران سے نقل کرتا ہے۔‘‘

(۳) سورۃ القصص میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بالکل واضح کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْا اَنْ يُّلْقٰى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ. (القصص:۸۶)

’’اورتو توقع نہ رکھتا تھا کہ اتاری جائے گی تجھ پر کتاب مگر مہربانی سے تیری رب کی،سوتو مت ہو مددگار کافروں کا۔‘‘

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیراحمد عثمانیؒ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

’’یعنی آپ پہلے سے کچھ پیغمبری کے انتظار میں نہ تھے،محض رحمت وموہبت الٰہیہ ہے جو حق تعالیٰ

نے پیغمبری اور وحی سے سرفراز فرمایا۔'' (تفسیر عثمانی، تفسیر سورۃ القصص)

امام بغویؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ای یوحی الیک القرآن الارحمةً من ربک قال الفرأ هذا من الاستثناء المنقطع معناه لکن ربک رحمک فاعطاک القرآن (بغوی ج۳، ص ۴۵۹)

''یعنی آپ کو اس بات کی توقع نہ تھی کہ آپ کی طرف قرآن نازل کیا جائے گا۔ فراء فرماتے ہیں کہ ﴿اِلَّا رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّکَ﴾ یہ مستثنیٰ منقطع ہے، معنی یہ ہے کہ مگر اللہ نے آپ پر رحم فرمایا اور آپ کو قرآن عطا کیا۔''

(۴) اسی طرح دوسرے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَکَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَآ اِلَیۡکَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا مَاکُنۡتَ تَدۡرِیۡ مَاالۡکِتٰبُ وَلَا الۡاِیۡمَانُ وَلٰکِنۡ جَعَلۡنٰهُ نُوۡرًا نَّهۡدِیۡ بِهٖ مَنۡ نَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِنَا وَاِنَّکَ لَتَهۡدِیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ۔ (الشوریٰ: ۵۲)

''اور اسی طرح بھیجا ہم نے تیری طرف ایک فرشتہ اپنے حکم سے، تو نہ جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب اور نہ ایمان، لیکن ہم نے رکھی ہے یہ روشنی اسی سے راہ سمجھا دیتے ہیں جس کو چاہیں اپنے بندوں میں اور بیشک تو سمجھاتا ہے سیدھی راہ۔'' (ترجمہ شیخ الہند)

اس آیت کی وضاحت درج ذیل حدیث سے ہوتی ہے، ابونعیم اور ابن عساکر سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

قیل صلی اللہ علیہ وسلم هل عبدت وثنا قط؟ قال لا، قالو فهل شربت خمراً قط؟ قال لا ومازلت اعرف ان الذی هم علیه کفر وماکنت ادری ما الکتاب ولا الایمان. (الخصائص الکبریٰ للسیوطی باب اختصاصه صلی اللہ علیه وسلم بحفظ اللہ ایاه فی شبابه جزء ۱ ص ۱۵۰)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ کیا آپ نے کبھی کسی بت کی پوجا کی ہے؟ فرمایا کہ نہیں، صحابہؓ نے عرض کیا کہ کیا آپ نے کبھی شراب پی ہے؟ فرمایا: نہیں۔ فرمایا مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ (مشرکین مکہ) جس (دین) پر قائم ہیں وہ کفر ہے البتہ مجھے کتاب اور ایمان کا علم

نہیں تھا۔''

امام بغوی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اهل الاصول علیٰ ان الانبیاء علیهم الصلوٰة والسلام كانوا مؤمنين قبل الوحی وكان النبی صلی الله علیه و سلم يعبد الله قبل الوحی علی دين ابراهيم ولم يتبين لهٗ شرائع دينه. (بغوی ج۴، ص ۱۳۲)

''اصولیین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام وحی سے قبل ہی صاحبِ ایمان ہوتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وحی سے پہلے دینِ ابراہیم کے مطابق اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرتے تھے لیکن شرائعِ دین ان کے سامنے واضح نہیں تھے۔''

اسی طرح علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

لاشک انه قبل الوحی لم یکن علیه الصلوٰة والسلام یعلم انه رسول الله وما علم ذلک الاّبالوحی. (روح المعانی جزء ۲۵، ص ۵۸)

''اس میں کوئی شک نہیں کہ وحی سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے رسول ہونے کا علم نہیں تھا، اس کا علم آپ کو وحی کے ذریعہ ہی ہوا۔''

امام ابن جوزی اس آیت کی تفسیر میں لکھے ہیں:

وذلک انه لم یکن یعرف القرآن قبل الوحی. ولا الایمان بمعنی الدعوة الی الایمان قاله ابو العالیة .(زاد المیسر جز ۷ ،ص ۱۲۶)

''آپ وحی سے قبل قرآن جانتے تھے اور نہ ایمان، ابوالعالیہ لکھتے ہیں کہ اس سے مراد ہے ایمان کی دعوت۔''

(۵) جب آپ کو مبعوث کیا گیا اور آپ پر وحی کا نزول شروع ہوا تب اللہ تعالیٰ نے اس انقلاب عظیم کا منہج اور طریقۂ کار بھی آپ پر واضح فرمادیا۔ جب اولین وحی نازل ہوئی تو آپ گھبرائے ہوئے گھر تشریف لائے اور زوجہ مطہرہ سیدہ خدیجہؓ سے فرمایا:

لقد خشیت علیٰ نفسی : (صحیح البخاری باب کیف کان بدء الوحی)

''مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے۔''

اس کی تشریح علامہ سہیلی نے اس طرح کی ہے:

ای خشیت الّا انتهض باعبأ النبوة وان اضعف عنها ثم ازال الله خشیته ورزَقه الاید والقوة والثبات والعصمة (الروض الانف ج ۱، ص ۱۵۷)

''مجھے اس بات کا خوف ہے کہ کہیں نبوت کی ذمہ داری نہ اٹھا سکوں اور کمزوری دکھاؤں، پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کے اس خوف کو ختم کردیا اور آپ کو طاقت وقوت، ثابت قدمی اور عصمت عطا فرمائی۔''

چونکہ نبوت ورسالت ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے اور آپ کو اس سے پہلے اس کا تجربہ تھا اور نہ طریقۂ کار معلوم تھا پھر اچانک اس کی ذمہ داری ڈالی جارہی تھی، اس لئے آپ نے محض خدشہ ظاہر فرمایا کہ میں اس کو کس طرح انجام دوں گا آپ کو اپنی نبوت میں شک وتردد ہرگز نہ تھا۔

(۶) حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی بیعت کی جاچکی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

اما بعد فاختار الله لرسوله صلى الله عليه وسلم الذى عنده على الذى عندكم وهذا الكتاب الذى هدى الله به رسولكم فخذوا به تهتدوا وانما هدى الله به رسوله (صحیح البخاری کتاب الاعتصام، باب الاعتصام بالکتاب والسنة).

''امابعد، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایسی چیز کا انتخاب کیا ہے جو اس کے ہاں بہتر ہے بنسبت اس کے جو تمہارے ہاں ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس کتاب کے ذریعے تمہارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رہنمائی کی ہے تم اسی کو مضبوطی سے تھام لوتو ہدایت پا جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ نے تو اسی کے ذریعے ہی اپنے رسول کی رہنمائی فرمائی تھی۔''

مقصد یہ ہے کہ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے ہیں لیکن قرآن کی صورت میں ہمارے پاس ایسی کتابِ ہدایت موجود ہے جس میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی فرمائی گئی اور آپ نے اس کے ذریعے نبوت ورسالت کی ذمہ داری انجام دی، لہٰذا ہمیں بھی اسی کو تھام لینا چاہئے اور اسی کے ساتھ آپ کی سنت پر بھی مضبوطی کے ساتھ عمل پیرا ہونا چاہیے۔

(۷) جریر بن حازم، حسن سے روایت کرتے ہیں:

لطم رجل امرأته فاستَعْدَتْ عليه رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال صلى الله عليه وسلم "عليكم القصاص" فانزل الله "وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُقْضٰى

اِلَیْکَ وَحْیُہٗ (طٰہٰ: ۱۱۴) ثم انزل اللہ تعالیٰ "اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ"

(احکام القرآن للجصاص ج ۲ ص ۲۳۶)

ایک آدمی نے اپنی بیوی کو طمانچہ مارا، اس عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استدعا کی تو آپ نے فرمایا "تمہارے اوپر قصاص لازم ہے" پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "وحی کے پہنچنے سے قبل قرآن میں جلدی نہ کیا کریں" اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی "مرد عورتوں پر نگہبان ہیں۔"

یعنی نزول قرآن سے پہلے آپ کسی چیز سے متعلق حکم نہ لگائیے بلکہ وحی کا انتظار کیجئے اور ملنے والے حکم پر عمل درآمد کروائیے کیونکہ کسی بھی معاملے سے متعلق حکم لگانے کا اختیار آپ کو نہیں ہے، چنانچہ الشیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محکوم حکم الٰہی بود در فعل و ترک ولطف وقہر وعفو واخذ ہیچ چیز ین از وی بادی نگذاشتہ بودنداز ہوائے نفس واتباع آن ومیگشت برسوکہ میگردانید اوراتقدیر الٰہی وحکم وی تعالیٰ۔ (مدارج النبوہ ج ۲ ص ۱۳۶)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم کے پابند تھے کسی کام کے کرنے نہ کرنے، مہربانی وسختی، عفو درگذر اور پکڑنے میں، کوئی چیز اپنی مرضی ونفسانی خواہش اور نفس کی پیروی کرتے ہوئے نہ کرتے تھے جو کچھ ہوتا اسے حکم الٰہی قرار دیتے اور اسی طرف متوجہ ہوتے جس طرف کا حکم ہوتا۔"

یعنی حقیقی حاکم وشارع اللہ تبارک وتعالیٰ ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے دیے ہوئے احکام کے پابند ہیں۔ آپ اپنی مرضی، خواہش اور سوچ وفکر کی بنیاد پر کوئی دینی کام انجام نہیں دے سکتے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت کے خاتمے اور باطل وکفریہ نظامہائے حیات کے خاتمے کے لئے ایک منہج اور طریقۂ کار اختیار کیا۔ یہ طریقۂ کار آپ نے اپنی عقل اور فہم کی بنیاد پر نہیں اپنایا بلکہ اللہ تعالیٰ نے وحی الٰہی کے ذریعہ آپ کو عطا کیا کیونکہ بعثت سے قبل نہ آپ کو یہ معلوم تھا کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں نہ یہ پتہ تھا کہ جاہلیت اور باطل نظاموں کو کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے اور لوگوں کو کس طرح دعوت دے کر دینِ حق اور کامل ومکمل نظام حیات کو اختیار کرنے پر تیار کیا جا سکتا ہے۔

اتنا احساس تو ضرور تھا کہ اہل مکہ کے عقائد غلط اور زندگی سے متعلق ان کے گھڑے ہوئے اصول

وضوابط کی بنیاد درست نہیں ہے، آپ کو ان کی اصلاح کی فکر بھی تھی لیکن یہ کیونکر اور کیسے ہوگا اس سے آپ نا آشنا تھے۔ تب اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کا سلسلہ شروع کر کے اس کی طرف واضح رہنمائی فرمائی اور طریقۂ کار بتلایا، جیسا کہ سیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام اور دی گئی ترتیب کے مطابق اپنی دعوت کو آگے بڑھا رہے تھے، حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھویؒ اظہارِ دعوت کے حکم سے متعلق لکھتے ہیں:

وفیھا وقیل بعد مضی ثلث سنین من البعثة ودخول السنة الرابعة امر اللہ عزوجل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باظھار دعوة الاسلام وانزل فی ذلک قولہ ﴿فَاصۡدَعۡ بِمَاتُؤۡمَرُ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ﴾۔ (بذل القوة ص ۱۲)

''تیسرے سال میں اور بعض کے نزدیک تین سال گزرنے کے بعد اور چوتھے سال کے شروع ہونے کے ساتھ اللہ عزوجل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت اسلام کے اظہار کا حکم دیا اور اس بارے میں یہ آیت نازل فرمائی ''جس چیز کا آپ کو حکم دیا گیا ہے آپ اس کا اظہار کر دیجئے اور مشرکین سے اعراض اور درگذر کیجئے۔''

اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے قبائل کو دعوت دینے کا حکم دیا تو آپ اس پر عمل پیرا ہوئے۔ ابن عباسؓ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں:

لما امر اللہ تبارک وتعالیٰ رسولہ ان یعرض نفسہ علیٰ قبائل العرب خرج وانا معہ وابوبکر رضی اللہ عنہ ۔(دلائل النبوة ج ۲ ص ۴۲۲، ۴۲۳)

''جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قبائل عرب کو دعوت دینے کا حکم دیا تو آپ مجھے اور ابوبکر کو ساتھ لے کر گئے۔''

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکمِ الٰہی کے مطابق دعوت کا کام انجام دے رہے تھے اور ہر موقع پر آپ کی رہنمائی کی جا رہی تھی۔

الحاصل اسلامی معاشرے کی تشکیل اور اسلام کے ضابطۂ حیات کے احیا اور نفاذ کے لئے جدوجہد کرنے والوں پر یہ لازم ہے کہ وہ اسی منزل من اللہ منہج اور طریقۂ کار کو اختیار کریں اور اس سے ہٹ کر اغیار کے طریقوں اور باطل راستوں کی طرف ہرگز التفات نہ کریں۔

اغیار کے طریقوں کو چھوڑنا لازم ہے

آج مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو زوال و پستی سے نکالنے اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے جدوجہد کرنے والی بیشتر جماعتیں، تنظیمیں اور تحریکیں امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور سیرت کو چھوڑ کر اغیار کے طریقوں کو اپنائے ہوئی ہیں اور یہی ان کی ناکامی کی سب سے بڑی اور بنیادی وجہ ہے، حالانکہ قران وسنت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور طریقۂ کار کو اپنانے کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔ امام بخاری روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا:

کیف تسألون اھل الکتاب عن شیءٍ و کتابکم الذی انزل علیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احدث تقرؤنہ محضاً لم یُشب وقد حدّثکم انّ اھل الکتاب بدلّوا کتاب اللہ وغیروہ وکتبوا بایدیھم الکتاب وقالوا ھو من عند اللہ لیشتروا بہ ثمناً قلیلاً. اَلا ینھاکم ماجاء کم من العلم عن مسألتھم لا واللہ مارأینا منھم رجلاً یسألکم عن الذی انزل علیکم. (صحیح البخاری کتاب الاعتصام بالکتاب والسنہ باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لاتسألوا اھل الکتاب. ایضاً کتاب الشھادات)

''تم اہل کتاب سے مسائل کیسے پوچھتے ہو، حالانکہ تمہارے پاس تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب جو کہ نئی ہے موجود ہے جسے تم پڑھتے ہو اس کے باوجود کہ وہ تمہیں بیان کرتی ہے کہ اہل کتاب نے کتاب اللہ میں تبدیلی اور تغیر کر لیا تھا اور اپنے ہاتھوں سے لکھ کر کہتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تاکہ وہ اس کے ذریعے تھوڑی سی رقم حاصل کر لیں۔ کیا تمہارے پاس جو علم آ چکا ہے اس نے تمہیں اس سے مسائل پوچھنے سے منع نہیں کیا، اللہ کی قسم! میں نے ان میں سے ایک آدمی کو بھی تمہارے اوپر نازل ہونے والی (کتاب) کے بارے میں پوچھتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

مقصد یہ ہے کہ جب کتاب اللہ موجود ہے تو ہمیں اغیار کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں خصوصاً جب ان کے علوم غیر معتبر اور تحریف شدہ ہوں تو پھر تو ان کی طرف التفات بھی نہ کرنا چاہئے، چہ جائیکہ ان سے مسائل پوچھے جائیں۔ اسی طرح اسلامی نظام کے نفاذ اور خلافت کے احیاء کے لیے قرآن وسنت کو ہی اختیار کرنا ہوگا اور اغیار کے وضع کردہ طریقوں کو ترک کرنا ہوگا، کیونکہ وہ باطل ہیں اور ان کے ذریعے اسلامی نظام کے نفاذ کا مقدس مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ اب تک کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔

فصل چهارم:

ترتیب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ سے ایک اہم اور بنیادی اصول یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ جاہلی معاشرے میں انقلاب برپا کر کے جو تبدیلی لائے اور باطل ادیان کی جگہ دینِ اسلام کے غلبہ کے لئے جو جدوجہد کی وہ باقاعدہ ترتیب کے ساتھ تھی، بالفاظ دیگر آپ نے باقاعدہ انقلابی تحریک کے انداز میں کام کیا، آپ نے بلا ترتیب اور "کیف ما اتفق" کے طور پر دعوتی کام نہیں کیا بلکہ ایک مرتب اور منظم منصوبہ بندی کے ساتھ اپنی جدوجہد کو آگے بڑھایا، اور آپ اور آپ کے اصحاب کرام کئی مراحل سے گزرنے کے بعد غلبۂ اسلام کا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس اصول کی وضاحت کے لیے ذیل میں چند امور پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) ترتیبِ دعوت

امام ابن القیم الجوزیہ نے "فصل في ترتيب الدعوة" کا عنوان قائم کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مراتب اور درجات کو بیان کیا ہے، فرماتے ہیں:

ولها مراتب، المرتبة الأولى النبوة الثانية إنذار عشيرته الأقربين. الثالثة إنذار قومه. الرابعة إنذار قوم ما أتاهم من نذير من قبله وهم العرب قاطبة. الخامسة إنذار جميع من بلغته دعوته من الجن والإنس إلى آخر الدهر (زاد المعاد ج ۱ ص ۲۷)

"اس دعوت کے چند درجات ہیں، پہلا درجہ نبوت (بعثت) ہے۔ دوسرا درجہ قریبی رشتہ داروں کو ڈرانا ہے۔ تیسرا درجہ اپنی قوم کو ڈرانا ہے۔ چوتھا درجہ ایسی قوم کو ڈرانا ہے جس کے پاس آپ سے پہلے (ایک طویل عرصے تک) کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا اور وہ جمیع (قبائلِ) عرب ہیں اور پانچواں درجہ آخر زمانے تک آنے والے تمام جن وانس جن تک آپ کی دعوت پہنچے کو ڈرانا ہے۔"

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ آپ کی جدوجہد یا تحریک کے کئی مراحل تھے، ان مراحل سے گزر کر آپ اور آپ کے رفقاء کرامؓ مقصد رسالت اظہار دین" کے حصول میں کامیاب ہوئے۔ دعوت

کے ابتدائی مراحل سے متعلق امام ابن القیم الجوزیہ لکھتے ہیں:

اقام بعد ذلک ثلاث سنین یدعو الی اللہ سبحانہ مستخفیاً ثم نزل علیہ فاصدع بما تؤمرو اعرض عن المشرکین (الحجر: ۹۴) فاعلن بالدعوۃ وجاھر قومہ بالعدواۃ واشتد الاذی علیہ وعلی المسلمین حتیٰ اذن اللہ لھم بالھجرتین

(زاد المعاد ج ۱ ص ۸۶)

''بعثت کے بعد آپ تین سال تک مخفی دعوت دیتے رہے، پھر آپ پر یہ آیت نازل ہوئی ''جس چیز کا آپ کو حکم دیا گیا ہے آپ اس کا اظہار کر دیجئے اور مشرکین سے اعراض اور درگذر کیجئے'' تو آپ نے اعلانیہ دعوت شروع کی چنانچہ آپ کی قوم نے کھلم کھلا آپ کے ساتھ عداوت کا اظہار کیا، آپ کو اور مسلمانوں کو سخت تکالیف پہنچیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دونوں ہجرتوں (پہلی اور دوسری ہجرتِ حبشہ) کی اجازت دی۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کو مخفی رکھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اظہار کا حکم دیا بعثت سے لے کر اظہار تک تین سال کا عرصہ ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ.

(الشعراء: ۲۱۴، ۲۱۶)

''اور ڈر سنادے اپنے قریبی رشتہ داروں کو، اور اپنے بازو نیچے رکھ اُن کے واسطے جو تیرے ساتھ ہیں ایمان والے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قریبی رشتہ داروں سے کھلم کھلا دعوت کی ابتداء کرنے کا حکم دیا، علامہ آلوسی اس آیت کی تفسیر میں اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وجہ تخصیص عشیرتہ صلی اللہ علیہ وسلم الاقربین بالذکر مع عموم رسالتہ علیہ الصلوٰۃ والسلام دفع توھم المحاباۃ وانّ الاھتمام بشأنھم اھمّ وانّ البداءۃ تکون بمن یلی ثم من بعدہ کما قال سبحانہ ''قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَکُمْ مِّنَ الْکُفَّارِ''

(روح المعانی جزء ۱۹، ص ۱۳۵)

''(اس آیت میں) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمومی رسالت کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی خاندان کو مخصوص کرنے کی وجہ انہیں مخصوص کرنے کے وہم کو دور کرنا اور یہ کہ ان کا اہتمامِ

شان زیادہ اہم ہے، اور یہ کہ اس کی ابتدا قریبی لوگوں سے ہو پھر اس کے بعد دوسروں کو دعوت دی جائے، جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں ''کفار میں سے قریبی لوگوں سے قتال کیجئے۔''

علامہ آلوسی کی مذکورہ تفسیر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ دعوت اگرچہ پوری انسانیت کے لئے عام ہے مگر خصوصی طور پر اس کی ابتداً اپنے قریبی اور دوست واحباب سے ہی کی جائے گی، پھر بتدریج دوسرے لوگوں تک اسے وسعت دی جائے گی جیسا کہ جہاد کا حکم ہوا کہ پہلے قریبی کفار سے ابتداء کی جائے، پھر آگے بڑھا جائے۔

امام ابن القیم دعوت کے مراتب بیان کرنے کے بعد ایک مستقل فصل کے تحت بعثت سے لے کر وفات تک آپ کی دعوت کے مراحل ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

أوّل ما أوحى إليه ربّه تبارک و تعالى: أن يقرأ باسم ربّه الّذي خلق و ذلک أول نبوته فأمره أن يقرأ في نفسه ولم يأمره إذ ذاک بتبليغ ثم أنزل عليه "يا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ" (المدثر: ١، ٢) فنبأه بقوله "اِقْرَأْ" وأرسله ب "ياء يُّهَا الْمُدَّثِّرُ" ثم أمره أن ينذر عشيرته الأقربين ثم أنذر قومه ثم أنذر من حولهم من العرب، ثم أنذر العرب قاطبة ثم أنذر العالمين فأقام بضع عشرة سنة بعد نبوته ينذر بالدعوة بغير قتال ولا جزية ويؤمر بالكف والصبر والصفح. ثم أذن له في الهجرة وأذن له في القتال ثم أمره أن يقاتل من قاتله ويكف عمن اعتزله ولم يقاتله ثم أمره بقتال المشركين حتى يكون الدّين كلّه لله (زاد المعاد ج ٢ ص ١١٣، ١١٤)

''اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کی طرف جو پہلی وحی بھیجی وہ یہ تھی کہ'' آپ اپنے اس رب کے نام سے پڑھیں جس نے (تمام مخلوقات کو) پیدا کیا ہے' اور یہ آپ کی نبوت کی شروعات تھی پس آپ کو حکم دیا کہ خود پڑھیں اور اس کی تبلیغ کا حکم نہیں دیا، پھر آپ پر "یاَ یُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ" (المدثر: ۱، ۲) نازل ہوئی، پس آپ کو ''اقرأ'' کے ذریعے نبی بنایا گیا اور یاَ یُّھَا الْمُدَّثِّرُ کے ذریعے رسول۔ پھر آپ کو اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرانے کا حکم دیا گیا، تو آپ نے اپنی قوم کو ڈرایا، پھر ان کے قریب کے عربوں کو، پھر تمام عرب کو، پھر تمام جہان والوں کو۔ آپ نے نبوت کے بعد مکہ میں قیام کے دوران دس سال تک بغیر قتال اور جزیے کے دعوت کے ذریعے ڈرایا اور (لڑائی سے) ہاتھ روکے رکھنے، (ظلم وستم پر) صبر کرنے اور درگذر کرنے کا حکم دیا گیا۔ پھر ہجرت کی اجازت دی گئی، اس کے بعد قتال کی اجازت

دی گئی، پھر حکم ہوا کہ قتال کرنے والوں سے قتال کیا جائے اور جو لڑائی نہ کریں ان سے لڑائی نہ کی جائے، اس کے بعد جمیع مشرکین سے (ابتداً) قتال کرنے کا حکم دیا گیا یہاں تک کہ دین سارے کا سارا صرف اللہ کا ہو جائے۔''

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک با قاعدہ ترتیب کے ساتھ کام کیا اور اپنے مشن کو آگے بڑھایا، آپ نے نہ تو پہلے ہی دن پوری قوم کو دعوتِ توحید دی اور دین اسلام کی طرف بلایا اور نہ بالکل ابتدائی زمانے میں قتال اور جہاد کا حکم دیا بلکہ پہلے نبوت پھر رسالت عطا ہوئی تو قریبی احباب سے دعوت شروع کی پھر خاندان، پھر قومِ قریش پھر دیگر اقوامِ عرب کو دعوت دی۔ اس دوران آپ اور آپ کے اصحابِ کرامؓ نے مشرکین کی طرف سے شدید تکالیف اور مصائب اٹھائے تو انہیں صبر وتحمل، ثابت قدمی اور عفو درگذر کی بار بار تاکید کی گئی، جبر وتشدد برداشت کیا گیا لیکن نہ تو اس کا اس جیسا ردِعمل دکھایا گیا اور نہ قتال اور لڑائی کی اجازت دی گئی حالانکہ مشرکین مکہ کے ظلم وستم کا نشانہ بننے والے صحابہ کرام آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرکین کا مقابلہ کرنے کے لئے قتال کی اجازت مانگتے تھے لیکن آپ نے انہیں اس کی اجازت نہ دی کیونکہ اس وقت اس کے لئے حالات سازگار نہ تھے، اور اس وقت آپ کے پاس نہ تو افرادی قوت زیادہ تھی نہ جنگی ساز وسامان زیادہ حاصل تھا، نیز نہ کوئی ایسا محفوظ مقام یا ٹھکانہ تھا جو آپ کے دفاع کا کام دے سکے جیسا کہ آئندہ سطور میں اس کی تفصیل آئے گی۔ انشاء اللہ

(۲) ترتیبِ جہاد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں دعوت ایک ترتیب کے ساتھ چلائی وہاں جب قتال کا حکم دیا گیا تو اسے بھی ایک ترتیب کے ساتھ بتدریج آگے بڑھایا۔ علامہ حلبی اس کا خلاصہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

فعلم أن القتال كان قبل الهجرة وبعد ها الى صفر من السنة الثانية محرّ ما لانه كان فى ذلك مأمورا بالتبليغ و كان انذارابلا قتال لانه نهى عنه فى نيف وسبعين آية ثم صار مأ ذونا له فيه أى أبيح قتال من قاتل ثم أبيح قتال من لم يبدأ به فى غير الاشهر الحرم ثم أمر به مطلقا أى لمن قاتل ومن لم يقاتل فى كل زمن أى فى الاشهر الحرم وغيرها .(السيرة الحلبية ج ا ص ا ا ۵)

''پس معلوم ہوا کہ ہجرت سے پہلے اور اس کے بعد دوسرے سال ماہِ صفر تک قتال حرام تھا، اس لیے کہ آپ کو اس وقت تبلیغ کا حکم دیا گیا تھا اور یہ انذار (خبردار کرنا) قتال کے بغیر تھا، اس لئے کہ ستر سے زائد آیات میں اس کے بارے میں نہی وارد ہوئی تھی، پھر اجازت دے دی گئی یعنی جو قتال کی ابتداء کرے (حملہ آور ہو) اس سے قتال کرنا مباح قرار دیا گیا، پھر جو ابتداء نہ بھی کرے (حملہ آور نہ بھی ہو) اس سے اشہرحرم کے علاوہ باقی ایام میں قتال مباح قرار دیا گیا، پھر اس کا مطلق حکم دیا گیا چاہے کوئی حملہ آور ہو یا نہ ہو، ہر زمانے میں چاہے وہ اشہرحرم ہوں یا نہ ہوں''۔

یعنی جہاد کے حکم کو رفتہ رفتہ آگے بڑھایا گیا، جیسے جیسے اہلِ اسلام کی قوت بڑھتی گئی ویسے ویسے اگلا حکم آتا گیا، مکی زندگی میں تعلیم وتربیت کا مرحلہ تھا اور جنگی طاقت بھی حاصل نہ تھی تو قتال حرام تھا، مدینہ ہجرت کرنے کے بعد اس کی راہ ہموار ہوئی تو ابتدائی طور پر جائز قرار دیا گیا، یہاں تک کہ وہ مرحلہ بھی آیا جب حملہ نہ کرنے والے کفار سے بھی جہاد کرنے کا حکم دیا گیا۔

الحاصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت وجہاد کو باقاعدہ ترتیب اور منصوبہ بندی کے ساتھ آگے بڑھایا، لہٰذا غلبۂ دین کے لیے جدوجہد کرنے والوں پر لازم ہے کہ وہ آپ کے اس نمونہ کو پیش نظر رکھیں اور اپنی دعوت وتحریک کو باقاعدہ ترتیب اور منصوبہ بندی کے ساتھ آگے بڑھائیں، بغیر ترتیب اور منصوبہ بندی کے نہ تو دعوت وتحریک کو صحیح طریقے سے آگے بڑھایا جا سکتا ہے اور نہ منزل کے حصول میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

فصل پنجم:

تنظیم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو منہج اختیار کیا تھا، اس کا ایک اہم اور بنیادی اصول یہ ہے کہ آپ نے با قاعدہ نظم اور جماعت تشکیل دے کر اپنی جدوجہد کو آگے بڑھایا اور پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ تنظیم سے مراد موجودہ دور میں ایک مخصوص طرز اور انداز میں بننے والی تنظیمیں نہیں بلکہ اس سے مراد ''ایک فکر اور نظریہ رکھنے والے افراد کو آپس میں جوڑنا اور انہیں ایک نظم میں پرونا، اس طرح کہ ان کا ایک امیر اور ذمہ دار ہو جس کی بات سنی جاتی اور اس کی اطاعت کی جاتی ہو اور امیر اپنے رفقا کی مشاورت سے دعوت و تحریک کے امور طے کرتا ہو۔'' اسے اسلام کی اصطلاح میں ''الجماعۃ'' اور ''امت'' کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دعوت قبول کرنے والے افراد کا تعلق مختلف طبقات سے ہوتا ہے اور ان کے درمیان خاندانی اور مالی حیثیت میں تفاوت ہوتا ہے، اس لئے قائدِ دعوت پر یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ ایسے اقدامات کرے جن کے ذریعے وہ ایک دوسرے کے قریب ہوں، ان میں اخوت و بھائی چارہ قائم ہو اور وہ ایک دوسرے کا سہارا بن کر اجتماعی امور کو بطریقِ احسن انجام دے سکیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا سلسلہ شروع کیا تو جیسے جیسے لوگ آپ کی دعوت قبول کرتے گئے آپ انہیں با قاعدہ ایک نظم میں جوڑتے گئے جس کی مختلف صورتیں یا شکلیں تھیں۔

(۱) کمزوروں کو مخیّر حضرات کے ساتھ جوڑنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعوت قبول کرنے والے بے وسائل اور مالی طور پر کمزور افراد کو مخیّر حضرات کے ساتھ ملا دیتے تھے، جس کا طریقہ کار اس طرح تھا، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

قد كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا اسلم الرجل والرجلان ممن لاشئ لهٗ ضمّهما رسول الله صلى الله عليه وسلم الى الرجل الذى فى يده السعة فينا لا من فضل طعامه. (دلائل النبوة ج ۲، ۲۱۶، عيون الاثر فى فنون المغازى والشمائل والسير ج ۱ ص ۲۱۶)

''ایسے افراد جن کے پاس (کھانے پینے کو) کچھ نہ ہوتا تھا جب ان میں ایک یا دو مسلمان ہو جاتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کی یہ ترتیب تھی کہ) انہیں مالی طور پر وسعت رکھنے والے آدمی کے ساتھ جوڑ دیتے تھے، تو وہ دونوں اس کے پاس کھانا کھاتے تھے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اقدام کے نتیجے میں تین بڑے فوائد یہ حاصل ہوئے:

(ا) ایک یہ کہ نومسلم کو سماجی تحفظ مل جاتا اور وہ مشرکین مکہ کے ظلم وستم سے ایک حدتک محفوظ ہوجاتا۔ (ب) دوسرا یہ کہ اس کا معاشی مسئلہ بھی حل ہوجاتا اورکھانے پینے کابندوبست ہوجاتا تھا۔ (ج) تیسرا یہ کہ مخیر حضرات میں انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔

(۲) مواخاۃ

مکہ میں قیام کے زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے درمیان نظم وضبط پیدا کرنے اورانہیں آپس میں جوڑنے کے لئے مواخات یعنی بھائی چارہ قائم فرمایا۔ اسی طرح جب آپ اورآپ کے اصحاب نے بے سروسامانی کی حالت میں مدینہ ہجرت کی تو بھی مہاجرین اورانصار کے درمیان مواخاۃ قائم فرمائی۔ چنانچہ اس موقع پرآپ نے مہاجرین وانصار کومخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

تأخوا فی الله اخوین اخوین (السیرۃ لا بن هشام ج ۲، ص ۱۱٦)

''اللہ کے لئے دودوآدمی آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے درمیان جواخوۃ قائم کی، انہوں نے اس کودل وجان سے قبول کیا اوراخوت اور بھائی چارے کی لازوال مثالیں قائم کیں، اس کا اندازہ درج ذیل واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔

قدم عبدالرحمن بن عوف المدینة فآخی النبی صلی الله علیه وسلم بینه و بین سعد بن الربیع الانصاری فعرض علیه ان یناصفه اهله وماله فقال عبدالرحمن بارک الله لک فی اهلک و مالک دُلنی علی السوق.

(صحیح البخاری کتاب المناقب باب کیف آخی النبی ﷺ)

''عبدالرحمٰن بن عوف مدینہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اور سعد بن الربیع انصاری کے درمیان مواخات قائم کی تو سعد نے انہیں پیشکش کی کہ وہ ان کی بیویوں اور مال میں سے نصف نصف لے لیں، عبدالرحمٰن نے جواب دیا ''اللہ تعالیٰ آپ کے اہل وعیال اور مال میں برکت عطا

فرمائے، آپ مجھے بازار کا راستہ بتادیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اقدام کے نتیجے میں مکی دور میں مسلمان ہونے والے تمام افراد آپس میں بھائی بھائی بن گئے، اسی طرح مدنی دور میں بھی خاندان، قبیلے، قوم اور علاقے کی تفریق مٹ گئی اور تمام مسلمان ایک دوسرے کو حقیقی رشتہ داروں سے زیادہ محبوب رکھتے تھے بلکہ جن مہاجرین وانصار کے درمیان مواخاۃ قائم ہوئی اللہ تعالیٰ نے ایک محدود عرصے تک انہیں ایک دوسرے کا وارث تک قرار دے دیا تھا۔ الغرض اسلام قبول کرنے والے کا تعلق چاہے کسی خاندان، قبیلے، قوم، علاقے اور زبان سے تھا، وہ ایک عقیدے اور نظریے کے تحت ایک نظم میں جڑ چکے تھے اور ان کے اس نظم اور جماعت کی علیحدہ شناخت قائم ہو چکی تھی۔

(۳) حزب اللہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام نے ایک نظم اور جماعت کی شکل اختیار کرلی، چنانچہ جب صحابہ کرامؓ پر مشرکینِ مکہ کی طرف سے ظلم وستم بڑھ گیا اور آپ نے انہیں حبشہ ہجرت کر جانے کی اجازت دی تو وہ باقاعدہ جماعت کی شکل میں وہاں گئے، جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ مہاجرین کا ایک امیر بھی مقرر کیا گیا تھا، چنانچہ علامہ حلبی لکھتے ہیں:

و کان امیراً علیهم (السیرة الحلبیة ج ۱، ص ۳۰۹)

''وہ (عثمان بن مظعونؓ) ان کے امیر تھے۔''

اسی ہجرت کے بعد جب حضرت جعفر اور ان کے رفقاء شاہ حبشہ نجاشی کے دربار میں بلائے گئے تو حضرت جعفر دوسرے حضرات کے ساتھ شاہ حبشہ سے ملاقات کیلئے شاہی محل پہنچے۔ مہاجرین کے وفد کی قیادت حضرت جعفر بن ابی طالب کر رہے تھے، جب انہوں نے شاہ حبشہ کے دربار میں داخلے کا ارادہ کیا تو آواز لگائی:

جعفر بالباب یستاذن ومعه حزب الله .(السیرة الحلبیة ج ۱، ص ۳۲۲ ایضازاد المعاد ج ۲ ص ۶۴)

''جعفر داخل ہونے کی اجازت چاہتا ہے اور اس کے ساتھ حزب اللہ (اللہ کی جماعت) موجود ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ نظم اور جماعت کے بغیر ایک معمولی کام بھی بہتر طور پر انجام نہیں دیا جاسکتا چہ

جائیکہ معاشرے میں تبدیلی اور انقلاب لایا جائے۔ معاشرے میں جوہری تبدیلی ،انقلاب اور ایک صالح نظامِ حیات کے نفاذ کے لئے تنظیم اور جماعت کی تشکیل ناگزیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک جتنے بھی انقلابی گزرے ہیں انہوں نے ایک تنظیم ، جماعت اور پارٹی تشکیل دی اور اس کے ذریعے انقلاب اور اپنے افکار ونظریات پر مبنی نظام کے نفاذ کے لئے جدوجہد کر کے اس میں کامیابی حاصل کی۔ اسی طرح انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام نے دعوت کے ذریعے اپنے گرد افراد اکھٹے کئے اور انہی اصحاب کو ساتھ لے کر اپنی دعوت کو پروان چڑھایا اور انہی کے ایثار ،قربانیوں اور جہاد کی بدولت دنیا میں غالب آئے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے خیر ،امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو سرانجام دینے کے لئے امت میں سے ایک جماعت کے قیام کو فرض قرار دیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (آل عمران ۱۰۴)

''اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک ایسی جماعت جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کرے برائی سے اور وہی پہنچے اپنی مراد کو۔''

فصل ششم:

اقدام سے پہلے تیاری

امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپ کے اختیار کردہ منہج کا ایک بنیادی اور اہم اصول یہ ہے کہ جاہلی معاشرے اور باطل نظام کے خلاف حتمی اور فیصلہ کن اقدام سے پہلے اس کے لئے تیاری کرنا ناگزیر ہے، لہٰذا جب تک مطلوبہ تیاری مکمل نہیں ہوتی اقدام نہ کیا جائے بلکہ اس سے پہلے کے مراحل کو طے کیا جائے اور آخری مرحلے کے لئے خوب تیاری کی جائے تاکہ جب اقدام کرتے ہوئے فرسودہ و باطل نظام پر چوٹ لگائی جائے اور اسے منہدم کرنے کی کوشش کی جائے تو اس میں کامیابی ملے، ناکامی کا سامنا نہ کرنا پڑے کیونکہ کامیابی حاصل نہ ہونے کی صورت میں انقلابی تحریک اور اربابِ تحریک کو بے شمار نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کا خمیازہ بعض اوقات صدیوں تک بھگتنا پڑتا ہے۔

اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائی مراحل میں ہی جاہلی معاشرے اور باطل نظامِ حیات کے خلاف فیصلہ کن اقدام یعنی جہاد اور قتال کا راستہ اختیار نہیں کیا بلکہ مشرکین کی طرف سے آپ اور آپ کے اصحابؓ کے خلاف جبر و تشدد روا رکھے جانے کے باوجود آپ نے خود بھی صبر و تحمل اور عفو درگزر کا مظاہرہ کیا اور اپنے اصحاب کو بھی اس کی بار بار تاکید کی حتی کہ بعض حضرات کو شہید کر دیا گیا، آپ کو قتل کرنے کے کئی بار منصوبے بنائے گئے، صحابہ کرامؓ کو مشرکین کے ظلم و ستم کی وجہ سے حبشہ کی طرف دو دفعہ ہجرت کرنا پڑی، تین سال تک آپؐ کے اصحابؓ اور خاندانِ ہاشم کے تمام گھرانے شعب ابی طالب میں محصور رہے۔ وہاں بھوک، فاقے اور دیگر مصائب اٹھائے، شعب ابی طالب سے نکلنے کے بعد دعوت کے لئے طائف تشریف لئے گئے تو وہاں یہ دردناک اور تاریخی المیہ بھی پیش آیا کہ اہل طائف نے پتھروں کی بارش کر کے آپ کو خون میں لت پت کر دیا لیکن آپ نے قتال، لڑائی اور مزاحمت کی راہ اختیار کی اور نہ صحابہ کرامؓ کو اس کی اجازت دی بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت اسے ٹالتے رہے لیکن جب آپ اور آپ کے اصحاب انصار کی دعوت پر مدینہ ہجرت کر گئے اور وہاں آپ کو ایک حد تک استحکام حاصل ہوا تو باقاعدہ طور پر جہاد کی اجازت ملی تو ظلم و ستم روا رکھنے

والے اور اسلام کی اشاعت اور غلبے میں رکاوٹ بننے والوں کے خلاف قتال شروع کر دیا گیا۔

مذکورہ اصول کی وضاحت کے لئے ہم چند امور پیش کرتے ہیں:

(۱) قتال سے پہلے تیاری

مکہ میں قیام کے دوران جب دعوت میں کچھ پیش رفت ہوگئی اور متعدد افراد اسلام قبول کر چکے تو صحابہ کرامؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعوت کے کھلم کھلا اظہار کے لئے اصرار کرتے تھے لیکن آپ اس پر تیار نہ ہوتے۔ سیدنا ابوبکرؓ کے بارے میں مروی ہے:

لما اجتمع أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم و کانوا ثمانیة وثلاثین رجلا ألحَّ أبوبکر علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الظهور فقال یاأبوبکر إنا قلیل(دلائل النبوة ج ۲ ص)

''جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اکٹھے ہوئے جن کی تعداد اڑتیس تھی تو ابوبکرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ظاہر ہونے (بطور جماعت نکل کر کھلم کھلا دعوت دینے) پر اصرار کیا تو آپ نے فرمایا۔ اے ابوبکر! اس وقت ہم تھوڑے ہیں۔''

اسی طرح جب سیدنا عمرؓ نے اسلام قبول کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

یا رسول اللہ علامَ نُخفی دیننا ونحن علی الحق، ویظهر دینهم وهم علی الباطل؟

''اے اللہ کے رسول! ہم اپنے دین کو کیوں چھپائے رکھیں حالانکہ ہم حق پر ہیں اور وہ (مشرکین) کیوں اپنے دین کا کھلم کھلا اظہار کرتے رہیں حالانکہ وہ باطل پر ہیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جواب دیتے ہوئے فرمایا:

یاعمر إنا قلیل قد رأیت ما لقینا. (السیرة لابن کثیر ج ۱، ص ۴۴۱، ۴۴۰)

''اے عمر! ہم اس وقت تھوڑے لوگ ہیں اور جو تکالیف ہمیں پہنچی ہیں آپ انہیں جانتے تو ہیں۔''

اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ دعوت وتحریک کا ابتدائی مرحلہ ایسا ہوتا ہے جس میں ارکان کی تعداد انتہائی کم ہوتی ہے اوران کے پاس مخالف طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اسباب ووسائل بھی نہیں ہوتے اس لیے تصادم سے گریز کرتے ہوئے دعوت وتحریک کو آگے بڑھایا جاتا اور اقدام کی تیاری کی جاتی ہے۔

﴿وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾

''اور یاد کرو جس وقت تم تھوڑے تھے مغلوب پڑے ہوئے مُلک میں ڈرتے تھے کہ اُچک لیں تم کو لوگ پھر اُس نے تم کو ٹھکانا دیا اور قوت دی تم کو اپنی مدد سے اور روزی دی تم کو ستھری چیزیں تا کہ تم شکر کرو۔''

علامہ حلبی لکھتے ہیں کہ مکہ کے زمانے میں صحابہ کرام مار کھا کر اور زخمی ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ انہیں فرماتے ''صبر اختیار کرو، مجھے (فی الحال) قتال کا حکم نہیں دیا گیا۔'' قتال کی اجازت نہ دینے کی وجہ یہ تھی:

لأنهم كانوا بمكة شرذمةقليلة، ثم لما استقر امره صلى الله عليه وسلم أى بعد الهجرة وكثرت أتباعه وشاء نهم أن يقدموا محبته على محبة أبائهم وأبنائهم وأزواجهم واصرّ المشركون على الكفر والتكذيب أذن الله تعالى لنبيه ﷺ أى ولأصحابه فى القتال. (السيرة الحلبية ج ١، ص ١٠٥)

''یہ اس لئے کہ یہ حضرات اس وقت مکہ میں کمزور اور قلیل تعداد میں تھے، پھر جب مدینہ میں ہجرت کے بعد آپ کے پاؤں جم گئے اور آپ کی اتباع کرنے والوں کی کثرت ہوگئی جن کی کیفیت یہ تھی کہ وہ آپ کی محبت کو اپنے والدین، اولاد اور بیویوں کی محبت پر ترجیح دیتے تھے، مشرکین کفر اور تکذیب پر مصر رہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور ان کے اصحاب کو قتال کی اجازت دی''۔

ابن القیم لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے کہا کہ قتال کی اجازت مکی دور میں دی گئی۔ وہ اس کو غلط قرار دے کر دلائل دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

هذاغلط لوجوه احدهما ان الله تعالى لم يأذن بمكة لهم فى القتال ولا كان لهم شوكة يتمكنون بها من القتال بمكة. (زادالمعاد جزء ٢ ص ٨٢)

یہ کئی وجوہ سے غلط ہے ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مکہ میں جہاد کی اجازت نہیں دی کیونکہ انہیں اتنی قوت حاصل نہ تھی جس کے بل پر وہ اہلِ مکہ سے قتال کر سکتے۔''

چونکہ مکی دور میں قتال کی اجازت دینا موزوں نہ تھا اس لیے نہیں دی گئی۔ پھر جب اس کے لیے مناسب وقت آ گیا تو اجازت دے دی گئی جیسا کہ امام ابن کثیر لکھتے ہیں:

وانما شرع الله تعالیٰ الجهاد فی الوقت الالیق به لانهم لما كانوا بمكة كان المشركون اكثر عدداً(تفسیر ابن كثير، سورة الحج)

''اللہ تعالیٰ نے جہاد کو اس کے مناسب وقت میں شروع کیا، اس لئے کہ مسلمان جب مکہ میں تھے تو مشرکین کی اکثریت تھی۔''

الغرض انقلاب برپا کر کے اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے مخالف قوتوں سے تصادم اور ٹکراؤ کے لیے مناسب وقت کا انتظار اور اس وقت تک اس کے لیے بھرپور تیاری ناگزیر ہے۔ مخالف قوتوں کے ظلم وستم سے تنگ آ کر تیاری سے پہلے اقدام کرنا مفید نہیں بلکہ انتہائی نقصان دہ ہے۔

(۲) ''حکومت کی مدد'' عطا کرنے کی درخواست

مشرکینِ مکہ کے ظلم وستم کا نشانہ بننے والے صحابہ کرامؓ تو مدینہ سے پہلے دوبار حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے اور وہاں امن وامان سے رہ رہے تھے، اسی طرح عقبۂ ثانیہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مدینہ ہجرت کر جانے والے صحابہ کرامؓ بھی امن وامان سے رہ رہے تھے، بلکہ انصار ان سے مکمل تعاون کر رہے تھے اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت کی تو آپ کا بنفسہٖ ہجرت کرنے کا سبب کیا تھا؟ اس کی وضاحت درج ذیل آیت، اس کی تشریح اور اس کے بارے میں مروی احادیث سے ہوتی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِن لَّدُنْکَ سُلْطَاناً نَصِیْراً. (الاسراء: ۸۰)

''اور کہہ اے رب داخل کر مجھ کو سچا داخل کرنا اور نکال مجھ کو سچا نکالنا اور عطا کر دے مجھ کو اپنے پاس سے حکومت کی مدد۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

مذکورہ بالا آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو دعا سکھلائی گئی ہے، اس سے متعلق امام ابن کثیر لکھتے ہیں:

ارشده الله والهمه ان يدعو بهذا الدعاء ان يجعل لهٗ مما هو فيه فرجاً قريباً و مخرجاً عاجلاً فاذن لهٗ تعالى فى الهجرة الىٰ المدينة النبوية حيث الانصار و الاحباب فصارت لهٗ داراً وقراراً واهلهالهٗ انصارًا. (ابن كثير ج۲، ص ۲۲٦)

''اللہ تعالیٰ نے آپ کی رہنمائی کی اور آپ کو الہام کیا کہ آپ ان الفاظ میں اللہ سے دعا کریں کہ

آپ جن مشکل حالات میں گھرے ہوئے ہیں، ان میں جلد فراخی اور ان سے نکلنے کے اسباب پیدا فرمائیں، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دی جہاں آپ کے مددگار اور احباب موجود تھے تو یہ شہر آپ کی محفوظ پناہ گاہ اور ٹھکانے میں بدل گیا اور اس کے رہائشی (اوس و خزرج) آپ کے انصار بن گئے۔''

علامہ زرقانی سلطاناً نصیراً کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قوة تنصرني بها على اعدائك. (شرح الزرقاني ج ۲، ص ۱۰۰)

''ایک ایسی قوت (عطا کیجئے) جس سے آپ اپنے دشمنوں کے خلاف مجھے فتح دیں۔''

امام بیہقیؒ حضرت قتادہؓ سے اس آیت کے بارے میں نقل کرتے ہیں:

فاخرجهُ الله من مكة الى المدينة بالهجرة مخرج صدق وادخله المدينة مدخل صدق قال و نبي الله صلى الله عليه وسلم علم انه لا طاقة لهُ بهذا الامر الا بسلطان فسأل سلطاناً نصيراً لكتاب الله وحدوده وفرائضه ولاقامة كتاب الله فان السلطان عزة من الله جعلها بين اظهر عبادهٗ لو لاذلك لاغار بعضهم على بعض واكل شديدهم ضعيفهم. (دلائل النبوة للبيهقي ج ۲، ص ۵۱۷)

''اللہ تعالیٰ انہیں مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے ذریعے سچائی کے ساتھ نکال لے گئے اور آپ کو مدینہ میں سچائی کے ساتھ داخل کیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ انہیں اس امر (اشاعت و غلبہ اسلام) کی سلطان (حکومت) کے بغیر طاقت نہیں ہے چنانچہ آپ نے اللہ سے کتاب اللہ، اس کے حدود و فرائض اور کتاب اللہ (کے احکام) کے قیام کیلئے سلطان (حکومت) کی درخواست کی، اس لئے کہ سلطان اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایسی شان وشوکت ہے جسے اللہ نے اپنے بندوں کے سامنے قائم کر دی ہے، اگر یہ نہ ہوتی تو لوگ ایک دوسرے کے خلاف غارت گری کرتے اور طاقتور کمزوروں کو کھا جاتے۔''

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یعنی غلبہ اور تسلط عنایت فرما، جس کے ساتھ تیری مدد و نصرت ہو، تا کہ حق کا بول بالا رہے اور معاندین ذلیل و پست ہوں۔ دنیا میں کوئی قانون ہو سماوی یا ارضی اس کے نفاذ کے لئے ایک درجہ میں ضروری ہے کہ حکومت کی مدد ہو۔ جو لوگ دلائل و براہین سننے اور آفتاب کی طرح حق واضح ہو چکنے

کے بعد بھی ضد و عناد پر قائم رہیں۔ان کے ضرر و فساد کو حکومت کی مدد ہی روک سکتی ہے۔''

(تفسیر عثمانی تفسیر سورۃ بنی اسرائیل)

سلطان کی مندرجہ بالا وضاحت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مکہ میں کتاب اللہ کے احکام وحدود کے نفاذ اور اسلامی حکومت کے قیام کی صورت ابھی تک نہ بن پائی تھی بلکہ بے شمار رکاوٹیں تھیں جن کی موجودگی میں فی الحال ایسا ہونا ممکن نہ تھا،اس لئے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بتلائی ہوئی دعا کے ذریعے اس سے وہ طاقت وقوت،اسباب وسائل اور ایسی جگہ عطا کرنے کی درخواست کی جہاں آپ اور آپ کے اصحاب بلا روک ٹوک کتاب اللہ کے احکام اور حکومت الٰہیہ کا نفاذ کرسکیں کیونکہ جب تک طاقت وقوت اور اسباب ووسائل فراہم کر کے کسی شہر اور خطے میں اسلام کے نظام کا عملی نفاذ نہیں ہوتا تب تک مخالفین اور معاندین کی مخالفت اور سازشوں کو روکا جاسکتا ہے نہ اسے مقبول بنایا جاسکتا ہے اور نہ اس کی اشاعت وتوسیع کی جاسکتی ہے۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا کتاب اللہ کے احکام اور حکومتِ الٰہیہ کے نفاذ کے لیے اللہ سے طاقت وقوت اور اسباب وسائل عطا کرنے کی درخواست کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جب تک طاقت وقوت اور اسباب وسائل دستیاب نہ ہوں اور حکومت الٰہیہ کے قیام کے لیے بھرپور تیاری نہ کی ہوتب تک اس کا قیام ممکن ہے اور نہ اقدام اور تصادم مفید ہے،لہٰذا اس کے لیے طاقت وقوت اور اسباب وسائل فراہم کرنا اور بھرپور تیاری کرنا لازم ہے کیونکہ اس کے بغیر حکومت الٰہیہ کے قیام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

(۳) اقدام کا عزم اور تیاری

اللہ تبارک وتعالیٰ غزوہ تبوک میں نہ جانے والوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَلَوْاَرَادُواالْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً . (التوبہ : ۴۶)

اور اگر وہ چاہتے نکلنا ضرور تیار کرتے کچھ سامان اس کا۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

یہ آیت غزوۂ تبوک سے متعلق ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری غزوہ ہے۔چونکہ یہ غزوۂ ایسے موقع پر آیا جب سخت گرمی کا موسم تھا،ادھر مدینہ میں کھجوروں کی فصل پک کر تیار ہو چکی تھی،مخلص مؤمنین تو بلا چون وچرا لشکر میں شامل ہوگئے اور آپ کے ساتھ تیس ہزار جانثاروں کا لشکر روانہ ہوا مگر منافقین کا نفاق اس موقع پر خوب ظاہر ہوا،وہ مختلف حیلے بہانے تراش کر آپ کی خدمت میں آتے

اور غزوہ میں شریک نہ ہونے کی رخصت مانگتے تھے، چنانچہ تمام منافقین اس غزوہ سے پیچھے رہ گئے، انہی سے متعلق اللہ تبارک وتعالیٰ فرمارہے ہیں کہ انہوں نے تو جہاد میں جانے کے لیے سرے سے تیاری ہی نہ کی تھی کیونکہ جانے کا ارادہ نہ تھا، اگرارادہ ہوتا تو ضرور تیاری کرتے۔ ان کا تیاری نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا سرے سے ارادہ ہی نہ تھا۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب کوئی کام انجام دینے کا ارادہ اور عزم ہوتا ہے تو اس کے لیے پہلے تیاری کی جاتی ہے۔ اگر کوئی آدمی تیاری نہ کرے پھر بھی دعویٰ کرے کہ وہ یہ کام کرنا چاہتا ہے تو وہ اپنے دعوے میں سچا نہیں ہے، اسی طرح غلبۂ دین کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے تیاری کرنا ہوگی۔ کسی نظام کو منہدم کرنا اور اس کی جگہ دوسرا نظام نافذ کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے، یہ کام محض خواہش، آرزو، تمنا اور دعاؤں کے ذریعے انجام نہیں دیا جاسکتا، بلکہ اس کے لیے بھرپور تیاری ناگزیر ہے، اس کے بغیر نہ تو اس جدوجہد کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے اور نہ اس سے پہلے اقدام اور تصادم کی راہ اختیار کرنا کارآمد ہے۔ آج امت مسلمہ میں ایک بڑا طبقہ ایسا موجود ہے جو خلافت کے احیاء اور اسلامی نظام کے نفاذ کو ضروری سمجھتا ہے اور اس کی دلی تمنا اور خواہش ہے کہ اسلامی نظام کا نفاذ ہو لیکن وہ اس کو عملی شکل میں لانے کے لیے جدوجہد اور تیاری کررہا ہے اور نہ اسے ضروری سمجھتا ہے۔ حالانکہ یہ امر مسلم ہے کہ کسی چیز کی محض آرزو کرنے سے وہ چیز وجود میں نہیں آجاتی بلکہ اسے وجود میں لانے کے لیے اس سے متعلقہ اسباب اور وسائل اختیار کرنے پڑتے ہیں اور اس کے لیے جدوجہد اور کوشش کرنی پڑتی ہے۔ یہ دنیا دارالاسباب ہے اور معمولی سے معمولی کام کے لیے بھی سبب اختیار کرنا پڑتا ہے تو خلافت کے احیاء اور اسلامی نظام کے نفاذ جیسا عظیم الشان اور غیر معمولی کام بغیر کسی جدوجہد اور تیاری کے انجام پائے گا اور اس کے لیے اسباب ووسائل اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے؟

علماء اصول کے ہاں یہ قاعدہ مسلم ہے کہ **مقدمة الواجب واجبة** (واجب کا مقدمہ اور پیش خیمہ بننے والی چیز بھی واجب ہے) لہٰذا جب خلافت کا احیاء اور اسلامی نظام کا نفاذ کرنا مسلمانوں پر فرض ہے تو اس کے لیے جدوجہد اور تیاری کرنا بھی فرض ہوگی بلکہ فرض ہے۔

افسوس صد افسوس! آج امتِ مسلمہ اتنی واضح بات سمجھنے سے قاصر ہے بلکہ ایک طبقہ تو خلافت کے احیاء جیسے اہم فریضے کی ادائیگی سے جان چھڑانے کے لیے اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہے کہ چونکہ ہمارے پاس وسائل ہیں اور نہ حالات سازگار ہیں اس لیے ہم اس فریضے کی ادائیگی کے مکلف نہیں ہیں، حالانکہ

جب خلافت کا احیاء فرض ہے اور مسلمان اس کے مکلّف ہیں تو وہ اس کی ادائیگی کے لیے مطلوبہ اسباب ووسائل اختیار کرنے اور تیاری کرنے کے بھی مکلّف ہیں، حاصل یہ کہ خلافت کے احیاء اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے تیاری کرنا اور بھرپور جدوجہد فرض ہے جس کی ادائیگی ہر مسلمان پر فرض ہے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انقلاب برپا کیا وہ باقاعدہ ایک منصوبہ بندی، ترتیب اور تنظیم کے ساتھ تھا، بالفاظ دیگر آپ نے ایک باقاعدہ لائحہ عمل کے ساتھ غلبۂ دین کا مقصد حاصل کیا، باطل نظام کے خلاف اقدام سے قبل اس کے لئے تیاری کی گئی، جب تک تیاری نہ ہوئی اور اقدام کے لئے طاقت وقوت اور ظاہری وباطنی اسباب ووسائل دستیاب نہیں ہوئے آپ نے اقدام نہیں کیا، پھر جب دستیاب ہو گئے تو اقدام کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

چونکہ اتباع نبوی امت پر لازم ہے اس لئے غلبۂ دین کے لئے جدوجہد کرنے والوں کا یہ فریضہ ہے کہ وہ آپ کی پیروی کرتے ہوئے باقاعدہ منصوبہ بندی، ترتیب، تنظیم اور واضح لائحہ عمل تشکیل دے کر غلبۂ دین کے عظیم مقصد کے حصول کے لئے اس جدوجہد کو آگے بڑھائیں، فرسودہ اور باطل نظام کے خاتمے کے لئے بھرپور تیاری کریں کیونکہ اس انسانیت دشمن نظام کی جڑیں ایک طویل عرصے سے مضبوط ہو چکی ہیں۔ تنا کافی موٹا ہو چکا اور اس کی شاخیں بہت پھیل چکی ہیں۔ اس لئے اسے جڑ سے اکھاڑنے کے لئے طاقتور آلات اور انہیں استعمال کرنے والے مضبوط رجالِ کار کی ضرورت ہے، جو اپنی کاری ضربوں سے اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکیں، اسی طرح اس کی جگہ اچھا اور بہتر درخت لگانے کے لئے بھی اسباب ووسائل اور رجال کار کا ہونا ناگزیر ہے لہٰذا ان دونوں امور یعنی تخریب اور تعمیر کے لئے بھرپور تیاری کی ضرورت ہے، لیکن آج افسوسناک صورت حال یہ ہے کہ احیاء اسلام کے لیے افراط وتفریط سے کام لیا جا رہا ہے۔

ایک طرف وہ طبقہ ہے جو اپنی جدوجہد کو ''مکی دور'' تک محدود کیے ہوئے ہے، وہ اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہتا ہے بلکہ اس کی بنیادی فکر میں اس سے آگے بڑھنے کا تصور تک نہیں ہے، چونکہ بنیادی فکر میں اس مرحلے سے آگے بڑھنے کا تصور بھی نہیں اس لیے اگلے مراحل کے لیے تعلیم وتربیت اور تیاری کا کوئی لائحہ عمل ہے اور نہ نظم قائم ہے، جس کے نتیجے میں یہ دعوت وتحریک ابتدائی مراحل تک ہی محدود ہے اور اربابِ دعوت اس سے اگلے مراحل کو ضروری نہیں سمجھتے بلکہ ان کا خیال ہے کہ اگلے مراحل خود بخود وجود میں آئیں گے۔ حالانکہ یہ نظریہ درست نہیں ہے کیونکہ جب فکر اور سوچ ابتدائی مراحل تک

محدود ہے اور اگلے مراحل کے لیے تعلیم وتربیت کا نظم بھی قائم نہیں تو اگلے مراحل خود بخود کیسے وجود میں آئیں گے؟ اگر یہی معاملہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ایک عرصے تک دعوت دینے کے بعد مختلف قبائل سے نصرت طلب کرتے اور نہ انصارِ مدینہ کی نصرت کی بدولت ہجرت کر کے دعوت وجہاد کے ذریعے پہلے مرحلے میں مدینہ، پھر مکہ اور بالآخر پورے جزیرہء عرب میں اسلام کی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد کرتے۔ لہذا آپ کی جدوجہد سے یہ ثابت ہوا کہ دعوت سے اگلے مراحل میں داخل ہونے کے لیے باقاعدہ جدوجہد کرنا ہوگی اور اس کے لیے تعلیم وتربیت اور تیاری کے لیے نظم قائم کرنا پڑے گا۔

دوسرا طبقہ پہلے طبقے کے برعکس ہے کہ وہ سیرت سے واضح ہونے والی ترتیب کو نظرانداز کرتے ہوئے ابتدائی مراحل کو چھوڑ کر آخری مرحلے یعنی قتال کو اختیار کرنے کا قائل ہے۔ وہ مسلمانوں کے تمام مسائل کا حل ''گولی'' اور ''ڈنڈے'' کے استعمال کو سمجھتا ہے۔ قتالِ وجہاد کی فرضیت، ضرورت، اہمیت، اور فضیلت سے انکار نہیں، اس کے علاوہ عالمی سامراجی وکفریہ طاقتوں کی طرف سے مسلم ممالک پر جو جارحیت کی جارہی ہے اور مسلمانوں کے علاقوں پر قبضہ جما کر جو ظلم وجبر اور دہشت گردی روا رکھی جارہی ہے بلاشبہ ان ممالک میں ان طاقتوں کی مداخلت، جارحیت اور تسلط کو روکنا اور جہاد کرنا فرض ہے اور یہی اس مسئلے کا حل ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جن مسلم ممالک میں اس طرح کی صورت حال نہیں ہے وہاں بھی یہی طریقۂ کار اختیار کرتے ہوئے محض گولی اور بارود کے ذریعے ہی شریعت اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے اٹھ کھڑا ہوا جائے۔ کیا سامراجی طاقتوں کی درندگی کا شکار اور پرامن مسلم ممالک کے حالات وواقعات اور ان کی جغرافیائی، سیاسی اور اقتصادی حالات کے درمیان پائے جانے والے فرق کو مدنظر نہ رکھا جائے گا؟ کیا شریعت حالات وواقعات کی تبدیلی کی بنا پر حکم تبدیل نہیں کرتی؟

غلبۂ دین کے لیے جدوجہد کرنے والے حضرات پر یہ امر واضح ہونا چاہیے کہ جن ممالک میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور وہاں حالات پُرامن ہیں یعنی کفریہ طاقتوں کا قبضہ اور تسلط نہیں ہے، وہاں نبوی طریقۂ کار کے مذکورہ بالا بنیادی اصولوں کی روشنی میں ہی لائحہ عمل ترتیب دینا ہوگا اور یہی وقت کا تقاضا ہے۔

فصل ھفتم:

آج بھی انہی اصولوں کی روشنی میں کام کیا جائے گا

ہم نے ماقبل صفحات میں سیرت کے چند اہم اور بنیادی اصول ذکر کیے ہیں جن کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی۔ یہاں ان بنیادی اصولوں کو اس لئے بیان کیا گیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ یہ وہ اصول ہیں جن پر آئندہ بھی عمل درآمد کرنا لازم ہے۔

جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ آج جدید اور ترقی یافتہ جاہلیت کا دور دورہ ہے، کفریہ اور باطل عقائد، افکار، نظریات، احساسات، جذبات، خیالات اور میلانات کا غلبہ ہے جبکہ اسلامی معاشرے اور نظامِ حیات کی عملی شکل کا کہیں وجود نہیں ہے، لہٰذا خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے اسلامی معاشرے کی تشکیل اور اسلامی نظامِ خلافت کے قیام کے لئے جدوجہد کرنا ہوگی جس کے لئے نبوی منہج اور سیرت ہمارے سامنے موجود ہے، اس لئے منہج نبوی کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں لائحہ عمل طے کرنا ہوگا۔ الغرض نبوی منہج کے بنیادی اصول آج بھی اور آئندہ کے لئے بھی مشعل راہ ہیں اور ان کا اختیار کرنا ناگزیر ہے۔ علامہ سہیلی ہجرتِ حبشہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وفيه من الفقه الخروج عن الوطن وان كان الوطن مكة علىٰ فضلها اذا كان الخروج فراراً بدينٍ وان لم يكن الى اسلام فان الحبشة كانوا نصارىٰ يعبدون المسيح ولا يقولون هو عبدالله...... فانظر كيف اثنى الله عليهم بهذه الهجرة وهم قدخرجوا من بيت الله الحرام الىٰ دار كفر لما كان فعلهم ذلک احتياطاً علىٰ دينهم ورجاء ان يخلى بينهم وبين عبادة ربهم يذكرون آمنين مطمئنين وهٰذا حكم مستمر متى غلب المنكر فى بلد واوذى على الحق مؤمن ورأى الباطل قاسراً للحق ورجى ان يكون فى بلدٍ آخر اىّ بلد كان يخلى بينه وبين دينه ويظهر فيه عبادة ربه فان الخروج على هذا الوجه حتم على المؤمن وهذه الهجرة لاتنقطع الى يوم القيامة.

(الروض الانف ج ۱، ص ۲۱۳)

''اس سے وطن سے نکلنے کا مسئلہ معلوم ہوتا ہے اگر چہ وطن مکہ جیسا شرف وفضیلت والا شہر کیوں نہ ہو، یہ اس وقت ہے جب یہ نکلنا اپنے دین کے تحفظ کے لئے ہو اگر چہ یہ ہجرت دارا سلام کی طرف بھی نہ ہو اس لئے کہ حبشہ نصاریٰ کا ملک تھا جو مسیح (علیہ السلام) کی عبادت کرتے تھے اورانہیں اللہ کا بندہ نہیں مانتے تھے، ملاحظہ ہو کہ کیسے اللہ تعالیٰ نے (اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ کے الفاظ کے ساتھ) اس ہجرت کی وجہ سے ان کی تعریف کی ہے حالانکہ وہ تو بیت اللہ سے نکل کر دارالکفر کی طرف گئے تھے، یہ (تعریف) اس لئے کہ ان کا یہ فعل اپنے دین کو بچانے کے لئے اوراس امید پر تھا کہ ان کے اوران کے رب کی عبادت کے درمیان حائل رکاوٹ ختم ہو جائے گی اور وہ اطمینان اورامن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرسکیں گے۔ یہ ہمیشہ باقی رہنے والا حکم ہے جب بھی کسی شہر میں منکر غالب آجائے اوراہل ایمان کوحق پر رہنے کی وجہ سے ایذائیں دی جاتی ہوں، باطل حق کوتوڑنا پھوڑنا چاہتا ہواوراس بات کی امید ہو کہ دوسرے شہر (ملک اورعلاقے) میں اس کے دین میں حائل رکاوٹ ختم ہو جائے گی، اپنے رب کی عبادت کا اظہار کر سکے گا تو اس صورت میں اپنے علاقے سے نکلنا اہلِ ایمان پر واجب ہوگا اورایسی ہجرت کا حکم تاقیامت ختم نہ ہوگا۔''

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ہجرت کا حکم تاقیامت ہمیشہ کے لئے ہے۔ جب اور جہاں کہیں بھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمانوں کے لئے اپنے علاقے میں رہتے ہوئے دین کے احکام پر عمل پیرا ہونا ممکن نہ ہو، انہیں دینی امور پر چلنے کی آزادی نہ ہواورانہیں امید ہو کہ کسی دوسرے علاقے میں ہجرت کر جائیں تو وہ دین پر عمل پیرا ہوسکیں گے تو اس وقت ہجرت لازم ہو جاتی ہے۔اسی پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب کسی علاقے خصوصاً (آج کے لحاظ سے) مسلم ممالک میں اگر یہ صورت حال پیدا ہو جائے کہ دین اسلام کے قوانین کو بالکل نافذ نہیں کیا گیا یا نافذ تھے لیکن انہیں کالعدم قرار دیا گیا، یا ایسی ترامیم کی گئیں جن کی وجہ سے ان کی شرعی حیثیت ختم ہوگئی ہے، اسلامی معاشرے کا کوئی وجود نہیں بلکہ یہود وہنود اور نصاریٰ کی معاشرت اور تہذیب وثقافت کو فروغ دیا جارہا اور پروان چڑھایا جارہا ہے۔الغرض جدید جاہلیت کا دور دورہ ہے اور مسلمان اسلامی معاشرے اورنظام کی بجائے باطل اورکفریہ نظام کے تحت زندگی گزار رہے ہیں (اوراس وقت تقریباً تمام مسلم ممالک میں یہی صورت حال ہے) تو اس وقت مسلمانوں پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ منہج نبوی کے مذکورہ بنیادی اصولوں کی روشنی میں لائحہ عمل ترتیب دے کراس فرسودہ معاشرے

اور نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور اسلامی قوانین کے نفاذ اور اسلام کے اجتماعی نظام کے قیام کے لئے بھر پور جدو جہد کریں۔

ایک اہم سوال کا جواب

یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں جو طریقۂ کار اور ترتیب اختیار فرمائی تھی، اس میں اور موجودہ زمانے میں تو زمین آسمان کا فرق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس زمانے میں انقلاب برپا کیا اس دور میں جزیرۂ عرب کوئی زیادہ متمدن علاقہ نہ تھا، وسائل وذرائع زیادہ نہ تھے، سیاسی، عسکری اور اقتصادی حوالے سے کوئی زیادہ ترقی نہ ہوئی تھی بلکہ بیشتر قبائلِ عرب پسماندہ زندگی گزار رہے تھے۔ پورے جزیرۂ عرب میں کوئی با قاعدہ حکومت نہ تھی ،قبائلی نظام رائج تھا، ہر قبیلہ آزاد اور خود مختار تھا، با قاعدہ نظامِ حکومت نہ ہونے کی وجہ سے عصر حاضر کی طرح با قاعدہ پولیس ،فوج ،انتظامیہ اور عدلیہ کا نظام نہ تھا۔ اس کے برعکس موجودہ دور میں زندگی کے تمام شعبوں میں ترقی ہوچکی ہے، سائنس وٹیکنالوجی میں بے پناہ ترقی کی بنا پر سیاسی عسکری، اقتصادی ،انتظامی ،عدالتی ،الغرض تمام شعبوں میں جدت آگئی ہے اور وہ ریاست کے مضبوط ستون بن چکے ہیں، اس لیے اس صورت حال میں چودہ سو سال پہلے اختیار کیے جانے والے طریقۂ کار کو اختیار کرنا نا قابلِ فہم ہے لہٰذا موجودہ زمانے کے تقاضے کے مطابق اور علاقائی اور بین الاقوامی حالات کے پیشِ نظر ایسا طریقۂ کار اپنایا جائے جو عصرِ حاضر میں قابلِ عمل ہو اور اس کے نتائج وثمرات بھی واضح طور پر سامنے آسکیں۔ نیز یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اختیار کردہ طریقۂ کار اسی زمانے کے ساتھ مخصوص ہے اس پر موجودہ جدید زمانے میں عمل درآمد کس طرح کیا جاسکتا ہے؟

ہمارے خیال میں اس سوال کا جواب حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ کی زبانی دیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ حضرت حکیم الاسلام، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو آفتابِ نبوت قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جس طرح مادی آفتاب نے سات دِن بنائے ،ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت نے اپنے روحانی طلوع وغروب سے جو زمانہ بنایا وہ بھی سات دن اور سات راتوں کا ہے۔

حضرت حکیم الاسلام آپ کی ولادت باسعادت کو اسلام کا پہلا دِن **یوم الولادة**، نبوت کو اسلام کا دوسرا دِن **یوم البعث** ،نبوت کے اعلان کو اسلام کا تیسرا دِن **یوم الدعوة**، مکہ سے مدینہ تشریف لانے کو اسلام کا چوتھا دِن **یوم الهجرة** ،قتال کی اجازت کو اسلام کا پانچواں دِن **یوم القوة** ،مکہ کی فتح

کو اسلام کا چھٹا دِن یوم الشوکۃ ،آیت کریمہ ''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ '' کے نزول کو اسلام کا ساتواں دن یوم الاکمال قرار دیتے ہیں۔

پھر فرماتے ہیں کہ جس طرح مادی آفتاب نے سات دِن بنائے جو دنیا کی پوری عمر ہیں کہ وہی لوٹ لوٹ کر آتے رہتے ہیں اور دنیا کی عمر دراز ہوتی رہتی ہے ایسے ہی آفتاب روحانی نے بھی مذکورہ سات ہی دن بنائے ، جولوٹ لوٹ کر آتے رہتے ہیں جن سے اسلام کی عمر دراز ہوتی رہتی ہے اور اس کی تاریخ بنتی رہتی ہے۔ یہاں سوال ہوگا کہ یوم ولادت ، یوم بعثت اور یوم اکمال وغیرہ تو وہ ایام ہیں جو دورِ نبوت کے ساتھ مخصوص ہیں ، یہ بعد کے زمانے میں کیسے لوٹ سکتے ہیں کہ ان کا تکرار تسلیم کیا جائے ؟اس سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جواباً عرض ہے کہ بلاشبہ یہ ایام اپنی خصوصیات کے لحاظ سے دورِ نبوت کے ساتھ مخصوص ہیں لیکن اگر ان کی عمومی روح کو دیکھا جائے تو یہ ایام معیار کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس حیثیت سے ہر دور میں آئے اور آتے رہیں گے۔ کیونکہ جسمانی ولادت شریفہ کی روح مرکزی شخصیت کا تعین ہے جس سے اصلاح کا کام لیا جائے ،روحانی ولادت (بعثت) کی روح نصب العین کا تعین ہے جسے عالم میں چلایا جائے۔دعوت کی روح نصب العین کا اعلان ہے جس سے عالم کی اصلاح متعلق ہو۔ہجرت کی روح مستقر اور فتنہ سے دور مرکزی مقام کا تعین ہے جس سے نصب العین دلوں تک پہنچ سکے۔قوت کی روح نصب العین کو طاقتور بناتی ہے تاکہ اس کے سامنے جھک سکیں۔شوکت کی روح غلبہ واقتدار ہے جس سے نصب العین کی ضد مغلوب ومقہور ہو جائے۔اکمال کی روح نصب العین کی تکمیل ہے جس سے کسی کو گریز کا موقع باقی نہ رہے۔اگر ان سات ایام کی مذکورہ ارواح اور اصولی حیثیت کو پیش نظر رکھا جائے تو واضح ہوگا کہ یہ ایام دورِ نبوت کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ بطفیل نبوت ہر قرن میں ہر اہم اور اجتماعی نصب العین کے لئے ان ہی اصول کی اور بالفاظِ دیگر انہی ایام کی ضرورت ناگزیر ہے۔ اگر کسی انحطاط کے دور میں خود پورے اسلام یا اس کے کسی دینی یا سیاسی شعبہ کو کسی تحریک کی صورت میں اٹھایا جائے گویا مجدد تجدید کے لیے کھڑا ہو تو اسے انہیں سات مراحل سے گذرنا پڑے گا۔مرکزی شخصیت کا تعین ،نصب العین کا تعین ،نصب العین کی اشاعت ،نصب العین کے لئے وسائل قوت کی فراہمی ،نصب العین کے لئے حصول غلبہ واقتدار ،نصب العین کی علمی اور عملی تکمیل۔اور جب کہ یہی سات دِن ان سات ایام کی اصولی روح ہیں تو نتیجہ یہ ہے کہ ہر نصب العین کو ان سات دنوں سے

گذرنا پڑے گا۔..... پس اس کے معنی اس کے سوااور کیا ہیں کہ یہ ایام اپنی اصولی اور کلی حیثیت سے دورنبوت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر دور میں جب بھی کسی نصب العین کوتحریک کی صورت میں لایا جائے اور رجال کار کھڑے ہوں گے تو انہیں انہی سات دنوں سے گذرنا پڑے گا۔'' (آفتاب نبوت ص ۱۶۲، ۱۶۳)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلامی نظام کے قیام کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے جو بنیادی اصول معلوم ہوتے ہیں اور آپ کی دعوت جن مراحل سے گزر کر کامیاب ہوئی آپ کے بعد تا قیامت جب بھی اس طرح کے حالات پیدا ہوں گے اور جاہلیت جدید انداز میں عود کر آئے گی تو اسلامی نظام کے قیام کے لئے انہی اصنولوں کی روشنی میں لائحہ عمل اختیار کرنا ہوگا اور اس دعوت وتحریک کو ان مراحل سے گزرنا ہوگا تب جا کر یہ تحریک کامیابی حاصل کرسکتی ہے، لہٰذا عصر حاضر میں نبوی طریقۂ کار کے مطابق غلبہ دین کی جدوجہد کو آگے بڑھانا لازم ہے، اس سے ہٹ کر اغیار کے طریقوں کو اپنانے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا بلکہ منزل دور سے دور ہوتی جائے گی جیسا کہ گذشتہ صدی عیسوی کی تاریخ شاہد ہے۔

حصہ سوم

غلبہ دین کا نبوی طریقۂ کار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ
حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ
الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا

(الاحزاب: ۲۱)

”البتہ تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی
میں بہترین نمونہ ہے، اس کے لیے جو اللہ
اور قیامت کی امید رکھتا اور اللہ کو بہت یاد
کرتا ہے۔“

باب اول:

بعثت

امام انقلاب کا ظہور کب ہوتا ہے؟

عالمگیر انقلاب سے قبل اس کی علامات اور آثار کا ظہور شروع ہو جاتا ہے۔ لوگوں میں بے چینی پائی جاتی ہے اور وہ مروجہ عقائد و افکار، معاشرت اور نظامِ حیات سے اکتا چکے ہوتے ہیں، چنانچہ ان کے دل و دماغ میں یہ بات آنا شروع ہو جاتی ہے کہ تبدیلی آنی چاہیے اور فساد و برائیوں کا خاتمہ ہونا چاہیے، رفتہ رفتہ یہ تصور پختہ ہوتا جاتا ہے، اس موضوع پر لوگوں میں مکالمہ اور مباحثہ شروع ہو جاتا ہے اور ہر آدمی انتظار کر رہا ہوتا ہے کہ تبدیلی لانے والا بالفاظِ دیگر امامِ انقلاب کا ظہور کب ہوگا اور اس آفتابِ ہدایت کا طلوع کب ہوگا، چنانچہ ایسی ہستیاں نمودار ہوتی ہیں تو سلیم الفطرت لوگ پروانوں کی طرح اس کے گرد جمع ہوتے ہیں اور عظیم الشان مقصد کے لیے اپنی جانیں تک لٹا دیتے ہیں۔

تشریف آوری کی بشارتیں

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے متعلق انبیاء کرام علیہم الصلوۃ السلام اپنی اپنی امتوں کو بشارتیں سناتے آئے تھے اور انہیں آپ کی اتباع وتقلید کی تلقین بھی کرتے رہے تھے، چنانچہ ان امتوں نے یہ بشارات اور علامات اپنے ہاں محفوظ رکھیں اور یوں نسل در نسل یہ سلسلہ چلتا رہا تا آنکہ آپ کی بعثت کا زمانہ بالکل قریب آ گیا۔ یہود چونکہ اہل کتاب تھے اس لئے انہیں آپ کی تشریف آوری اور علامات کا زیادہ علم تھا۔ ابن اسحاق، سلمۃ بن سلامہ (جو انصاری و بدری صحابی تھے) سے روایت کرتے ہیں کہ مدینہ میں ایک یہودی ہمارا پڑوسی تھا، ایک دن جبکہ میں کم عمر تھا اس نے بنو عبدالاشہل کے سامنے قیامت، بعث بعد الموت، حساب، میزان، جنت اور جہنم کا ذکر کیا تو ان مشرکین نے پوچھا! کیا موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ اس نے کہا ہاں ایسا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ اس کی کیا نشانی ہے؟ تو اس نے کہا:

نبی مبعوث من نحو هذه البلاد وأشار بيده إلى مكة واليمن إن يستنفد هذا الغلام عمره يدركه. قال سلمة: فوالله ماذهب الليل والنهار حتى بعث الله محمدا

رسولهﷺ، وهو حی بین أظهرنا فآمنا به و كفر به بغيا و حسدا.

(السيرة لابن هشام ج ١، ص ١٤٠)

''مکہ اور یمن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس علاقے سے ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے۔ انہوں نے کہا آپ کے خیال میں یہ کب ہوگا؟ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا (جبکہ میں سب سے کم عمر تھا) اگر اس لڑکے نے اپنی عمر پوری کی تو اس کے زمانے کو ضرور پائے گا۔ سلمہ فرماتے ہیں کہ زیادہ ایام گزرنے نہیں پائے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، وہ ہمارے پاس حیات ہیں، ہم ان پر ایمان لائے جبکہ اس نے سرکشی اور حسد کی وجہ سے انکار کر دیا۔

تب ہم نے اس سے کہا'' کیا تو نے ہی ان (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں اس طرح کی باتیں نہیں کی تھیں؟ کہا کیوں نہیں لیکن یہ وہ نہیں، جن کے بارے میں نے بتلایا تھا۔

اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و نبوت کا بخوبی علم تھا، وہ آپ کی تمام علامات اور حالات جانتے تھے یہی وجہ ہے کہ جب آپ مبعوث ہوئے اور انہوں نے آپ کے حالات و واقعات اور علامات کا مشاہدہ کیا تو انہیں آپ کی نبوت و رسالت کی حقانیت کا یقین ہو گیا اور متعدد حضرات نے آپ کے ہاتھ پر اسلام بھی قبول کیا لیکن اکثر لوگ محض بغض وحسد، سرکشی وضلالت اور ازلی بدبختی کی وجہ سے اسلام قبول کرنے پر تیار نہ ہوئے اور اسلام اور اہل اسلام کو مٹانے اور دبانے کی ناکام کوششیں کرتے رہے لیکن انہیں ذلت و رسوائی کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوا جیسا کہ آگے چل کر تفصیل آئے گی۔

عالمگیر رسالت

چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پوری دنیا کیلئے رحمت کاملہ اور بگڑے ہوئے اور فساد زدہ معاشروں میں انقلاب برپا کر کے اللہ تبارک وتعالیٰ کے منتخب کردہ دینِ اسلام کے غلبے کا باعث تھی، اس لئے متعدد انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے آپ کی بعثت کی بشارت دی اور ان کی امت کے سلیم الفطرت افراد نے ان بشارتوں کو نسل در نسل آگے منتقل کیا، اسی لئے آپ کی ولادت سے قبل ہی آپ کے ظہور کی علامات ظاہر ہونا شروع ہو گئیں، چنانچہ ولادت سے قبل حمل سے ان کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، کعب الاحبار کی درج ذیل روایت ملاحظہ ہو:

''اس رات (جس میں آپ کے والد عبداللہ اور والدہ آمنہ کا ملاپ ہوا) آسمان اور زمین اور اس

کے اطراف واکناف میں منادی کی گئی کہ وہ چھپا ہوا نور جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوگی، وہ آمنہ کے پیٹ میں چلا گیا ہے۔ پس اس کے لئے کیا ہی خوشخبری ہے۔ اس دن صبح پوری دنیا کے بت منہ کے بل گر گئے، قریش سخت قحط سالی اور بڑی تنگی میں تھے پس زمین سرسبز وشاداب ہوگئی، درخت پھلدار ہوگئے اوران کے پاس ہر طرف سے مدد آنے لگی، چنانچہ جس سال آپ کی والدہ کو حمل ٹھہرا اس کا نام ''فتح اور خوشحالی کا سال'' رکھا گیا۔'' (شرح الزرقانی ج ا ص ۱۹۷)

یعنی آپ کی ولادت کے ساتھ ہی دنیا سے کفروشرک اور ضلالت وگمراہی کے آثار مٹنا شروع ہوگئے اوراس کے ساتھ ساتھ زمین کی سرسبزی وشادابی اوراہل زمین کی خوشی وراحت کا دور بھی شروع ہوگیا۔ حمل ٹھہرنے کے ساتھ ہی یہ اعلان کردیا گیا کہ اب دنیا میں آپ ہی کی امامت وپیشوائی ہوگی۔ پوری دنیا آپ کی نبوت ورسالت کے آفتاب وماہتاب کے نور سے روشنی حاصل کرے گی، اب حکومت وسلطنت آپ کی ہوگی اورظالم وجابر حکمرانوں اورشہنشاہوں کے تخت وتاج گرجائیں گے، ان کی ظلم وجبر اورناانصافی پرمبنی سلطنتوں کا خاتمہ ہوجائے گا اورعقیدۂ توحید ورسالت پرمبنی نظامِ عدل جاری وساری ہوگا اور پوری دنیا اس سے استفادہ کرے گی۔

مشرق ومغرب میں پھیلنے والا نور

اسی طرح ابونعیم عطاء بن یسار سے، وہ ام سلمۃ سے اوروہ حضرت آمنہ سے روایت کرتی ہیں کہ ''جس رات میں نے انہیں (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) جنا تو مجھے ایسا نور نظر آیا جس سے شام کے محل روشن ہوگئے اوروہ مجھے نظر آنے لگے۔'' (مواہب مع الشرح الزرقانی ج ا، ۲۱۹)

حضرت آمنہ نے جس نور کی زیارت کی تھی یہ کون سا نور تھا اوراس کا مقصد کیا تھا؟ اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے۔

وخروج هذا النور عند وضعه اشارة الى مايجئ به من النور الذى اهتدى به اهل الارض وزال به ظلمة الشرك. (مواهب اللدنيه مع الشرح الزرقانى، ج ا، ۲۲۱)

''آپ کی ولادت کے وقت اس نور کا نکلنا آنے والے اس نور کی طرف اشارہ تھا جس سے انسانیت نے ہدایت پائی اوراس کے ذریعے شرک کی تاریکی ختم ہوئی۔''

ایک اورروایت میں حضرت آمنہ سے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں:

''پس میں نے مشرق ومغرب دیکھے اور میں نے تین گڑے ہوئے علَم دیکھے، ایک مشرق میں،

ایک مغرب میں، اور ایک کعبہ کی چھت پر۔'' (مواہب مع الشرح الزرقانی ج۱،ص۲۱۱)

علامہ زرقانی اس روایت کی شرح میں لکھتے ہیں:

ولعل حکمة ذلک الاشارة الی ان شرعه یعم المشارق والمغارب ویعلو علی مکة ویصیر بیننا واضحاً کالاعلام(شرح الزرقانی ج ۱، ص ۲۱۱)

''شاید اس کی حکمت یہ ہے کہ اس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود تھا کہ آپ کی شریعت مشرق ومغرب میں عام ہوگی اور وہ مکہ پر غالب ہوگی اور ہمارے سامنے جھنڈوں کی طرح واضح ہوگی۔''

علامہ سہیلی لکھتے ہیں:

وذلک بما فتح الله علیه من تلک البلاد حتی کانت الخلافة فیها مدة بنی أمیة واستضاء ت تلک البلاد و غیرها بنوره صلی الله علیه وسلم.

(الروض الانف ج ۱ ص)

''اور یہ اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان علاقوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح دی حتیٰ کہ بنو امیہ کے زمانے میں یہاں خلافت قائم ہوگئی اور یہ اور دیگر ممالک آپ کے نورِ نبوت سے منور ہوگئے۔''

مذکورہ روایت سے واضح ہوگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین اور شریعت کی نہ صرف مکہ بلکہ پوری دنیا میں اشاعت ہوگی بالآخر اسے غلبہ وتسلط حاصل ہوگا اور دیگر ادیان باطلہ مغلوب اور سرنگوں ہوں گے۔ دراصل آپ کی نبوت ورسالت اور شریعت پوری دنیا کے انسانوں کے لیے ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا﴾(سباء: ۲۸)

''ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے نذیر اور بشیر بنا کر بھیجا ہے۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ داعی کا یہ نظریہ اور فکر ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی طرح اس کی دعوت بھی عالمگیر ہے، کیونکہ یہ وہی دعوت ہے جو آپ نے پیش فرمائی تھی، لہٰذا وہ پوری دنیا کی ہدایت اور عالمگیر انقلاب کی فکر اور نظریہ لے کر اٹھے اور اس طرح محنت اور جدوجہد کرے کہ عالمگیر انقلاب کی ٹھوس بنیادیں رکھی جائیں اور آئندہ آنے والی نسلیں اسے عملی شکل دے سکیں جیسا کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے خلفاء نے آپ کے مشن کی تکمیل کی۔

عالمگیر رحمتِ خداوندی

چونکہ خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت عالمگیر ہے اس لیے وہ نہ صرف اہل ایمان کے لئے بلکہ پوری انسانیت کے لئے رحمت خداوندی ہے کیونکہ یہ آپ کی نبوت و رسالت کے باعث جہاں سلیم الفطرت اور سعادت مند لوگوں کو ایمان وعمل کی عظیم دولت ملی اور وہ دنیا وآخرت میں کامیاب وکامران ٹھہرے، وہاں تمام نوعِ انسانی کو ظلم وجبر، ناانصافی اور جہالت سے چھٹکارا ملا اور، عدل وانصاف اور امن وسکون فراہم ہوا۔ علامہ حلبی لکھتے ہیں:

وبعثته صلى الله عليه وسلم رحمة حتى للكفار بتأخير العذاب عنهم ولم يعاجلوا بالعقوبه كسائر الامم المكذبة وحتىٰ للملئكة قال تعالى ﴿ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ (السيرة الحلبيه ج ا ،ص ٢٢١)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت رحمت ہے حتیٰ کہ کفار کے لئے بھی، اس طرح کہ ان سے عذاب مؤخر کر دیا گیا ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام کو جھٹلانے والی سابقہ امتوں کی طرح انہیں دنیا میں سزا نہیں دی گئی، فرشتوں کے لئے بھی رحمت ہے، چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں'' ہم نے آپ کو تمام عالموں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

چونکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پوری دنیا کے لیے رحمت ہے، لہٰذا غلبۂ دین کی دعوت کے حاملین کو اس نظریہ اور فکر کا حامل ہونا چاہیے کہ وہ اس دعوت کے ذریعے پوری دنیا کے انسانوں کو رحمۃ للعالمین کے سایۂ رحمت میں لائیں گے۔ نیز رحم ورحمت کا جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کو بھرا ہونا چاہیے اور رحمۃ العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ رحمت کا پیکر ہونا چاہیے۔ جب تک ان کے اندر انسانیت کی حالتِ زار پر رحم کھانے اور انہیں اسلامی نظام حیات کے دائرے میں لا کر جہنم سے بچانے کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا تب تک وہ کامل طور پر اور بھرپور جذبہ اور تڑپ کے ساتھ دعوت نہیں چلا سکتے ہیں۔

بکریوں کی گلہ بانی اور جہانبانی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ بڑے ہوئے تو اہلِ مکہ کے دستور کے مطابق آپ نے اجرت پر بکریاں چرانا شروع کر دیں۔ امام بخاریؒ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مابعث اللہ نبیاً الا رعی غنم فقال لہٗ اصحابہٗ وانت فقال نعم کنت ارعاھا علی قراریط لاھل مکۃ.(صحیح البخاری کتاب الاجارات باب رعی الغنم علی قراریط ایضاًدلائل النبوۃ ج ۲،ص ۶۵)

''اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی ایسا مبعوث نہیں کیا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں،صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا آپ بھی؟فرمایاہاں میں نے اہل مکہ کی بکریاں چند قراریط کے عوض چرائی ہیں۔''

بکریوں کا چرانا نہ صرف آپؐ کی بلکہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت ہے جیسا کہ علامہ سہیلیؒ بکریاں چرانے کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وإنما جعل اللہ ھذا في الأنبیاء تقدمۃ لھم لیکونوا رعاۃ الخلق ولتکون أممھم رعایا لھم (الروض الانف ج ۱ ص)

''اللہ تبارک وتعالیٰ نے بکریاں چرانے کوانبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے لئے اس بات کا مقدمہ اور پیش خیمہ بنا دیا کہ انہوں نے مخلوق کا راعی اور نگہبان بننا تھااوران کی امتیں ان کی رعایا بنی تھیں۔''

انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کا بکریاں چرانا اُمت کی گلہ بانی اور جہانبانی کا دیباچہ اور پیش خیمہ تھا، دراصل دیگر جانوروں مثلاً اونٹ اور گائے کا چرانا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ بکریوں کا چرانا دشوار ہے۔ بکریاں کبھی ایک چراگاہ میں جاتی ہیں تو کبھی دوسرے کھیت میں،ایک وقت میں اگراس جانب ہیں تو دوسرے لحہ میں دوسری جانب دوڑتی نظر آتی ہیں۔گلہ کی کچھ بکریاں دائیں طرف ہوتی ہیں تو کچھ بائیں طرف،جبکہ چرواہا ہرطرف نظر رکھتا ہے کہ کوئی بھیڑیا یا درندہ تو ان کی تاک میں نہیں۔وہ چاہتا ہے کہ سب بکریاں ایک جگہ جمع رہیں کہیں ایسا نہ ہوکہ کوئی بکری ریوڑ سے الگ ہوجائے اور بھیڑیا اس کو اٹھا کرلے جائے،چنانچہ چرواہا صبح سے شام تک اسی طرح سرگردان رہتا ہے۔

حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ کا بھی یہی حال ہوتا ہے کہ وہ امت کی ہدایت،اصلاح اوراس کی فلاح وبہبود کی فکر میں دن رات سرگرم رہتے ہیں۔امت کے افرادتو بھیڑوں اور بکریوں کی طرح بے پرواہ ہوتے ہیں اور دنیوی مال ومتاع کے حصول کے لئے دوڑتے بھاگتے پھرتے ہیں،انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ کی دعوت سے اعراض کرتے اوراسے قبول کرنے سے انکارکرتے ہیں لیکن انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام انتہائی شفقت ومہربانی سے اُنہیں للکارللکارکراپنی طرف بلاتے رہتے ہیں۔امت کے

مذکورہ ردِّعمل سے ان حضرات کو جو تکلیف اور مشقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس پر صبر اور تحمل کا مظاہرہ کرتے ہیں، کسی بھی وقت دعوت اور تبلیغ اور تعلیم وتربیت سے اکتاتے اور گھبراتے نہیں اور جس طرح بھیڑیں، بھیڑیوں اور درندوں کے خونخوار حملوں سے بے خبر ہوتی ہیں، اسی طرح امت، نفس اور شیطان کے ضلالت اور گمراہی پر مبنی حملوں سے بے خبر ہوتی ہے، امت کو تو اپنی ہلاکت کا خیال بھی نہیں ہوتا جبکہ انبیاء کرام علیہم السلام کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ ان کی اس حالت کو دیکھ کر اندر ہی اندر گھلتے اور کڑھتے رہتے ہیں، چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لئے تڑپ اور قلبی کیفیت سے متعلق فرماتے ہیں:

لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَنْ لَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ. (الشعراء: ۳)

''شاید آپ اُن کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے اپنی جان دے دیں۔''

الغرض غلبۂ دین کے داعی کے اندر انبیاء کرام خصوصاً خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جیسی تڑپ، کڑھن، جذبہ صادقہ، صبر واستقامت، رحمت ومشقت اور تحمل وبرداشت کی صفات ہونی چاہئیں۔

داعی اور اخلاق حمیدہ

داعی کے لئے یہ امر انتہائی ضروری ہے کہ وہ باصفات ہو، اخلاقِ حسنہ کا پیکر اور خصائلِ حمیدہ کا نمونہ ہو، تاکہ جب وہ دعوت شروع کرے اور لوگوں میں انقلاب کی منادی کرے تو اس کے اخلاق و اطوار اور نجی زندگی سے متعلق کسی فرد کو اعتراض کرنے اور منفی پروپیگنڈہ کرکے اس کی دعوت کو قبول کرنے سے روکنے کا موقع نہ ملے کیونکہ دعوت حق کے مخالفین سب سے پہلے داعی کی ذات کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں۔ اگر انہیں داعی کا کوئی کمزور پہلو مل جائے تو اسے خوب اچھالتے اور پروپیگنڈہ کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو اس سے متنفر کرکے دعوتِ حق کے قریب بھی نہ آنے دیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو معصوم بنا کر مبعوث کیا اور انبیاء کی عصمت میں یہی حکمت کارفرما تھی، چنانچہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بچپن سے لے کر بعثت تک جاہلیت کے مشرکانہ عقائد، خیالات وجذبات اور رسوم وعادات الغرض تمام برائیوں سے محفوظ رہے اور کبھی بھی ان کا ارتکاب نہیں کیا۔ علامہ سہیلی امام بخاری سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میں نے صرف دومرتبہ جاہلیت کے برے امور کا ارادہ کیا، روایت کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ آپ اور ایک قریشی لڑکا بکریاں چرا رہے تھے تو آپ نے اپنے ساتھی سے کہا تم بکریاں سنبھالو میں مکہ سے

ہو کر آتا ہوں (جہاں کوئی میلہ تھا جس میں لہو ولعب اور گانا بجانا تھا) جب آپ اس گھر کے قریب گئے تو آپ پر نیند طاری کر دی گئی یہاں تک (صبح ہو جانے کے بعد) سورج کی روشنی سے آپ بیدار ہوئے، دراصل یہ اللہ کی جانب سے آپ کو معصوم رکھنا تھا دوسری مرتبہ بھی آپ نے اپنے ساتھی سے یہی کہا لیکن آپ پر نیند طاری کر دی گئی جیسے پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا۔''

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بچپن سے جوانی کے زمانے میں داخل ہوئے تو آپ کے اندر جو خوبیاں اور صفات تھیں ان کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں جوان ہوئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جاہلیت کی تمام برائیوں سے آپ کو محفوظ رکھا، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو عظمت اور رسالت سے نوازنا تھا۔ آپ اپنی قوم میں مروت میں سب سے افضل، حسنِ اخلاق میں اعلیٰ مرتبہ والے، حسب ونسب میں بلند تر، اچھے پڑوسی، انتہائی تحمل و برداشت والے، سچ بولنے والے، صاحبِ امانت، فحش اور برے اطوار جن میں آدمی ملوث ہو جائے، ان سے انتہائی دور رہنے والے تھے، یہاں تک کہ انہی اخلاق عالیہ کی وجہ سے آپ اپنی قوم میں'' الامین'' کے لقب سے مشہور ہو گئے۔'' (السیرۃ لا بن ہشام ج۱ص۱۲۲، ایضاً دلائل النبوۃ ج۲،ص۳۰)

امام ابن جوزی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی صفاتِ عالیہ کا خلاصہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

فکان نبینا صلی اللہ علیہ وسلم اصح الانبیاء مزاجاً واکملهم بدناً واصفاهم روحاً. (الوفا ج ۱ ص ۳۵۵)

''ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء میں سے صحیح مزاج والے، کامل بدن والے اور پاک روح والے ہیں۔''

الامین

چونکہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی الامین کے لقب سے شہرت ہو چکی تھی اور آپ شام کی طرف سفر اور تجارت کا تجربہ بھی رکھتے تھے، اس لئے مکہ کی مالدار خاتون سیدہ خدیجہ بھی اس طرف متوجہ ہوئیں، ابن ھشام لکھتے ہیں:

''جب سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی، امانت داری اور پاکیزہ اخلاق سے متعلق باتیں پہنچیں تو انہوں نے آپ کی طرف اپنا آدمی بھیجا اور آپ کو شام کی طرف مالِ

تجارت لے جانے کی پیشکش کی۔''(السیرۃ لابن ہشام ج۱،ص۱۲۴)

آپ نے سیدہ خدیجہؓ کی پیش کش کو قبول کرلیا تو اس نے اپنا غلام میسرہ بھی آپ کے ساتھ روانہ کردیا۔ میسرہ نے دورانِ سفر آپ کے حالات واقعات کو ملاحظہ کیا تو واپسی پر اس کی تمام روداد سیدہ خدیجہؓ کو سنائی۔ انہوں نے یہ تمام حالات و واقعات اپنے چچا زاد ورقہ بن نوفل کے سامنے بیان کئے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بیان کردہ واقعات سن کر ورقہ بن نوفل نے کہا کہ ''اگر یہ باتیں درست ہیں تو اے خدیجہ! یقیناً محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس امت کے نبی ہیں اور مجھے یہ معلوم ہے کہ یقیناً اس امت کا نبی آنے والا ہے جس کا انتظار ہو رہا ہے اور اس (کے ظہور) کا یہی زمانہ ہے۔''

(ابن هشام ج ۱، ۱۲۶)

حضرت خدیجہؓ نے آپ سے متعلق ورقہ بن نوفل کی پیشین گوئی سنی تو آئندہ چند سال بعد نبی بننے والی عظیم ترین ہستی سے عقیدت پیدا ہوگئی اور ان سے نکاح کی خواہش پیدا ہوئی چنانچہ آپ کو پیغام بھجوایا:

یا ابن عم! انی قدر رغبت فیک لقرابتک وسطتک فی قومک وامانتک وحسن خلقک وصدق حدیثک. (السیرۃ لابن هشام ج ۱، ج۱۲۵)

''اے چچازاد! میں آپ کی طرف آپ کی قرابت (رشتہ داری)، قوم میں شریف النسب ہونے، امانت و دیانت، حسن اخلاق اور سچائی کی وجہ سے مائل ہوئی ہوں۔''

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا اور سرپرست ابوطالب سے مشورے کے بعد اس پیشکش کو قبول کیا، پھر نکاح ہوگیا۔

اولین وحی کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ خدیجہ کے پاس آئے تو انہوں نے آپ کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا تھا۔

کلاو الله مایحزنک ابداً انک لتصل وتحمل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علیٰ نوائب الحق. (صحیح البخاری باب کیف کان بدأالوحی)

''ہرگز نہیں، خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی ذلیل و رسوا نہ کرے گا، آپ صلہ رحمی اور رشتہ داری کا پاس و لحاظ کرتے ہیں، دوسروں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں محتاجوں کے کام آتے ہیں مہمان کی ضیافت و خاطر مدارت کرتے ہیں، راہِ حق کی تکلیفوں اور مصیبتوں میں مدد کرتے ہیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ صحابہ کرامؓ بھی انہیں خوبیوں کے مالک تھے۔ چنانچہ

جب حضرت ابوبکر صدیقؓ حبشہ کی طرف ہجرت کے ارادے سے مکہ سے نکلے اور راستے میں ابن الدغنہ سے ملاقات ہوئی تو یہی الفاظ ابوبکرؓ کو ابن دغنہ نے کہے تھے۔اس نے کہا:

ان مثلک لایخرج ولایخرج فانک تکسب المعدوم وتصل الرحم وتحمل الکل وتقری الضیف وتعین علیٰ نوائب الحق .(صحیح البخاری کتاب الکفالۃ باب جوار ابی بکر الصدیق)

''تم جیسے شخصیت نہ تو خود باہر نکل جاتی ہے اور نہ اسے نکالا جاتا ہے،تم دوسروں کا بوجھ ہلکا کرتے ہو،صلہ رحمی کرتے ہو محتاجوں کے کام آتے ہو،مہمان کی خاطر مدارت کرتے ہو اور راہِ حق کی تکلیفوں اور مصیبتوں میں مدد کرتے ہو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متاثر کن اخلاقِ عالیہ کی دوسری مثال ملاحظہ ہو کہ حضرت زید بن حارثہؓ جو کہ بچپن میں غلام بنا لئے گئے تھے،حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کے بعد آپ کی خدمت میں آئے اور ایک عرصہ آپ کے ساتھ رہے۔حضرت زید بن حارثہؓ کے والد کو اپنے فرزند کے بارے میں معلوم ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ ہم زید کو واپس لے جانا چاہتے ہیں۔آپ نے فرمایا کہ اگر زید اپنی خوشی سے جانا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے، پھر زید سے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو میرے پاس رہو اور اگر چاہو تو اپنے والد کے ساتھ جا سکتے ہو، زید نے عرض کیا: آپ میرے باپ اور چچا کی طرح ہیں میں آپ پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا اس پر ان کے والد اور چچا نے کہا:

''اے زید! تم پر افسوس ہے تم غلامی کو آزادی پر اور اپنے باپ، چچا اور اہل خانہ پر ترجیح دے رہے ہو؟''(الاستیعاب ج ا ص ۱۸۷ ترجمہ زید بن حارثہ)

زید نے جواب دیا:

''جی ہاں! میں نے اس آدمی میں جو (خوبیاں) دیکھی ہیں تو میں ان پر کسی کو کبھی بھی ترجیح نہ دوں گا۔''(ایضاً)

زید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہنے اور اپنے والد کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تو ان کے والد نے حیرت کا اظہار کیا اور اپنے فرزند سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رویے اور سلوک کے بارے میں پوچھتے ہوئے کہا'' تمہارے آقا تمہارے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں؟ کہا:

یؤ ثرنی علیٰ اهله وولده ورزقت منه حباً فلا اصنع الاما شئتُ

(السیرة الحلبیه ج ا ،ص ۲۵۹)

'' وہ مجھے اپنے گھر والوں اور اولاد پر ترجیح دیتے ہیں، مجھے ان سے بے پناہ محبت ملی ہے، میں جو کام چاہتا ہوں کرتا ہوں (کوئی پابندی اور سختی نہیں ہے)۔''

اس کے بعد آپ نے مسجد حرام میں کھڑے ہو کر تمام لوگوں کے سامنے انہیں اپنا بیٹا بنانے کا اعلان کر دیا اور زید کے والد اور چچا مطمئن ہو کر چلے گئے۔

زید بن حارثہؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہی رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو انہوں نے آپ کی تصدیق کی، اسلام قبول کیا اور آپ کے ساتھ نماز ادا کی۔

اسی طرح دس سال کی عمر میں آپ کی خدمت میں آنے والے اور مسلسل دس سال تک آپ کی خدمت کرنے والے جلیل القدر صحابی حضرت انسؓ سے آپ کے اخلاق حمیدہ کے بارے میں مروی ہے:

لم یکن النبی صلی الله علیه وسلم سبّاباً ولافاحشاً ولالعّاناً. (صحیح البخاری کتاب الادب باب لم یکن النبی صلی الله علیه وسلم فاحشاً).

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہ گالیاں دیتے تھے، نہ فحش بات کرتے تھے اور نہ لعن طعن کرتے تھے۔''

الغرض ایک داعی اور انقلابی کو اخلاقِ حمیدہ کا پیکر ہونا چاہئے، اس طرح کہ لوگ اس کے اخلاقِ حمیدہ کے معترف ہوں، اس سے عقیدت و محبت رکھتے ہوں حتی کہ جان نچھاور کرنے کے لئے تیار ہوں۔

داعی اور وسائل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو آپ کی مالی حالت کچھ اچھی نہ تھی، اس کے باوجود آپ کو چالیس سال کی عمر میں نبوت و رسالت عطا کی گئی اور آپ نے دعوتِ حقہ شروع کر دی۔ اگرچہ سیدہ خدیجہؓ نے نکاح کے بعد اپنا تمام مال و اسباب آپ کی خدمت میں پیش کر دیا تھا لیکن وہ غریبوں محتاجوں اور بے کسوں پر لٹا دیا گیا تھا یعنی آپ نے بے سروسامانی کی حالت میں دعوت شروع کر دی۔ امام بیہقی ابن شہاب زہریؒ سے روایت کرتے ہیں۔

لَمَّا اِستَوٰی رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ وَبَلَغَ اَشُدَّہٗ وَلَیسَ لَہٗ کَثِیرُ مَالٍ اِستَأجَرَ خَدِیجَۃُ بِنتِ خُوَیلِدٍ اِلَی سُوقِ حُبَاشَۃ (سُوقٌ لِلعَرَبِ بِنَاحِیَۃِ مَکَّۃَ)

(دلائل النبوۃ ج ۲ ص ۶۸)

''ابن شہاب سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ جوان ہوئے تو آپ کے پاس کوئی زیادہ مال نہ تھا چنانچہ خدیجہ بنت خویلدؓ نے آپ کو حباشہ کے بازار کی طرف مالِ تجارت دے کر بھیجا۔''

انقلابی دعوت کیلئے وسائل کی کثرت ضروری نہیں

بعض لوگوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ ایک انقلابی نظریے اور فکر کی اشاعت کر کے اور لوگوں کو اس کا قائل کر کے انقلاب برپا کرنا اور مروج باطل نظام کو ختم کر کے اس کی جگہ صحیح اور صالح نظام قائم کرنا انتہائی کھٹن کام ہے جس کیلئے بے پناہ وسائل واسباب اور بے تحاشا مال ودولت ناگزیر ہے، اس کے بغیر انقلاب کی آواز لگانا بے سود بلکہ مجنونانہ باتیں ہیں۔ اس خدشے کا جواب یہ ہے کہ

(الف) انقلابی نظریے اور فکر کی اشاعت اور اس کی بنیاد پر ایک صالح نظام کے قیام کیلئے وسائل واسباب کی ضرورت واہمیت ایک مسلم امر ہے، جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ دنیا دارالاسباب ہے اور اسباب کے بغیر کوئی معمولی کام کرنا بھی انتہائی مشکل ہے چہ جائیکہ انقلاب جیسا عظیم الشان کام تو ان کے بغیر ناممکن ہے، لیکن یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ انقلابی دعوت کی ابتداء کیلئے کثرتِ وسائل ضروری نہیں، اور جب تک بے پناہ وسائل وذرائع فراہم نہ ہوں تب تک اس کا انتظار کرنا کوئی دانشمندی کی بات نہیں کیونکہ اگر کثرتِ وسائل کی فراہمی کا انتظار کیا جائے پھر تو کبھی بھی انقلاب کی نہ آواز لگائی جاسکتی ہے اور نہ انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے، اس لیے کہ کثرتِ وسائل کی مقدار متعین ہوسکتی ہے اور نہ ان کی فراہمی کا وقت متعین ہوسکتا ہے، پھر یہ وسائل کس طرح کے ہوں، اس کا معیار مقرر کرنا بھی مشکل ہے کیونکہ لوگ تو مختلف طبقات سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کے معیار میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔

(ب) دینِ اسلام نے حسبِ استطاعت جد وجہد لازم کی ہے اور جو کام بندے کی استطاعت سے باہر ہے وہ اس پر لازم نہیں کیا گیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفسًا اِلَّا وُسعَھَا﴾ (البقرۃ: ۲۸۶)

''اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے۔''

اسی طرح حدیثِ نبوی ﷺ ہے

مَنْ رأی منکم منکراً فَلْیُغَیّرہ بیدہ فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان.

(صحیح المسلم کتاب الامارۃ باب اذابویع الخلیفتین)

''تم میں سے جو شخص منکر کو دیکھے اسے چاہیے کہ اسے ہاتھ (طاقت) سے ختم کرے، اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے اور اگر اس کی استطاعت بھی نہ ہو دل سے (اسے برا سمجھے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔''

اس حدیث سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ منکر کے خاتمے کے مختلف درجات ہیں، جس درجے کی بندے میں استطاعت ہے اس کے مطابق عمل کرنا لازم ہے اور جس قدر وسائل فراہم ہوں، چاہے انتہائی قلیل ہوں اس کے مطابق انقلابی نظریے کی دعوت اور اس کی اشاعت اور اس کی بنیاد پر ایک جماعت کا قیام لازم ہے۔ جب دعوت شروع کر دی جائے گی اور استقامت و استقلال کے ساتھ اس کو آگے بڑھایا جائے گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے لیے راستے کھولتے جائیں گے، دعوت قبول کرنے اور اسے آگے پھیلانے والے افراد ملتے جائیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ وسائل و اسباب بھی فراہم ہوتے جائیں گے۔

(ج) یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دنیا میں جتنے بھی انقلاب آئے ہیں اور ایک فکر اور نظریے کی بنیاد پر معاشروں اور نظاموں میں جو تبدیلیاں لائی گئی ہیں، ان کی دعوت دینے والے اور انقلابی تحریکوں کے بانی اور قیادت کرنے والے رہنما بے پناہ وسائل و ذرائع رکھنے والے نہ تھے بلکہ غالب اکثریت کا تعلق متوسط اور غریب طبقے سے تھا۔ اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے جتنے انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو مبعوث کیا ہے ان میں سوائے چند ایک کے، سب بے پناہ مال و دولت اور دنیوی اسباب و وسائل سے محروم تھے، یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے دعوت شروع کی تو انہیں غربت و مسکنت، مال و دولت سے محرومی اور بے سروسامانی کے طعنے دیے گئے حتیٰ کہ امام الانبیاء ﷺ کو بھی اس طرح کی باتیں سننا پڑیں، جیسا کہ آپ آگے چل کر ملاحظہ فرمائیں گے۔

درحقیقت ان داعیوں اور انقلابیوں کو صحیح ایمان وعقائد اور برحق افکار و نظریات کی سب سے بڑی دولت حاصل تھی، ان کا سب سے بڑا اور قیمتی سرمایہ اپنے ایمان وعقائد اور اصول و نظریات پر پختگی اور

ان کی بنیاد پر ایک صالح نظام کی تشکیل کیلئے عزم واستقامت تھا، چنانچہ انہوں نے بے پناہ وسائل واسباب کی عدم دستیابی اور بے سروسامانی کی حالت میں عزمِ مصمم کے ساتھ اپنی دعوت شروع کی، اسے آگے بڑھایا اور بالآخر ایک ایسا نظام قائم کرنے میں کامیاب ہوئے جس پر عمل پیرا ہونے میں انسانیت کی دنیاوآخرت میں کامیابی وکامرانی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک چالیس برس کے قریب ہوئی تو خلوت کا سلسلہ جاری تھا تا آنکہ غارِ حرا میں حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے آپ سے کہا:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ. الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ. (العلق: ۱، ۵)

''پڑھ اپنے رب کے نام سے جو (سب کا) بنانے والا ہے، بنایا آدمی کو جمے ہوئے لہو سے، پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے، سکھلایا آدمی کو جو وہ نہ جانتا تھا۔''

آزمائش اور امتحان کی طرف اشارہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں ما انا بقاری (میں پڑھا ہوا نہیں ہوں) فرمایا۔ تو جبرائیل نے آپ کو پکڑ کر دبایا، تین دفعہ ایسا ہوا۔ جبرائیل کے آپ کو تین دفعہ پکڑ کر دبانے میں جو حکمت تھی، اس سے متعلق علامہ سہیلی لکھتے ہیں:

''اس میں اس امر (نبوت ورسالت) میں سختی ومشقت کا اظہار ہے اور یہ کہ وہ کتاب (قرآن) کو مضبوطی سے تھام لیں اور انتظار چھوڑ دیں کیونکہ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔''

(الروض الانف ج۱ص۱۵۵)

جبرائیل کے آپ کو بار بار دبوچنے کا سبب بیان کرتے ہوئے حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھویؒ لکھتے ہیں:۔

''آپ کو دبوچا اور بار بار دبوچا تا کہ آپ کو جمیع انسانوں کے حکم سے نکالیں، آپ کے دل سے بشری صفات کو نکال کر اس میں ملکی صفات ڈال دیں اور اس میں ایمان اور نبوت کے انوارات بھر دیں۔'' (بذل القوۃ ص۱۱)

ابن کثیر، ابوسلیمان الخطابی سے اس حوالے سے نقل کرتے ہیں:

انما فعل ذلک به لیبلو صبره ویحسن تأدیبه فیرتاض لاحتمال ما کلفهٔ به من اعباء النبوة(البداية والنهاية ج۳، ص۷)

''(جبرائیل نے) یہ اس لئے کیا تا کہ آپ کے صبر کا امتحان لیں اور آپ کی حسنِ تادیب کریں تا کہ آپ کو نبوت کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کی مشق ہو جائے۔''

علامہ سہیلیؒ مزید لکھتے ہیں:

''ان تین دفعہ کے دبانے میں آئندہ پیش آنے والی تین بڑی مشکلات کی طرف اشارہ تھا کہ پہلے آپ ان میں مبتلا ہوں گے جس کے بعد آسانی اور راحت ملے گی، جیسا کہ آپ اور آپ کے اصحاب کرامؓ کو شعب ابی طالب میں بھوک کا سامنا کرنا پڑا جب قریش نے اس بات کا عہد کر لیا تھا کہ وہ ان سے خرید وفروخت کریں گے نہ خوراک ان تک پہنچنے دیں گے، دوسری بڑی مشکل (ہجرت کے وقت) کفار کی طرف سے خوف اور ان کا آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ تھا، تیسری بڑی مشکل جب آپ کو اپنے محبوب وطن سے جلا وطن کر دیا گیا، لیکن آخر کار بہتر انجام متقیوں کے لئے ہے اور تمام تعریفیں رب العالمین کے لئے ہیں۔'' (الروض الانف ج۱ص۱۵۵)

جبرائیل کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دبوچنے کی حکمت اور وجہ سے متعلق مختلف اقوال نقل کئے گئے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ آپ کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ یہ کام یعنی نبوت ورسالت معمولی نہیں بلکہ ایک بھاری ذمہ داری ہے۔

۲۔ اس عظیم الشان ذمہ داری کی انجام دہی میں مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا ہوگا جس کی مشق ابھی سے کرائی جا رہی ہے۔

۳۔ تین دفعہ دبوچنے میں آئندہ پیش آنے والی تین بڑی بڑی آزمائشوں اور مشکلات کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

۴۔ چونکہ اس عظیم الشان کام کی انجام دہی ہر انسان کے بس کی بات نہیں اس لئے آپ کے قلب مبارک میں صفاتِ ملکیہ ڈالی جا رہی ہیں اور اسے انوارِ نبوت سے منور کیا جا رہا ہے۔

الغرض پہلی وحی میں ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آئندہ پیش آنے والے حالات پر متنبہ کیا جا رہا ہے اور آپ کو پہلے دن سے ہی اس کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ داعی انقلاب

کو انقلاب اور تبدیلیٔ نظام کے عظیم الشان کام میں مستقبل میں پیش آنے والے امور اور کٹھن مراحل کا روزِ اول سے ہی پتہ ہونا چاہئے اور پہلے دن سے ہی اس حوالے سے اس کا ذہن صاف اور مشکلات برداشت کرنے کے لئے تیار ہونا چاہئے بلکہ اس دعوت کو قبول کرنے سے قبل ہی ان امور کو پیشِ نظر رکھ لینا چاہئے ۔قائدِ دعوت کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دعوت قبول کرنے والوں پر یہ امور واضح کردے ،انہیں ذہنی ،نفسیاتی اور جسمانی طور پر ان امور کا سامنا کرنے کے لئے تیار کرنا چاہئے تاکہ جب آزمائش و امتحان کا مرحلہ آئے تو یہ ان کے لئے کوئی اجنبی اور ناگہانی چیز نہ ہو بلکہ وہ پہلے سے اس سے آگاہ ہوں بلکہ اس مرحلے سے گزرنے کے لئے تیار ہوں۔

خوشخبری

اولین وحی میں جہاں آئندہ پیش آنے والی مشکلات کی طرف اشارات دے دیئے گئے تھے ،وہاں اس بات کی خوشخبری بھی تھی کہ آگے چل کر نہ صرف آپ کی مشکلات اور آزمائشیں ختم ہوجائیں گی بلکہ فتوحات بھی حاصل ہوں گی ۔بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت جبرائیل دیباج (ریشم) کے ٹکڑے میں اولین وحی کی تحریر لپیٹ کر لائے تھے۔جیسا کہ حضرت الشیخ عبدالحق محدث الدھلویؒ لکھتے ہیں:

''ایک روایت میں ہے کہ جب جبرائیل علیہ السلام نے کہا''اقرأیا محمد!''تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا''میں کیا پڑھوں ،میں تو کچھ پڑھا ہوا نہیں؟اس پر جبرئیل نے موتی اور یاقوت سے مرصع ایک جنتی حریر کا نامہ (تحریر) نکالا اور کہا پڑھیئے ! آپ نے فرمایا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں اور مجھے معلوم نہیں کہ اس میں کیا لکھا ہوا ہے؟'' (مدارج النبوۃ ج۲ص۴۳)

مذکورہ روایت سے متعلق علامہ سہیلیؒ لکھتے ہیں:

فیہ دلیل و اشارۃ الی انّ ھذا الکتاب یفتح علی امتہ ملک الاعاجم ویسلبونھم الدیباج والحریر الّذی کان زیھم وزینتھم وبہ ایضاً ینال ملک الآخرۃ ولباس الجنۃ وھو الحریر والدیباج.(الروض الانف ج۱،ص۱۵۵)

''یہ اس بات کی دلیل اور اشارہ ہے کہ یہ کتاب(قرآن)اپنی امت کے لئے (جو اسے قبول کرکے اس پر عمل پیرا ہوگی) عجمیوں کے ملک فتح کردے گی اور وہ ان (عجمیوں) سے دیباج اور حریر، جو ان کی زیب و زینت ہیں کو چھین لیں گے اور اسی (کتاب) کی بدولت آخرت کی بادشاہت اور

جنت کا لباس جو کہ دیباج اور حریر ہے، پالیں گے۔''

اولین وحی میں غلبۂ اسلام اور فتوحات کی طرف جو مذکورہ اشارہ کیا گیا تھا وہ حرف بحرف پورا ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں دعوت و جہاد کے ذریعے بتدریج دین اسلام کو پورے جزیرۃ العرب پر غالب کر دیا جبکہ آپ کے خلفاءؓ نے دعوت و جہاد کے ذریعے دنیا کی دو طاقتور سلطنتوں یعنی روم اور فارس کو فتح کر کے عجم کے ایک وسیع علاقے پر اسلامی نظام کو عملاً نافذ کر دیا۔

نصرتِ الٰہیہ کے ساتھ آگے بڑھنا ہوگا

انقلاب اور تبدیلئ نظام کوئی معمولی کام نہیں بلکہ ایک انتہائی مشکل اور کٹھن معاملہ ہے، جس کے لئے ہمت، عزم و استقامت لازم ہے، نیز اس کام سے رغبت اور اس میں خلوص اور سنجیدگی ناگزیر ہے جو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توفیق اور نصرت کے بغیر ممکن نہیں، اس لئے داعی پر لازم ہے کہ وہ تقویٰ، للّٰہیت اور تعلق مع اللہ میں زیادہ سے زیادہ مضبوطی لائے اور اس عظیم الشان کام کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ سے محنت، خلوص، توفیق اور نصرت طلب کرے، امام ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

معنی اِقْرَأْ تہیی است برای وحی قرآن وتلاوت آن۔ (فتح الرحمٰن)

''اقرأ کا مطلب ہے قرآن کی وحی (لینے) اور اس کی تلاوت کے لیے تیار ہو جائیں۔''

اولین وحی سے متعلق علامہ سہیلی لکھتے ہیں:

فَقِيلَ لَهُ: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ اَیْ اِنَّكَ لَا تَقْرَأُهُ بِحَوْلِكَ وَلَا بِثِقَةِ نَفْسِكَ وَلَا بِمَعْرِفَتِكَ وَلٰكِنْ اِقْرَأْ مُفْتَتِحًا بِاسْمِ رَبِّكَ كَمَا خَلَقَكَ وَكَمَا نَزَعَ عَنْكَ عَلَقَ الدَّمِ وَمَغْمَزَ الشَّيْطَانِ بَعدَ مَا خَلَقَ فِيْكَ كَمَا خَلَقَ فِي كُلِّ اِنْسَانٍ.

(الروض الأنف ج ۱ ص ۱۵۴)

''آپ سے کہا گیا آپ اپنے رب کے نام سے پڑھیے یعنی آپ اسے اپنی طاقت وقوت اور معرفت سے نہیں پڑھ سکتے، بلکہ آپ اللہ کے نام سے پڑھنا شروع کیجئے جیسا کہ اس نے آپ کو پیدا کیا، گوشت کے لوتھڑے سے نکالا اور شیطان کے شر کو آپ میں پیدا کرنے کے بعد (جیسا کہ ہر انسان میں پیدا کیا جاتا ہے) اسے نکالا۔''

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلی ہی وحی میں بتایا جا رہا ہے کہ ٹھیک ہے کہ آپ اُمّی ہیں لیکن آپ نے یہ عظیم الشان کام انجام دینا ہے لیکن یہ کام محض اپنی طاقت وصلاحیت کے بل بوتے پر انجام نہیں

دینا بلکہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی نصرت و تعاون سے آپ اس کی ابتدا کریں اور پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ جب تک نصرتِ الٰہیہ شاملِ حال نہ ہو یہ عظیم الشان کام انجام دینا انسان کے بس کی بات نہیں۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت جبرائیل نے عرض کیا کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) شیطان کی شر سے پناہ مانگئے آپ نے پڑھا ''استعیذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم'' پھر جبرائیل نے کہا کہیے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، اس کے بعد کہا ''اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ''

الشیخ عبدالحق محدث دہلویؒ مذکورہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

یعنی تو بحول قوت منگر بتائید وتقویت ما کہ پروردگار ومعلم تو ایم بہین۔ (مدارج النبوۃ ج۲ص۴۳)

''مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی قوت و طاقت کی جانب نہیں بلکہ ہماری تائید وتقویت کی جانب نظر رکھئے کہ ہم آپ کے رب اور معلم ہیں''۔

آپ پر یہ واضح کر دیا گیا کہ اپنی طاقت وقوت کے بل پر نہیں بلکہ جو ذات آپ کو یہ ذمہ داری تفویض کر رہی ہے، اس کی نصرت ومدد پر نظر رکھیے اور اسی سے توفیق مانگیے، چنانچہ امام قرطبی ''اِقْرَأْ وَرَبُّکَ'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اقرأ یامحمد وربک یعینک ویفھمک وان کنت غیر القاری.

(الجامع لاحکام القرآن ، تفسیر سورۃ العلق)

''اے محمد! پڑھئے، آپ کے رب آپ کی اعانت کریں گے، آپ کو سمجھا دیں گے اگرچہ آپ پڑھ نہیں سکتے۔''

رسول ﷺ امی تھے۔ اس لیے وحی الٰہی کو پڑھنے سے عذر ظاہر فرمایا لیکن آپ سے کہا گیا کہ آپ اس وحی کو پڑھئے، اس کے مطالب ومفاہیم سمجھنے اور اس کے مطابق نبوت ورسالت کی ذمہ داری انجام دینے میں کسی مشکل کا سامنا نہ کریں گے بلکہ ان تمام امور میں اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کی اعانت کریں گے۔

علم کی اہمیت

اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَم .(العلق : ۴)

''جس نے علم سکھلایا قلم سے۔''

توحید، نبوت و رسالت اور جملہ عقائد کی اشاعت، مقصدِ رسالت ''اظہارِ دین'' (تمام ادیان پر غلبہ) کا حصول اور اسلام اور تمام مسلمانوں کی ترقی وعروج کا محور قرآنی تعلیمات ہیں۔ اس لئے اولین وحی میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے علم کی اہمیت کو بالکل واضح بیان کر دیا۔ علم کی اہمیت یوں تو ہر دور میں مسلم رہی ہے، لیکن عصر حاضر میں اس کی ضرورت واہمیت ایک کھلی حقیقت ہے، جس سے انکار ممکن نہیں۔ اقوام کے عروج وزوال میں علم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جو اقوام علوم میں مہارت حاصل کرتی اور ان کی بنیاد پر زندگی کے مختلف شعبوں میں ترقی کی منازل طے کرتی ہیں وہی دوسری اقوام پر عروج وغلبہ حاصل کرتی ہیں۔ اس لئے داعیٔ انقلاب پر یہ لازم ہے کہ وہ علوم کی ضرورت واہمیت اور حیثیت کو ہمیشہ مدنظر رکھے اور ارکانِ تحریک کو بھی علوم وفنون کے حصول اور ان میں مہارت حاصل کرنے کی طرف راغب کرے۔

داعی اور ارکانِ تحریک کو چاہئیے کہ وہ سب سے پہلے دینی علوم خصوصاً قرآن کریم اور سنت وحدیث سے آگاہی حاصل کریں۔ قرآنی علوم ومعارف پر عبور حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ سنت اور حدیث کا معنیٰ ومفہوم اور اسرار وحکمتیں معلوم کی جائیں۔ الغرض اپنی دعوت کا مرکز ومحور قرآن وسنت کو ہی بنایا جائے، نیز قرآن، سنت اور فقہ سے منتخب ایسا نصاب تیار کیا جائے جس کے ذریعے ارکان تحریک کی باقاعدہ تعلیم وتربیت کا نظم قائم کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ عصری علوم وفنون کے حصول اور ان میں مہارت حاصل کرنے کی بھی خوب سعی کی جائے کیونکہ انقلابی تحریک موجودہ باطل اور فرسودہ نظام کو ختم کر کے اس کی جگہ اسلامی نظام لانا چاہتی ہے تو اس نظام کو چلانے کے لئے رجالِ کار کی تیاری ناگزیر ہے۔

وہبی علوم

﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ﴾

''سکھلایا آدمی کو جو وہ نہ جانتا تھا۔''

مذکورہ آیت میں علم لدنی اور علمِ وہبی کی طرف اشارہ ہے گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد ''ماانابقاری'' (میں پڑھا ہوا نہیں ہوں) کا جواب دیا گیا ہے کہ انبیاء کی تعلیم کے لئے کتاب اور قلم ضروری نہیں ان اسبابِ ظاہری کی وساطت کے بغیر بھی علوم ومعارف عطا کئے جاتے ہیں۔

مذکورہ وحی کے بعد آپ گھر تشریف لائے اور بدن مبارک پر لرزہ اور کپکی طاری تھی۔ آتے ہی اپنی

رفیقۂ حیات ام المؤمنین حضرت سیدہ خدیجہؓ سے فرمایا:

زمّلونی زمّلونی. (صحیح البخاری باب کیف کان بدء الوحی)

''مجھے کچھ اڑھاؤ۔''

امام بخاری سیدہ عائشہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

لقد خشیت علی نفسی. (ایضاً)

''مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے۔''

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ کی تشریح علامہ سہیلی نے اس طرح کی ہے۔

ای خشیت علی نفسی الاانتهض باعبأ النبوة واَنُ اضعف عنها ثم ازال الله خشیتهٗ ورزقه' الاید والقوة والثبات والعصمة (الروض الانف اول ۱۵۶)

''یعنی مجھے اپنے متعلق اس بات کا خطرہ ہے کہ کہیں میں نبوت کی ذمہ داری نہ اٹھا سکوں، کمزوری کا مظاہرہ کروں، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کا خوف ختم کردیا، آپ کو طاقت وقوت اور ثابت قدمی اور عصمت عطا فرمائی۔''

اولین وحی کے بعد آپ پر طاری ہونے والی گھبراہٹ پر ہونے والے اشکال کا جواب دیتے ہوئے علامہ سہیلی بعض حضرات کی یہ رائے نقل کرتے ہیں:

''کہا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خوف اس بناء پر تھا کہ کہیں آپ ﷺ کی قوم آپ کو قتل نہ کرے اور یہ خوف قابل اعتراض یا عیب کی بات نہیں کیونکہ آپ ﷺ بشر ہیں اور جیسے انسان قتل اور سخت تکالیف سے ڈرتا ہے آپ بھی اس بشری تقاضے کی وجہ سے ان سے ڈرتے تھے، پھر آپ کے لیے اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہر قسم کے خوف میں صبر واستقامت آسان ہوگئی اور آپ کے دل میں کامل طور پر شجاعت وقوت ڈال دی گئی۔'' (الروض الأنف ج ا ص ۱۵۷)

چونکہ وحی کے انوار وتجلیات کا آپ پر اچانک نزول ہوا تھا اس لیے وحی کی عظمت اور جلال کی وجہ سے آپ یہ سمجھے کہ اگر وحی اسی طرح نازل ہوتی رہی تو ممکن کہ میری بشریت، وحی کے بوجھ کو نہ برداشت کرسکے یا نبوت کے بوجھ سے مغلوب ہوکر فنا ہوجائے چنانچہ درج ذیل آیت میں اسی ثقل کی طرف اشارہ ہے۔

﴿اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلاً ثَقِیْلاً﴾ (المزّمّل: ۵)

''(اے محمد) ہم تم پر ایک ثقیل اور بھاری کلام نازل کریں گے۔''

خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت و رسالت میں کسی قسم کا تردد اور شک نہ تھا۔

(۲) آپ پر جو لرزہ، خوف اور پریشانی طاری ہوئی یہ بشری تقاضے کی بنا پر تھی، جو قابل اعتراض اور عیب کی بات نہیں۔

(۳) آپ کو شک نہیں بلکہ اس بات کی پریشانی تھی کہ نبوت و رسالت کی بھاری ذمہ کو کیسے انجام دیں گے۔

(۴) آپ کو اس بات کا خوف تھا کہ جو ذمہ داری آپ پر عائد کی گئی ہے اس کو انجام دینے کے نتیجے میں قوم آپ کو قتل بھی کر سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ تمام اندیشے اور خدشات ختم کر دیے، آپ کو ہمت، جرأت، شجاعت اور طاقت عطا کی گئی اور آپ نے یہ عظیم الشان ذمہ داری نہ صرف انجام دی بلکہ اس کا حق ادا کر دیا، لہٰذا داعیٔ انقلاب کو خطرات، خدشات اور خوف کے باوجود پیچھے نہ ہٹنا چاہئے بلکہ آگے بڑھنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ سے ہمت، جرأت، شجاعت اور ثابت قدمی کی توفیق مانگتے رہنا چاہئے۔

نبوت ایک بھاری ذمہ داری

نبوت کوئی معمولی کام نہیں بلکہ ایک ایسی بھاری ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برآ ہونا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں، اس کے لئے انتہائی باہمت، جرأت مند اور استقلال اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنے والے افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے ہی باصفات افراد کو منتخب فرماتے ہیں اور ان سے اقوام اور ممالک کی ہدایت کا عظیم کام لیتے ہیں، ابن ہشام لکھتے ہیں:

والنبوة أثقال و مؤنة لا يحملها و لا يستطيع بها إلا أهل القوة و العزم من الرسل بعون الله تعالى و توفيقه لما يلقون من الناس و ما يرد عليهم مما جاء وا به عن الله سبحانه و تعالى. (ابن هشام ج ١، ص ١٥٧)

''نبوت ایک بھاری ذمہ داری اور مشقت بھرا کام ہے، اسے صاحبِ قوت اور صاحب عزم رسول ،اللہ کی نصرت اور توفیق سے اس کی استطاعت رکھتے اور اسے اٹھا سکتے ہیں، اس لئے کہ اس کی انجام دہی میں لوگوں کی طرف سے تکالیف اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ تعلیمات کی تردید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

حوصلہ افزائی

سیدہ خدیجہؓ اپنے چچازاد ورقہ بن نوفل کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت سے متعلق معلوم کر چکی تھیں، اولین وحی کے نزول کے بعد آپ نے سب سے پہلے اپنی زوجہ مطہرہ کو ہی آگاہ کیا تھا، اس لئے وہ آپ پر ایمان لے آئیں اور روزِ اول سے وفات تک آپ کی غمخوار اور غمگسار رہیں، ہر مشکل گھڑی میں آپ کا ساتھ دیا اور آپ کو حوصلہ دیا۔

''وہ اللہ اور اس کے رسول پر سب سے پہلے ایمان لانے والی اور تصدیق کرنے والی تھیں۔ ان کی بدولت اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا غم ہلکا کر دیا، آپ کی تردید کی جاتی یا تکذیب کی جاتی جس سے آپ غمگین ہوجاتے تو جب آپ ان کی طرف (گھر) لوٹتے تو ان کی بدولت آپ کا غم جاتا رہتا، وہ آپ کو تسلی دیتیں، آپ کا غم ہلکا کرتیں، آپ کی تصدیق کرتیں تو لوگوں کی باتوں کا اثر باقی نہ رہتا، اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نازل فرمائیں۔'' (السیرۃ لابن ہشام ج ۱، ص ۱۵۷، ۱۵۸)

حوصلہ افزائی کرنا اور غمزدہ آدمی کو تسلی دے کر اس کا بوجھ ہلکا کرنا ایک ایسی چیز ہے جس سے داعی کے اندر حوصلہ اور اپنے اوپر اعتماد پیدا ہوتا ہے، چنانچہ داعی مایوس ہوتا ہے اور نہ دلبر داشتہ ہوکر بیٹھ رہتا ہے، نہ اپنی دعوت افکار و نظریات سے پیچھے ہٹتا ہے اور نہ باطل نظام اور اس کے محافظوں اور کارندوں سے کوئی سمجھوتا کرتا ہے، حوصلہ افزائی دعوت کے ابتدائی زمانے میں بہت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس زمانے میں دعوت کو قبول کرنے والے افراد کم اور اس کا رد کرنے والے اور داعی کی تکذیب اور اسے طعن و تشنیع کا نشانہ بنانے والے لوگ تعداد میں زیادہ اور وسائل کے لحاظ سے مضبوط ہوتے ہیں۔

سلیم الفطرت افراد کی تلاش

اس پہلی وحی کے بعد آپ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ اپنے چچازاد ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آنے والا واقعہ بیان کیا تو انہوں نے حضرت خدیجہؓ سے کہا کہ ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں ورقہ بن نوفل کی جان ہے، اے خدیجہ! اگر تم سچ کہتی ہو تو یقیناً ان کے پاس وہی ناموس اکبر آئے ہیں جو موسیٰ کے پاس آیا کرتے تھے، بلاشبہ یہ اس امت کے نبی ہیں، ان سے کہہ دیجئے کہ وہ اس پر ثابت قدم رہیں۔'' (السیرۃ لابن ھشام ج ۱ ص ۱۵۵)

کفر کی تاریکیوں اور شرک کی ظلمتوں کے باوجود ہر دور میں سلیم الفطرت اور آسمانی تعلیمات

پر یقین رکھنے والے حضرات محدود تعداد میں ضرور موجود رہے ہیں جو نہ صرف خود خدا کی توحید کے قائل اور شرک سے دور رہے بلکہ ایک حد تک لوگوں کو اس پر مائل کرنے کی کوششیں کرتے رہے ہیں۔ ورقہ بن نوفل بھی سلیم الفطرت آدمی اور دینِ مسیحیت کے عالم تھے، اس لئے آسمانی تعلیمات اور زبور، انجیل کی روشنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی توثیق کی بلکہ وہ آپ کو ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنے کا بھی کہہ رہے ہیں۔ داعیٔ انقلاب پر یہ لازم ہے کہ وہ ایسے سلیم الفطرت اور حق بات کو سمجھنے اور اسے قبول کرنے والے افراد کو ڈھونڈ نکالے اور انہیں اپنے دائرے میں لے آئے، کیونکہ ایسے لوگوں کی تائید، توثیق، تصدیق اور حمایت ونصرت بہت مفید ہوتی ہے۔

دعوت میں مستقبل کی مشکلات

حضرت خدیجہؓ گھر واپس آئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ورقہ کے تبصرے کے بارے میں بتایا۔ بعد میں طواف کعبہ کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ورقہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے آپ سے کہا:

بعض روایات کے مطابق سیدہ خدیجہؓ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئی تھیں۔ اس سے متعلق الشیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

والذي نفسي بيده إنك لنبي هذه الأمة ولقد جاءك الناموس الأكبر الذى جاء موسى ولتكذبنه ولتؤذينه ولتخرجنه ولتقاتلنه ولئن انا ادركت ذلك اليوم لأنصرن الله نصرا يعلمه.(السيرة لا بن هشام ج ۱، ص ۱۵۵)

''قسم ہے! اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، آپ اس امت کے نبی ہیں، آپ کے پاس وہی ناموس اکبر آئے ہیں جو موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس آتے تھے، (یاد رکھیں) آپ کو جھٹلایا جائے گا، آپ کو تکالیف دی جائیں گی، آپ کو (اپنے شہر سے) نکال دیا جائے گا، آپ سے جنگ کی جائے گی اور اگر میں نے وہ زمانہ پایا تو میں اللہ (کے دین) کی ایسی نصرت کروں گا جسے وہ جان لے گا۔''

درقصہ بردن خدیجہؓ آنحضرتؐ رانزد ورقہ و پرسیدن کیفیت حال اشارت است کہ مشاورت استفسار واستکشاف دروقت حیرت واشتباہ ازعلماء واہل بصائر لازم است تاک راہی بمقصود نمایند۔ (مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۴۵)

''سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ورقہ کے پاس لے جانے کے واقعے میں یہ اشارہ ہے کہ حیرت واشتباہ کے وقت علماء اور اہل بصیرت سے مشورہ اور استفسار کرنا لازم ہے تا کہ مقصد کی طرف رہنمائی حاصل ہو سکے۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اربابِ دعوت کو وقت کے علماء، فقہاء، اتقیاء وغیرہم سے بے نیاز نہیں ہونا چاہئے بلکہ ان سے مشاورت کرنا چاہئے، ان کے تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور ان سے رہنمائی حاصل کرتے رہنا چاہئے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ جہاں ان کی طرف سے حوصلہ افزائی اور رہنمائی ملے گی وہاں وہ دعوت کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر بھی نظر رکھیں گے اور اربابِ دعوت کو اس سے آگاہ کرتے رہیں گے، جس کا یہ فائدہ ہوگا کہ دعوت ''صراط مستقیم'' پر رہے گی اور راہِ اعتدال سے اِدھر اُدھر نہ بھٹکے گی۔ امام بخاریؒ نے ام المؤمنین سیدہ عائشہؓ سے یہ الفاظ روایت کیے ہیں:

هذا الناموس الذی نزل الله علیٰ موسیٰ یالیتنی فیها جذعاً یا لیتنی اکون حیاً اذ یخرجک قومک فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم او مخرجیّ هم قال نعم لم یأتِ رجلٌ قطّ بمثل ماجئت به الاّ عودی واِنْ یدرکنی یومک انصرک نصراً مؤزراً. (صحیح البخاری باب کیف کان بدٔالوحی)

''یہ وہی ناموس (راز دار فرشتہ) ہے جسے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) پر نازل کیا تھا، کاش کہ میں اس وقت جوان اور زندہ رہتا جب آپ کی قوم آپ کو (آپ کے شہر سے) نکال دے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا، کیا وہ مجھے نکال دیں گے؟ ورقہ نے جواب دیا، جی ہاں جب کبھی کوئی آدمی ایسی تعلیمات لایا ہے جو آپ لائے ہیں تو اس سے دشمنی اختیار کی جاتی ہے، اگر میں نے آپ (کی دعوت) کا زمانہ پایا تو آپ کی بھرپور نصرت ومدد کروں گا۔''

الشیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

یعنی سنت الٰہی بران جاہمیست کہ کافران ہمیشہ دشمن پیغمبران میباشد ہیچ پیغمبری نیامد مگر آنکہ دشمن داشتند اورا کافران۔ (مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۴۵)

''مطلب یہ ہے کہ سنت الٰہی اسی طرح جاری ہے کہ کفار ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کے دشمن رہے ہیں اور کوئی نبی ایسا نہیں آیا جس سے کافروں نے دشمنی نہ کی ہو۔''

صاحب مواہب نے ورقہ بن نوفل کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

ابشر فانا اشهد انک الذی بشر به ابن مریم وانک علیٰ مثل ناموس موسیٰ و انک نبی مرسل وانک ستؤمر بالجهاد وان ادرک ذلک لا جاهدنّ معک. (المواهب اللدنیه مع شرح الزرقانی ج ۱، ص ۲۵۲)

''آپ کو بشارت ہو، میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ آپ وہی (آخری رسول) ہیں جس کی ابن مریم (علیہ السلام) نے بشارت دی تھی اور آپ کے پاس بھی موسیٰ (علیہ السلام) والے راز دار (فرشتے) کی طرح (فرشتہ) آیا ہے۔ آپ نبی اور رسول ہیں، آپ کو عنقریب جہاد کا حکم دیا جائے گا اور اگر میں نے یہ زمانہ پایا تو آپ کے ساتھ مل کر ضرور جہاد کروں گا۔''

جب ورقہ نے آپ کو کہا کہ ''آپ کی قوم آپ کو نکال دے گی'' تو آپؐ نے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا ''آپ جو تعلیمات لائے ہیں جو آدمی بھی یہ لاتا ہے اس سے دشمنی اختیار کی جاتی ہے''۔ علامہ حلبی اس سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وهذا یفید بظاهره ان من تقدم من الانبیاء اخرجوا من اماکنهم لمعاداة قومهم لهم(السیرة الحلبیه ج ۱، ص ۲۳۲)

''بظاہر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سابق انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ان کی قوموں نے عداوت کی بنا پر ان کے مقامات سے نکال دیا تھا۔''

قرآن وسنت میں اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ان کی اپنی قوموں نے اپنے شہروں سے نکال دیا تھا کیونکہ جو دعوت انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام اپنی اپنی اقوام کے سامنے پیش کرتے تھے، اس سے ان کے عقائد ونظریات کی نفی ہوتی تھی اور انہیں اس بات کا خدشہ لاحق ہوتا تھا کہ اگر یہ دعوت پھیل گئی تو ان کے عقائد ونظریات کا خاتمہ ہو جائے گا، ان کے مروجہ رسوم ورواج کی موت واقع ہوگی اور ان کا نافذ کردہ نظامِ زندگی دھڑام سے گر جائے گا، لہٰذا وہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ اس دعوت کی اشاعت روکنے کے لئے ان انبیاء کرام علیہم السلام کو اپنے علاقوں سے نکال کر جلا وطن کر دیا جائے جیسا کہ حضرت لوط علیہ السلام سے متعلق ان کی قوم نے کہا:

﴿وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ﴾(الاعراف: ۸۲)

''اور کچھ جواب نہ دیا اس کی قوم نے مگر یہی کہا کہ نکالو ان کو اپنے شہر سے، یہ لوگ بہت ہی پاک

رہنا چاہتے ہیں۔''

یہی صورت حال خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پیش آئی کہ آپ کو اپنا محبوب آبائی شہر چھوڑ کر دوسرے علاقے میں جانا پڑا جیسا کہ تفصیل آگے آئے گی۔

وطن کی محبت اور دعوت کیلئے اس سے ہجرت

ورقہ کے قول لتخرجنه کے جواب میں آپ نے او مخرجيّ هم فرمایا۔ اس سے استدلال کرتے ہوئے علامہ سہیلی لکھتے ہیں:

ففي هذا دليل علىٰ حب الوطن وشدة مفارقته على النفس وايضاً فانه حرم الله وجوار بيته وبلدة ابيه اسماعيل. (الروض الانف ج ١، ص ١٥٨)

''یہ اس بات کی دلیل ہے کہ (آپ کو) وطن سے محبت تھی اور اس سے جدائی طبیعت پر ناگوار تھی، کیونکہ وہ اللہ کا حرم، ان کے گھر کا پڑوس اور آپ کے جد اعلیٰ حضرت اسماعیلؑ کا شہر تھا۔''

اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے یہ بتلایا جارہا ہے کہ آئندہ اس دعوتِ حقہ میں کیا کیا مشکلات پیش آنے والی ہیں اور کن کن دشواریوں سے گزرنا پڑے گا، تاکہ آپ پہلے سے اس کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو جائیں، کیونکہ ماضی میں بھی بے شمار داعیِ حق یعنی انبیاء ورسل علیہم الصلوۃ والسلام اور ان کے متبعین اور پیروکار، ان مراحل سے کامیابی کے ساتھ گزرے ہیں اور انہیں بھی دین کی اشاعت اور غلبے کے لئے اپنا گھر بار، وطن اور شہر چھوڑنا پڑا، چنانچہ جو مشکلات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئیں بیشک اس سے پہلے کسی داعیِ حق کو ایسے شدید مصائب و آلام کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مصائب کو نہ صرف خندہ پیشانی سے برداشت کیا بلکہ جوں جوں دعوتِ حقہ کے مخالفین کی عداوت اور ان کا ظلم وستم بڑھتا گیا آپ اس سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ اپنی دعوت اور فکر کو آگے بڑھاتے گئے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو روزِ اول سے ہی متنبہ کیا جارہا ہے کہ آپ کو یہ مشکلات پیش آئیں گی آپ دعوت دیں گے تو مشرکین مکہ کی طرف سے۔

۱۔ آپ کی تکذیب کی جائے گی، آپ کی نبوت رسالت اور پیش کردہ عقائد وافکار کو جھٹلایا جائے گا اور آپ کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈہ کیا جائے گا۔

۲۔ مشرکین مکہ کی طرف سے آپ کی تکذیب اور آپ کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے

کے باوجود دین حق کی اشاعت جاری رہے گی اور دعوت قبول کرنے والوں میں روز بروز اضافہ ہوتا ہے جائے گا تو مشرکین مکہ آپ کو اور آپ کے اصحاب کرامؓ کو ایذائیں پہنچائیں گے، انہیں شدید تکالیف دیں گے، ان پر جبر و تشدد کریں گے اور انہیں ظلم و ستم کا نشانہ بنائیں گے۔

۳۔ مخالفت، جھوٹے پروپیگنڈے، جبر و تشدد اور ظلم و ستم کے باوجود دعوت پھیلتی جائے گی تو مشرکین مکہ اپنے علاقے سے نکلنے اور جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیں گے اور اپنا گھربار، خاندان، کاروبار، تجارت، مال و دولت اور محبوب وطن چھوڑنا پڑے گا۔

۴۔ جلاوطنی اور ملک بدری کے باوجود مشرکین مکہ کو آپ اور آپ کے اصحاب سے خطرہ محسوس ہوگا تو وہ جنگ اور لڑائی پر اتر آئیں گے، آپ اور آپ کے اصحاب پر حملہ آور ہوں گے لیکن انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا اور فتح اور غلبہ حق کو حاصل ہوگا۔

حکمِ صلوٰۃ، فکر و عمل ساتھ ساتھ

جہاں پہلی وحی کے ذریعہ آپ کو نبوت عطا کی گئی، نظریۂ توحید پہنچایا گیا اور اسلام کے بنیادی اصولوں کی تعلیم دی گئی وہاں اس کے ساتھ ساتھ عمل کا بھی سلسلہ شروع کر دیا گیا، چنانچہ نماز کا حکم دیا گیا، اس کی ادائیگی کی تعلیم دی گئی اور آداب سکھائے گئے، اس لیے کہ محض عقیدہ اور فکر و نظریے تک محدود رہنا کافی نہیں ہے بلکہ اس کو عملی جامہ پہنانا بھی ضروری ہوتا ہے کیونکہ کسی بھی عقیدے، فکر اور نظریے کی بنیاد پر معاشرے اور نظام میں اس وقت تبدیلی لائی جا سکتی ہے جب اس کے لئے عملی قدم اٹھایا جائے اور باقاعدہ جدوجہد کی جائے۔ محض فکر اور نظریہ پیش کرنا اور اس کا پرچار کرنا کافی نہیں ہوتا بلکہ منظم طور پر اس فکر اور نظریے کی بنیاد پر لائحہ عمل اختیار کرنا، اس فکر اور نظریے کو قبول کرنے والوں کو ایک نظم میں جوڑنا یعنی ان کی جماعت تشکیل دینا اور اسے تعلیم و تربیت اور دیگر مراحل سے گزارتے ہوئے اس کے ذریعے مروج نظام کو منہدم کرنا ضروری ہوتا ہے تب ایک نیا معاشرہ اور نظام تشکیل دیا جا سکتا ہے، لہٰذا فکر اور نظریے کے ساتھ عملی قدم اٹھانا ناگزیر ہے۔ ابن اثیر لکھتے ہیں:

ثم كان اول شيء فرض الله من شرائع الاسلام عليه بعد الاقرار بالتوحيد والبرأة من الاوثان الصلوة. (الکامل لابن اثیر ج ۲ ص ۳۲)

''توحید کے اقرار اور بتوں سے برأت کے اعلان کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسلام کے احکام و تعلیمات میں سے سب سے پہلے نماز فرض فرمائی۔''

چنانچہ اسامۃ بن زیدؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جبرائیل اولین وحی لے کر آپ کے پاس آئے تو آپ کو وضو اور نماز کا طریقہ سکھایا۔''

(الوفاً لابن جوزی ج۱،ص۱۶۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف خود نماز کے حکم پر عمل کیا بلکہ دوسروں کو اس کی تعلیم دینا بھی شروع کر دی جیسا کہ ابن ہشامؒ لکھتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ کے پاس تشریف لائے اور جیسے جبرائیل نے وضو کر کے دکھایا تھا، ویسے انہیں وضو کر کے دکھایا تو انہوں نے آپ کی طرح وضو کیا، پھر جیسے حضرت جبرائیل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھ کر دکھلائی تھی ویسے آپ نے انہیں نماز پڑھائی تو انہوں نے ویسے ہی پڑھی۔'' (السیرۃ لابن ہشام ج۱،ص۱۶۰)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ انقلابی فکر و دعوت قبول کرنے کے بعد نہ صرف خود اس کے لائحہ عمل پر عمل پیرا ہوا جائے بلکہ دوسروں کو بھی اس کی تعلیم و ترغیب دی جائے اور انہیں عملی اقدام پر آمادہ کیا جائے۔

اشاعتِ دعوت کی ابتداء

حضرت علامہ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی حضرت ابوبکر الصدیقؓ کے اسلام قبول کرنے سے متعلق لکھتے ہیں:

روی ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بعث فی اول نہار یوم الاثنین واسلم ابوبکر فی آخر ذلک الیوم (بذل القوۃ ص ۴)

''یہ روایت آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوموار کے دن کے پہلے حصے میں مبعوث ہوئے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ اسی روز کے آخری حصے میں مسلمان ہو چکے تھے۔''

امام بیہقی ابن اسحاق سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میں نے جس کسی کو بھی دعوت دی تو اس نے تردد اور غور و فکر کیا مگر ابوبکر نے کہ جب میں نے ان سے بات کی تو انہوں نے قبول کرنے میں دیر کی اور نہ اس میں تردد کیا۔'' (دلائل النبوۃ ج۲،ص۱۶۴)

فترۃ الوحی

اولین وحی کے نزول کے بعد فترۃ الوحی یعنی وحی منقطع ہونے کا زمانہ شروع ہوا جس کی مدت کے بارے میں مختلف اقوال نقل کیے گئے ہیں۔

اول تعلیم پھر تبلیغ

صاحب مواہب لکھتے ہیں:

فقد تبين ان نبوته عليه الصلوة والسلام كانت متقدمة على ارساله كما قال ابو عمر وغيره كما حكاه ابو اسامه بن النقاش وكان فى نزول "اِقْرَأْ" نبوته وفى سورة المدثر ارساله بالنذارة والبشارة والتشريع وهذا قطعا متاخر عن الاول لانه لما كانت سورة اِقْرَءْ متضمنة لذكر اطوار الآدمى من الخلق والتعليم والافهام ناسب ان تكون اول سورة انزلت وهذا هو الترتيب الطبيعى وهو ان يذكر سبحانه وتعالى ما اسداه الى نبيه عليه الصلوة والسلام من العلم والفهم والحكمة والنبوة ويمن عليه بذلك فى معر ض تعريف عباد ه بمااسداه اليهم من نعمة البيان الفهمى والنطقى والخطى ثم يامره سبحانه وتعالى ان يقوم فينذرعباده(المواهب مع الشرح الزقانى ج ا ص ۴۴۲،۴۴۳)

یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت آپ کی رسالت سے مقدم تھی جیسا کہ ابوعمر اور دیگر نے کہا ہے جسے ابواسامہ النقاش نے نقل کیا ہے کہ سورہ اقراء سے آپ کو نبوت ملی اور سورہ المدثر میں ''ڈرانے، بشارت سنانے اور شرعی احکام کے ذریعے آپ کو رسالت عطا کی گئی اور یہ رسالت قطعی طور پر پہلی چیز (نبوت) سے موخر ہے اس لیے کہ جب سورہ اقراء انسانی اطوار تخلیق، تعلیم اور تفہیم کو متضمن ہے تو مناسب یہ ہے کہ یہ سب سے پہلے نازل ہونے والی سورت ہو اور یہی طبعی وفطری ترتیب ہے اور وہ یہ کہ اللہ تبارک وتعالی نے پہلے اپنے نبی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) پر کیے جانے والے احسانات علم، فہم، حکمت اور نبوت کا ذکر کیا ہے اور یہ اپنے بندوں کی تعریف کے ضمن میں آپ پر بیانِ فہمی، نطقی اور خطی کے احسان کو ذکر کر کے کیا ہے، بعد میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حکم دیا کہ وہ اٹھ کھڑے ہوں اور اس کے بندوں کو خبردار کریں۔''

اربابِ دعوت پر اس فطری ترتیب کو اختیار کرنا لازم ہے۔ دعوت قبول کرنے والے افراد کو تعلیم وتربیت کے مرحلے سے گزارا جائے۔ انہیں دعوت وتحریک کا نصاب باقاعدہ طور پر پڑھایا جائے، ان کی روحانی وفکری تربیت کی جائے، پھر انہیں تبلیغ ودعوت پر ماموکیا جائے اور ان کی باقاعدہ تشکیل کی جائے تاکہ وہ تعلیم وتربیت کے ذریعے تحریک کے افکار ونظریات سے آگاہ ہوجائیں بلکہ ان کے اندر

رچ بس جائیں، پھر جب وہ دعوت کے لئے نکلیں تو مخاطبین کے سامنے مؤثر انداز میں تحریک کی دعوت اور افکار ونظریات پیش کر کے انہیں اس دعوت کو قبول کرنے اور اس کی حمایت ونصرت کرنے پر آمادہ کرسکیں۔ الغرض تعلیم وتربیت کے مرحلے سے گزرنے کے بعد تبلیغ ودعوت کے لئے نکلنا زیادہ مفید اور مؤثر ہوتا ہے۔

فترۃ کے خاتمے کے بعد لگاتار وحی کے نزول کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ فترۃ کا زمانہ سورۃ المدثر کے نزول کے ساتھ ختم ہوا۔ امام بخاری روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''میں پیدل چل رہا تھا کہ اتنے میں میں نے آسمان سے آواز سنی، میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہی فرشتہ تھا جو میرے پاس غارِ حرا (پہلی وحی لے کر) آچکا تھا، اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں ''اے لحاف میں لپٹنے والے، کھڑا ہو پھر ڈر سنادے، اور اپنے رب کی بڑائی بول، اور اپنے کپڑے پاک رکھ، اور گندگی سے دور رہ'' اس کے بعد وحی کا لگاتار سلسلہ شروع ہوگیا۔''

(صحیح البخاری باب کیف کان بدُ الوحی)

ثم تتام الوحی الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو مؤمن باللہ مصدق بما **جاء ہ منہ قد قبلہ بقبولہ وتحمل منہ ماحمل علی رضا العباد وسخطھم.**

(الروض الانف ج ا ص)

''پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لگاتار وحی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ آپ اللہ پر ایمان رکھتے، جو احکام الٰہیہ آپ کو ملتے ان کی تصدیق کرتے، آپ نے اس (ذمہ داری) کو قبول کرلیا اور اس (ذمہ داری) کو کامل طریقے پر اٹھالیا، چاہے لوگ اس پر راضی ہوں یا ناراض۔''

انقلابی دعوت کو قبول کرنے اور یہ عظیم الشان ذمہ داری اٹھانے کے بعد داعیٔ انقلاب کو اس بات کی پراوہ نہیں کرنی چاہئے کہ لوگ اس پر راضی اور خوش ہیں یا ناراض، کیونکہ لوگ تو انقلابی فکر اور نظریے کو کبھی بھی اشاعت پذیر ہوتا اور پروان چڑھتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے بلکہ وہ تو اس بات کی بھرپور کوشش کرتے ہیں کہ اس کی مخالفت کریں، اس کے خلاف خوب پروپیگنڈہ کریں اور ارکان دعوت پر ظلم وستم ڈھا کر اس دعوت اور تحریک کو بزور دبادیں، لیکن انقلابی فکر اور دعوت دبنے یا ختم ہونے والی نہیں بلکہ وہ تو پھیلنے اور غالب ہونے والی ہوتی ہے، لہٰذا داعی کو مخالفین کی مخالفت، ناخوشی اور ناراضگی کو خاطر میں لانا چاہیے اور نہ اس سے مایوس اور دلبرداشتہ ہونا چاہیے جیسا کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے طرزِ عمل

اختیار کیا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

کمر ہمت باندھ لی جائے

سورۃ المدثر کے نزول کے بعد آپ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے اور ہر طبقے تک اپنا عقیدہ اورنظریہ پہنچانے اور انہیں اس کی بنیاد پر معاشرے اور نظام میں تبدیلی لانے کے لئے آمادہ کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، چنانچہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

قام حينئذٍ رسول الله صلى الله عليه وسلم فى الرسالة اتم القيام وشمر عن ساق العزم ودعا الى الله القريب والبعيد والاحرار و العبيد فامن به كل لبيب نجيب سعيد و استمرّ على مخالفته وعصيانه كلّ جبّار عنيد. (البداية والنهاية ج۳، ص۱۷)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت رسالت کے فریضے کی ادائیگی کیلئے کما حقہ اٹھ کھڑے ہوئے، عزم مصمم کے ساتھ کمر ہمت باندھ لی اور قریب اور دور اور آزاد اور غلام (جس کو مناسب سمجھتے) کو دعوتِ الٰہیہ دینے لگے جس کے نتیجے میں ہر سمجھدار، صاحب بخت وسعادت فرد اس پر ایمان لے آیا اور ہر سرکش اور عناد رکھنے والا ہمیشہ آپ کی مخالفت اور نافرمانی پر قائم رہا۔''

داعی کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو کما حقہ ادا کرنے کی پوری پوری کوشش کرے اور کسی قسم کی کوتاہی نہ کرے، دوست احباب، قریبی تعلق رکھنے والے اور اجنبی الغرض زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو مؤثر انداز میں دعوت دے، پھر ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کردے اور نتائج کی پراوہ نہ کرے، کیونکہ داعی کا فریضہ کامل طریقہ پر دعوت دینا ہے وہ نتائج کا مکلّف نہیں، دلوں کے مالک اللہ تبارک وتعالیٰ ہیں، وہ جسے چاہتے ہیں ہدایت قبول کرنے کی توفیق دیتے ہیں اور اذہان وقلوب کو قبولِ حق پر مائل کردیتے ہیں چنانچہ سلیم الفطرت اور سعادت مند حضرات تو اس دعوت کو برضا ورغبت قبول کرلیتے ہیں، لیکن کج فطرت اور بدبخت وبدنصیب لوگ ہمیشہ مخالفت کرتے اور انقلابی دعوت کو دبانے اور ختم کرنے کی مذموم سعی کرتے ہیں، لہٰذا داعی کو ان کی پراوہ نہ کرتے ہوئے اپنی ذمہ داری کو انجام دینے پر ہی توجہ مرکوز رکھنی چاہئے۔

رب العالمین کی بڑائی پیشِ نظر رہے

﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾

''اپنے رب ہی کو بڑا سمجھئے۔''

علامہ سہیلی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

ای ربک کبر لا غیرہ لایکبر علیک شیء من امر الخلق.

(الروض الانف ج ۱، ص ۱۸۴)

''یعنی اپنے رب ہی کو بڑا سمجھئے نہ کہ اس کے غیر کو، آپ پر مخلوق کی کوئی بات گراں نہ ہو۔''

جب رب کی بڑائی اور عظمت کو پیش نظر رکھا جائے گا تو مخلوق کی کوئی بات بڑی نہیں لگے گی، اس کا طبیعت پر کوئی بوجھ نہ ہوگا۔ اس لئے داعی پر رب العالمین کی بڑائی اور عظمت کے وردو مراقبے کا معمول لازمی ہے، تاکہ اللہ رب العزت کی حکمت و بزرگی اس کے دل و ماغ میں راسخ ہوجائے اور مخلوق کی باتوں کی اس کی نظر میں کوئی حیثیت نہ رہے۔

امام ابن جوزیؒ المدثر کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یاایُّھَا الْمُدَّثِّرُ بالنبوۃ واثقالھا قال عکرمۃ دُثّرت ھذا الامر فقم بہ.

(زاد المیسر جز ۸، ۱۴۵)

''اے نبوت اور اس کی ذمہ داری کو اٹھانے والے، عکرمہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''آپ پر اس امر (نبوت) کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے پس آپ اس کو لے کر اٹھ کھڑے ہوں۔''

راحت و آرام کا زمانہ گزر گیا، کام کا وقت آچکا

مذکورہ آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی ذمہ داری سے آگاہ کیا جارہا ہے کہ وہ بڑی ثقیل اور بھاری ہے، تاکہ آپ اس فریضہ کی ادائیگی کیلئے ذہنی اور جسمانی طور پر مکمل طور پر تیار ہوجائیں، جیسا کہ علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں:

قیل الظاھر ان یراد بالمدثر وکذا بالمزمل الکنایۃ عن المستریح الفارغ لانہ فی اوّل البعثۃ کانّہ قیل لہٗ علیہ الصلوٰۃ والسلام قد مضیٰ زمن الراحۃ وجاء تک المتاعب من التکالیف وھدایۃ الناس. (روح المعانی جز ۲۹، ص ۱۱۶)

''بعض کا کہنا ہے کہ بظاہر تو اس سے مراد یہ ہے کہ مدثر اور مزمل کنایہ ہیں آرام کرنے والے اور فارغ سے، اس لئے کہ یہ بعثت کی ابتدا تھی، گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا جارہا ہے کہ راحت و آرام کا زمانہ گزر چکا، اب آپ کے پاس تکالیف و تھکاوٹ کا باعث بننے والے اور لوگوں کی رہنمائی کی ذمہ داری انجام دینے والے احکام آچکے ہیں۔''

مقصد یہ ہے کہ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس حوالے سے کوئی ذمہ داری نہ تھی گویا فراغت اور آرام کا زمانہ تھا، لیکن اب جب آپ کو یہ ذمہ داری سونپ دی گئی ہے تو گویا یہ زمانہ گزر چکا ہے اور اب ایسا دور آرہا ہے جس میں یہ عظیم الشان ذمہ داری انجام دیں گے تو مشقتوں اور تکالیف کا سامان کرنا پڑے گا، بلکہ آپ کے قتل کی سازشوں کی نوبت بھی آسکتی ہے، لہٰذا اس اہم کام کو انجام دینے کے لئے پوری ذمہ داری، خلوص اور جذبے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہونا ہوگا۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ جب ایک آدمی دعوت قبول کرلے تو وہ اس سے پہلے کے زمانے اور ایامِ حیات کو راحت وسکون کا دور شمار کرلے اور اب یہ سمجھے کہ کام کرنے کا وقت آگیا ہے لہٰذا اس ذمہ داری کو پوری تندہی سے انجام دینا ہے بلکہ ناسمجھی اور نادانی میں گزرے ایام کی تلافی بھی کرنی ہے۔

انقلابی فکر قبول نہ کرنے کا انجام

امام قرطبی قُمْ فَاَنْذِرْ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ای خوّف اهل مكة وحذرهم العذاب ان لم يسلموا. (قرطبی جز ۱۹، ص ۵۸)

''یعنی آپ اہل مکہ کو خوف دلایئے اور اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں انہیں عذاب سے ڈرایئے۔''

داعی کو چاہئے کہ وہ مخاطبین پر جہاں اس دعوت اور اس کے نتیجے میں قائم ہونے والے معاشرے اور نظام کی خوبیاں اور دنیوی واخروی فوائد واضح کرے، وہاں انہیں یہ بھی بتائے کہ اس دعوت کو قبول نہ کرنے اور فرسودہ وباطل نظام کو منہدم کرکے اسلامی نظام قائم کرنے کی جدوجہد نہ کرنے کی صورت میں کیا کیا نقصانات ہورہے ہیں اور دنیا وآخرت میں مزید کن تباہیوں وبربادیوں اور رسوائیوں کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔ عصرِ حاضر میں اسلامی نظام نافذ نہ ہونے کی وجہ سے امتِ مسلمہ جن گوناگوں مسائل ومشکلات اور مصائب کا شکار ہے اور مسلمان روحانی، فکری، نظریاتی، معاشرتی، معاشی واقتصادی، سیاسی اور عسکری لحاظ سے ایک طویل عرصے سے جس زوال سے دوچار ہیں اور روز بروز مزید تاریکیوں اور دلدلوں میں ڈوبتے جارہے ہیں، ان تمام امور سے مخاطب کو آگاہ کرنا اور اسے ذہن نشین کرانا ضروری ہے تاکہ وہ غفلت کی چادر اتار کر بیدار ہوجائیں اور غلبۂ دین کے لئے اپنا کردار ادا کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

"قُمْ" من مضجعک اوقم قیام عزم وتصمیم. (روح المعانی ۲۹، ص ۱۱۶)
"اپنے بستر سے اٹھ کھڑے ہوں یا عزمِ مصمم کے ساتھ بھرپور قیام کریں۔"
امام ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:
قُمْ فَاَنْذِرْ ای شمّر عن ساق العزم وانذر الناس. (تفسیر ابن کثیر ج ۴، ص ۴۴۰)
"قُمْ فَاَنْذِرْ کا مطلب ہے آپ کمر بستہ ہو جائیے اور لوگوں کو خبردار کیجئے۔"

قیام ناگزیر ہے

انقلابی دعوت کو کامیابی سے ہمکنار کرنے اور اسے مقصود تک پہنچانے میں "عمل" کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جس عقیدے اور فکر کے پیچھے عملی اقدام نہ ہو اسے کامیابی سے ہمکنار کرنا اور پایۂ تکمیل تک پہنچانا ناممکن ہے۔ دنیا کی معلوم تاریخ شاہد ہے کہ آج تک اسی نظریے کی بنیاد پر کوئی معاشرہ تشکیل دیا گیا اور نظام نافذ کیا گیا ہے جس کے پیچھے عملی طور پر جدوجہد بھی کی گئی۔ جس نظریے کے پیچھے منظّم جدوجہد نہیں ہوتی اور اس نظریے کا حامل مفکر محض نظریہ اور فکر پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہے تو وہ کبھی بھی معاشرے اور نظام میں تبدیلی لانے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو "قم" (اٹھ کھڑے ہوں) کا حکم دیا جارہا ہے، کیونکہ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے قیام کرنے اور اٹھ کھڑے ہونے کے علاوہ چارہ کار نہیں ہے۔

آج امت مسلمہ کا سب سے بڑا اور بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اس کی اکثریت ہمہ جہت زوال کے حقیقی اسباب کا شعور ہی نہیں رکھتی اور جنہیں ایک حد تک اس کا شعور ہے وہ کچھ کرنے کے لئے قیام کرنے پر تیار نہیں بلکہ غفلت کی چادر اوڑھے محوِ خواب رہنا چاہتے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کے مسائل سے صرف نظر کرتے ہوئے گوشہ نشینی اور اطمینان وسکون کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ غلبۂ دین کی جدوجہد میں شریک ہوتے ہیں تو انہیں اپنی ملازمت، تجارت، مال ودولت، گھربار، بیوی بچوں اور دیگر محبوب دنیوی چیزوں کی قربانی دینا پڑے گی جو کہ قابلِ قبول نہیں ہے۔ کیونکہ موجودہ دور میں اس طرح کی دعوتی اور تحریکی زندگی اختیار کرنا تو زندگی اجیرن کرنے کے مترادف ہے۔ الغرض جب تک افرادِ امت خصوصاً اہل علم "قم" پر عمل پیرا نہیں ہوں گے تب تک اسلامی نظام اور غلبۂ دین اسلام کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

نظریے پر ثابت قدمی

امام ابن جوزی وَلِرَبِّکَ فَاصْبِرْ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

لامر ربک فاصبر: فیه قولان احدهما علیٰ طاعته وفرائضه والثانی علی الاذی والتکذیب.(زاد المیسر جز ۸، ص ۱۴۷)

"اپنے رب کے حکم کے لئے ،صبر کیجئے۔اس میں دوقول ہیں اوّل یہ کہ اپنے رب کی اطاعت اور اس کے فرائض پر ثابت قدم رہیے، دوم یہ کہ دی جانے والی تکالیف اور جھٹلائے جانے پر ثابت قدم رہئے۔"

امام قرطبیؒ مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں ابن زید کا قول نقل کرتے ہیں:

قال ابن زید حمّلت امراً عظیماً محاربة العرب والعجم فاصبر علیه لله.(الجامع لاحکام القرآن ج ۱۹، ص ۶۶)

"ابن زید فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو ایک بہت بڑے کام (نبوت ورسالت) کی ذمہ داری سونپی گئی ہے (جس کا نتیجہ بالآخر) عرب اور عجم (پوری دنیا) سے جنگ کرنا ہے تو پس اس پر ثابت قدم رہیے۔"

مندرجہ بالا اقوال کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ مذکورہ آیت کا مطلب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جارہا ہے کہ:

۱۔ آپ نبوت ورسالت کی تبلیغ واشاعت میں اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری کرتے رہیے اور فرائضِ نبوت کو ثابت قدمی کے ساتھ سرانجام دیتے رہیے۔

جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ انقلابی نظریے اور فکر کی دعوت واشاعت اور اس کی بنیاد پر ایک نظم وجماعت تشکیل دے کر معاشرے اور نظام میں تبدیلی لانا کوئی معمولی کام نہیں ہے، کیونکہ اس راستے میں قدم قدم پر مخالفت اور مصائب ومشکلات کے کانٹے بچھے ہوئے ہیں ،جس کی وجہ سے ہر ہر مرحلے پر اس راہ کے راہی کے بھٹکنے اور اس کے پاؤں پھسلنے کے خدشات لاحق رہتے ہیں۔اس لئے استقلال ،استقامت اور ثابت قدمی وہ عظیم خوبی بلکہ درحقیقت نعمتِ الٰہیہ ہے جس کی بدولت اس راہ کا راہی آگے بڑھتا جاتا اور منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے،لہٰذا داعی کو جہاں خود بھی استقامت اور ثابت قدمی کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے وہاں ارکان دعوت کو بھی استقامت کا خوگر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے،دعوت

قبول کرنے والے حضرات کی اس طرح تعلیم وتربیت کی جائے کہ وہ گھربار، بیوی بچے، مال ودولت اوراپنی جان تک قربان کردیں لیکن اپنے نظریے اورطریقۂ کار سے پیچھے نہ ہٹیں، یہی ان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

۲۔ اس کے نتیجہ میں جو مشکلات اور مخالفانہ ردعمل آئے اس پر فی الحال صبر،تحمل اور برداشت کا مظاہرہ کیجئے۔انقلابی دعوت جیسے ہی لوگوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے فوراًہی اس کی مخالفت شروع ہوجاتی ہے، دعوت اورداعی کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈہ کیاجاتاہے، داعی کوطعن وتشنیع کانشانہ بنایاجاتاہےلیکن اس کے باوجود دعوت پھیلتی جاتی ہےاوراسے قبول کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتاجاتاہےتو مخالفین کی پریشانی میں اضافہ ہوجاتاہے، چنانچہ وہ ارکانِ دعوت پرظلم وستم کرتے اورانہیں جبروتشدد کانشانہ بناتے ہیں۔اس موقع پرصبروتحمل کادامن پکڑنے اورعفودرگذر کامظاہرہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، ہاتھ اٹھانے اورتشدد کاجواب تشدد سے دینے سے گریز کیاجاتاہے کیونکہ اگر جوابی کاروائی کی جائے اوراینٹ کاجواب پتھر سے دیاجائےتو چونکہ اس وقت دعوت قبول کرنے والے افراد انتہائی قلیل تعداد میں ہوتے ہیں اورزیادہ ترافراد کمزور طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ مخالفین بھاری اکثریت میں اورہرلحاظ سے طاقتور ہوتے ہیں اس لئے وہ ارکانِ دعوت پرتشدد پسندی اوردہشت گردی کاالزام لگاتے ہوئے دعوت وتحریک کوجڑ سے اکھاڑنے کے لئے کوئی بڑی اورمنظم کاروائی کرسکتے ہیں ،جس کادفاع کرنااس وقت ارکانِ دعوت کے لئے ممکن نہ ہوگا،اس لئے مخالفین کے انتہائی ظلم وستم کے باوجودصبروتحمل اختیارکرناناگزیر ہوتاہےاوراس مرحلے کاانتظار کیاجاتاہے جب ارکانِ دعوت معقول تعداد میں ہوجاتے ہیں اور ان کاکوئی ٹھکانہ (بیس کیمپ) بھی بن جاتاہے تواس وقت صبروتحمل اور برداشت کی بجائے مسلح ہوکر جنگ (جہاد) کیاجاتااوراس کے ذریعے دعوت کے راستے میں حائل تمام رکاوٹوں کوختم کرکےایک صالح معاشرہ اورنظام تشکیل دیاجاتاہے۔

۳۔ آپ کو بہت بڑی ذمہ داری تفویض کی گئی ہے جس کابڑامرحلہ بالآخر پوری دنیا کے ساتھ جنگ (جہاد) ہےلہٰذاآپ اس پرثابت قدم رہیں۔انقلابی نظریہ اوردعوت کسی ایک علاقے تک محدودنہیں رہتی بلکہ وہ بتدریج پھیلتی جاتی ہے،اگرچہ ابتدائی ایام میں اس کےایک محدودعلاقے میں بھی قبولِ عام حاصل کرنے کے آثارنظرنہیں آتےلیکن رفتہ رفتہ اس کی اشاعت ہوتی جاتی ہے، پھروہ مرحلہ بھی آتاہے جب داعیانِ انقلاب اورمخالفین کے درمیان باقاعدہ تصادم اور جنگ ہوتی ہے اورحق

غالب آجاتا ہے، جس کے بعد یہ دوسرے علاقوں میں وسعت حاصل کرنا چاہتا ہے، جس کے مقابلے میں وقت کی بڑی بڑی طاقتیں اور سلطنتیں میدان میں آتی ہیں لیکن فتح اور کامیابی اہل حق کے قدم چومتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جا رہا ہے کہ اب آپ صبر وتحمل کا مظاہرہ کریں، پھر عرب وعجم یعنی پوری دنیا کے ساتھ جنگ کرنے کے مرحلے میں بھی ثابت قدم رہیے گا۔ الغرض دونوں مرحلوں میں استقامت اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا ناگزیر ہے۔

تعلیم وتربیت کے دو اہم رکن

اسی زمانہ میں سورۃ المزمل نازل ہوئی۔ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنیادی اصول اور ہدایات وتعلیمات دی گئیں۔ آپ سے فرمایا گیا:

﴿يٰاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ،قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا نِصْفَهٗ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ،اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا﴾ (المزمل: ۱،۵)

''اے کپڑے میں لپٹنے والے! کھڑا رہ رات کو مگر کسی رات، آدھی رات یا اس میں سے کم کردے تھوڑا یا زیادہ کر اس پر، اور کھول کھول کر پڑھ قرآن کو صاف، ہم ڈالنے والے تجھ پر ایک بات وزن دار (بھاری)۔''

ان آیات میں دو اہم اور بنیادی باتوں کا حکم ہے (۱) قیام لیل (۲) ترتیلِ قرآن

قیام لیل (تہجد)

پہلا اہم اور بنیادی حکم قیام لیل کا ہے۔ حضرت امام فخر الدین رازیؒ صلوۃ لیل کی حکمت ومصلحت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

واعلم انه تعالى لما أمره بصلاة الليل أمره بترتيل القرآن حتى يتمكن الخاطر من التأمل فى حقائق تلك الآيات ودقائقها، فعند الوصول الى ذكر الله يستشعر عظمته وجلالته، وعند الوصول الى الواعد والوعيد يحصل الرجاء والخوف، وحينئذ يستنير القلب بنور معرفة الله. (التفسير الكبير، تفسير سورة المزمل جز ۲۹، ص ۱۷۴)

''معلوم ہو کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو ترتیلِ قرآن کے ساتھ صلوۃ لیل کا حکم دیا تا کہ دل ان آیات کے حقائق ومعارف پر غور وفکر کر سکے تو اللہ کے ذکر کی (آیات) کے وقت وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت

وبزرگی شعور حاصل کرے گا اور وعدو وعید کی (آیات) کے وقت اسے امید وخوف کی صفت حاصل ہوگی اور اس وقت اس کا دل اللہ تعالیٰ کی معرفت کے نور سے منور ہو جائے گا۔''

یعنی جب تہجد میں قرآن کریم کی تلاوت کی جائے گی تو جس قسم کی آیات تلاوت کی جائیگی وہ مضامین ذہن نشین ہوتے جائیں گے ،صفات پیدا ہوتی جائیں گی اور دامن معرفت الہیہ کے درجات طے کرتا ہوا مقرب الی اللہ ہوتا جائے گا۔

امام رازیؒ مذکورہ آیت کا ماقبل آیات سے ربط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ووجه النظم أنه تعالى لماأمره بصلاة الليل،فكأنه قال : انماامرتک بصلاة الليل،لأنا سنلقي عليک قولاعظيماً،فلابدوأن تسعى في صيرورة نفسک مستعدة لذلک القول العظيم،ولايحصل ذلک الاستعدادالا بصلاة الليل.(ايضا)

''ربط یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو صلوۃ لیل کا حکم دیا تو گویا فرمایا کہ وہ ہم نے آپ کو صلوۃ لیل کا حکم دیا ہے اس لیے کہ ہم عنقریب آپ پر عظیم کلام نازل کرنے والے ہیں تو اس لیے یہ لازم ہے کہ آپ اپنے آپ کو اس عظیم کلام کو اٹھانے کے لیے تیار کرلیں اور یہ تیاری صلوۃ لیل کے بغیر نہیں ہوسکتی۔''

﴿ان ناشئۃ اللیل﴾ کے تحت امام قرطبی لکھتے ہیں:

بين تعالى في هذه الآية فضل صلوة الليل على صلوة النهار وانّ الاستكثار من صلوة الليل بالقراة فيها ماامكن اعظم للاجرواجلب للثواب.(الجامع لاحكام القرآن تفسيرسورة المزمل)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت میں رات کی نماز (تہجد) کی دن کی نماز پر فضیلت بیان فرمائی ہے اور یہ کہ رات کی نماز میں حتی الامکان کثرتِ قرأت اجر کو بڑھانے اور ثواب اکٹھا کرنے کا باعث ہے۔''

تہجد کی اس قدر اہمیت اور فضیلت کی وجہ سے حضرت حسن بصری فرماتے ہیں:

صلّوامن الليل ولوعلى قدر حلب شاةٍ.(تفسيرحسن البصرى ج۵ ص ۲۰۹)

''رات کے وقت (تہجد) پڑھا کرو اگر چہ بکری کا دودھ دوہنے کے وقت کی مقدار ہو۔''

الحاصل داعی کو تہجد کا اہتمام کرنا چاہیے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط جوڑا جائے اور اس سے توفیق ، ہمت، استطاعت اور نصرت مانگی جائے۔ داعی دن میں دعوتی امور میں مشغول رہے

تورات کے پچھلے پہر رب کے حضور سرِ نیاز جھکا کر دعوت کی کامیابی کے لیے آہ وزاری کرے۔

ترتیلِ قرآن (فہمِ قرآن)

دوسرا اہم حکم ترتیل قرآن کا ہے۔ ترتیل قرآن سے کیا مراد ہے، امام ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقولهٗ تعالیٰ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ای اقرأه علی تمهل فانه يكون عوناً علیٰ فهم القرآن وتدبره وكذلك كان يقرء صلوات الله وسلامهٗ عليه. (تفسیر ابن کثیر ۴، ۴۳۴)

"قرآن کو ترتیل سے پڑھیے یعنی اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیے کیونکہ اس سے قرآن کو سمجھنے اور اس میں غور وفکر کرنے میں مدد ملتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح (فہم وتدبر) کے ساتھ پڑھتے تھے۔"

قرآن کریم کا فہم اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب اسے تدبر وتفکر کے ساتھ پڑھا جائے اور اس کے معانی ومطالب، اغراض ومقاصد اور اسرار ورموز پر غور وخوض کیا جائے۔ یوں تو اسلامی تعلیمات اور احکام کا منبع وسرچشمہ اور محور قرآن ہی ہے لیکن غلبۂ دین کی دعوت وتحریک کو اس پر خصوصی توجہ دینی چاہئے۔ اس کے لئے باقاعدہ نصاب مرتب ہونا چاہئے اور فہم قرآن کے اصول وضوابط کی روشنی میں مطالعۂ قرآن کے حلقے قائم کرنے چاہیں، ارکانِ دعوت اسلاف کے مطالعۂ قرآن کے نمونہ کے مطابق قرآن کریم پڑھیں خصوصاً صحابہ کرامؓ اور خود ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو پیشِ نظر رکھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اندازِ تلاوت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآنِ پاک کی تلاوت کیسے فرماتے تھے، امام ابن القیم الجوزیہؒ نے اس سے متعلق تفصیل سے لکھا ہے، فرماتے ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرأت ٹھہر ٹھہر کر کرتے تھے اور ہر آیت پر وقف کیا کرتے تھے الحمد للہ رب العالمین پڑھتے، الرحمٰن الرحیم پر وقف کرتے، مالک یوم الدین پر وقف کرتے، امام زہری روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک آیت کرکے پڑھتے تھے۔" (زادالمعاد ج اص ۱۲۴)

امام ابن القیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تلاوتِ قرآن کے طریقے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وهذا هو الأفضل الوقوف علی رؤوس الآيات وان تعلقت بما بعد ها وذهب بعض القراء إلی تتبع الأغراض والمقاصد والوقوف عند انتهائها واتباع هدي النبي

صلی اللہ علیہ وسلم وسنته أولی. (زادالمعاد ج ۱ ص ۱۲۵)

''یعنی آیات پر وقوف کرنا یہی افضل ہے اگر چہ ان کا بعد والی آیات سے (معنی مفہوم کے لحاظ سے) تعلق ہو، بعض قراء کا مسلک ہے کہ اغراض و مقاصد پر غور وخوض کرنا اور آیات کے اختتام پر وقوف کرنا افضل ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کی اتباع اور آپ کی سنت اولیٰ ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز میں قرآن پاک کی تلاوت اس طرح فرمایا کرتے تھے:

وکان رسول الله صلی الله علیه وسلم یسر بالقراءة في صلاة اللیل تارة ویجهر بها تارة ویطیل القیام تارة ویخففه تارة ویوتر آخر اللیل وهوا لاکثر و أوله تارة وأوسطه تارة. (زادالمعاد ج ۱ ص ۱۲۶)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کی نماز (تہجد) میں کبھی تو آہستہ قرأت کرتے اور کبھی اونچی آواز میں، کبھی تو قیام طویل کرتے تھے اور کبھی اس میں تخفیف فرماتے، وتر اکثر رات کے آخری حصے میں پڑھتے تھے اور کبھی رات کے شروع میں اور کبھی رات کے درمیانی حصے میں پڑھتے تھے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف خود انتہائی خشوع وخضوع اور فہم وتدبر کے ساتھ تلاوت فرماتے تھے بلکہ دوسروں سے بھی تلاوت سنتے تھے۔

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھتے بیٹھتے، لیٹتے ہوئے، حالتِ وضوء میں اور بلا وضو قرأت کرتے تھے، صرف حالتِ جنابت ہی قرأت سے مانع ہوتی تھی۔'' (زادالمعاد ج اص ۱۹۰)

تدبرِ قرآن افضل ہے

قرآن پاک کی کثرت سے تلاوت کرنا اور زیادہ سے زیادہ پڑھنا افضل ہے یا کم لیکن تدبر وتفکر کے ساتھ پڑھنا افضل ہے، اس بارے میں دو مسلک ہیں۔ بعض کے نزدیک پہلی صورت افضل ہے جبکہ بعض کے نزدیک دوسری۔ صحابہ کرامؓ میں تفسیرِ قرآن میں مستند مانی جانے والی دو شخصیات حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کا مسلک درج ذیل ہے:

''ابن مسعود، ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر حضرات کا مسلک یہ ہے کہ ترتیل اور تدبر کے ساتھ پڑھنا اگرچہ قلیل ہو، تیزی کے ساتھ اور کثیر پڑھنے سے افضل ہے، ان حضرات کا کہنا ہے کہ قراتِ قرآن کا اصل مقصد اسے سمجھنا، اس پر غور وفکر کرنا، اس کا فہم پیدا کرنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔ باقی تلاوت اور اس کا حفظ کرنا تو اس کے معانی سمجھنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہے جیسا کہ بعض اسلاف فرماتے ہیں

کہ ''قرآن اس لئے نازل ہوا ہے تاکہ اس پر عمل پیرا ہوا جائے ،لہٰذا اس کی تلاوت عمل کی نیت سے کی جائے''۔لہٰذا حاملینِ قرآن وہی ہیں جو اس کے علوم کے حامل اور اس پر عمل کرنے والے ہیں اگرچہ انہوں نے اسے حفظ نہ بھی کیا ہو۔'' (زادالمعاد ج ا ص ۱۲۵)

حاملِ قرآن

مذکورہ اقتباسات سے قرآن کے نزول اور اس کی تلاوت کا مقصد معلوم ہوگیا ہے اور یہ کہ حاملین قرآن کہلانے کے اصل مستحق کون ہیں؟ لہٰذا بغیر تدبر اور تفکر کے محض تلاوت کرنا اور حفظ کرنا کافی نہیں بلکہ اس کے معانی ومطالب میں تدبر وتفکر کرنا اور اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا لازم ہے ورنہ ایسا شخص حاملِ قرآن کہلانے کا مستحق نہ ہوگا۔امام ابن القیم اس بارے میں وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وأما من حفظه ولم يفهمه ولم يعمل بما فيه فليس من أهله وإن أقام حروفه السهم. قالوا : ولأن الإيمان افضل الاعمال وفهم القرآن وتدبره هو الذي يثمر الإيمان وأما مجرد التلاوة من غير فهم ولا تدبر فيفعلها البر والفاجر والمؤمن والمنافق .(زادالمعاد ج ا ص ۱۲۵)

''جس نے حفظ کیا لیکن نہ تو اسے سمجھا اور نہ اس کے احکام پر عمل کیا تو وہ اہل قرآن میں سے نہیں اگرچہ وہ حروف کو تیر کی طرح سیدھا کرکے (تجوید کے ساتھ) پڑھتا ہو،اسلاف فرماتے ہیں کہ اس لئے کہ ایمان افضل ترین عمل ہے،قرآن کو سمجھنے اور اس پر غور وفکر کے نتیجے میں ایمان مرتب ہوتا ہے۔باقی بغیر فہم اور تدبر کے محض تلاوت تو نیک وبد اور مومن اور منافق بھی کرتا ہے۔''

مندرجہ بالا موقف کے برعکس شوافع کے نزدیک کثرتِ قرأت افضل عمل ہے۔

امام ابن القیم الجوزیہ مذکورہ دونوں مسلک نقل کرنے کے بعد دونوں میں تطبیق دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

الصواب في المسألة أن يقال إنّ ثواب قراءة الترتيل والتدبر أجلّ وأرفع قدراً وثواب كثرة القراءة أكثر عدداً فالأول كمن تصدق بحوهرة عظيمة او أعتق عبداً قيمته نفيسة جداً والثاني: كمن تصدق بعدد كثير من الدراهم أو أعتق عددا من العبيد قيمتهم رخيصة. (زادالمعاد ج ا ص ۱۲۵، ۱۲)

''اس مسئلہ میں صحیح بات یہ ہے کہ ترتیل اور تدبر کے ساتھ پڑھنے کا ثواب قدر ومنزلت کے لحاظ سے اعلیٰ وارفع ہے جبکہ کثرت کے ساتھ پڑھنے کا ثواب عدد کے لحاظ سے زیادہ ہے،پہلی صورت ایسی

ہے جیسے ایک آدمی ایک بہت بڑا جوہر صدقہ کرے یا ایک بیش قیمت غلام آزاد کرے اور دوسری ایسی ہے جیسے ایک آدمی بہت سے درھم صدقہ کرے یا کم قیمت والے بہت سے غلام آزاد کرے۔''

قیامِ لیل اور ترتیل قرآن کے حکم کی حکمت

مذکورہ بالا دو احکام یعنی قیامِ لیل اور ترتیل قرآن کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلاً ثَقِیْلاً (سورۃ المزّمّل : ۵)

''(اے محمد) ہم تم پر ایک ثقیل اور بھاری کلام نازل کرینگے''۔

امام ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

یعنی دعوت کفار باسلام (فتح الرحمٰن)

''مطلب یہ ہے کہ کفار کو اسلام کی دعوت دینے کی ذمہ داری آپ پر ڈالی جائے گی''۔

یعنی قیامِ لیل اور ترتیلِ قرآن کے ذریعے اس ''قول ثقیل'' کو اٹھانے کی استعداد پیدا ہوگی اور ان دونوں امور پر ایک عرصہ تک عمل کرنے سے ہمت وجرأت پیدا ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت کی ذمہ داری انجام دینے کے لیے جہاں دعوت اور اس کے متعلقات کا فہم ضروری ہے وہاں اخلاص، جذبہ، استقامت اور جرأت کا ہونا ضروری ہے۔ دعوت کے فہم کے لئے علومِ قرآن کا حصول لازم ہے، پھر دورانِ تلاوت تدبر وتفکر ناگزیر ہے، اسی طرح قیامِ لیل یعنی تہجد سے تعلق مع اللہ، للّٰہیت، خشیت، اخلاص اور جرأت جیسی صفات پیدا ہوتی ہیں۔ لہٰذا داعی کو چاہیے کہ وہ تہجد اور فہم قرآن کا معمول بنائے تا کہ جہاں خود اس کے اندر مذکورہ صفات پیدا ہوں وہاں وہ دعوتی امور کو بھی کما حقہ انجام دے سکے۔

باب دوم:

دعوت اور تعلیم و تربیت

دعوتِ خاصہ

انقلابی دعوت اور نظریہ بتدریج پھیلتا ہے۔ داعیٔ انقلاب شروع دن سے ہی تمام لوگوں کے سامنے اپنے افکار و نظریات پیش نہیں کرتا بلکہ وہ ابتداءً رازداری کے ساتھ اپنی فکر ایک خاص طبقے تک پہنچا کر انہیں اپنا ہمنوا بنانے کی کوششیں کرتا ہے، وہ خفیہ طور پر اپنی دعوت پھیلاتا ہے تاکہ آئندہ کے لئے اس کے لئے فضا سازگار بنائی جائے اور رائے عامہ ہموار کی جائے، چنانچہ بعثت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عرصے تک اپنی دعوت کو خفیہ رکھا یعنی جب تک اعلانیہ دعوت دینے کا حکم نہیں آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم خفیہ طور پر اور خاص خاص لوگوں کو دعوتِ اسلام دیتے رہے، اسے دعوت خاصہ کا نام دیا جاسکتا ہے، جیسا کہ علامہ حلبیؒ لکھتے ہیں:

لایخفی انہ صلی اللہ علیہ وسلم لمابعث اخفی امرہ وجعل یدعو الی اللہ سراً. (السیرۃ الحلبیۃ ج ۱، ص ۲۵۵)

''اس امر میں کوئی خفا نہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو آپ نے اس کو خفیہ رکھا اور لوگوں کو خفیہ دعوت دینے لگے۔''

دعوتِ خاصہ کی حکمت

انقلابی نظریے اور دعوت کو ابتداً اس لئے خفیہ رکھا جاتا ہے کہ یہ اجنبی اور نامانوس ہوتی ہے، اگر کھلم کھلا اور اعلانیہ اس کی اشاعت شروع کردی جائے تو مخالفین کی طرف سے شدید ردِعمل آسکتا ہے اور آتا بھی ہے، جس کا نقصان یہ ہوسکتا ہے کہ اس دعوت اور داعی حضرات کا ابتداء میں ہی گلا گھونٹ دیا جائے اور پروان چڑھنے سے پہلے ہی اس کا خاتمہ کردیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل تین سال تک دعوتِ خاصہ دیتے رہے، جیسا کہ ابن ہشام لکھتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے بعد اپنی دعوت کو جو خفیہ رکھا اس میں اور اس کے اعلانیہ اظہار کے درمیان تین سال کا عرصہ ہے۔'' (السیرۃ لابن ہشام ج ۱ ص ۱۶۸)

ابن سعد لکھتے ہیں:

اقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمکۃ ثلاث سنین من اوّل نبوتہ مستخفیاً ثم اَعْلَنَ فی الرابعۃ فدعا الناس الی الاسلام عشر سنین.

(الطبقات الکبریٰ ج ۱، ص ۲۱۶)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں قیام کے دوران نبوت کی ابتداء سے لے کر تین سال تک خفیہ (دعوت دیتے) رہے پھر چوتھے سال اس کا اعلانیہ اظہار کیا اور لوگوں کو دس سال تک اسلام کی دعوت دیتے رہے۔''

بظاہر تین سال کا عرصہ طویل لگتا ہے لیکن انقلابی دعوتوں کی تاریخ سامنے رکھی جائے تو تین سال کا عرصہ کچھ بھی زیادہ نہیں، ان تین سالوں کے اندر خفیہ طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو محنت کی اور اپنے اصحاب تیار کیے اور جس طرح ان کی تعلیم وتربیت کی، اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ تین سال بعد کے کئی سالوں پر بھاری ثابت ہوئے اور بعد میں حاصل ہونے والی جملہ کامیابیوں اور کامرانیوں کا انحصار بھی اسی ابتدائی زمانے پر تھا۔

اولین وحی کے بعد جبریل آپ کو ایک چشمے پر لے گئے اور وہاں وضو کا طریقہ بتلایا اور نماز پڑھ کر دکھلائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر لوٹ آئے اور زوجہ مطہرہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کو بھی اس کی تعلیم دی، چنانچہ امام بیہقی روایت کرتے ہیں ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو لے کر چشمے پر آئے، دونوں نے جبریل کی طرح وضو کیا، دو رکعتیں پڑھیں اور چار سجدے کئے:

ثم کان ھو وخدیجۃ یُصلّیان سِرّاً. (دلائل النبوۃ للبیھقی ج ۲، ص ۱۶۰)

''پھر آپ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا مخفی نماز پڑھنے لگے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیرِ پرورش اور زیرِ تربیت تھے، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا ''اے محمد! یہ کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''یہ اللہ تعالیٰ کا وہ دین ہے جو اس نے اپنے لئے منتخب فرمایا ہے اور اس کے ساتھ رسول بھیجے ہیں۔ میں تمہیں اللہ وحدہ کی طرف جس کا کوئی شریک نہیں، اس کی عبادت کی طرف اور لات اور عزیٰ کی نفی کی طرف بلاتا ہوں۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر داعی سے اس کے اعمال واطوار کے بارے میں دریافت کیا جائے تو وہ نہ صرف ان کے بارے میں بتلائے بلکہ اجمالی طور پر اپنی پوری دعوت بھی سائل کے سامنے رکھ دے تا کہ اسے پوری بات سمجھ آ جائے۔

ایسا نہ دیکھا نہ سنا

حضرت علیؓ نے عرض کیا:

هذا أمرٌ لم أسمع (به) قبل اليوم فلست بقاض أمراً حتى أحدث به أبا طالب.

''یہ تو ایسی بات ہے جو میں نے آج تک نہیں سنی ، جب تک کہ میں ابوطالب (والد) کو نہ بتلاؤں اس سے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔''

حقیقت یہ ہے کہ انقلابی افکار ونظریات لوگوں کے لئے اجنبی ہوتے ہیں جب وہ ایسی چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہیں یا اس کے بارے میں سنتے ہیں تو ابتداءً بہت سے لوگوں کا یہی کہنا ہوتا ہے کہ ''ہم نے تو آج تک ایسی بات نہ دیکھی اور نہ سنی ہے'' چنانچہ وہ اس چیز کو بنیاد بنا کر قبول حق میں تردد اور تذبذب کا شکار ہو جاتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ناپسند کیا کہ وہ اس کا اعلان کرنے سے قبل اس راز کا افشاء کردیں تو فرمایا:

يا عليُّ إذالم تسلم فاكتم.

''اے علی! جب تم اسلام نہیں لائے تو اس معاملے کو راز میں رکھو''۔

چونکہ ابھی اس دعوت کے اظہار کا وقت نہیں آیا تھا اس لئے آپ نے حضرت علیؓ سے یہی فرمایا۔ حضرت علیؓ کی اگلی رات تو اسی طرح گذر گئی پھر انہیں شرح صدر ہوا تو صبح کے وقت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:

''تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ، نیز تم لات وعزی کی نفی کرو اور شریک (بتوں) سے بری ہو جاؤ۔''

حضرت علیؓ نے آپ کی دعوت قبول کر لی اور مسلمان ہو گئے البتہ ان کا طرزِ عمل یہ تھا۔

فمكث عليٌّ يأتيه على خوف من أبي طالب، وكتم عليٌّ إسلامه ولم يظهره.

''علیؓ آپؐ کے پاس ابوطالب سے ڈرتے ہوئے آتے، آپ نے اپنے قبولِ اسلام کو مخفی رکھا اور اس کا اظہار نہ کیا۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ دعوت قبول کرنے کے بعد اگر اس کو کچھ عرصہ مصلحتاً مخفی رکھا جائے اور اظہار نہ کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اس طرح فوری اور شدید ردعمل سے بچا جا سکتا ہے۔ (دلائل النبوۃ ج ۲، ص ۱۶۱، ایضاً البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۲۴)

سنجیدہ لوگوں کو دعوت

افرادِ معاشرہ کے لئے اجنبی اور نامانوس عقائد ونظریات کی ابتداءً نہ تو کھلم کھلا تبلیغ کی جاسکتی ہے اور نہ ہر آدمی کے سامنے ان کا اظہار کیا جاسکتا ہے، کیونکہ معاشرے میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو کم فہم ہوتے ہیں اور ان امور کو محض اپنی عقل وفراست کی بنیاد پر سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ اس لئے ابتدائی طور پر اپنے قریبی دوست واحباب اور سنجیدہ اور معاملہ فہم لوگوں سے دعوت کی ابتدا کی جاتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ عمومی دعوت کی طرف بھی پیش قدمی کی جاتی ہے، چنانچہ دعوتِ خاصہ کے زمانہ میں اسی آدمی کو دعوت دی جاتی جو سنجیدہ اور بات کو سمجھنے والا ہوتا اور جس کے بارے میں توقع ہوتی کہ وہ دعوت کو قبول کرلے گا۔ ابن اثیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق لکھتے یں:

ثم ان اللہ تعالیٰ اَمر النبی ﷺ بعد مبعثہ بثلاث سنین ان یصدع بما یؤمر وکان قبل ذلک فی السنین الثلاث مستتراً بدعوتہ لایظھر ھا اَلا لمن یثق بہ.

(الکامل لابن اثیر ج ۲، ص ۶۰)

''بعثت کے تین سال بعد اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اظہارِ دعوت کا حکم دیا، اس سے قبل وہ تین سال تک خفیہ (دعوت دیتے) رہے، اس کا اظہار صرف اُس آدمی کے سامنے کرتے جس پر آپ کو اعتماد ہوتا۔''

اس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خاندان کے بااعتماد افراد کو دعوت دیتے تھے۔ ابن اثیر لکھتے ہیں:

فکان یذکر ذلک سراً الیٰ من یطمئن الیہ من اھلہ. (الکامل لابن اثیر ج ۲ ص ۳۲)

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خفیہ طور پر (اپنی دعوت کا) اپنے خاندان کے صرف انہی لوگوں سے تذکرہ کرتے تھے جن سے متعلق آپ کو اطمینان ہوتا تھا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح آپ کی اتباع کرنے والے حضرات کا بھی یہی طریقہ کار تھا، چنانچہ اولین آپ کی دعوت قبول کرنے والے، آپ کے دست راست اور آپ کی دعوتی مہم میں سرگرم کردار ادا کرنے والے حضرت ابوبکر الصدیقؓ سے متعلق علامہ زرقانی لکھتے ہیں:

حین اسلم ابوبکر رضی الله عنه دعا الی الله تعالیٰ و رسوله صلی الله علیه وسلم من وثق به من قومه لانه کان محبباً فی قومه فجعل یدعو من وثق به (شرح الزرقانی علی مواهب اللدنیه ج ۱ ص ۲۴۹)

''جب ابوبکر مسلمان ہوئے تو انہوں نے اپنی قوم میں سے اپنے اعتماد کے لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بلایا، اس لئے کہ وہ اپنی قوم کے محبوب فرد تھے، انہیں جن پر اعتماد تھا انہوں نے انہیں دعوت دینا شروع کر دی۔''

دعوت قبول کرنے کے معاملے کو مخفی رکھنے کا حکم

چونکہ یہ دعوت بالکل ابتدائی مراحل میں تھی اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اولین پیروکار اپنے حلقۂ احباب اور بااعتماد لوگوں کو ہی دعوت دیتے تھے، نہ صرف یہ بلکہ جو آدمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کرتا آپ اسے مخفی رکھنے کا حکم دیتے تھے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے بارے میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ قبول اسلام کے بعد انہوں نے اس معاملے کو مخفی رکھا۔ اسی طرح حضرت ابوذر سابقین اولین میں سے تھے، وہ مسلمان ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یا ابا ذر اکتم هذا الامر وارجع الیٰ قومک فاخبرهم یاتونی فاذا بلغک ظهورنا فاقبل (السیرة الحلبیه ج ۱ ص ۴۵۲)

''اے ابوذر اس بات کو مخفی رکھو اور اپنی قوم کی طرف لوٹ جاؤ، انہیں جا کر بتلاؤ تا کہ وہ میرے پاس آئیں، پھر جب تمہیں ہمارے غلبے کی خبر ملے تو چلے آنا۔''

خفیہ عبادت

عقیدے اور نظریے کا تعلق دل ودماغ سے ہے، اسے مصلحتاً مخفی رکھنا کوئی مشکل نہیں ہوتا لیکن اعمال وحرکات وسکنات کو چھپانا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ اولین وحی کے بعد نماز کا حکم بھی آچکا تھا، اس لئے بالکل ابتدائی زمانے میں پہلے پہل اس دعوت کو قبول کرنے والے

حضرات اپنے عقائد و نظریات مخفی رکھنے کے ساتھ ساتھ نماز بھی خفیہ پڑھتے تھے، چنانچہ بعثت کے بعد ابتدائی زمانے سے متعلق ابن اِسحاق روایت کرتے ہیں:

وذكر بعض أهل العلم أن رسول الله ﷺ كان إذا حضرت الصلاة خرج إلى شعاب مكة، وخرج معه علي بن أبي طالب مستخفيا من أبيه أبي طالب ومن جميع أعمامه وسائر قومه. (السيرة لا بن هشام ج ا ،ص ۱۶۱ ، ۱۶۲ ،ایضاً تاریخ الامم والملوک لابن جریر الطبری ج ۲ ص ۵۸)

"بعض علماء فرماتے ہیں کہ جب نماز کا وقت ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی گھائیوں میں چلے جاتے اور علی بن ابی طالبؓ بھی اپنے والد ابو طالب، تمام چچوں اور پوری قوم سے مخفی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے۔"

دونوں وہاں نماز پڑھتے رہتے، جب شام ہوتی تو لوٹ آتے، یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔

خفیہ عبادت کا ہمیشہ معمول نہ تھا بلکہ بعض اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں جا کر مشرکین مکہ کے سامنے بھی نماز پڑھتے تھے، چنانچہ عفیف کندیؓ سابقین میں سے تھے، فرماتے ہیں کہ میں تجارت کرتا تھا، ایام حج میں تجارت کے سلسلے میں مکہ آیا تو دیکھا کہ ایک مرد نے کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا شروع کردی، پھر ایک عورت آئی اور اس نے بھی نماز شروع کردی، پھر ایک لڑکا آیا اور اس نے اس کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز شروع کردی۔ میں نے عباس سے پوچھا کہ یہ کون سا دین ہے، میں تو اس دین کے بارے میں نہیں جانتا؟ انہوں نے بتایا:

هذا محمد بن عبدالله يزعم انّ الله ارسله وان كنوز كسرىٰ وقيصر ستفتح عليه وهذه امرأته خديجة بنت خويلد آمنت به وهذا الغلام ابن عمه علي بن ابي طالب آمن به. (السیرۃ لابن کثیر ج ا ،/ص ۴۲۹، ایضاً الاصابه فی تمییز الصحابه ج ۲ ،ص ۴۸۷ ترجمه عفیف الکندی)

"یہ محمد بن عبداللہ ہیں، ان کا خیال ہے کہ اللہ نے انہیں رسول بنا کر بھیجا ہے اور یہ کہ کسریٰ اور قیصر کے خزانے اس (کے ہاتھ) پر فتح ہوں گے۔ یہ اس کی بیوی خدیجہ بنت خویلد ہے جو اس پر ایمان لا چکی ہے، یہ لڑکا اس کا چچا زاد علی بن ابی طالب ہے، یہ بھی اس پر ایمان لا چکا ہے۔"

حضرت عباسؓ اگر چہ اس وقت مسلمان نہ ہوئے تھے لیکن ایک غیر قریشی کے استفسار پر انہوں نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین وعقائد اور مستقبل کے بارے میں بھی بتا دیا، چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت میں روم وفارس کی فتوحات کا ذکر بھی کرتے تھے، اس لئے حضرت عباسؓ نے آپ کی رسالت کے ساتھ اس کا بھی تذکرہ کر دیا۔

دعوتِ خاصہ کا مطلب

دعوتِ خاصہ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کا کہیں تذکرہ نہیں ہوتا اور نہ لوگ اس سے متعلق جانتے ہیں بلکہ اس سے مراد ایک عرصے تک خاموشی کے ساتھ مخصوص طبقے کو انفرادی طور پر دعوت دینا ہے جس میں دوست، احباب، قریبی اور اعتماد والے افراد شامل ہیں۔ اس عرصے میں کھلم کھلا دعوت دی جاتی ہے اور نہ اجتماعی طور پر لوگوں کو اپنے افکار ونظریات کی طرف بلایا جاتا ہے، اس کے باوجود لوگ اسے جانتے ہیں اور مخفی طور پر اسے قبول کرتے رہتے ہیں یعنی لوگوں میں اس کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے اور وہ اس کے بارے میں اپنی آراء کا اظہار کرتے رہتے ہیں جیسا کہ حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ کے قبول اسلام کے بارے میں خود ان سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ میں بصری کے بازار میں تجارت کی غرض سے موجود تھا کہ ایک راہب نے اپنے صومعہ میں پوچھا ''اہل بازار میں تحقیق کراؤ کہ کیا کوئی آدمی اہل حرم میں سے بھی آیا ہے۔'' حضرت طلحہؓ فرماتے ہیں میں نے کہا ہاں میں اہل حرم میں سے ہوں ،اس پر اس نے پوچھا، کیا احمد کا ظہور ہو چکا ہے؟ میں نے کہا کون احمد؟ اس نے کہا عبداللہ بن عبدالمطلب کے فرزند، پھر کہا:

''اسی مہینے میں ان کا ظہور ہوگا، وہ انبیاء میں سے آخری نبی ہیں۔ ان کا مقامِ ظہور حرم ہے اور مقامِ ہجرت کھجور، حرہ اور سباخ والی جگہ ہے، تم ان کی (دعوت قبول کرنے کی) طرف سبقت کرو۔''

فرماتے ہیں ''اس کی بات میرے دل میں گھر کر گئی، میں جلدی جلدی مکہ پہنچا اور لوگوں سے پوچھا ''کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے؟ لوگوں نے جواب دیا:

نعم ، محمد بن عبدالله الأمين قد تنبأ، وقد اتبعه أبوبكر ابن أبی قُحافة.

(دلائل النبوة ج ٢، ص ١٦٦)

ہاں! محمد بن عبداللہ الامین (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور ابوبکر ابن ابی قحافہ نے ان کی اتباع کی ہے۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تازہ تازہ نبوت عطا ہوئی تھی لیکن

ابوبکر کے قبولِ اسلام کی وجہ سے لوگوں کو اس کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خفیہ دعوت کے زمانے میں اس دعوت کا لوگوں کو علم ہوتا ہے، اس کو قبول کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے، لوگوں میں اس کا تذکرہ ہونے لگتا ہے اور وہ اپنی مجالس میں داعی حضرات اور ان کی دعوت سے متعلق مختلف تبصرے اور تجزیے کرتے ہیں۔

دعوت خاصہ کے زمانہ میں تشکیل

حضرت ابوذر غفاریؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بارے میں سنا تو اپنے بھائی انیس کو معلومات کے لئے مکہ بھیجا، وہ مکہ آئے تو واپس جا کر اپنے بھائی کو کارگزاری سناتے ہوئے کہا:

''میں نے انہیں اچھے اخلاق کی تعلیم دیتے ہوئے اور ایسا کلام پڑھتے ہوئے دیکھا ہے جو شاعری نہیں ہے۔'' (صحیح البخاری کتاب المناقب باب اسلام ابی ذر)

حضرت ابوذرؓ بھائی کی بات سے مطمئن نہ ہوئے تو خود مکہ آئے۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کی دعوت پر اسلام قبول کیا تو آپ نے انہیں فرمایا:

''اپنی قوم کی طرف لوٹ جایئے، انہیں اسلام کی خبر دیجئے یہاں تک کہ تمہیں ہمارے غلبے کی خبر پہنچے۔'' (ایضاً)

دعوت خاصہ کے زمانے میں چونکہ اعلانیہ دعوت نہیں دی جاتی اور نہ دعوت قبول کرنے والوں کی کثرت ہوتی ہے، نیز دعوت قبول کرنے والوں کو دعوت کو مخفی رکھنے کا کہا جاتا ہے، اس لیے اس دعوت کو قبول کرنے والے حضرات بعض اوقات ایک دوسرے سے بھی واقف نہیں ہوتے اور نہ ارکانِ دعوت کے بارے میں انہیں زیادہ معلومات ہوتی ہیں۔ حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت عمرو بن عبسہؓ میں سے ہر ایک کا کہنا ہے کہ وہ اسلام قبول کرنے والا چوتھا آدمی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دونوں حضرات کی بات اپنی جگہ درست ہے جیسا کہ ابن جریر طبری جبیر بن نفیر کی روایت نقل کرتے ہیں:

كان ابوذر وابن عبسة كلاهمايقول لقدرأيتني ربع الاسلام ولم يسلم قبلي الاّ النبي وابوبكر وبلال كلاهما لايدري متىٰ اسلام الآخر.

(تاريخ الامم والملوك ج٢ ص ٥٩)

''ابوذر اور ابن عبسہ میں سے ہر ایک کا کہنا ہے کہ وہ اسلام قبول کرنے والا چوتھا آدمی ہے اور مجھ سے پہلے صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر اور بلال مسلمان ہوئے تھے حالانکہ دونوں کو یہ معلوم

نہیں کہ دوسرا کب اسلام لایا تھا۔''

حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھویؒ نبوت کے پہلے سال میں اسلام قبول کرنے والوں کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت ابوذر غفاریؓ سے متعلق لکھتے ہیں:

''اسلام قبول کرنے والے پانچویں آدمی تھے، بلکہ بعض کے نزدیک چوتھے آدمی تھے، اسی (نبوت کے پہلے) سال میں ان سے چند روز قبل ان کے بھائی انیس بن جنادہ مسلمان ہو چکے تھے، انیس، ابوذر سے عمر میں بڑے تھے، پھر ابوذر اور انیس دونوں اپنی قوم بنوغفار میں واپس لوٹ آئے۔'' (بذل القوة ص ٦)

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت ابوذر غفاریؓ کو اپنے علاقے کی طرف لوٹ جانے اور اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دینے کے حکم اور دونوں بھائیوں کے اپنی قوم میں لوٹ جانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب مخاطب دعوت قبول کرلے اور بنیادی عقائد وافکار کا فہم حاصل کرلے تو داعی کو چاہیے کہ وہ اسے اس کے علاقے اور قوم کی طرف دعوت وتبلیغ کے لئے بھیج دے، بالفاظِ دیگر اپنے علاقے اور ''مقام'' کے لئے اس کی باقاعدہ ''تشکیل'' کردے تاکہ وہ اپنی قوم اور اہل علاقہ کو ان کی زبان واسلوبِ بیان کے مطابق اور ان کی ذہنی سطح اور ان کے باطل افکار اور نظریات کا پس منظر اور پیش منظر مدِ نظر رکھتے ہوئے انقلابی عقائد ونظریات کی دعوت دے، کیونکہ کسی بھی قوم اور علاقے کی زبان، ثقافت، معاشرت اور سوچ کے بارے میں اسی قوم اور علاقے کا فرد ہی زیادہ بہتر طور پر جانتا ہے اور وہ ایک اجنبی کی بنسبت زیادہ احسن طریقے سے تبلیغ ودعوت کا فریضہ انجام دے سکتا ہے۔ اس لئے کوشش اس بات کی ہونی چاہیے کہ کسی بھی علاقہ اور قوم کے افراد کی تعلیم وتربیت کر کے انہیں ان کی اپنی قوم اور علاقے کی طرف تشکیل کی جائے، البتہ ان کی معاونت اور رہنمائی کے لئے مرکزِ دعوت کی طرف سے دیگر علاقوں اور اقوام کے داعی حضرات کی تشکیل کی جاسکتی ہے، بلکہ بعض دفعہ یہ امر ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ کچھ لوگ اپنی قوم اور علاقے کے افراد کی بجائے دیگر اقوام اور علاقوں کے افراد سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور ان کی بات قبول کرتے ہیں، جیسا کہ آگے آئے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ کی تعلیم وتربیت اور اشاعتِ اسلام کے لئے اپنے قریبی صحابی حضرت مصعب بن عمیرؓ کو مدینہ بھیجا تھا۔

سابقین اولین

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ سیدہ خدیجہؓ کے اسلام لانے کے بعد آٹھ حضرات نے بالکل ابتدائی ایام میں اسلام قبول کیا جن میں حضرت ابوبکر الصدیق، علی بن ابی طالب، زید بن حارثہ، عثمان بن عفان، زبیر بن العوام، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص اور طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ شامل ہیں۔ ابن ہشام ان سے متعلق لکھتے ہیں:

فکان ھؤلاء النفر الثمانية الذين سبقوا الناس بالاسلام فصلوا وصدقوا رسول الله صلى الله عليه وسلم بماجائه من الله.

(السیرۃ لابن ہشام ج ۱ ص ۱۶۴)

''یہ وہ آٹھ افراد ہیں جنہوں نے اسلام قبول کرنے میں لوگوں سے پہل کی، نماز ادا کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ (عقائد و احکام) اللہ کی طرف سے لائے اس کی تصدیق کی۔''

مذکورہ آٹھ حضرات کے بعد معروف صحابہ کرامؓ میں سے یہ حضرات مشرف بہ اسلام ہوئے:

ابوعبیدہ بن الجراح، ابوسلمہ، عبداللہ بن عبدالاسد، ارقم بن ابی الارقم، عثمان بن مظعون، قدامہ بن مظعون، عبداللہ بن مظعون، عبیدہ بن حارث بن المطلب، سعید بن زید، ان کی زوجہ فاطمۃ بنت الخطاب، اسماء بنت ابی بکر، خباب بن الارت، عبداللہ بن مسعود، عمیر بن ابی وقاص وغیرہم رضی اللہ عنہم۔ (ایضاً ص ۱۶۵)

مذکورہ بالا آٹھ حضرات کی فہرست میں سے حضرت زید بن حارثہؓ کے علاوہ باقی تمام کا قریش کے بڑے گھرانوں سے تعلق تھا، اور وہ سب حضرات نوجوان تھے اسی طرح دوسری فہرست میں بھی چند ایک کے علاوہ باقی تمام حضرات کا تعلق قریش کے اونچے خاندانوں سے تھا۔ جس سے یہ معلوم ہوا کہ دعوتِ اسلام سماجی و معاشی طور پر نچلے طبقات سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کی بنسبت اونچے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں میں زیادہ مقبول ہو رہا تھا۔

دعوت قبول کرنے والوں کا لگاتار سلسلہ

ابن القیم الجوزیہ لوگوں کے قبولِ اسلام سے متعلق لکھتے ہیں:

دخل الناس في الدين واحداً بعدواحدٍ. (زادالمعاد ج ۲ ص ۶۰)

''لوگ یکے بعد دیگرے دینِ اسلام میں داخل ہونے لگے۔''

یعنی اس کے بعد تو اسلام قبول کرنے والوں کا لگا تار سلسلہ شروع ہو گیا اور اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، جبکہ شروع ایام میں یہ حالت تھی کہ حضرت عمار بن یاسرؓ فرماتے ہیں:

''میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف پانچ غلام، دو عورتیں اور ابوبکر تھے۔'' (صحیح البخاری کتاب المناقب باب ذکر ماتقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

اسی طرح حضرت ابوذر سے مروی ہے:

''اولین اسلام کا اظہار کرنے والے سات حضرات یہ تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر، عمار، ان کی والدہ سمیہ، صہیب، بلال اور مقداد۔'' (المواہب اللدنیہ مع شرح الزرقانی ج ۱، ص ۴۹۷ ایضاً دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۲، ص ۲۸۱)

علامہ زرقانی مذکورہ بالا روایت کی شرح میں لکھتے ہیں:

اظهاراً تاماً لا خفأ معهٔ بحيث لا يبالى بمن علم به (شرح الزرقانی ج ۱ / ۴۹۷)

''یہ کامل طور پر اظہارِ اسلام تھا جس میں کوئی خفا نہ تھا، اس طرح کہ انہیں اس بات کی کوئی پرواہ نہ تھی کہ کسے ان (کے اسلام) کا علم ہوا ہے۔''

یعنی وہ اپنے اسلام کے اظہار میں کسی قسم کے خوف میں مبتلا نہ تھے، وہ اس کا کھل کر اظہار کرتے تھے اور وہ اس بات کی پرواہ نہ کرتے کہ جاننے والا اس پر کیا ردعمل دکھائے گا، کسی مخالف کی مخالفت اور ظالم کے ظلم کی انہیں کوئی فکر نہ تھی۔ دراصل ایسے حضرات کے اظہار اور جرأت و استقامت سے ہی دعوت پھیلتی جاتی ہے اور اسے قبول کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اگر اس دعوت کو قبول کرنے والا ہر فرد مخالفت، مصائب اور لوگوں کے تبصروں، تجزیوں اور تنقید سے خوفزدہ ہو جائے تو اس نئی دعوت کی اشاعت ممکن نہیں۔

نچلے طبقات کا دعوت قبول کرنا

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اولین اسلام قبول کرنے میں سے زیادہ تعداد قریش کے بڑے گھرانوں کے نوجوانوں کی تھی، لیکن اس کے بعد نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد بھی کافی تعداد میں مسلمان ہوئے۔ چنانچہ علامہ حلبی لکھتے ہیں:

لايخفى انه صلى الله عليه وسلم لما بعث اخفى امره وجعل يدعوالى الله سراً واتبعهٔ ناس عامتهم ضعفاء من الرجال و النساء والى هذا الاشارة بقوله صلى الله

علیه وسلم ان هذا الدین بدأ غریباً وسیعود کما بدا فطوبی للغرباء

(السیرة الحلبیة ج ۱ ص ۲۵۵)

''اس امر میں کوئی خفا نہیں کہ جب آپ مبعوث ہوئے تو آپ نے اسے مخفی رکھا اور لوگوں کو خفیہ دعوت دینے لگے تو عام اور کمزور لوگوں میں سے مردوں اور عورتوں نے آپ کی اتباع کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں اس طرف اشارہ ہے آپ نے فرمایا:''بلاشبہ اس دین کی ابتداء اجنبیت سے ہوئی، اور عنقریب ابتداء والی حالت کی طرف لوٹ جائے گا، پس اسے ابتدائی زمانے میں قبول کرنے والوں کیلئے خوشخبری ہو۔''

حضرت بلالؓ سابقین اولین میں سے تھے، اسلام قبول کرنے کے وقت عبداللہ بن جدعان کے غلام تھے، ان کے آقا کے سو غلام تھے۔ چونکہ نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد خصوصاً غلام دعوت اسلام کی طرف زیادہ متوجہ ہو رہے تھے، اس لئے قریش نے غلاموں کو شہر سے باہر بھجوا دیا تا کہ وہ اس نئی دعوت سے دور رہیں۔ امام نوویؒ نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کے قبول اسلام کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فلکون الاشراف یانفون من تقدم مثلهم علیهم والضعفاء لایانفون فیسرعون الی الانقیاد واتباع الحق (شرح لصحیح مسلم کتاب الجهاد والسیر باب کتب النبی صلی الله علیه وسلم الی هرقل)

''کیونکہ بڑے لوگ اپنے بڑوں (آباء واجداد) کے اختیار کردہ (مذہب وعقائد) کی بنیاد پر انا پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں جبکہ کمزور طبقے سے تعلق رکھنے والے اس طرح نہیں کرتے چنانچہ وہ جلد فرمانبرداری اور اتباع حق کی طرف آجاتے ہیں۔''

بہر حال عبداللہ بن جدعان نے بھی اپنے غلاموں کو شہر سے باہر بھیج دیا۔ جیسا کہ علامہ حلبی لکھتے ہیں:

''جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا تو انہیں مکہ سے اس خوف کی بنا پر نکال دیا گیا کہ کہیں یہ اسلام نہ قبول کر لیں، سب کو تو باہر بھیج دیا گیا لیکن بلال کو نہ بھیجا گیا کیونکہ وہ اس کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔'' (السیرۃ الحلبیۃ ج۱،ص۲۸۴)

حضرت بلال بکریاں چرانے کے لئے مکہ میں رہ گئے تھے، اس لئے ان تک اسلام کی دعوت پہنچ گئی

اور وہ مسلمان ہو گئے، جس سے عبداللہ بن جدعان جیسے لوگوں کے اپنے غلاموں کے اسلام سے متاثر ہو کر اسے قبول کرنے سے متعلق خدشات درست ثابت ہوئے اور وہ ایک غلام کو بھی اسلام سے دور رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

سنت اللہ یہی ہے کہ انقلابی عقائد و افکار اور دعوت کو ابتدائی ایام میں صحیح معنوں میں معاشرے کے عام اور نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد قبول کرتے ہیں۔ چونکہ یہ طبقہ سیدھا سادہ، عقلی امور اور فلسفوں سے دور اور رائج ریاستی نظام کے ظلم و جبر کا شکار ہوتا ہے اس لئے وہ حق پر مبنی عقائد و افکار کو قبول کرنے میں تردد و تذبذب میں نہیں پڑتا اور عدل و انصاف کو عملی اور یقینی طور پر پیش کرنے والے نظام کی پناہ میں آنا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس بسا اوقات سماجی و سیاسی اور اقتصادی طور پر اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد خصوصاً جن کے رائج نظام سے بڑے بڑے مفادات وابستہ ہوتے ہیں وہ اس دعوت کو قبول نہیں کرتے بلکہ اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں، پھر جب یہ دعوت ان رکاوٹوں کے باوجود نہ رکے تو ''دیکھو اور انتظار کرو'' کی پالیسی پر عمل پیرا ہوتے ہیں، پھر جب دعوت کا پلڑا بھاری نظر آتا ہے اور کامیابیوں (فتوحات) کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو اس میں شامل ہو جاتے ہیں تاکہ اپنے ذاتی مفادات کا بخوبی تحفظ کر سکیں۔

دعوت میں وسعت

جب داعیِ حق دعوت لے کر اٹھتا ہے تو بالکل شروع میں تو وہ اکیلا ہوتا ہے لیکن بتدریج لوگ اسے قبول کرتے ہیں تو دعوت کی اشاعت ہوتی ہے اور وہ پھیلتی جاتی ہے۔ ابن اسحاق روایت کرتے ہیں:

فلما أسلم أبو بكر رضي الله عنه أظهر إسلامه ودعا إلى الله وإلى رسوله. وكان أبو بكر رجلا مألفا لقومه محببا سهلا، وكان أنسب قريش لقريش وأعلم قريش بها، وبما كان فيها من خير وشر وكان رجلا تاجراً ذاخلق ومعروف وكان رجال قومه يأتونه ويألفونه لغير واحد من الأمر لعلمه وتجارته وحسن مجالسته فجعل يدعو إلى الله وإلى الإسلام من وثق به من قومه ممن يغشاه ويجلس إليه. (السيرة لابن هشام ج ا ص ١٦٣)

''ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ جب ابو بکر اسلام لائے تو انہوں نے اس کا اظہار کیا اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف دعوت دی۔ ابو بکر اپنی قوم میں محبوب و نرم مزاج تھے، قریش کے (قبیلوں میں)

بڑے نسب والے اور ان کے نسب کے اچھے اور برے کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے، آپ تاجر، اچھے اخلاق کے مالک اور معروف آدمی تھے، آپ کی قوم کے لوگ آپ کے علم، تجارت اور اچھی صحبت کی وجہ سے آپ کے پاس آتے اور آپ سے محبت کرتے تھے، پس جو آدمی ان کے پاس آتے اور ان کے پاس بیٹھتے تو یہ ان میں سے قابل بھروسہ افراد کو اللہ اور اسلام کی طرف بلاتے۔''

حضرت ابوبکر الصدیقؓ کی گوناں گوں صفات اور اخلاقِ حمیدہ کی برکت سے دعوتِ اسلام کی زبردست اشاعت ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ اولین داعیٔ اسلام ہیں جن کے ہاتھ پر بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

''جب اسلام آ چکا تو انہوں نے اس (کے قبول کرنے) کی طرف سبقت کی اور آپ سے محبت کرنے والے اور آپ کی طرف میلان رکھنے والی جماعت نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا چنانچہ عشرہ مبشرہ میں سے پانچ صحابہ نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔''

(اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابۃ ج ۳ ص ۳۱۰ ترجمہ ابوبکر الصدیق)

امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ قبولِ اسلام کے بعد ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں سے چلے گئے اور شام کو عثمان بن عفان، طلحہ بن عبیداللہ، زبیر بن العوام، سعد ابن اَبی وقاص کو دعوت دے کر آپ کی خدمت میں لائے تو انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔ دوسرے دن عثمان بن مظعون، ابوعبیدہ بن الجراح، عبدالرحمٰن بن عوف، ابوسلمہ بن عبدالاسد، ارقم بن ابی ارقم رضی اللہ عنہم کو ساتھ لے آئے تو وہ بھی مسلمان ہو گئے۔ (السیرۃ لابن کثیر ج ۱، ص ۴۳۹، ایضاً خصائص العشرۃ الکرام البررۃ للزمخشری ص ۲۷)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ ابوبکر کی دعوت پر عثمان، طلحہ وغیرہ مسلمان ہوئے، آگے لکھتے ہیں:

حصل بسبب ذلک للاسلام قوة عظيمة (قرۃ العینین ص ۲۲۰)

''اس دعوت کے سبب سے اسلام کو عظیم قوت حاصل ہوگئی۔''

لوگوں کو مرکزِ دعوت لایا جائے

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ طلحہ بن عبیداللہؓ بصریٰ کے بازار میں تجارت کی غرض سے موجود تھے کہ ایک راہب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے بارے میں پوچھا اور بتایا کہ اسی مہینے میں ان کا ظہور ہوگا۔ طلحہ بن عبیداللہ جلدی جلدی مکہ پہنچے اور ابوبکرؓ کے پاس آئے تو

فخرج أبوبكر بطلحة فدخل به على رسول الله صلى الله عليه وسلم، فأسلم طلحة. (دلائل النبوة ج ٢، ص ١٦٦)

''ابوبکر طلحہ کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو طلحہ نے اسلام قبول کرلیا۔''

اس واقعے سے یہ سبق ملتا ہے کہ اگر داعی سے دعوت اور قائدِ دعوت کے بارے میں استفسار کیا جائے تو نہ صرف وہ اس کی وضاحت کرے بلکہ سائل اور مخاطب کو اس بات پر بھی آمادہ کرے کہ وہ خود قائدِ دعوت کی خدمت میں حاضر ہوکر ان سے بالمشافہ دعوت سنے اور اپنے سوالات یا تحفظات کا اظہار کرکے اپنی تسلی کرلے۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مخاطب کو مرکزِ دعوت لایا جائے تاکہ وہ اس دعوت کو تسلی سے جان سکے وہاں مرکز کے ماحول اور ارکانِ دعوت کے حالات کا بھی مشاہدہ کرے۔

ماں کی بھوک ہڑتال اور استقامت کا مظاہرہ

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے حضرت ابوبکر الصدیقؓ کی دعوت پر اسلام قبول کیا تھا، ان کی والدہ کو ان کے قبولِ اسلام کا علم ہوا تو انہوں نے ماں کی بھوک ہڑتال پر اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

تعلمين والله ياامه ولو كان لك مائة نفس تخرج نفساً نفساً ماتركت دين هذا النبي ﷺ فكلي ان شئتِ اولا تأكلي .(السيرة الحلبية باب ذكر اوّل الناس ايماناً)

''اے اماں! آپ جانتی ہیں کہ اللہ کی قسم! اگر آپ کی سو جانیں ہوں اور وہ ایک ایک کرکے نکل رہی ہوں تب بھی میں اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دین نہیں چھوڑوں گا، آپ کی مرضی ہے کھانا کھائیں یا نہ کھائیں۔''

جب ان کی والدہ نے یہ صورتحال دیکھی تو کھانا کھالیا۔ اس سے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی دین میں پختگی اور استقامت کا علم ہوتا ہے کہ انہوں نے ماں کی بھوک ہڑتال کی پروانہ کی اور اپنے عقیدے پر ڈٹے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب داعیِ حق استقلال و استقامت کا مظاہرہ کرتا ہے تو مخالفین بھی عاجز آجاتے ہیں اور بالآخر ہار مان لیتے ہیں جیسے سعد بن ابی وقاصؓ کی والدہ نے بیٹے کی استقامت دیکھتے ہوئے بھوک ہڑتال ختم کردی اور کھانا کھالیا۔

حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ تو سابقین اولین میں سے تھے لیکن ان کے والد حالتِ کفر پر قائم رہے، غزوۂ بدر میں کفار کی طرف سے شریک ہوئے، اپنے فرزند سے آمنا سامنا ہوا تو ان سے مقابلے

کی ٹھان لی، ابوعبیدہ نظر انداز کرتے رہے۔ لیکن وہ باز نہ آئے آخرکار ابوعبیدہ نے مجبور ہوکر انہیں قتل کر دیا۔ (خصائص العشر ۃ الکرام البررۃ ص ۱۵۹)

اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

لَاتَجِدُقَوْمًایُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّاللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ کَانُوْآ اٰبَآءَ هُمْ اَوْاَبْنَاءَ هُمْ اَوْاِخْوَانَهُمْ اَوْعَشِیْرَتَهُمْ ط اُوْلٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ط وَیُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَاالْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاط رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْاعَنْهُ ط اُوْلٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰهِ ط اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ٥(المجادلة : ۲۲)

''تو نہ پائے گا کسی قوم کو جو یقین رکھتے ہوں اللہ پر اور پچھلے دن پر کہ دوستی کریں ایسوں سے جو مخالف ہوئے اللہ کے اور اس کے رسول کے، خواہ وہ اپنے باپ ہوں یا اپنے بیٹے یا اپنے بھائی یا اپنے گھرانے کے۔ ان کے دلوں میں اللہ نے لکھ دیا ہے ایمان اور ان کی مدد کی ہے اپنی غیب کے فیض سے۔ اور داخل کریگا ان کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں ہمیشہ رہیں ان میں۔ اللہ ان سے راضی اور وہ اس سے راضی۔ وہ لوگ ہیں گروہ اللہ کا۔ سنتا ہے جو گروہ ہے اللہ کا وہی مراد کو پہنچے۔''

سابقین اولین کی قربانیاں

خلفائے اربعہ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے عشرہ مبشرہ کو جو مقام و مرتبہ اور فضیلت حاصل ہے وہ ان کی دین کے لئے قربانیوں اور مشقتیں جھیلنے کی وجہ سے ہے۔ ان کی دینِ اسلام کیلئے قربانیاں اور خدمات بھی بے شمار ہیں۔ تحفظِ دین اور اشاعتِ اسلام میں ان کا کردار لازوال، مثالی اور تاریخی ہے۔ درج ذیل روایت سے ان کی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں:

کان مقام ابی بکر و عمر و عثمان و علی و طلحة والزبیر وسعد وعبدالرحمن ابن عوف وسعید بن زید کانوا امام رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فی القتال وورائهٗ فی الصلوٰة. (اسد الغابه ج ۲، ص ۳۸۹، ترجمه سعید بن زید)

''حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد، عبدالرحمٰن بن عوف اور سعید بن زید (رضی اللہ عنہم) کا مقام و مرتبہ یہ تھا کہ وہ لڑائی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے ہوتے تھے اور نماز میں آپ کے پیچھے کھڑے ہوتے تھے۔''

یعنی جب دین کیلئے قربانی اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جانیں نچھاور کرنے کا موقع ہوتا تو یہ جلیل القدر حضرات آگے آگے ہوتے اور جہاد میں آپ کے سامنے ڈھال بنے ہوتے اور جب نماز واقتداء کا وقت ہوتا تو آپ کے پیچھے کھڑے ہوتے تھے۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ:

(الف) جب دعوت وتحریک کے لئے قربانی اور ایثار کا وقت ہو تو ارکانِ دعوت خصوصاً قائدِ دعوت کے ساتھ خصوصی تعلق رکھنے والے حضرات کو چاہیے کہ وہ اس میں پیش پیش رہیں اور ہراول دستے کا کردار کریں اور پیچھے نہ رہیں۔

(ب) اسی طرح اقتداُ واتباع اور قائد کے حکم کی تعمیل کا وقت ہو تو بلا چون وچرا اسے بجالانا چاہئے اور جیسے مقتدی امام کے خلاف کرسکتا ہے اور نہ اس سے پس وپیش کرسکتا ہے، اسی طرح ارکانِ دعوت بھی قائدِ دعوت کے آگے ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے'' کی مجسم تصویر بنے ہوئے ہوں۔

سابقین اولین کے جذبات واحساسات

سابقین اولین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہ کر آپ سے جو تعلیم وتربیت پائی تھی، اس کا نتیجہ تھا کہ وہ انتہائی ثابت قدم، وفا شعار، جذبۂ ایثار سے سرشار اور ہر مشکل مرحلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دین اسلام کیلئے جانیں نچھاور کرنے والے تھے۔ حضرت صہیب رومی سابقین میں سے تھے، ان کے درجہ ذیل الفاظ سے سابقین اولین کے جذبات اور ان کی قربانیوں کی ایک جھلک نظر آتی ہے، فرماتے ہیں:

قال لم یشھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم مشھداً قط الّا کنت حاضرہٗ ولم یبایع بیعۃ الاکنت حاضرۃً ولم یسر سریۃً قط الّا کنتُ حاضرھا ولا غزا غزاۃ الّا کنت فیھا عن یمینہ او شمالہ وما خافوا امامھم قط الاکنت امامھم ولا ماورائھم الا کنت ورائھم وما جعلت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بینی و بین العدوّ قط حتی توفی. (الاصابہ فی تمییز الصحابہ ج۲، ص ۱۹۶ ترجمہ صہیب)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس مقام میں بھی تشریف لے گئے میں بھی اس میں حاضر ہوا، آپ کے ہاتھ پر جب کبھی بیعت کی گئی، میں حاضرِ خدمت تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو لشکر بھیجا میں اس میں شریک تھا، جس غزوے میں آپ تشریف لے گئے میں اس میں آپ کے دائیں اور بائیں موجود

رہا، آپ کے آگے خطرہ محسوس کیا گیا تو میں آپ کے آگے موجود تھا، آپ کے پیچھے خطرہ محسوس کیا گیا تو میں آپ کے پیچھے موجود تھا، الغرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک میں آپ اور آپ کے دشمن کے درمیان حائل رہا۔''

نظریے کی وضاحت

اگر چہ یہ خفیہ دعوت کا زمانہ تھا تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس کو دعوت دیتے اس پر اپنے عقائد ونظریات بالکل واضح بیان فرما دیتے تھے اور اس میں کسی قسم کا اخفاء نہیں کرتے تھے۔ خالد بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ چوتھے یا پانچویں مسلمان ہیں۔ انہوں نے خواب دیکھا کہ آگ کے کنارے کھڑے ہیں اور ان کے والد انہیں آگ میں گرانا چاہتے ہیں جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کھینچ کر بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خواب دیکھنے کے بعد ابوبکر الصدیقؓ سے ملاقات کی اور انہیں بتایا تو انہوں نے کہا:

''تمہارے ساتھ بھلائی کا ارادہ کیا گیا ہے، یہ اللہ کے رسول ہیں، ان کی اتباع کرو، اسلام اختیار کرو گے تو وہ تمہیں آگ میں گرنے سے بچالیں گے جبکہ تمہارا باپ تمہیں اس میں گرانا چاہتا ہے۔'' (الاستیعاب ج۱ص۱۵۱ ترجمہ خالد بن سعید بن العاص)

چنانچہ ابوبکرؓ کی ترغیب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا اے محمد! آپ کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا:

''میں اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی طرف بلاتا ہوں اور یہ کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں، تم پتھروں کی عبادت چھوڑ دو، یہ پتھر نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں، نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ کوئی نفع دے سکتے ہیں اور نہ انہیں یہ معلوم ہے کہ کس نے ان کی عبادت کی ہے اور کس نے نہیں کی۔''

(دلائل النبوۃ ج۲،ص۱۷۳)

خالدؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اور آپ اس کے رسول برحق ہیں، یوں میں اسلام میں داخل ہو گیا۔ باپ کو جب میرے اسلام کا علم ہوا تو مجھے اس قدر مارا کہ سر زخمی ہو گیا اور چھڑی کو میرے سر پر توڑ ڈالا، پھر کہا:

اتبعت محمداً وانت ترى خلاف قومه وماجاء من عيب آلهتهم وعيبه من مضى من آبائهم؟ (حياة الصحابة ج ۱ ص ۴۳)

''تو نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اتباع کیا؟ جس نے ساری قوم کے خلاف کیا اور ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا اور ہمارے آباؤ اجداد کی عیب جوئی کرتا ہے''۔

خالد کہتے ہیں، میں نے اپنے باپ سے کہا۔ واللہ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم بالکل سچ فرماتے ہیں۔ میری اس بات پر باپ کو اور بھی غصہ آ گیا اور مجھے سخت سست کہا، گالیاں دیں اور کہا ''اے کمینے تو جہاں جانا چاہتا ہے چلا جا۔ واللہ میں تیرا کھانا پینا بند کردوں گا۔'' خالد نے کہا:

ان منعتنی فان اللّٰہ عزوجل یرزقنی مااعیش به .(ایضاً ص ۴۴)

''اگر تم کھانا بند کردو گے تو اللہ عزوجل مجھ کو رزق عطا فرمائیں گے''۔

اس پر باپ نے مجھ کو اپنے گھر سے نکال دیا اور اپنے بیٹوں سے کہا کہ کوئی اس سے بات چیت نہ کرے اور جو اس سے بات کرے گا اس کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جائے گا۔ خالد اپنے باپ کا گھر چھوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درِ دولت پر آ پڑے، آپ خالد کا بہت اکرام فرماتے تھے۔

عمرو بن عبسہ السلمی ابتدائی زمانے میں اسلام لانے والوں میں سے ہیں (جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ان کا کہنا تھا کہ وہ اسلام قبول کرنے والے چوتھے آدمی ہیں) وہ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں یہ بات آئی کہ بتوں کی عبادت باطل (عقیدہ) ہے، ایک آدمی نے مجھ سے یہ بات سنی تو اس نے کہا اے عمرو! مکہ میں ایک آدمی ہے وہ بھی یہی کہتا ہے جو تو کہتا ہے، فرماتے ہیں کہ میں مکہ آیا اور ان کے بارے میں پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ وہ مخفی رہتے ہیں، رات کے وقت ہی آ کر وہ بیت اللہ کا طواف کرنے پر قادر ہیں۔ عمرو بن عبسہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا، آپ کیا ہیں؟ یعنی کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں نبی ہوں۔ میں نے پوچھا نبی کیا ہوتا ہے؟ فرمایا:

رسول اللہ (اللہ کا بھیجا ہوا پیامبر)

میں نے کہا اللہ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟ فرمایا ہاں۔ میں نے کہا کیا دے کر بھیجا ہے؟ فرمایا:

بأن یعبَدَ اللّٰہ وتکسر الأوثان، وتوصل الأرحام. (دلائل النبوة للبیهقی ج ۲، ص ۱۶۸)

''یہ کہ اللہ کی عبادت کی جائے، بتوں کو توڑ دیا جائے اور صلہ رحمی کی جائے۔''

حضرت خالد بن سعیدؓ اور عمرو بن عبسہؓ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کے عقائد و افکار کے بارے میں سوالات اور آپ کی طرف سے واضح جوابات سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی جس کو دعوت دے، یا اس سے اس کے افکار و نظریات کے بارے میں تحقیق حال کی نیت سے استفسار کیا جائے تو وہ

ان افکار ونظریات کو کھول بیان کر دے تا کہ مخاطب ان کو بخوبی سمجھ لے اور شرح صدر ہونے پر قبول کرلے۔

بنیادی اصول تبدیل نہیں ہوتے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء دعوت میں جن عقائد ونظریات کا اظہار کیا آخر تک انہی پر قائم رہے۔ مثلاً ابتداء دعوت میں حالت کفر وشرک میں مرنے والے اہل مکہ کے بارے میں بتلایا کہ ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی انقلابی دعوت یا تحریک کے بنیادی اصول کبھی بھی تبدیل نہیں ہوا کرتے، کیونکہ ایک داعی اور مفکر بڑے غور وفکر اور سوچ بچار کے بعد ان اصولوں کو اختیار کرتا ہے اور انہی کی بنیاد پر وہ انقلاب برپا کر کے نظام کی تبدیلی چاہتا ہے، اگر داعی خود ان اصولوں سے نام نہاد مصلحت، حکمت اور حالات کے تقاضے کے تحت انحراف کرلے تو اس دعوت اور تحریک کا مقصد ہی فوت ہو جاتا اور اس کا جواز ختم ہو جاتا ہے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جن تحریکوں اور دعوتوں نے آگے چل کر اپنے ہی اصولوں سے انحراف کیا بلکہ ان پر ضرب لگائی وہ کبھی بھی منزل مقصود تک نہ پہنچ سکیں بلکہ اس انحراف کے انتہائی منفی اثرات سامنے آئے۔ انقلابی فکر رکھنے والے حضرات میں مایوسی وناامیدی پیدا ہوئی اور ان کے ذہنوں میں یہ تصور جڑ پکڑنے لگا کہ نہ تو کامیاب تحریک چلانا ممکن ہے اور نہ کامیاب اور مخلص انقلابی قیادت اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کرنے کے لئے منظرِ عام پر آ کر امت کی قیادت ورہنمائی کرسکتی ہے۔

مخالفین کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اربابِ دعوت کو ان کے راستے، مشن اور کاز سے ہٹایا جائے اور ان کے بارے میں کوئی ایسی بات تلاش کی جائے جس کے ذریعے عوام میں ان کے خلاف منفی پروپیگنڈہ کیا جاسکے، اس میں سب سے اہم بات اربابِ دعوت کا اپنے اصولوں پر عمل درآمد کرنا یا اس سے انحراف کرنا ہے۔ اگر ارباب دعوت اپنے ہی طے کردہ اصولوں سے عملی طور پر منحرف ہو جائیں تو اس بات کا عوام میں پروپیگنڈہ کر کے دعوت وتحریک کو بدنام اور ناکام بنانا مخالفین کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے، لہٰذا امیر دعوت اور مرکزی قیادت کو اس حوالے سے انتہائی محتاط رہنا چاہئے کہ کہیں بھی اور کبھی بھی دعوت وتحریک کے بنیادی نظریات اور اصولوں کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے، ارکانِ دعوت کی اس حوالے سے خوب ذہن سازی اور تربیت کی جائے۔

اربابِ دعوت سیرت کا یہ پہلو ہمیشہ مدنظر رکھیں کہ دعوت کی وسعت، مقبولیت، ترقی اور تیز رفتاری

کے لئے نظریات اور اصولوں کو پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا۔ اگر کوئی فرد، گروہ یا جماعت ایسی شرائط کے ساتھ دعوت قبول کرتی ہے جس سے اصولوں پر زد پڑتی ہو تو اسے ہرگز قبول نہ کیا جائے، ارکانِ دعوت کی تعداد میں اضافے کی امید اور لالچ پر نظریات اور اصولوں کی قربانی نہیں دی جا سکتی۔ ایسے لوگوں پر واضح کر دیا جائے کہ تم دعوت قبول کرو یا نہ کرو لیکن نظریات اور اصولوں کو ترک نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا جن بنیادی اصولوں پر ایک انقلابی دعوت اور تحریک کی بنیاد رکھی جائے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے اور اس کے بعد تک ان پر استقامت کے ساتھ ڈٹے رہنا چاہئے اور ان سے سرِ مو انحراف نہ کرنا چاہئے۔ اسی صورت میں تبدیلی اور انقلاب لانا ممکن ہے۔

جماعت کا وجود

جب داعی دعوت لے کر اٹھتا ہے تو وہ اکیلا ہوتا ہے لیکن بتدریج اس دعوت کو قبول کرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ایک عرصے بعد اس قدر لوگ اس دعوت پر اکٹھے ہو جاتے ہیں کہ انہیں ''جماعت'' کہا جا سکتا ہے۔ بعثت کے بعد تین سال کے عرصے میں معتد بہ افراد اسلام قبول کر چکے تھے، چنانچہ سابقین اولین کے مختصر تذکرہ کے بعد ابن ہشام لکھتے ہیں:

ثم دخل الناس فی الاسلام أرسالا من الرجال والنساء حتى فشا ذكر الاسلام بمكة وتحدث به ثم ان الله عزوجل امر رسول الله ﷺ ان يصدع بما جاءهٗ منه وان يبادی الناس بامره وان يدعو اليه (ابن هشام ج ١، ص ٢٦٨)

''پھر لوگوں میں سے مردوں اور عورتوں کی جماعتیں اسلام میں داخل ہوئیں یہاں تک کہ مکہ میں اسلام کا ذکر پھیل گیا اور اس سے متعلق باتیں کی جانے لگیں پھر اللہ عزوجل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے اظہار کا حکم دیا اور یہ کہ لوگوں میں اس کا اعلان کر دیں اور انہیں دعوت دیں۔''

کم سے کم جماعت

ویسے تو عام طور پر ''ایک نظریہ اور مقصد پر متفق اور اس کے حصول کے لئے منظم طور پر کوشاں افراد'' کو ہی جماعت کہا جاتا ہے اور عام طور پر اس کا اطلاق اچھی خاصی تعداد پر کیا جاتا ہے لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ جماعت کی کوئی تعداد متعین نہیں ہے۔ لاکھوں، ہزاروں افراد کو بھی جماعت کہا جا سکتا ہے اور محض دو افراد کو بھی۔ داعیٔ اول کی دعوت کو اگر ایک آدمی بھی قبول کر لیتا ہے اور وہ اس مقصد کو اپنا مقصدِ زندگی بنا کر اس کی دعوت شروع کر دیتا ہے تو یہ بھی جماعت ہی کہلائے گی، جیسا کہ حافظ

ابن حجر عسقلانی، ابوامامہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کیا کوئی آدمی اس پر صدقہ کرے گا کہ وہ اس کے ساتھ نماز پڑھے؟ ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ نماز پڑھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

هذه الجماعة وهؤلاء الجماعة. (المطالب العاليه ج ۱، ص ۱۱۰)

''یہ جماعت ہے اور وہ لوگ جماعت (کے ارکان) ہیں۔''

اس سے یہ واضح ہوا کہ دو افراد جب وہ تابع اور متبوع (امیر اور مامور) کی حیثیت رکھتے ہوں تو اس پر جماعت کا اطلاق کیا جا سکتا ہے اور ان افراد کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس جماعت کے ارکان ہیں۔

جماعت کا اظہار ضروری نہیں

جب جماعت وجود میں آ چکی تو اس کا اظہار ضروری نہیں ہوتا بلکہ ابتدائی زمانے میں تو اسے مخفی رکھنا ہی دعوت کے لئے مفید اور کارآمد ہوتا ہے کیونکہ اس وقت چونکہ دعوت کی زیادہ اشاعت نہیں ہوئی ہوتی اور اس کے اظہار کے لئے فضا سازگار نہیں ہوتی اس لئے مصلحت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ اس مختصر جماعت کا اظہار نہ کیا جائے، البتہ دعوت کا کام جاری وساری رہے اور اس میں کسی قسم کی کمی، کوتاہی یا سستی وکاہلی نہ کی جائے، علامہ حلبی لکھتے ہیں:

ان القهر انما ينافي اظهار الجماعة لا فعلها (السيرة الحلبيه ج ۱، ص ۲۵۹)

''سختی اور شدت جماعت کے اظہار کے تو منافی ہے لیکن اس کے فعل (عملی کام) کے منافی نہیں ہے۔''

فعلِ جماعت اور اظہارِ جماعت میں فرق

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ''فعل جماعت'' اور ''اظہارِ جماعت'' دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اگر جماعت وجود میں آ جائے تو اس کا اظہار ضروری نہیں ہے بلکہ حکمت ومصلحت کے تحت ایک مدت تک اسے مخفی رکھا جا سکتا ہے کیونکہ جب ایک انقلابی دعوت منظرِ عام پر آتی ہے۔ دعوت کے ابتدائی زمانے میں چونکہ اس کی زیادہ اشاعت نہیں ہوتی اور اس کو قبول کرنے والے افراد کم اور مخالفت کرنے والے زیادہ ہوتے ہیں، اس لئے اس قلیل اور محدود جماعت کا اظہار کیا جائے تو اس کے ارکان کیلئے مسائل ومشکلات میں اضافہ ہو جاتا ہے جو ان کے لئے ناقابل برداشت ہوتے ہیں دراصل جس طبقے

کے عقائد وافکار اور، مروج نظام سے وابستہ سیاسی واقتصادی مفادات پر ضرب پڑتی اور مستقبل تاریک ہوتا نظر آتا ہے تو وہ اس کے درپے ہو جاتے ہیں اور اپنے شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے داعیوں پر جبر وتشدد ڈھاتے ہیں، اس لئے حکمت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ دعوت کا کام تو جاری رہے البتہ بحیثیت جماعت اس کا اظہار نہ کیا جائے اور انتظار کیا جائے، پھر مناسب وقت پر اس کا اظہار کیا جائے۔

اس لئے ابتدائی ایام میں اسے مخفی رکھا جاتا ہے اور اس کا اظہار نہیں کیا جاتا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ ''حالات کے ناسازگار'' ہونے اور مخالفین کے ''شدید ردعمل اور مخالفت'' کے پیش نظر دعوت کو ترک کر دیا جائے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر حالات کے سازگار ہونے کا انتظار کیا جائے، نہیں بلکہ حالات ناسازگار ہونے اور مخالفین کے شدید ردعمل اور مخالفت کے یقینی امکان کے باوجود اظہارِ جماعت کے بغیر دعوت اور جماعتی کام کو جاری رکھا جاسکتا ہے۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ بہت سی دعوتوں اور تحریکوں پر مخالفین خصوصاً صاحبانِ اختیار واقتدار کی طرف سے پابندیاں لگادی گئیں اور اربابِ دعوت وتحریک کے لئے زمین تنگ کر دی گئی تو وہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ نہیں رہے بلکہ انہوں نے ''زیرزمین'' یا کسی دوسری متبادل ترتیب یا نظم کے ساتھ اپنی دعوت اور جماعتی کام کو جاری رکھا، پھر جب ظلم وجبر کے بادل چھٹ گئے تو دوبارہ اظہارِ جماعت کے ساتھ زور وشور سے کام شروع کر دیا گیا۔ الغرض ایک انقلابی دعوت کبھی رکتی ہے اور نہ اربابِ دعوت تھکتے اور حالات سے مایوس ہوتے ہیں بلکہ وہ ہر قسم کے حالات میں اپنی دعوت جاری رکھتے ہیں، کبھی ''اظہارِ جماعت'' کے بغیر اور کبھی اظہارِ جماعت کے ساتھ۔

دعوت خاصہ کے زمانے میں تصادم سے گریز

دعوت چونکہ مسلسل جاری رہی اس لئے کافی سلیم الفطرت حضرات نے اسلام قبول کرلیا اور ایک مختصر جماعت قائم ہوگئی تھی لیکن جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ دعوت کی طرح عبادت بھی خفیہ کی جاتی تھی اور صحابہ کرامؓ گھاٹیوں میں جا کر چھپ کر نماز ادا کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ صحابہ کرام نماز پڑھ رہے تھے کہ مشرکین نے دیکھ لیا تو اس پر اپنا شدید ردعمل ظاہر کرتے ہوئے صحابہ کرامؓ کے ساتھ لڑائی شروع کر دی، جس کے دوران حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک مشرک کو جانور کی ہڈی اٹھا کر ماری جس سے وہ زخمی ہوگیا۔ یہ پہلا خون تھا جو اسلام میں گرایا گیا۔ اس واقعے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جماعت کو لے کر دارالارقم میں مقیم ہوگئے۔

ثم دخل صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ مستخفین فی دار الارقم بعد ھذہ الواقعۃ. فان جماعۃ اسلموا قبل دخولہ صلی اللہ علیہ وسلم دار الارقم.

(السیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۲۶۹)

''پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام اس واقعہ کے بعد خفیہ طور پر دار ارقم میں داخل ہو گئے۔ اس لئے کہ ایک جماعت دار ارقم میں داخل ہونے سے پہلے ہی اسلام قبول کر چکی تھی۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حالات کا ادراک کرتے ہوئے اپنی جماعت کو لے کر خفیہ طور پر دار ارقم میں مقیم ہو گئے کیونکہ مذکورہ واقعے کے بعد اہل اسلام اور مشرکین کے درمیان تصادم کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ چونکہ تصادم و لڑائی اور جوابی کاروائی کا ابھی وقت نہیں آیا تھا اور نہ مسلمانوں کو اس کی اجازت تھی بلکہ انہیں عفو و درگذر اور پہلوتہی کرنے اور ہاتھ نہ اٹھانے کا حکم تھا اس لئے اس جماعت کو خفیہ مقام پر مقیم رکھنا اور تصادم و تشدد سے بچنا ضروری تھا جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل درآمد فرمایا۔

مرکز میں تعلیم و تربیت

دار الارقم میں قیام کے کئی مقاصد تھے۔ یعنی اپنے صحابہؓ کا ایک مقررہ جگہ پر اجتماع، صحابہؓ میں نظم وضبط پیدا کرنا وغیرہ، تاہم سب سے بڑا مقصد ان کی فکری و عملی تعلیم و تربیت کا نظم قائم کرنا تھا، تا کہ آئندہ جب اس دعوت کا اظہار اور کھلم کھلا اعلان کیا جائے تو یہ ارکان نظریاتی و عملی طور پر ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں، ان کے پاؤں میں کسی قسم کی لغزش نہ آنے پائے۔ اور وہ تعلیم و تربیت پانے کے بعد اس دعوت کی بطریقِ احسن اشاعت و تبلیغ کر سکیں۔

فکان صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ یقیمون الصلوۃ بدار الارقم ویعبدون اللہ تعالیٰ فیھا الی ان امرہ اللہ تعالیٰ باظھار الدین. (السیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۲۷۰)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ دار ارقم میں نماز قائم کرتے اور اللہ تعالیٰ کی عبادات کیا کرتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین کے کھلم کھلا اظہار کا حکم فرمایا۔''

دعوت عامہ، اظہار دعوت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ سمیت دار الارقم میں ہی مقیم تھے اور تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری تھا کہ اظہارِ دعوت اور کھلم کھلا اعلانِ توحید کا حکم نازل ہوا۔ جیسا کہ علامہ حلبی لکھتے ہیں:

''یہ سیاق اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام دارِ ارقم میں

خفیہ طور پر مقیم رہے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چوتھے سال میں دعوت کا کھلم کھلا اظہار اور اعلان کیا۔'' (السیرۃ الحلبیۃ ج ا،ص ۲۷۰)

حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی اظہار دعوت کے حکم سے متعلق لکھتے ہیں:

وفیھا وقیل بعد مضی ثلث سنین من البعثۃ ودخول السنۃ الرابعۃ امر اللہ عزوجل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باظھار دعوۃ الاسلام وانزل فی ذلک قولہ ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ وکان قبل ذلک یدعو الناس سرًا مستخفیاً خوفاً من اعدائہ المشرکین. (بذل القوۃ ص ۱۶)

''تیسرے سال میں اور بعض کے نزدیک تین سال گزرنے کے بعد اور چوتھے سال کے شروع ہونے کے ساتھ اللہ عزوجل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت اسلام کے اظہار کا حکم دیا اور اس بارے میں یہ آیت نازل فرمائی ''جس چیز کا آپ کو حکم دیا گیا ہے آپ اس کا اظہار کر دیجئے اور مشرکین سے اعراض اور درگذر کیجئے'' اس سے قبل آپ اپنے دشمنوں یعنی مشرکین کے خوف کی وجہ سے خفیہ طور پر لوگوں کو دعوت دیتے تھے۔''

مذکورہ بالا آیت کے تحت علامہ معین کاشفی لکھتے ہیں:

یعنی وقت آن آمد کہ اسلام را آشکارائی ودعوت خلق ظاہر گردانی وقرآن بآواز بلند بخوانی وخود راز کافران فارغ داری کہ ماشر ایشان از تو باز داشتیم۔ (معارج النبوۃ فی مدارج النبوۃ رکن سوم ص ۱۸)

''مطلب یہ ہے کہ اب وقت آچکا ہے کہ آپ اسلام کو ظاہر کر دیجئے، لوگوں کو دعوت دینے کے معاملے کا اظہار کر دیجیے اور قرآن بآواز بلند پڑھیئے اور اپنے آپ کو کفار سے دور رکھیئے ہم ان کے شر سے آپ کو محفوظ رکھیں گے۔''

امام قرطبی مذکورہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ای فرّق جمعھم وکلمتھم بانْ تدعوھم الی التوحید فانھم یتفرقون بان یجیب البعض فیرجع الصدع علی ھذا الیٰ صدع جماعۃ الکفار. (قرطبی جز ۷، ص ۵۷)

''آپ ان کی جماعت اور جمعیت میں تفریق پیدا کر دیجئے اس طرح کہ انہیں توحید کی دعوت دیجیئے تو وہ متفرق ہو جائیں گے، اس طرح کہ بعض تو اس دعوت کو قبول کرلیں گے اور بعض قبول نہ کریں گے اس طرح یہ تفریق کفار کی جماعت کی طرف ہی لوٹے گی۔''

جب حق کی آواز لگتی ہے تو لامحالہ سلیم الفطرت اور حق کے متلاشی افراد اسے بتدریج قبول کرتے جاتے ہیں، اس طرح رفتہ رفتہ دعوت حقہ کو قبول کرنے والوں کی ایک الگ جماعت بن جاتی ہے اور یوں لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور ان کی جمعیت منتشر ہو جاتی ہے۔ ایک دعوت کو قبول کرنے والا اور دوسرا اس کی مخالفت کرنے والا۔ مخالفین کو جہاں دوسرے مسائل پیش آتے ہیں وہاں انہیں سب سے زیادہ پریشانی اپنی جمعیت کے ٹوٹنے پر لاحق ہوتی ہے، پھر اس پریشانی میں اس وقت اضافہ ہوتا جاتا ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ دعوت قبول کرنے والے افراد کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور یہ جماعت مضبوط ہوتی جارہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قریش مکہ اپنی جمعیت کے ٹوٹنے کا بار بار ذکر کرتے تھے جیسا کہ آگے آئے گا۔

امام ابن جوزی آیت ''فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرْ'' کے تحت لکھتے ہیں:

قال موسیٰ بن عبیدۃ ما زال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مستخفیاً حتی نزلت ھذہ الآیۃ فخرج ھو و اصحابہ. (زاد المیسر جز ۴، ص ۳۲۰)

''موسیٰ بن عبیدہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخفی (دعوت دیتے) رہے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی تو آپ اور آپ کے اصحاب باہر نکلے (اور اعلانیہ دعوت دینے لگے)۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ ایک عرصے تک دعوتِ خاصہ دینے کے بعد جب اظہارِ دعوت کے لئے راہ ہموار ہو جائے تو قائدِ دعوت اور ارکانِ دعوت اس دعوت کو لے کر اٹھ کھڑے ہوں اور زور و شور کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی ہر دو صورتوں میں دعوت کے سلسلے کو جاری رکھیں اور حسبِ استطاعت اپنی صلاحیتیں اس کے لئے صرف کر دیں۔

مخالفین کی بالکل پرواہ نہ کی جائے

جب داعی دعوتِ حقہ لے کر اٹھتا ہے اور سلیم الفطرت افراد اسے قبول کرنا شروع کر دیتے ہیں تو یہ چیز باطل عقائد رکھنے والی اقوام، جماعتوں اور گروہوں کیلئے قابل قبول نہیں ہوتی چنانچہ ان کی طرف سے شدید ردعمل سامنے آتا ہے اور مخالفت شروع ہو جاتی ہے۔ اس وقت داعی کو کیا طرز عمل اختیار کرنا اور کون سا اصول اپنانا چاہئے، ملاحظہ ہو علامہ آلوسی ﴿اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ (مشرکین سے اعراض کیجئے) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ای لا تلتفت الیٰ مایقولون ولا تبالِ بھم (روح المعانی ج ۱۴، ص ۸۵، ۸۶)

''یعنی وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کی طرف توجہ نہ کیجئے اور نہ ان کی پرواہ کیجئے۔''

داعی کو شروع دن سے یہ معلوم ہونا چاہئے اور یہ تصور اس کے ذہن میں واضح ہونا چاہئے کہ اس نے جس دعوت اور عقائد او فکار کو قبول کیا ہے، مخالفین کی طرف سے اس دعوت اور اس کے حامل داعی کی شدید مخالفت کی جائے گی اور کئی مسائل و مصائب پیش آسکتے ہیں، لہٰذا ان حالات کے لئے پہلے سے ذہنی وجسمانی طور پر تیار ہونا ہوگا اور ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اظہار دعوت کے حکم کے ساتھ اس بات کا بھی حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ کو انواع واقسام کی مخالفانہ باتوں اور طعن وتشنیع کا سامنا کرنا ہوگا لیکن آپ نے ''اعراض'' (پہلوتہی) کے اصول پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے کام میں لگے رہنا ہے اور ان کی باتوں کا فی الحال کوئی جواب نہیں دینا کیونکہ اس طرح مخالفین کے سوالات اور اعتراضات کے جواب در جواب کا سلسلہ شروع ہو جائے گا تو مناظرہ ومجادلہ میں وقت صرف ہو جائے گا اور اصل دعوت رہ جائے گی جبکہ مخالفین کی تو یہی خواہش ہوتی ہے کہ داعیٔ حق کو مناظرہ ومباحثہ میں الجھا دیا جائے تاکہ اس کی اصل دعوت اور افکار ونظریات لوگوں تک نہ پہنچ سکیں۔

بعثتِ خاصہ وعامہ

اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پوری انسانیت کے لئے نبی ہیں لیکن خصوصی طور پر آپ کی نبوت قریش سے شروع ہوتی ہے اور آپ کو سب سے پہلے اپنی قوم کو ہی دعوت دینے کا حکم دیا گیا۔ ابن کثیر روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

یا بنی عبدالمطلب انّی بعثت الیکم خاصةً و الی الناس عامةً. (ابن کثیر ۳، ۳۵۰)

''اے بنو عبدالمطلب! مجھے آپ کی طرف خصوصی طور پر اور تمام انسانوں کی طرف عمومی طور پر مبعوث کیا گیا ہے۔''

قریبی لوگوں سے دعوت کی ابتداء

آیت ''فَاصْدَعْ'' کے متصل بعد حضرت مخدوم محمد ہاشمؒ نے آیت ''وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ'' کے نزول اور آپ کے صفا پہاڑی پر چڑھ کر اپنے قبیلے کو دعوت دینے کا ذکر کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوا ہے کہ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ کی پہلی صورت یا شکل یا مرحلہ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ہے، واللہ اعلم بالصواب، اسی طرح ابن ہشامؒ نے بھی فَاصْدَعْ الخ کے متصل بعد وَاَنْذِرْ

عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ کا ذکر کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

وکان بین ما اخفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرہ واستتربہ الیٰ ان امرہ اللہ تعالیٰ باظہار دینہ ثلاث سنین فیما بلغنی من مبعثہ ثم قال اللہ تعالیٰ لہ ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِیْنَ﴾ (الحجر: ۹۴) وقال تعالی ﴿وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (الشعراء: ۲۱۴، ۲۱۶) (السیرۃ لابن ھشام ج ۱، ۱۶۸)

''مجھے جو روایت پہنچی ہے اس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کو مخفی رکھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اظہار کا حکم دیا بعثت سے لے کر اظہار تک اس کے درمیان تین سال کا عرصہ ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا'' پس جو حکم تم کو (خدا کی طرف سے ملا ہے وہ لوگوں کو سنا دو اور مشرکوں کا (ذرا) خیال نہ کرو۔'' اور فرمایا'' اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈر سنا دو اور جو مؤمن تمہارے پیرو ہو گئے ہیں ان سے متواضع پیش آؤ۔''

قریبی لوگوں سے دعوت کی ابتداء کی وجہ

دعوتِ عامہ کی قریبی لوگوں سے ابتداً کرنا اور بتدریج اسے دوسرے لوگوں تک وسعت دینے کی وجہ یہ ہے کہ قریبی لوگ ہی داعی کے اخلاق واطوار اور طرزِ زندگی کو بہتر طور پر جانتے ہیں۔ اگر دعوت شروع کرنے سے قبل یا دعوت کے دوران وہ اس سے متاثر ہیں تو وہ اس کی دعوت کو بآسانی قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ دوسرا ان کے اور داعی کے درمیان اجنبیت نہیں ہوتی اور انہیں مخاطب کرنا داعی کے لئے مشکل نہیں ہوتا، تیسرے اگر وہ مخالفانہ ردِّعمل کا اظہا کرتے بھی ہیں تو اس قدر نہیں ہوتا جس قدر اجنبی لوگوں کی جانب سے اس کا امکان ہوتا ہے بلکہ بیشتر لوگ رشتہ داری، قوم، برادری اور دوستی اور میل جول کی وجہ سے بھی داعی کی بات سے صرفِ نظر کرتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی سامنے آتے ہیں جو دعوت قبول نہ کرنے کے باوجود داعی کی اخلاقی حمایت کرتے، اس کا دفاع کرتے اور اسے مخالفین کے جبر وتشدد سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان امور کے برعکس دیگر اقوام اور گروہوں کے سامنے داعی کی زندگی کا نقشہ ہوتا ہے اور نہ وہ اس کے اخلاق واطوار سے واقف ہوتے ہیں۔ دوسرے ان کے اور داعی کے درمیان اجنبیت کی دیوار بھی حائل ہوتی ہے اس لئے وہ اس کی بات پر اعتماد کرنے کے لئے بآسانی تیار نہیں ہوتے بلکہ وہ داعی کے

قریبی لوگوں اور دوست واحباب کی طرف سے داعی کے بارے میں اختیار کیے جانے والے طرز عمل کو سامنے رکھتے ہیں اور بسا اوقات اسی کے مطابق ردعمل کا اظہار کرتے ہیں جیسا کہ آگے آئے گا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایام حج کے دوران قبائل عرب کو دعوت دیتے اور ابولہب اور دیگر مشرکین مکہ آپ کے خلاف منفی پروپیگنڈہ کرتے اور لوگوں کو آپ کی دعوت قبول کرنے سے منع کرتے تو یہ قبائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے جواب میں کہتے تھے:

اسرتک وعشیرتک اعلم بک حیث لم یتبعوک. (زاد المعاد ج۳ ص ۳۹)

''تمہارا خاندان اور قبیلہ تمہارے بارے میں بہتر طور پر جانتا ہے اور انہوں نے تو تمہاری پیروی نہیں کی۔''

اسی طرح امام بیہقی روایت کرتے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے سے کہتے تھے:

قوم الرجل أعلم به أترون أن رجلاً یصلحنا وقد أفسد قومه ولفظوه.

(دلائل النبوة للبیهقی ج۲، ص ۴۱۴)

''ہر آدمی کو اس کی قوم کے افراد ہی بخوبی سمجھتے ہیں، کیا تم نہیں دیکھتے کہ ایک شخص ہماری اصلاح کرنا چاہتا ہے حالانکہ اس نے اپنی قوم میں بگاڑ پیدا کر دیا ہے اور اس کی قوم نے اسے ایک طرف پھینک دیا ہے۔''

یعنی جب خاندان اور قبیلے کے لوگوں نے ہی دعوت قبول نہیں کی حالانکہ وہ ہم سے زیادہ تمہارے بارے میں بہتر طور پر سمجھتے ہیں تو ہم کیوں قبول کریں؟۔ دراصل جب اپنے ہی لوگ دعوت قبول نہ کریں تو دیگر اقوام کی طرف سے بھی شدید ردعمل سامنے آتا ہے جیسا کہ سفرِ طائف میں اہل طائف نے آپ کے ساتھ انتہائی ظالمانہ سلوک کیا، جبکہ قریشیوں نے اگرچہ آپ کی شدید مخالفت کی اور آپ کو ایذائیں بھی پہنچائیں لیکن اس طرح کی نوبت کبھی نہ آئی تھی۔

خاندان کو دعوت

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت **وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ** نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ'' مجھے معلوم ہے کہ اگر میں نے اس کا اپنی قوم کے سامنے اظہار کیا تو ایسا ردعمل ظاہر کریں گے جو مجھے ناگوار گزرے گا چنانچہ میں اس خیال سے خاموش ہو گیا تو میرے پاس جبریل آئے اور کہا: اے محمد! آپ کے رب نے آپ کو جو حکم دیا ہے اگر آپ نے اسے پورا نہ کیا تو وہ

آپ کو عذاب میں مبتلا کریں گے۔''

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انقلابی دعوت کی شدید مخالفت اوراس کے ردعمل میں یقینی طور پر شدید مشکلات ومصائب پیش آنے کے باوجود اس فریضے کو ترک نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس عظیم ذمہ داری کو نبھانے کے لئے اٹھ کھڑا ہونا لازم ہے کیونکہ انقلابی دعوت کے لئے نہ اٹھنے کی وجہ سے جہاں قوم وملت مزید تباہیوں اور ناکامیوں سے دوچار ہوسکتی ہے وہاں اس فریضے کے مکلّف افراد دنیاوآخرت کی سعادتوں سے محروم ہوسکتے ہیں اورآخرت میں ان کی گرفت کی جاسکتی ہے، جس کا تحمل کسی انسان کے بس میں نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ نے مجھے فرمایا: اے علی ؓ کھانا تیار کرو پھر بنو عبدالمطلب کو جمع کرو۔ میں نے ایسا ہی کیاتو اس دن چالیس سے ایک زائد یا ایک کم افراد جمع ہوئے۔ (السیرۃ لابن کثیر ج ۱ ص ۴۵۷)

قبول اسلام اور معاونت کی دعوت

عقائد ونظریات کوصرف قبول کرلینا کافی نہیں اس کے ساتھ ساتھ اس کی نشرواشاعت اوردعوت و غلبہ میں معاونت بھی لازمی ہے چنانچہ خاندانِ عبدالمطلب کو خطاب کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انا ادعوکم الیٰ کلمتین خفیفتین علی اللسان ثقیلتین فی المیزان شهادة ان لا الٰه الا الله وانی رسول الله فمن یجیبنی الی هذا الامر ویوازرنی ای یعاوننی علی القیام به؟(السیرۃ الحلبیۃ ج ۱، ص ۲۷۲، ۲۷۳)

''میں تمہیں دوایسے کلموں کی دعوت دیتا ہوں جو زبان پر بالکل ہلکے اور (آخرت میں) میزان میں بہت وزنی ہیں، وہ اس کی بات کی گواہی دینا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں، کون ہے جو اس بات کو قبول کرے اوراس کو لے کر اٹھ کھڑے ہونے میں میرا ساتھ دے؟''

ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں حضرت علیؓ سے نقل کیا ہے کہ کھانے کے فوراً بعد آپ نے بات چیت شروع کردی اور فرمایا:

أیکم یقضی عنی دینی ویکون خلیفتی فی أهلی؟(السیرۃ لابن کثیر ج ۱ ص ۴۶۰)

''تم میں سے کون میرا قرض اتارے گا اور میرے اہل خانہ میں میرے بعد میرا قائم مقام ہوگا۔''

حضرت علی فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ صورت حال دیکھی کہ سب خاموش ہیں تو عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں حاضر ہوں۔ فرمایا کیا تم؟ علیؓ فرماتے ہیں:

وإنی یومئذ لأ سوأهم هیئة، وإنی لأعمش العینین، ضخم البطن، خمش الساقین. (ایضاً)

''میں ان دنوں ان میں سے بری حالت والا، آنکھیں آئی ہوئی تھیں، پیٹ بڑا تھا اور پنڈلیاں کمزور تھیں۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ بظاہر کمزور، دبلے پتلے اور کوئی بڑی حیثیت و مرتبے کے مالک نہیں ہوتے لیکن ان کے اندر صلاحیت واستعداد اور حق کو قبول کرنے اور اسے غالب کرنے کا جذبۂ صادقہ موجود ہوتا ہے چنانچہ وہ دعوت کو قبول کر کے اس کی اشاعت و ترقی اور غلبے کا باعث بنتے ہیں۔

مشکلات کا ادراک

امام ابن کثیر مذکورہ ارشاد نبوی ''تم میں سے کون میرا قرض اتارے گا اور میرے اہل خانہ میں میرے بعد میرا قائم مقام ہوگا۔'' کی تشریح میں لکھتے ہیں:

یعنی إذا مت، وکأنه صلی الله علیه وسلم خشی إذا قام با بلاغ الرسالة إلی مشرکی العرب أن یقتلوه، فاستوثق من یقوم بعده بما یُصلح أهله، ویقضی عنه، وقد أمَّنه الله من ذلک فی قوله تعالی "یَاأَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ، وإنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ" الآیة (ایضاً)

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد (کون میرا قرض اتارے گا اور میرے بعد قائم مقام ہوگا) کا مطلب یہ ہے کہ یہ تب جب میری وفات ہو جائے گی، گویا آپ کو اس بات کا خدشہ تھا کہ جب وہ پیغامِ الٰہی عرب کے مشرکوں تک پہنچانے کیلئے اٹھ کھڑے ہوں گے تو انہیں قتل کر دیا جائیگا۔ پس آپ اس بات کا وثوق چاہتے تھے کہ ان کے بعد ان کے اہل خانہ کے امور کون سنبھالے گا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو امان دینے کی اطلاع دیتے ہوئے فرمایا ''اے اللہ کے رسول! جو آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے، آپ اسے پہنچایئے، اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے ان کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھیں گے۔''

ابن کثیر کی مذکورہ تشریح سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوتِ اسلام کے نتیجے میں ممکنہ طور پر پیش آنے والی مشکلات کا بخوبی ادراک تھا اور آپ بخوبی جانتے تھے کہ مشرکین عرب آپ کو قتل کرنے کے درپے ہو سکتے ہیں، آپ کو اس بات کا ادراک کیوں نہ ہو کہ بعثت کے اول روز سے ہی آپ کو مستقبل کی مشکلات کی طرف آگے چل کر اشارات دے دیئے گئے تھے جیسا کہ ماقبل میں لکھا جا چکا ہے، الغرض آپ کے خدشات درست ثابت ہوئے اور وہ مرحلہ بھی آیا جب مشرکین مکہ سمیت پورے جزیرۂ عرب کے کفار نے آپ اور آپ کے اصحاب کو ختم کرنے کی ناکام کوششیں کیں۔

خاندان کو دی جانے والی پہلی دعوت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چند روز خاموش رہے، اس کے بعد آپ نے خاندان عبدالمطلب کو دوبارہ جمع کیا اور ان سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا بلاشبہ خاندان کا فرد اپنے خاندان کے لوگوں سے جھوٹ نہیں بولتا، اللہ کی قسم! اگر تمام لوگ جھوٹی بات کریں تو بھی میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا، اگر تمام لوگ دھوکہ کریں تو بھی میں تم سے دھوکہ نہ کروں گا:

واللہ الذی لا الہ الا ھو انی لرسول اللہ الیکم خاصۃ والی الناس کافۃ...الخ(السیرۃ الحلبیۃ ج ا ص ۲۸۲)

''اللہ کی قسم جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، میں خاص طور پر تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں اور پوری انسانیت کے لئے عمومی طور پر رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

تمام لوگوں نے تو نرمی سے آپ سے گفتگو کی لیکن ابولہب نے خاندان کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

یابنی عبدالمطلب ھذہ واللہ السوأۃ خذوا علی یدیہ قبل أن یأخذ علی یدیہ غیرکم فان أسلمتموہ حینئذ ذللتم وإن منعتموہ قتلتم. (ایضاً)

''اے بنو عبدالمطلب! اللہ کی قسم یہ تو بڑی بُری چیز ہے، تم ابھی سے ان پر قابو پالو اس سے پہلے کہ دوسرے لوگ اس پر قابو پالیں (اس پر غالب آجائیں) اگر تم اس وقت اسے ان کے سپرد کرو گے تو ذلیل ورسوا ہو جاؤ گے اور اگر تم نے اس کا دفاع کیا تو قتل کر دیے جاؤ گے''۔

ابولہب کی اس تقریر کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی صفیہ بنت عبدالمطلب نے ابولہب سے کہا کہ تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ اپنے بھتیجے کو رسوا کرو، مزید کہا:

''اللہ کی قسم! علماء (اہل کتاب اور آسمانی تعلیمات کے حاملین) ہمیشہ یہ خبر دیتے رہے ہیں کہ

عبدالمطلب کی نسل سے ایک نبی ظاہر ہوگا، یہ وہی تو ہیں۔''

اس کے جواب میں ابولہب نے کہا:

''اللہ کی قسم! یہ بات باطل ہے محض خواہشات اور پردہ نشین عورتوں کی باتیں ہیں۔ جب قریش کی مختلف برادریاں اور ان کے ساتھ قبائل عرب (اس کے خلاف) اٹھ کھڑے ہوں گے تو اس وقت ہمیں ان کے مقابلے کی تاب نہ ہوگی اور اللہ کی قسم! ہم ان کے سامنے تر لقمہ ثابت ہوں گے۔'' (السیرۃ الحلبیۃ ج ۱،۲۷۲)

مخالفین کی دور اندیشی

ابولہب کے مذکورہ الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ اسے اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ اس کے بھتیجے محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جو بات پیش کر رہے ہیں اور جس چیز کی دعوت دے رہے ہیں اس کا بالآخر نتیجہ یہی ہوگا کہ غیر قریشی اقوام عرب بھی اس دعوت کے حاملین کے خلاف لڑائی پر اتر آئیں گی اور اگر اس دعوت کو ابھی نہ روکا گیا تو اس بات کا قوی امکان ہے ان اقوام کی یلغار میں قریشی بھی رگڑے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ابولہب کا خدشہ درست ثابت ہوا اور وہ وقت بھی آیا جب دیگر اقوام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا یلغار کرتیں خود قریش مکہ دیگر اقوام کو ساتھ لے کر آپ اور آپ کے اصحاب پر حملہ آور ہوئے لیکن ناکامی اور ذلت ورسوائی ان کا مقدر بنی جیسا کہ غزوۂ بدر سے غزوۂ احزاب اور اس کے بعد فتح مکہ تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔

پہاڑی پر اعلانِ حق

خاندان عبدالمطلب کو دعوت دینے کے بعد آپ نے دوسرے مرحلے میں صفا پہاڑی پر چڑھ کر تمام قریش کو بلایا، امام بخاری حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے قریش سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا:

ان أخبر تكم أن خيلا بالوادی ترید أن تغیر علیكم أكنتم مصدقونی قالو نعم اماجرّبنا علیک قال فِانّی لا أغنی عنكم من الله شيئا انی نذير لكم بين يدی عذاب شديد .(صحيح البخاری كتاب التفسير باب قوله وانذر عشيرتک الاقربين)

''اگر میں تمہیں بتلاؤں کہ ایک لشکر اس وادی میں موجود ہے اور وہ تمہارے اوپر حملہ آور ہونا چاہتا ہے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے، انہوں نے کہا ہمیں آپ کے بارے میں ہمیشہ سچ بولنے کا ہی

تجربہ ہوا ہے، آپ نے فرمایا: اے گروہ قریش! اپنے آپ کو آگ سے بچالو، میں تمہیں نہیں بچا سکتا، میں تمہیں پیش آنے والے شدید عذاب سے واضح طور پر ڈرانے والا ہوں۔''

مذکورہ واقعے سے دو اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) مروجہ ذرائع ابلاغ کا استعمال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش مکہ کو دعوت اسلام دینے اور ان تک اپنی بات پہنچانے کے لئے وہ طریقہ اختیار کیا جو مروج تھا۔ اس زمانے میں عرب میں یہ رواج تھا کہ جب کسی آدمی کو اپنے قصبے اور شہر کے لوگوں کو کسی اہم بات سے مطلع کرنا ہوتا مثلاً کسی حملہ آور لشکر سے متعلق بتانا ہوتا تھا تو وہ کسی اونچی جگہ پہاڑی وغیرہ پر چڑھ کر اہلِ قصبہ اور اہلِ شہر کو آواز لگاتا تھا، نیز اگر کوئی حادثاتی معاملہ ہوتا مثلاً دشمن حملے کے لئے سر پر آچکا تا ہوتو وہ اپنے کپڑے پھاڑ کر اور چیخ چیخ کر ''یا صباحاہ'' کہہ کر بلاتا تھا تاکہ لوگ جلد سے جلد اس کے پاس پہنچ کر اس کی بات سنیں اور اپنے تحفظ اور دفاع کے لئے فوری طور پر کمربستہ ہوجائیں، چنانچہ اس مروج طریقۂ ابلاغ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے بالفاظ دیگر عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق ذرائع ابلاغ میں سے ایک معروف ذریعے کو اختیار کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بلایا اور ان کے سامنے اپنی دعوت رکھی اسی طرح صلح حدیبیہ کے بعد بادشاہوں اور سلاطین کو دعوت دینے کا مرحلہ آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے کے مروج طریقۂ ابلاغ کے مطابق انہیں خطوط بھیجے، نیز مشرکین اور یہود آپ اور مسلمانوں کے خلاف ہرزہ سرائی کرتے اور اشعار کی صورت میں ہجو کرتے تو حضرت حسان بن ثابتؓ اور دیگر شعراء صحابہ اشعار کی صورت میں ان کا جواب دیتے تھے۔ یعنی زبانی طور پر نظم کی صورت میں یا قلم کے ذریعے، جس طرح بھی ہو سکا دعوت دی گئی۔

لہٰذا ایک اسلامی انقلابی دعوت کے لئے عصری تقاضوں کے مطابق ذرائع ابلاغ کو اختیار کرنا ناگزیر ہے، اس کے بغیر چارۂ کار نہیں ہے تاہم اس میں دو باتوں کا لحاظ ضروری ہے۔

ایک یہ کہ صرف وہ ذرائع ابلاغ اختیار کئے جائیں جو شرعاً جائز ہوں اور ان کے اپنانے میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو، ہر وہ ذریعۂ ابلاغ جو شرعاً ناجائز ہو اور علماء وفقہاء عصر اس کے ناجائز اور حرام ہونے پر متفق ہوں اسے اختیار کرنا ہرگز جائز نہ ہوگا، یا فقہاء عصر کی کثیر تعداد کسی ذریعۂ ابلاغ کو شرعاً ناجائز اور حرام سمجھتی ہو تو اسے بھی ہرگز نہ اپنانا چاہئے کیونکہ اسلامی انقلابی دعوت کا مقصد قوانین شریعت

کا احیاء ہے تو اگر وہ خود کسی نا جائز یا متنازع فیہ فعل کا ارتکاب کرے گی تو وہ اپنے عظیم الشان مقصد کے خلاف ورزی کرے گی اور اہلِ علم طبقے کی نظر میں اس کی ساکھ انتہائی خراب ہو جائے گی جسے بحال کرنا اربابِ دعوت کے بس میں نہ ہوگا۔

دوسری بات یہ کہ اربابِ دعوت کو یہ امر بھی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع دن سے صفا پہاڑی پر چڑھ کر لوگوں کو نہیں بلایا یا بالفاظِ دیگر پہلے دن سے ہی مروج ذرائع ابلاغ کو اختیار کرتے ہوئے کھلم کھلا اپنی دعوت شروع نہیں کی بلکہ عرصہ تین سال تک دعوت خاصہ دیتے رہے اور ایک جماعت تیار کرنے کے بعد جب اعلانیہ دعوت دینے کے لیے راہ ہموار ہوگئی تو مروج ذریعۂ ابلاغ کو اختیار کرتے ہوئے کھلم کھلا دعوت شروع کر دی، لہٰذا معلوم ہوا کہ مروجہ ذرائع ابلاغ کو اپناتے ہوئے شروع دن سے ہی کھلم کھلا دعوت نہیں دی جا سکتی بلکہ اس کے لئے بھی ایک مناسب وقت کا ہونا ضروری ہے اور وہ وقت اور مرحلہ تب آتا ہے جب ایک عرصے تک خفیہ دعوت دی جاتی رہے، لوگوں کو ساتھ ملایا جائے، ان کی تعلیم و تربیت کی جائے، لوگوں کو اس دعوت کی گن سن ہو جائے اور معتد بہ افراد پر مشتمل ایک باقاعدہ جماعت وجود میں آ جائے تو اس مرحلے سے گزرنے کے بعد دوسرا مرحلہ ''کھلم کھلا دعوت'' کا ہوتا ہے جس کے لئے مروجہ ذرائع ابلاغ اختیار کئے جاتے ہیں۔

(۲) دعوت میں مخاطب کی ذہنی ونفسیاتی کیفیت کا لحاظ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخاطبین کے ذہن اور ان کی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے مختصر، واضح اور قابلِ فہم اسلوبِ بیان اختیار کیا۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہوا شخص پہاڑ کے دونوں اطراف دیکھ رہا ہوتا ہے جبکہ نیچے کھڑے ہوئے افراد کو صرف ایک طرف نظر آ رہی ہوتی ہے اس لئے انہیں پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے شخص کی طرف سے پہاڑ کے دوسری طرف کے حالات کے بارے میں دی گئی اطلاع اور معلومات پر لامحالہ اعتماد کرنا پڑتا ہے خصوصاً اگر وہ ایسی ہستی ہو جسے وہ خود ہی ''الصادق'' اور ''الامین'' کے لقب سے یاد کرتے ہوں تو اس کی بات پر اعتبار کیوں نہ کریں گے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخاطبین سے اقرار کروالیا کہ وہ آپ کی دی گئی معلومات پر یقین کریں گے تو تب آپ نے اصل مدعا بیان کیا کہ جب تم دنیوی معاملے میں مجھ پر اعتماد کرنے کے لئے تیار ہو تو دینی معاملے میں بھی مجھ پر اعتماد کرو اور میں تمہیں جس خطرے اور بھیانک انجام سے خبردار کر رہا ہوں اس سے بچنے کا سامان کر لو کیونکہ یہ ظاہری دشمن کے حملے سے زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہے۔

اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ داعی مخاطبین کی ذہنیت اور نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے اور مؤثر اسلوب بیان اختیار کرتے ہوئے انہیں دعوت دے، ان کے سامنے اس بات کو بالکل کھول کر بیان کرے کہ وہ مخاطب کا ہمدرد و خیر خواہ ہے جو اسے ایک بہت بڑی ہلاکت اور انتہائی بُرے انجام سے بچانا چاہتا ہے۔ داعی مخاطب پر یہ واضح کردے کہ اگر اس کی بات قبول نہ کی گئی اور اسے رد کر دیا گیا تو اس کے نتیجے میں انہیں دنیاوآخرت کی ناکامیوں، رسوائیوں اور ہلاکتوں کا سامنا کرنا پڑے گا، لہٰذا خوابِ غفلت سے بیدار ہوا جائے اور داعی کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے سعادت وکامرانی کی راہ اختیار کی جائے۔

داعی اور مخاطب کی مثال

داعی اور مخاطب کے اس تعلق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال سے سمجھایا ہے۔ امام بخاریؒ، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

انما مَثلی ومثل مابعثنی اللہ بہ کمثل رجلٍ اتیٰ قوماً فقال یاقوم انی رأیت الجیش بعینیَّ وانی انا النذیر العریان فالنجاءَ فاطاعہ طائفۃ من قومہ فادلجوا وانطلقوا علی مھلھم فنجوا وکذبت طائفۃ منھم فاصبحوا مکانھم فصبّحھم الجیش فاھلکھم واجتاحھم فذلک مثل من اطاعنی فاتبع ماجئتُ بہ ومثل من عصانی وکذّب ماجئتُ بہ من الحق. (صحیح بخاری کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ باب الاقتداء بسنن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم)

''میری اور اللہ نے جو (شریعت) مجھے دے کر بھیجا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی اپنی قوم کے پاس آکر انہیں بتلائے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے لشکر دیکھا ہے (جو تمہارے اوپر حملہ آور ہونے والا ہے) میں تمہیں اس سے واضح طور پر خبردار کر رہا ہوں، پس تم اپنی نجات کا سامان کرلو، ایک گروہ تو اس کا کہا مان لیتا ہے، وہ لوگ رات کے وقت ہی نکل کھڑے ہوتے ہیں اور اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہیں، دوسرا گروہ اسے جھٹلاتا ہے، وہ اپنے گھروں میں ہی صبح تک ٹھہرے رہتے ہیں چنانچہ لشکر علی الصباح حملہ آور ہو کر انہیں تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ یہی مثال اس شخص کی ہے جو میری اطاعت کرتا اور جو میں لایا ہوں ان کی پیروی کرتا ہے اور یہ مثل ہے اس شخص کی جس نے میری نافرمانی کی اور میں جو حق لایا ہوں اس کی تکذیب کرتا ہے۔''

انقلابی دعوت قبول نہ کرنے کا انجام

بسا اوقات انسان اس وقت تک دوسروں کی باتوں پر اعتبار نہیں کرتا جب تک خود ان کا مشاہدہ اور تجربہ نہ کر لے اس لئے ایسے افراد جو داعی کی بات پر کان نہ دھریں، انہیں تاریخی شہادتوں سے قائل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کیونکہ انسان دوسروں کے بھیانک انجام سے بھی سبق حاصل کر لیتا ہے ،چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں روایت کیا گیا ہے:

كان إذا جلس رسول الله ﷺ مجلساً، فدعا فيه إلى الله تعالى، وتلا فيه القرآن وحذر فيه قريشاً ما أصاب الأمم الخالية.(السيرة لابن هشام ج ۲ ص ۸)

''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی مجلس میں بیٹھتے تو اللہ تعالیٰ (کے دین) کی دعوت دیتے، قرآن پاک کی تلاوت کرتے اور قریش کو سابقہ امتوں کو دیے جانے والے عذاب سے ڈراتے۔''

خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بھی بنی اسرائیل، عاد و ثمود اور دیگر اقوام کے حالات اور ان کے انجام کا ذکر فرمایا ہے تا کہ مشرکین مکہ اور دیگر اقوام ان قصص سے سبق حاصل کریں اور دعوت قبول کر کے پہلی امتوں کے سے بھیانک انجام سے بچ جائیں۔

اظہارِ دعوت کے بعد داعی کا فریضہ

اظہارِ دعوت کے مرحلے میں داخل ہونے کے بعد داعی پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس کے لئے کمربستہ ہو جائے۔ اسے اللہ کا حکم اور اپنے آپ کو اس کا مکلّف یقین کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہو ،معاشرے کے تمام طبقات کو مخاطب کرے اور ان تک اپنی دعوت پہنچائے ، چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اظہارِ دعوت کا حکم دیا جا چکا تو آپ نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا:

فشمّر صلى الله عليه وسلم عن ساق الاجتهاد وقام في طاعة الله اتمّ قيام يدعوالى الله تعالىٰ الصغير والكبير والحرّو العبدو الرجال والنساء والاسود والاحمر .(امتاع الاسماع ج ۱ ،ص ۱۴، ۱۵)

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کام کے لئے جدوجہد کرنے پر کمربستہ ہوئے ،اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں کما حقہ اٹھ کھڑے ہوئے اور چھوٹے بڑے، آزاد و غلام ،مرد وں عورتوں اور گوروں اور کالوں کو دعوت الی اللہ دینے لگے۔''

اسی طرح امام ابن کثیر آپ کی دعوتی جدوجہد اور انتھک کوشش کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

والمقصود أن رسول الله صلى الله عليه وسلم استمر يدعو إلى الله تعالى ليلاً ونهاراً، وسراً وجهاراً، لا يَصرفه عن ذلك صارف ولا يردُّه عن ذلك رادٌّ، ولا يصدُّه عن ذلك صاد، يَتْبع الناس في أنديتهم ومجامعهم و محافلهم، وفي المواسم، ومواقف الحج يدعو من لقيه من حرّ وعبد، وضعيف وقوى، و غنى وفقير، جميع الخلق في ذلك عنده شرع سواء.(السيرة لا بن كثير ج ا ،ص ٤٦٠)

''مقصود یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دن رات ،خفیہ اور اعلانیہ دعوتِ الٰہی دیتے رہے، نہ کوئی رکاوٹ ڈالنے والا آپ کے راستے میں رکاوٹ ڈال سکا اور نہ اس کو رد کرنے والا آپ کو اس سے باز رکھ سکا، آپ لوگوں کے پاس ان کی مجالس، ان کی محفلوں، سالانہ بازاروں اور حج کے مقامات میں جاتے اور آپ کو جو بھی ملتا، آزاد ہو یا غلام، کمزور ہو یا طاقتور، امیر ہو یا غریب انہیں دعوت دیتے اور اس معاملے میں آپ کے نزدیک شرعاً تمام لوگ برابر تھے۔''

مذکورہ اقتباس سے ہمیں درج ذیل اہم امور معلوم ہوتے ہیں:

(الف) دعوت کا وقت مختص نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دن رات دعوت دیتے تھے یعنی آپ نے دعوت دینے کے لئے کوئی وقت مخصوص نہیں کیا ہوا تھا بلکہ دن اور رات میں جب بھی موقع ملتا لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلاتے تھے، گویا آپ نے دعوتِ دین اور غلبۂ دین کو ہی مقصدِ زندگی بنایا ہوا تھا اور دن رات کی تمیز کئے بغیر اس کے لئے کوشاں اور سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے، لہٰذا داعی کو چاہیے کہ غلبہ دین کی جدو جہد کو اپنی زندگی کا مقصد بنالے، ہمہ تن و ہمہ وقت اس کے لئے کوشاں اور اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے ہر قسم کی قربانی وایثار کے لئے تیار رہے۔غلبۂ دین کی دعوت کے لئے کوئی وقت متعین اور مخصوص نہ کرے بلکہ جب اور جہاں بھی اسے موقع ملے، دن ہو یا رات، صبح ہو یا شام، سفر ہو یا حضر لوگوں تک اپنی بات پہنچانے کی بھر پور سعی کرے۔

(ب) آپ صلی اللہ علیہ وسلم خفیہ اور اعلانیہ دعوت دیتے تھے، اگر چہ یہ زمانہ دعوتِ عامہ کا تھا تاہم بعض اوقات ایسے مواقع آتے ہیں کہ جہاں خفیہ دعوت ہی موزوں ہوتی ہے، اس لئے داعی دونوں طریقوں سے دعوت چلائے۔

(ج) دورانِ دعوت مخالفین کی مخالفت اور ان کی طرف سے ڈالی جانے والی رکاوٹیں آپ کو اپنی دعوت سے باز نہ رکھ سکتی تھیں بلکہ مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود آپ اپنا کام جاری رکھتے تھے

جیسا کہ تفصیل آگے آ رہی ہے۔ لہٰذا داعی دورانِ دعوت مخالفین کی مخالفتوں اور رکاوٹوں کو خاطر میں نہ لائے اور اپنا کام جاری رکھے۔

(د) آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے پاس ان کی مجالس اور ان کے اجتماعات کے مقامات پر تشریف لے جا کر انہیں دعوت دیتے تھے، لہٰذا داعی کو چاہئے کہ وہ دعوتِ عامہ کے زمانہ میں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اپنی دعوت پہنچانے کے لئے ایسے مقامات پر خود چل کر جائے جہاں لوگوں کا اجتماع ہوتا ہو بالفاظِ دیگر عوامی جگہوں (پبلک مقامات) بیٹھکوں، بازاروں، پارکوں، عیدگاہوں، ہسپتالوں، بس اسٹاپوں وغیرہ جیسے مقامات پر جا کر لوگوں کو اجتماعی دعوت دے۔

(س) آپ صلی اللہ علیہ وسلم آزاد غلام، کمزور طاقتور، امیر غریب الغرض جو بھی ملتا اسے دعوت دیتے تھے اور ان کے درمیان کوئی تفریق نہ کرتے تھے، لہٰذا داعی کو چاہئے کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو دعوت دے اور ان کے درمیان فرق روا نہ رکھے، کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر شخص اس بات کو قبول کرنے کا مکلّف ہے لہٰذا ہر شخص تک یہ دعوت پہنچنی چاہیئے۔ دوسری بات یہ کہ ضروری نہیں کہ کوئی مخصوص طبقہ ہی اس دعوت کو قبول کرے، نہیں بلکہ یہ ایسی دعوت ہے جسے ہر طبقے کے افراد قبول کرتے ہیں جیسا کہ صحابہ کرامؓ میں ہر طبقے کے افراد موجود تھے۔

عام اور مزدور پیشہ لوگوں کو دعوت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام اور مزدور پیشہ لوگوں کو بھی دعوت دیتے تھے، چنانچہ علامہ حلبی لکھتے ہیں:

و كان قيناً اى حداداً و كان صلى الله عليه وسلم يألفه ويأتيه

(السيرة الحلبيه ج ١، ص ٢٨٦ باب استخفائه)

''حضرت خباب لوہار تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے الفت کرتے اور ان کے پاس تشریف لے جایا کرتے تھے۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت خباب سے محبت والفت سے پیش آنے، ان سے میل جول رکھنے کے نتیجے میں ہی وہ آپ کی دعوت سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے، لہٰذا داعی کو چاہئے کہ وہ ہر طبقے خصوصاً سماجی اور معاشرتی طور پر نچلے طبقات کے افراد سے الفت و محبت کا معاملہ رکھیں، ان سے میل جول رکھیں اور یوں انہیں اپنی دعوت دے کر اسے قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کریں۔

باب سوم:

مخالفت و آزمائش اور استقامت

جب بھی کوئی مفکر اپنی فکر اور داعی اپنی دعوت پیش کرتا ہے تو اس فکر اور دعوت کی وجہ سے معاشرے کے جن طبقات کے عقائد و افکار اور مروج نظام سے وابستہ سماجی، سیاسی اور اقتصادی مفادات پر زد پڑنے کا خدشہ ہوتا ہے وہ اس نئی فکر اور دعوت کی سخت مخالفت کرتے ہیں اور جب داعی ان کی مخالفت کی پرواہ نہیں کرتا تو اسے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے یعنی داعی کے لیے آزمائش کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اعلانیہ دعوت شروع کرنے کے بعد آپ کی دعوت اسی مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔

ابو طالب کے پاس پہلا وفد

دعوت کا سلسلہ جاری تھا، لوگ اس کی طرف متوجہ ہو کر اسے قبول کر رہے تھے، اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اور یہ جماعت دن بدن مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ مخالفین کی مخالفت کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی عقائد و افکار پیش کرنے کے ساتھ قریشیوں کے عقائدِ فاسدہ اور معبودانِ باطلہ کی تردید اور ان پر زبردست تنقید کر رہے تھے، دوسری طرف آپ کے چچا ابوطالب آپ کا دفاع کر رہے تھے۔ جس کی وجہ سے مشرکینِ مکہ کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ علامہ معین کاشفی ابن اسحاق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

چون قریش دیدند کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم دین خود را آشکارا کرد و علانیہ بدعوت خالق خلائق اشتغال می نماید و روز بروز کار او در ترقی است و عبادتِ اصنام در دل خلائق مستہجن و مستقبح میگرادند۔ الخ

(معارج النبوۃ فی مدارج النبوۃ رکن وسم ص ۲۰)

"جب قریش نے دیکھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دین کا کھلم کھلا اعلان کر دیا ہے اور اعلانیہ خالقِ کائنات کی دعوت دینے میں مشغول ہیں، ان کا کام روز بروز ترقی کر رہا ہے اور لوگوں کے دلوں میں بتوں کی عبادت کی برائی گھر کرتی جا رہی ہے۔"

اسلامی دعوت کی ترقی دیکھ کر مشرکین نے ابوطالب سے باقاعدہ بات چیت کرنے کے لئے ایک

وفد تیار کیا، ابن ہشامؒ لکھتے ہیں:

''جب کفار نے دیکھا کہ ان پر ہماری ناراضی کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اوران کے چچا ابوطالب ان کی حمایت کررہے ہیں اور وہ آپ کو ان کے حوالے نہیں کررہے تو ان کے سربرآوردہ لوگوں کا وفد جمع ہو کر ابو طالب کے پاس آیا۔''

اس وفد نے ابوطالب سے اپنی پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

یا ابا طالب ان ابن اخیک قد سبَّ آلھتنا وعاب دیننا وسفّه احلامنا وضلّل آبائنا فامّا ان تکفّه عنّا واما ان تخلّی بیننا و بینه فانک علیٰ مثل مانحن علیه من خلافه فتکفیه. (السیرۃ ابن ھشام ج ۱، ص ۱۶۹)

''اے ابوطالب! آپ کے بھتیجے نے ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہا۔ ہمارے دین میں عیب لگایا ، ہماری عقلوں کو حماقت زدہ قرار دیا اور ہمارے آباؤاجداد کو گمراہ کہا۔ اب یا تو آپ ان کو ان باتوں سے روکیں یا ان کی حمایت سے الگ ہو جائیں اور ہمارے اور ان کے درمیان حائل نہ ہوں کیونکہ آپ کی حالت بھی ہماری ہی سی ہے پس آپ انہیں روکیں۔''

قریش کی بے چینی

قریشی وفد کی گفتگو سے ان کی بے چینی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روز بروز ترقی کرتی ہوئی دعوت سے اس قدر پریشانی تھی کہ وہ اسے قبول کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے، وہ اپنے معبودانِ باطلہ، اپنے فاسد عقائد ونظریات اوراپنے آباءواجداد پر ہونے والی تنقید کو اپنے معبودوں، دین اورآباء کی توہین وتنقیص تصور کرتے تھے جسے وہ کسی بھی صورت میں برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

آباءواجداد کا طرزِ عمل اور صراطِ مستقیم

دراصل جب دعوتِ حقہ منظرِ عام پر آتی ہے اور داعیٔ حق مروجہ فاسد عقائد ونظریات پر تنقید کرتا ہے تو سلیم الفطرت لوگ تو اسے برضا ورغبت قبول کر لیتے ہیں لیکن مخالفین اپنے عقائد ونظریات پر نظر ثانی کرنے اور دعوتِ حقہ اور داعی کے پیش کردہ افکار وآراء پر غور کرنے کی بجائے اس تنقید کو اپنے عقائد ونظریات اوران کی حامل شخصیات کی توہین وتنقیص سمجھتے ہیں اور لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر ہماری افکار ونظریات برحق نہیں ہیں تو کیا ہمارے آباءواجداد جو ان افکار ونظریات کے حامل اوران پر کاربند تھے وہ گمراہ تھے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم میں بھی کفار کے اس طرزِ استدلال

کا بار ہا ذکر فرمایا ہے اور جوابات دیے ہیں (جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں)۔

اگر آباء واجداد اور اکابر میں سے کچھ حضرات ایک غلط راستے پر چل رہے تھے اور (آج کے دور کے مطابق) یہ ان کی اجتہادی غلطی تھی تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ حق واضح ہونے کے باوجود غلط طرزِ عمل پر نظر ثانی نہ کی جائے اور آنکھیں بند کر کے اس پر کاربند رہا جائے؟ نہیں بلکہ شریعت اور عقل اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اجتہادی غلطی کی وجہ سے اختیار کئے جانے والے طریقۂ کار اور فکر پر نظر ثانی کی جائے اور جب حق روزِ روشن کی طرح واضح ہو گیا تو اسے قبول کیا جائے، اس میں نہ اکابر کی توہین وتنقیص ہے اور نہ شریعت کی خلاف ورزی ہے بلکہ یہ تو صراطِ مستقیم ہے جسے اختیار کرنا ہر سلیم الفطرت آدمی کا بنیادی فریضہ ہے۔ الغرض ابوطالب نے ان لوگوں کو نہایت نرمی سے سمجھا کر رخصت کر دیا اور ان کے مطالبے پر عمل درآمد کرنے اور اپنے بھتیجے کو دعوت سے روکنے یا ان کی حمایت ترک کرنے پر آمادگی ظاہر نہ کی۔

خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت قدمی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اظہارِ دعوت کے حکم کے بعد مسلسل دعوت دیتے رہے اور آپ کے اصحابؓ بھی کارِ دعوت میں آپ کے ساتھ شریک تھے۔ اعلانیہ دعوت کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد کفارِ مکہ کی طرف سے مختلف حربوں سے صدائے حق کو دبانے کی کوشش کی گئی، لیکن یہ دعوت چونکہ پھیلنے کیلئے آئی تھی تو کفار کے روکنے سے کب رک سکتی اور دبانے سے کب دب سکتی تھی؟ چنانچہ قریشی وفد کی ابوطالب سے ناکام واپسی کے بعد بھی آپ نے دعوت کا سلسلہ جاری رکھا جیسا کہ علامہ حلبی لکھتے ہیں:

مضیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یظھر دین اللہ ویدعو الیہ لایردہ عن ذلک شیءٌ. (السیرۃ الحلبیۃ ج ۱، ص ۴۶۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے دین کا اظہار کرتے اور اس کی طرف لوگوں کو بلاتے رہے اور آپ کو اس سے کوئی چیز باز نہ رکھ سکی۔''

اجتماعی دعوت

اس عرصے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں انفرادی دعوت دیتے وہاں اجتماعی دعوت بھی دیتے تھے، کیونکہ اس صورت میں پوری کی پوری جماعتوں کے قبولِ دعوت کی امید ہوتی ہے اور ویسے بھی ہر خاندان ہر قبیلے اور ہر علاقے میں جا کر ایک ایک آدمی کو انفرادی طور پر دعوت دینا اور انہیں اس کو قبول کرنے پر آمادہ کرنا انتہائی مشکل کام ہے اور اس کے لئے بہت طویل وقت اور محنت چاہیے۔

ثم قام صلی اللہ علیہ وسلم یدعو جماعاتھم الی اللہ تعالیٰ بان یقولوا لا الہ الّا اللہ حسبما أمر (السیرۃ الحلبیۃ اول ۲۶۲)

''پھر جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا تھا آپ جماعتوں کو دعوت الی اللہ دینے لگے اور ان سے فرماتے کہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کہ لو۔''

اسی طرح علامہ قسطلانیؒ لکھتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے پاس ان کی جگہوں پر چکر لگاتے اور ان سے فرماتے کہ ''اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو اور ان کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ، ابولہب آپ کے پیچھے پیچھے ہوتا اور کہتا جاتا کہ لوگو! یہ (آدمی) چاہتا ہے کہ تم اپنے آباؤ اجداد کا دین چھوڑ دو۔'' (المواہب اللدنیہ مع شرح الزُرقانی ج۱ص ۴۶۷)

دوسرا وفد

جیسا کہ ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا سلسلہ جاری رکھا، جس کی وجہ سے بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پیش کردہ عقائد و تعلیمات کا لوگوں پر گہرا اثر پڑنے لگا۔ اس لئے کفار کی پریشانی اور اضطراب میں اضافہ ہوا۔ قریش کے ہر مجمع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہونے لگا، ایک دوسرے کو آپ کے خلاف بھڑکانے لگے اور مختلف منصوبے بنائے جانے لگے۔ ابن ہشام لکھتے ہیں:

ومضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ماھو علیہ یظھر دین اللہ و یدعو الیہ (السیرۃ لا بن ھشام ج ۱، ص ۲۶۹)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو دعوت لے کر اٹھے تھے، اس کا سلسلہ جاری رکھا، اللہ کے دین کا اظہار کرتے رہے۔''

تو مشرکین کے اور آپ کے درمیان کشیدگی بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ لوگ ایک دوسرے سے دور ہو گئے او آپس میں کینہ رکھنے لگے تو قریش اکثر اپنی مجالس میں آپ کا تذکرہ کرتے، آپ کے بارے میں آپس میں مشاورت کرتے اور ایک دوسرے کو آپ کے خلاف اکساتے۔

جنگ کی دھمکی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پورے زور و شور سے دعوتِ حق پہنچا رہے تھے۔ جوں جوں آپ کا حلقۂ اثر بڑھتا جارہا تھا، اہل کفر کیلئے یہ انقلابی دعوت نا قابل برداشت ہوتی جارہی تھی، چنانچہ سب مل کر

دوبارہ آپ کے چچا ابوطالب کے پاس وفد کی صورت میں آئے اور کہا:

یـا أبـا طـالـب ان لـک سـنًا و شرفاً ومنزلةًفيناو انا قد استنهيناک من ابن أخيک فـلـم تـنـهـه عـنـا و انا والله لانصبر على هذا من شتم وآبائنا و تسفيه أحلامنا عيب آلهتناحتّٰى تكفه عنا أو ننازله واياک في ذلک حتى يهلک أحد الفريقين أو كما قالوا لهٗ.(السيرة لابن هشام ج ١ ص ١٧٠ ايضاًالكامل لابن اثير ج ٢، ص ٤٣)

''اے ابوطالب! آپ عمر میں بھی ہم سے بڑے ہیں۔شرف ومرتبت بھی آپ کا ہم سب سے بلند ہے۔ہم سب نے آپ سے استدعا کی تھی کہ اپنے بھتیجے کو ان باتوں سے روکیں لیکن آپ نے انہیں نہ روکا۔خدا کی قسم! اب ہم سے یہ برداشت نہیں ہوسکتا کہ ہمارے آباء کو گالیاں دی جائیں، ہمارے عقائد کو اعلانیہ بُرا بھلا کہا جائے اور ہمارے معبودوں میں عیب لگایا جائے۔اب یا تو آپ ان کو روکو یا پھر ہم آپ سے اور ان سے دودو ہاتھ کریں گے یہاں تک دونوں فریقوں میں سے یا ہم ہلاک ہوجائیں گے یا تم ہلاک ہوجاؤ گے۔''

اتنا کہہ کر وہ لوگ غصے میں اُٹھ کر چلے گئے۔قریشی وفد کی دھمکی آمیز گفتگو سُن کر ابوطالب سخت پریشان ہوئے۔ان کے لئے یہ بات بہت تکلیف دہ تھی کہ ساری قوم ناراض اور دشمن ہوگئی ہے،لیکن ان کے لئے مشکل یہ تھی کہ نہ انہیں یہ گوارا تھا کہ اسلام قبول کرلیں اور نہ یہ پسند تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قتل کئے جائیں یا ذلیل ہوں۔انہوں نے اسی پریشانی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلوایا اور کہا: تمہاری قوم جمع ہوکر میرے پاس آئی تھی اور اس نے اس طرح مجھ سے گفتگو کی ہے،لہذا:

''اے محمد! تم مجھ پر اور اپنے اوپر رحم کرو۔میرے اوپر ایسا بوجھ نہ ڈالو جو میرے لئے قابل برداشت نہ ہو۔'' (الکامل لابن اثیر ج ۲،ص ۴۳)

نصب العین کیلئے جان کی پرواہ نہ کرنا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابوطالب کی اس بات سے یہ سمجھے کہ ''وہ کفار کے مقابلہ میں اپنے آپ کو کمزور محسوس کررہے ہیں اس لئے اب میری نصرت وحمایت سے دستبردار ہونا چاہتے ہیں اور مجھے کفار کے سپرد کردینا چاہتے ہیں۔'' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے چچا! اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں تاکہ میں اس دعوت کو چھوڑ دوں تو بھی میں اس کو نہیں چھوڑ سکتا۔یا تو اللہ اس امر (اسلام) کو غالب کرے گا یا میں

نہ رہوں گا اور ہلاک کر دیا جاؤں گا۔'' (الوفا ج ا ص ۱۹۱)

یہ کہنے کے بعد آپ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور آپ اُٹھ کر وہاں سے چل پڑے۔ ابو طالب پر آپ کی اس استقامت کا بہت اثر پڑا، انہوں نے بلایا اور کہا:

''اے میرے بھتیجے! جو تمہارا دل چاہے کہو اور کرو، میں کسی حالت میں تمہیں دشمنوں کے سپرد نہ کروں گا۔'' (السیرۃ لابن ہشام ج ا ص ۱۷۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج اور چاند کا ذکر کیوں فرمایا؟ اس سے متعلق علامہ سہیلی لکھتے ہیں:

خص رسول الله صلى الله عليه وسلم النيرين حين ضرب المثل بهما لان نورهما محسوس و النور الذى جاء به من عند الله وهو الذى ارادوه على تركه هو لا محالة اشرف من النور المخلوق قال الله سبحانه يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ، فاقتضت بلاغة النبوة لما ارادوه على ترك النور الاعلى ان يقابله بالنور الادنى. (الروض الانف ج ١، ص ١٧٠، ١٧١)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور مثال دو روشن سیاروں کا نام لیا، اس لئے کہ ان دونوں کا نور محسوس ہے اور وہ نور جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے اور جس کے ترک کر دینے کا وہ (مشرکین) ارادہ رکھتے ہیں، یہ نور لامحالہ مخلوق نور (سورج و چاند) سے زیادہ شرف و مرتبت رکھتا ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں'' ان کا ارادہ یہ ہے کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں لیکن اللہ تو اسے مکمل کرنا چاہتا ہے۔'' منصبِ نبوت کی بلاغت کا تقاضا ہے کہ جب وہ لوگ نورِ اعلیٰ کے ترک کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس کا نورِ ادنیٰ سے تقابل کیا جائے۔''

یعنی قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ نورِ اعلیٰ کو ترک کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے تو آپ نے دو ادنیٰ نور یعنی سورج اور چاند کی مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ مجھے یہ دونوں نور دے دیے جائیں تب بھی میں نورِ اعلیٰ ترک کرنے پر تیار نہیں۔

سرپرستی وحمایت پر انحصار نہ کیا جائے

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سمجھا کہ آپ کے مربی، سرپرست اور آپ کی نصرت وحمایت پر ہمہ تن و ہمہ وقت کمربستہ رہنے والی ہستی آپ کی نصرت وحمایت سے دستبردار ہوا چاہتی ہے تو آپ نے صاف صاف اور دوٹوک الفاظ میں ان پر واضح کر دیا کہ اگر آپ نصرت وحمایت سے ہاتھ

کھینچ لینا چاہتے ہیں تو مجھے پھر بھی اس کی پرواہ نہیں ہے اور نہ میں اپنے مقصد اور مشن کو چھوڑ سکتا ہوں ،آپ کے دستبردار ہونے کے باوجود یہ جدوجہد جاری رہے گی تا آنکہ یا تو یہ پایۂ تکمیل تک پہنچے گی اور اللہ کا دین غالب آئے گا، یا پھر میری زندگی اور جان اس میں کام آ جائے گی اور دونوں صورتوں میں کامیابی ہے، ناکامی ہرگز نہیں ہے۔

انقلابی دعوت وتحریک کے حاملین کے لئے مذکورہ واقعے میں یہ سبق ہے کہ اگر کوئی صاحب شرف ومنزلت اور بااثر شخصیت ان کی سرپرستی اور نصرت وحمایت کرتی ہے تو یہ ان کی سعادت وکامیابی ہے اور حقیقت میں یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے غیبی نصرت ہے، لیکن مذکورہ سرپرستی وحمایت پر انحصار نہ کیا جائے اور نہ محض اس کی بنیاد پر ہی دعوت وتحریک کو آگے بڑھایا جائے کیونکہ بہرحال اس بات کا امکان موجود ہے کہ مخالفت ودباؤ بڑھ جائے اور سرپرست وحامی حضرات اس سے پریشان ومضطرب ہو کر ہاتھ کھینچ لیں، اگر اس جیسی سرپرستی اور حمایت پر انحصار کیا گیا اور مشکل گھڑی میں سرپرستوں اور حامیوں نے بھی کنارہ کشی اختیار کرلی تو اس وقت اس دعوت کا دم واپسیں ہوگا، نظم وجماعت درہم برہم ہو جائے گی اور اس کے ارکان تتر بتر ہو جائیں گے۔ لہٰذا سرپرستی وحمایت کی اہمیت، حیثیت، ضرورت اور اس کے فوائد اپنی جگہ لیکن اربابِ دعوت کو مذکورہ امور کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا اور ایسا نظم اور ترتیب بنانا ہوگی کہ سرپرستیوں اور حمایتوں کے خاتمے کے بعد بھی دعوت وتحریک ایک لمحے کے لئے بھی نہ رکے اور اس کا نظام تسلسل سے چلتا رہے۔

الغرض جب مشرکین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عزم واستقلال کا علم ہوا تو ان کی عداوت میں مزید اضافہ ہوگیا اور اہل اسلام واہل شرک کے درمیان جاری کشمکش بڑھ گئی۔

کفار کا تیسرا وفد

دوسرے وفد کے ناکام لوٹنے کے بعد جب قریش کو یقین ہوگیا کہ ابوطالب کسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذلت ورسوائی پسند کریں گے اور نہ ان کی حمایت چھوڑیں گے بلکہ اس کے لئے وہ سارے قوم کی مخالفت اور عداوت کی بھی پرواہ نہیں کرتے تو اس کے لئے انہوں نے ایک اور ترکیب کی۔ وہ لوگ عمارہ بن الولید نامی نوجوان کو ساتھ لے کر ابوطالب کے پاس آئے اور کہا ''اے ابو طالب! اب ہم تمہارے پاس عمارہ بن ولید کو لائے ہیں۔ یہ قریش میں سب سے زیادہ عقلمند، جوان، شاعر اور خوبصورت ہے۔ اس کا مال ومتاع اور خدمت آپ کے لئے وقف ہے۔ اس کو تم اپنا بیٹا بنالو اور

اس کے بدلے میں تم اپنے بھتیجے کو ہمارے سپرد کردو، جس نے ہمارے عقلمندوں کو احمق قرر دیا، تمہارے اور تمہارے آباء واجداد کے دین کی مخالفت کی اور تمہاری قوم کی جمعیت میں تفریق پیدا کردی ہے۔ ہم اسے قتل کریں گے، آدمی کے بدلے آدمی حاضر ہے۔'' (الکامل فی التاریخ ج ۲، ص ۴۳)

ابوطالب نے کہا ''اللہ کی قسم! یہ تو بدترین سودا ہے۔ تم اپنا لڑکا دیتے ہو کہ ہم اس کو اپنے پاس سے کھلائیں اور میرا لڑکا مانگتے ہو کہ اس کو قتل کرو۔''

''اللہ کی قسم! یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔'' (السیرۃ لابن ہشام ج ۱، ص ۱۷۰)

مطعم بن عدی نے ابوطالب سے کہا:

واللہ یا ابا طالب لقد أنصفک قومک وجھدوا علی التخلص مما تکرھه فما أراک ترید ان تقبل منھم شیأ (السیرۃ لابن ھشام ج ۱، ص ۱۷۱)

''اے ابوطالب! خدا کی قسم! تمہارے ساتھ تمہاری قوم نے بالکل انصاف کیا ہے۔ جس پریشانی میں وہ مبتلا ہوگئے ہیں اُس سے بچنے کے لئے انہوں نے پوری کوشش کی، مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی کوئی بات قبول کرنے کیلئے تم تیار نہیں ہو۔''

مطعم بن عدی کی اس گفتگو سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو روکنے اور آپ کو اس سے باز رکھنے کے لئے اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن انہیں اس میں کامیابی نہیں ملی اور بقول مطعم بن عدی ''انہیں چھٹکارہ نہیں مل رہا'' دراصل دعوتِ حقہ میں ایسی تاثیر وقوت ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی چلی جاتی ہے اور لوگ دیوانہ وار اس کی طرف لپکتے ہیں۔ اب مخالفین اس کے خلاف جو حربے اور ذرائع استعمال کریں یہ دبتی ہے اور نہ رکنے میں آتی ہے بلکہ بڑھتی ہی جاتی ہے، جس کی وجہ سے مخالفین اسے روکنے میں عاجز آجاتے ہیں اور اس سے ''چھٹکارا'' پانا ان کے لئے ناممکن ہوجاتا ہے۔

بہرحال ابوطالب نے مطعم بن عدی کو جواب دیتے ہوئے کہا: ''واللہ انہوں نے مجھ سے انصاف نہیں کیا ہے اور اے مطعم! تو نے ہی قوم کو بھڑکا کر میرے خلاف یہ مظاہرہ کرایا ہے اور تم سب چاہتے ہو کہ ہمیں ذلیل کرو۔ جاؤ! تم لوگوں کے دل میں جو آئے کرو۔''

ابوطالب کے اس جواب کے بعد ارکانِ وفد ابوطالب کے ذریعے بالفاظِ دیگر ''دباؤ'' اور بالواسطہ ''گفت وشنید'' کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو روکنے میں اور آپ کو (نعوذ باللہ) قتل

کرنے میں ناکام ہوگئے تو وہ مایوس ہوگئے۔

تعلیم وتربیت کا سلسلہ جاری رہا

تیسری مرتبہ قریشی وفد ابوطالب سے ناکام ہوکر لوٹ گیا تو اسی شام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاپتہ ہوگئے۔ابوطالب نے اپنے خاندان کے لوگوں کو ڈھونڈنے کے لئے بھیجا۔حضرت زید بن حارثہؓ واپس آئے تو ابوطالب نے پوچھا کیا مل گئے۔انہوں نے کہا ہاں وہ دارارقم میں موجود ہیں،ابوطالب نے کہا جب تک میں انہیں دیکھ نہ لوتب تک گھر میں داخل نہ ہوں گا چنانچہ زید بن حارثہؓ دوڑتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو:

وھو فی بیت عندالصفا ومعہ اصحابہ یتحدثون.(الطبقات الکبریٰ ج ا ص ۲۰۳)

''آپ صفا کے پاس ایک گھر میں اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھے گفتگو فرمارہے تھے۔''

حضرت زیدؓ نے آپ کو ابوطالب کے بارے میں بتایا تو آپ زید کے ساتھ ہوکر ابوطالب کے پاس چلے آئے۔انہوں نے آپ کو دیکھا تو تب چین کا سانس لیا۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ جس وقت آپ اورآپ کے اصحاب اعلانیہ دعوت دے رہے تھے اورقریش روز بروز ترقی کرتی اورزور پکڑتی دعوت سے خوفزدہ ہوکر بار بار وفد بنا کر ابوطالب کے پاس آرہے تھے،اس دوران بھی تعلیم وتربیت کا سلسلہ جاری تھا اورمرکزِ تعلیم وتربیت دارِارقم میں اجتماعات بدستور جاری تھے۔

تیرے وفد کی ناکامی کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال کچھ یوں تھی:

فحقب الامر وحمیت الحرب وتنابذ القوم وبادی بعضھم بعضاً.

(السیرۃ لابن ھشام ج ا ص ۱۷۱)

''حالات کشیدہ ہوگئے جنگ قائم ہوا چاہتی تھی،لوگ ایک دوسرے سے کینہ رکھنے لگے۔''

مخالفت اورمصائب کیوں شروع ہوتے ہیں؟

جب داعیٔ حق عقائد وافکارِ حقہ کی دعوت لے کر اٹھتا ہے اورلوگوں کو ان کی طرف بلاتا ہے تو اس سے اگر چہ اہلِ باطل چین بہ جبیں ہوتے ہیں اورانہیں پیشانی لاحق ہوتی ہے لیکن اس کی زیادہ مخالفت نہیں کی جاتی اور نہ داعیٔ اول اوراس کے پیروکاروں کو جبر وتشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے لیکن جب داعی باطل عقائد ونظریات کی تردید کرتا اور دلائل کے ساتھ ان کا باطل ہونا ثابت کرتا ہے تو اہلِ باطل

مخالفت کرنا شروع کر دیتے ہیں، پھر بات بڑھ جانے پر داعی اور ان کے متبعین پر ظلم وستم ڈھانا شروع کر دیتے ہیں، چنانچہ حافظ ابن عبدالبرؒ لکھتے ہیں کہ آپ کی خفیہ اور اعلانیہ دعوت پر بہت سے نوجوانوں، عمر رسیدہ اور کمزور لوگوں نے اسلام قبول کر لیا لیکن قریشیوں نے اتنی بڑی بات کو قابل اعتناء نہ سمجھا اور ان کی حالت یہ تھی:

وكفار قريش غير منكرين لما يقول، يقولون اذمرّ عليهم ان غلام بني هاشم هذا ويشيرون اليه ليكلم، زعموا من السماء فكانوا على ذلك حتى عاب آلهتهم الذي كانوا يعبدون وذكر هلاك آبائهم الذين ماتوا كفاراً فغضبوا لذلك وعادوه.

(الدرر في اختصار المغازي والسير ص ۳۸)

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو فرماتے تھے کفارِ قریش اس پر حرف گیری نہ کرتے بلکہ جب آپ کے پاس سے گزرتے تو اشارے کر کے کہتے کہ خاندانِ ہاشم کا نوجوان آسمانی باتیں کرتا ہے، وہ یہی طرز عمل اختیار کرتے رہے یہاں تک جب آپ نے ان کے معبودوں کی عیب جوئی کی (جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے) اور ان کے وہ آباء واجداد جو کفر کی حالت میں مر چکے تھے، ان کے ہلاکت آنگیز انجام کا ذکر کیا تو اس کی بنیاد پر وہ غضبناک ہو گئے اور آپ سے عداوت کرنے لگے۔''

اسی طرح ابن ہشام لکھتے ہیں:

''آپ نے اس کا اظہار کیا اور اپنی قوم سے اسلام کی دعوت کی ابتدا کی اور اللہ کے حکم کے مطابق اس کا اظہار کیا تو آپ کی قوم آپ سے دور ہوئی اور نہ اس کی زیادہ تردید کی مگر (مجھ تک جو روایات پہنچی ہیں) یہاں تک کہ ان کے معبودوں (بتوں) کا ذکر کیا اور ان کی برائی کی، جب آپ نے یہ کام کیا تو انہوں نے اسے بہت بڑی بات سمجھا، آپ کے مقابلے پر آ گئے اور آپ کی مخالفت اور دشمنی پر اتفاق کر لیا مگر جن حضرات کو اللہ تعالیٰ نے قبولِ اسلام کے ذریعے محفوظ رکھا اور یہ قلیل تعداد میں تھے اور مخفی رہتے تھے۔'' (السیرۃ لابن ہشام ج ا ص ۱۶۸، امتاع الاسماع ج ا ص ۱۸)

مندرجہ بالا عبارت سے واضح ہو گیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانیہ دعوت کا سلسلہ شروع کیا اور مشرکین مکہ پر مختلف حوالوں سے تنقید شروع کی، تو اس کے نتیجے میں ہی آپ کو اور آپ کے اصحاب کو بے پناہ ظلم وستم، مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یعنی جب تک آپ نے ان کے عقائد وافکار پر تنقید نہیں کی تب تک آپ کی زیادہ مخالفت نہیں کی گئی اور نہ ان کی طرف سے

جبر وتشدد کا سامنا کرنا پڑا، جب تنقید شروع کی اوران کا بطلان ثابت کرنا شروع کیا تو شدید ردعمل سامنے آیا۔

باطل کی نفی ضروری ہے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ فاسد عقائد وافکار، رسوم ورواج اور مروج نظام پر تنقید کر کے ان عقائد وافکار، رسوم ورواج اور نظام کے حامل طبقات کی مخالفت مول لینے اور ان کی طرف سے ہونے والے جبر وتشدد کا نشانہ بننے کی کیا ضرورت ہے؟ س سے بہتر صورت یہ ہے کہ بس صحیح اور برحق عقائد وافکار کو بیان کردیا جائے، لوگ خود بخود اس کے برعکس عقائد وافکار کو باطل سمجھنا اور انہیں ترک کرنا شروع کردیں گے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بظاہر تو یہ بات بہت معقول ہے لیکن بوجوہ درست نہیں ہے کیونکہ

(الف) حضرت نوح علیہ الصلوۃ والسلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی سنت اور طریقۂ دعوت یہی رہا ہے کہ وہ عقائد حقہ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ فاسد عقائد کا باطل ہونا بھی ثابت کرتے تھے، لوگوں کے سامنے اللہ وحدہ لاشریک لہ کی وحدانیت اور اس کی خالقیت وربوبیت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتلاتے تھے کہ شرک کرنا کفر ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام وفرامین کا انکار کرنا اور اس کی نافرمانی کرنا سب سے بڑا جرم ہے بلکہ ہر نبی اور رسول نے اپنی دعوت ہی ان الفاظ سے شروع کی کہ ''لوگو! لا الہ اللہ'' (نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے) کا اقرار کرلو، یعنی ان کی دعوت کا پہلا کلمہ ہی ''لا'' یعنی پہلے معبودانِ باطلہ اور عقائدِ فاسدہ کی نفی، پھر حقیقی خالق کائنات اور معبود کا اثبات۔

(ب) خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم میں خیر کے ساتھ شر، ایمان کے ساتھ کفر، توحید کے ساتھ شرک، ہدایت کے ساتھ ضلالت وگمراہی، نور کے ساتھ ظلمت اور دن کے ساتھ رات کو بھی بیان کیا ہے تاکہ دونوں میں فرق واضح ہوجائے۔

(ج) جب تک حق کے ساتھ باطل اور ایمان کے ساتھ کفر کو نہ بیان کیا جائے تب تک دونوں میں تفریق واضح نہیں ہوتی، جیسے تاریکی کے بغیر روشنی اور رات کے بغیر دن سمجھ نہیں آسکتا مثلاً اگر ایک آدمی نے صرف دن کی روشنی ہی دیکھی ہو تو اسے رات کی تاریکی سمجھ میں نہیں آسکتی ہے جب تک وہ اس کا مشاہدہ نہ کرلے۔

مذکورہ وجوہ کی بنا پر باطل عقائد وافکار اور نظامہائے حیات پر تنقید کرنا ناگزیر امر ہے، باقی رہا اس کے نتیجے میں جبر وتشدد اور مخالفت تو یہ تو ایک فطری چیز ہے جس کا ظہور ہونا ہی ہے اور داعی کو بہر حال اس کا سامنا کرنا ہی ہوتا ہے۔ خلاصہ بحث یہ کہ تنقید ناگزیر ہے اور اس کے ردعمل میں مخالفت، جبر وتشدد اور ظلم وستم لازمی امر ہے، اس لئے داعی ان مسائل ومشکلات کے پیش نظر اپنی دعوت چھوڑ سکتا ہے اور نہ باطل عقائد ونظریات پر تنقید ترک کی جاسکتی ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ مداہنت کے بغیر ایسا اسلوب بیان اختیار کیا جائے جس سے مخالفین کی طرف سے زیادہ شدید ردعمل سامنے نہ آئے۔

کفار کے مظالم اور ابتلاء

جب قریشِ مکہ نے دعوتِ اسلام کو روکنے کے لئے مختلف حربے اور ذرائع استعمال کر لئے اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو اس کے بعد انہوں نے مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ جس جس قبیلے کے میں لوگ مسلمان ہو گئے ہیں اُس قبیلہ والے خود اُن مسلمانوں کو سزائیں دیں تا کہ وہ لوگ پھر اپنے دین پر واپس آجائیں۔ یہ مسلمانوں کے لئے بڑی مصیبت اور آزمائش کا وقت تھا۔ ابن ہشام لکھتے ہیں:

فوثبت کل قبیلۃٍ علی من فیھم من المسلمین یعذ بونھم ویفتنونھم عن دینھم (السیرۃ لا بن ھشام ج ۱، ص ۱۷۱)

''ہر قبیلہ اپنے اپنے مسلمان ہونے والے افراد پر ٹوٹ پڑا، وہ انہیں سزائیں دینے لگے اور دین سے منحرف کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔''

سابقین اوّلین کو اُس وقت انتہائی سخت تکلیفیں پہنچائی گئیں اور مشرکینِ مکہ کے ہاتھوں بڑے بڑے مصائب سہنے پڑے۔ ان کی آہ وبُکا سے مکہ گونج اُٹھا۔ ہر طرف واویلا اور وامصیبتا کی صدائیں بلند ہوئیں کیونکہ سابقین اولین صحابہ کرام میں سے متعدد افراد ایسے تھے جو سماجی اور معاشی طور پر کسی بڑی حیثیت کے مالک نہ تھے اور معاشرے کے کمزور طبقے سے ان کا تعلق تھا، چنانچہ ابن اثیرؒ لکھتے ہیں:

وھم الذین سبقوا الی الاسلام ولا عشائر لھم تمنعھم ولا قوۃ لھم یمنعون بھا فاما من کانت لہ عشیرۃ تمنعہ، فلم یصل الکفار الیہ.

''یہ وہ حضرات تھے جنھوں نے اسلام قبول کرنے میں پہل کی تھی، ان کا کوئی خاندان نہ تھا جو انہیں تحفظ دیتا اور نہ خود انہیں اس قدر طاقت حاصل تھی کہ اس کے بل پر اپنا دفاع کرتے، جن کا قبیلہ تھا اس نے انہیں تحفظ دیا اور کفار (کے ناپاک ہاتھ) ان تک نہ پہنچ سکے۔''

جب کفار نے دیکھا کہ خاندان رکھنے والے مسلمانوں کا دفاع کیا جا رہا ہے تو ہر قبیلہ کے لوگ اپنے اپنے قبیلے کے کمزور مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔

''انہیں قید کرنا، مارنا پیٹنا، بھوکا، پیاسا رکھنا اور مکہ کی شدید دھوپ اور آگ میں پھینکنے کا سلسلہ شروع کر دیا تا کہ وہ اپنے دین سے منحرف ہو جائیں، چنانچہ بعض تو ظلم وستم کی شدت نہ سہتے ہوئے فتنہ میں مبتلا ہو گئے (زبان سے کلمۂ کفر کہہ لیا لیکن) ان کے دل ایمان پر مطمئن تھے، بعض دین پر ثابت قدم رہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں کفار کے شر سے محفوظ رکھا (اور وہ کلمۂ کفر سے بچ گئے)۔''

(الکامل لابن اثیر ج ۲ ص ۴۵)

یہ اسلام کا معجزہ اور ان حضراتِ صحابہؓ کی عظمت کی کھلی دلیل ہے کہ کمزور اور بے یار و مددگار ہونے کے باوجود اسلام قبول کیا پھر کفار کا ظلم وستم برداشت کیا لیکن اسلام نہیں چھوڑا اور ڈٹے رہے۔

ضعفاء پر استہزاء

ابن ہشام ابن اسحٰق سے روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں تشریف رکھتے اور خباب، عمار، ابوفکیہ اور صہیب جیسے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے صحابہ کرامؓ آپ کے ساتھ بیٹھے ہوتے تو قریش ان پر استہزاء اور ٹھٹھا کرتے اور ایک دوسرے سے کہتے:

''کیا یہی اس کے ساتھی ہیں جنہیں تم دیکھ رہے ہو؟ کیا خدا نے ہم میں سے انہیں ہی کو ہدایت اور حق سے نوازا ہے، اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی لائی ہوئی بات میں بھلائی ہوتی تو یہ لوگ اسے قبول کرنے میں ہم سے پہل نہ کرتے اور خدا ہمیں چھوڑ کر انہیں ہی مخصوص نہ کرتے۔''

(السیرۃ لابن ہشام ج ۲، ص ۳۱)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم میں بھی قریشیوں کے مذکورہ استدلال کا ذکر کیا ہے (الانعام: ۵۲ تا ۵۴) یعنی قریشی یہ سمجھ رہے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ دعوت برحق ہوتی تو نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی بجائے اسے قبول کرنے میں یہ سماجی ومعاشرتی، سیاسی واقتصادی مقام ومرتبہ رکھنے والے ہی سبقت کرتے، گویا وہ یہ سمجھتے تھے کہ جب معاشرتی واقتصادی طور پر ان کا بڑا مقام ومرتبہ اور سرداری کے ساتھ ساتھ مال ودولت ہے، اسی طرح مذہبی حوالے سے بھی انہیں ''نوازا'' جاتا حالانکہ انہیں اس بات کا شعور نہیں تھا کہ جنہیں سماجی واقتصادی اور سیاسی مقام ومرتبہ دیا گیا ہے ضروری نہیں کہ مذہبی قیادت وسیادت بھی انہیں کے حوالے کی جائے۔

درحقیقت سیاسی، اقتصادی اور سماجی مقام و مرتبہ اور معاشرے میں اثر ورسوخ رکھنے والے افراد کے دل ودماغ پر یہ بات چھائی ہوئی تھی کہ دنیا کی تمام نعمتیں انہیں ہی عطا کی گئی ہیں، لہٰذا ہر وہ چیز جو شرف ومرتبت کا باعث بن سکتی ہو وہ اس کے مستحق ہیں، اسی طرح مذہبی حوالے سے مقام ومرتبہ رکھنے والی بعض شخصیات بھی سمجھتی ہیں کہ دینی ومذہبی حوالے سے جو امور بھی انجام دیے جائیں انہی کے ہاتھوں انجام پذیر ہوں اور یہ ان کا حق ہے جبکہ دوسروں کو اس چیز کا حق حاصل نہیں، چنانچہ اسی سوچ اور فکر کے تحت یہ حضرات جب دیکھتے ہیں کہ ان کی اجازت، سرپرستی یا مشاورت کے بغیر دین ومذہب سے تعلق رکھنے والے کسی دینی شعبے میں خدمت انجام دی جارہی ہے تو اس کی مخالفت کرتے اور اسے ہدفِ تنقید بناتے ہیں خصوصاً اگر دین ومذہب سے تعلق رکھے والے غیر معروف اور بے سروسامان نوجوان ایک اسلامی انقلابی دعوت لے کر اٹھ کھڑے ہوں تو ان پر شدید تنقید کی جاتی ہے اور بے سروسامانی کے طعنے دے کر پاگل پن کی پھبتیاں کسی جاتی ہیں، حالانکہ ان چیزوں کا شرعی، عقلی اور اخلاقی طور پر کوئی جواز نہیں ہوتا، بے شمار بے سروسامان اور نوجوان انبیاء کرام (علیہم السلام) کو اصلاح وانقلاب کے لیے مبعوث کیا گیا۔

قریش نے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کو سب سے زیادہ ظلم وستم کا نشانہ بنایا جن میں سے اکثر غلام تھے۔ بدقسمتی سے ان کے آقا مسلمان نہ ہوئے تھے، اس لئے انہیں اپنے آقاؤں کی طرف سے جبر وتشدد سہنا پڑا۔

''احد احد'' کی صدا

حضرت بلالؓ سابقین اولین میں سے ہیں۔ ان کا آقا امیہ بن خلف مشرک اور اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے ساتھ شدید عداوت رکھتا تھا۔ اس نے حضرت بلال کے ساتھ یہ برتاؤ کیا کہ جب دوپہر کے وقت دھوپ میں شدت آجاتی تو انہیں منہ اور پشت کے بل سخت گرم اور پتھریلی جگہ پر ڈال دیتا پھر ان کے سینے پر بڑا بھاری پتھر رکھ دیتا اور وہ کہتا: تم ہمیشہ اسی حالت میں رہو گے الا یہ کہ مر جاؤ یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم کے دین) کا انکار کردو اور لات اور عزیٰ کی عبادت کرو:

هو يقول أحد أحد. (الكامل لابن اثير ج ۲ ص ۴۵)

''وہ احد احد کہتے رہتے۔''

نیز ان کے ساتھ یہ برتاؤ بھی کیا جاتا کہ ان کے گلے میں رسی ڈال کر لڑکوں کے حوالے

کر دیا جاتا جو انہیں لے کر (گلیوں میں) گھومتے پھرتے جبکہ حضرت بلال کا طرزِ عمل یہ ہوتا:

وھو فی کل ذلک صابر محتسب لایبالی بمالقی فی ذات اللہ تعالیٰ رضوان اللہ علیھم. (جوامع السیرۃ ص ۵۴)

''وہ ہر حال میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ،اللہ تعالیٰ کی رضا پیش نظر رکھتے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں انہیں جن مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا،اس کی کچھ پروانہ کرتے تھے۔''

حضرت بلال کے طرزِ عمل سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ جبر وتشدد کے دوران ''احد احد'' کہتے رہتے یعنی اپنے عقائد ونظریات کو ترک نہ کرتے اور ڈٹے رہتے ،لہٰذا داعی کے لئے عزیمت کا راستہ یہی ہے کہ انتہائی ظلم وستم ڈھائے جانے کے باوجود وہ اپنے افکار ونظریات اور موقف پر ڈٹا رہے اور اس سے ایک لمحے کے لئے اور ذرا بھی پیچھے نہ ہٹے۔

۲۔ جبر وتشدد پر صبر کرتے اور اسے برداشت کرتے تھے۔ان کے پاؤں میں لغزش آتی تھی اور نہ جبر وتشدد سے دلبر داشتہ ہوکر اپنے افکار ونظریات اور موقف سے دستبردار ہوتے تھے،لہٰذا داعی کو چاہئے کہ وہ ایسے حالات میں استقامت ،استقلال اور پامردی کا مظاہرہ کرے۔اسے اس بات پر یقین ہو کہ یہ جبر وتشدد عارضی ہے،ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے،کیونکہ آخر کار ظلم کے بادل چھٹیں گے،اندھیری رات ختم ہوگی اور طلوعِ سحر ضرور ہوگی۔

۳۔ اس مشکل گھڑی میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ جڑے رہتے تھے،اللہ کی رضا ان کے پیش نظر رہتی اور اسی کی خوشنودی کے حصول کے لئے اپنے اوپر ہونے والے مظالم کی بالکل پروانہ کرتے تھے۔لہٰذا داعی کو چاہئے کہ وہ جبر وتشدد اور ظلم وستم کے دوران بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جوڑے رکھے اور اس کی رضا وخوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہی یہ تمام چیزیں برداشت کرے ،کوئی دوسرا مقصد اس کے سامنے بالکل نہ ہونا چاہئے۔

لوگوں کو خراب کرنے کا الزام

حضرت ابوبکر نے حضرت بلال کو مذکورہ عذاب میں دیکھا تو اُمیۃ بن خلف نے کہا''کیا تم اس مسکین کے بارے میں خدا سے نہیں ڈرتے؟ اسے کب تک اس عذاب میں مبتلا رکھو گے۔''اس نے جواب دیا:

أنت أفسدته فانقذه مماتری. (السیرۃ لا بن ھشام ج ۱ ،ص ۲۰۳)

''تو نے ہی اسے خراب کیا ہے، تم ہی اسے اس حالت سے بچاؤ جس میں اسے دیکھ رہے ہو۔''

ابوبکرؓ نے کہا ''میرے پاس تیرا ہم مذہب (مشرک) اس سے زیادہ طاقتور حبشی غلام ہے، میں اس کے بدلے وہ تمہیں دینے کیلئے تیار ہوں۔'' چنانچہ ابوبکرؓ نے اسے اپنا غلام دے کر بلال کو لے لیا اور انہیں آزاد کر دیا۔

ارکان سے تعاون کا مقصد رضا الٰہی ہو

مدینہ کی طرف ہجرت کرنے سے قبل حضرت ابوبکر الصدیقؓ نے حضرت بلالؓ سمیت سات غلام مسلمانوں کو خرید کر آزاد کیا۔ ان کے والد ابوقحافہ نے انہیں کہا کہ ''تم کمزور لوگوں کو خرید کر آزاد کر رہے ہو، اگر ایسا کرنا بھی ہے تو طاقتور غلاموں کو خرید کر آزاد کرو کہ کل تمہارے کام آئیں اور تمہاری مدد کریں۔'' اس کے جواب میں حضرت الصدیقؓ نے فرمایا:

یاَبت !انی انماارید ماارید للّٰہ عزوجلّ .

(السیرۃ لا بن ھشام ج ۱، ص ۲۰۴ ایضاً الدرر ص ۴۸)

''میں جو کچھ کر رہا ہوں، یہ محض اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے کر رہا ہوں۔''

یعنی حضرت الصدیقؓ کسی دنیوی مفاد اور مستقبل میں حاصل ہونے والے فائدے کے لالچ میں ایسا نہیں کر رہے تھے، بلکہ ان کا مقصد اللہ رب العزت کی رضا و خوشنودی کا حصول تھا، لہٰذا داعی کو چاہئے کہ ویسے تو وہ ہر کام ہی اللہ کی رضا کے لئے کرے لیکن اپنے رفقاء سے کسی بھی قسم کا تعاون کرے تو کسی دنیاوی مفاد اور آئندہ اس کی طرف سے بھی تعاون کی امید پر نہ کرے بلکہ محض اللہ کی رضا کے لئے کرے، الغرض اخلاص اور نیت کا درست ہونا ضروری ہے۔

پورے گھرانے پر تشدد

حضرت یاسر، ان کی اہلیہ سمیہ اور ان کے فرزند عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم بھی سابقین اولین میں سے تھے، اس گھرانے کو جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑا سابقین اولین میں سے کسی گھرانے کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ عمار، ان کے والد اور والدہ تینوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا تھا، چنانچہ ابن اثیرؒ لکھتے ہیں:

''یاسر بنو مخزوم کے حلیف تھے، بنو مخزوم عمار اور ان کے والد اور والدہ کو ابطح لے جاتے جب پتھر (دھوپ سے) گرم ہو جاتے تو انہیں گرم پتھروں کی تپش سے سزا دیتے۔''

(الکامل لابن اثیر ج ۲ ص ۴۵)

استقامت پر جنت کا وعدہ

ایک مرتبہ انہیں اسی طرح سزا دی جا رہی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرے تو فرمایا:

صبرا آل یاسر فان موعدکم الجنة (الکامل فی التاریخ ج ۲ ص ۴۵)

''اے خاندانِ یاسر! ثابت قدم رہو، تمہارے لئے جنت کا وعدہ ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاندان یاسر کو ایک بات کی تلقین فرمائی اور ایک خوشخبری سنائی، استقامت و ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنے کی تلقین فرمائی جبکہ جنت کے وعدے کی خوشخبری سنائی تا کہ وہ ڈگمگائیں نہیں بلکہ جنت کے وعدے کا سن کر مزید ڈٹ جائیں۔ مصائب و مشکلات کا شکار صحابہ کرامؓ کی تربیت کا یہ نرالا انداز ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف تو اپنے عقائد و افکار پر ڈٹے رہنے کی تلقین فرما رہے ہیں دوسری طرف اس کے نتیجے میں ملنے والے اجر و ثواب اور عظیم جزا یعنی جنت کے حصول کی خوشخبری بھی سنا رہے ہیں، لہٰذا داعی کو چاہئے کہ جب وہ دعوت کی وجہ سے مخالفین کے جبر و تشدد کا خود شکار ہو اور مسائل و مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہو تو جہاں خود استقامت کا مظاہرہ کرے اور اس کے بدلے میں کئے گئے وعدوں یعنی جنت اور اس کی نعمتوں کو یاد کرے، وہاں اپنے رفقاء کو بھی ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنے کی ترغیب دے اور انہیں اس کے بدلے میں آخرت میں ملنے والے اجر و ثواب اور جنت کی ابدی و لافانی نعمتیں بھی یاد دلائے۔ قرآنی آیات اور احادیث نبویہ پڑھ کر سنائی جائیں تا کہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور ان پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کی شدت انہیں کم سے کم محسوس ہو، کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے کہ مصائب و مشکلات میں گھرے انسان کو کوئی خوشخبری دی جائے تو اسے راحت ملتی ہے اور وہ غم و الم کی شدت میں کمی محسوس کرتا ہے۔

پہلی شہید خاتون

ابو جہل نے حضرت یاسر کی اہلیہ سمیہ کو بھی جبر و تشدد کا نشانہ بنایا، ان کی شرمگاہ میں نیزہ مارا جس سے وہ شہادت کے رتبہ پر فائز ہو گئیں۔ ابن اثیرؒ لکھتے ہیں:

''یہ اسلام میں شہید ہونے والی پہلی خاتون ہیں''

اسی طرح حضرت یاسر بھی عذاب سہتے ہوئے وفات پا گئے۔ والد اور والدہ کے بعد حضرت عمار پر بھی ظلم و ستم بڑھا دیا گیا۔ کبھی تو انہیں سخت دھوپ میں کھڑا کرتے، کبھی گرم پتھر ان کے سینے پر رکھ

دیتے اور کبھی انہیں پانی میں غوطے دیتے۔'' اس دوران ان سے کہتے:

لانترکک حتی تسب محمداً و تقول فی اللات و العزی خیرا۔

''ہم تجھے اس وقت تک نہ چھوڑیں گے جب تک تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گالی نہیں دیتا اور لات اور عزیٰ کے بارے میں اچھی بات نہیں کرتا۔''

عمار نے ایسا کرلیا اور انہوں نے انہیں چھوڑ دیا تو روتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے۔

اور عرض کیا ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم انہوں نے مجھے بہت زیادہ تکالیف دی ہیں تبھی میں نے مجبوراً اس طرح کہا ہے۔'' آپ نے فرمایا ''تمہارے دل کی کیا حالت تھی؟ عرض کیا:

أجده مطمئناً بالایمان . (الکامل لا بن اثیر ج ۲ ص ۴۶)

''میں نے اسے ایمان پر مطمئن پایا تھا۔''

آپ نے فرمایا: اے عمار! اگر وہ دوبارہ ایسا کریں تو تم بھی ایسا ہی کرنا۔

نفسیاتی دباؤ اور جسمانی تشدد

نفسیاتی دباؤ اور جسمانی تشدد برداشت کرنا ہر ایک آدمی کے بس کی بات نہیں ۔ کچھ لوگ ذہن وجسمانی دونوں طرح مضبوط ہوتے ہیں، وہ برداشت کر لیتے ہیں، اسی طرح بعض جسمانی طور پر کمزور جبکہ دماغی ونفسیاتی طور پر مضبوط ہوتے ہیں وہ بھی برداشت کر لیتے ہیں، بعض ذہنی وجسمانی دونوں طرح یا بعض جسمانی طور پر تو مضبوط لیکن دماغی ونفسیاتی طور پر کمزور واقع ہوتے ہیں وہ برداشت نہیں کر پاتے اور ان کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں، چنانچہ حضرت عمار دماغی ونظریاتی طور پر تو مضبوط واقع ہوئے لیکن چونکہ ان پر ہونے والا تشدد انتہائی شدید تھا، اس لئے وہ محض زبان سے کلمۂ کفر کہنے پر مجبور ہوگئے، یہی وجہ ہے کہ وہ روتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صورت حال بتائی تو آپ نے نہ صرف انہیں تسلی دی بلکہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی اس سے متعلق آیت نازل فرمائی۔

عزیمت کا راستہ

یہاں سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(الف) ایک یہ کہ اگر داعی کو شدید تشدد کا نشانہ بنایا جائے تو عزیمت کا راستہ یہ ہے کہ اپنے

عقیدے، افکار ونظریات اور موقف پر ڈٹا رہے اور ذرا برابر پیچھے نہ ہٹے لیکن اس کے ساتھ رخصت بھی ہے کہ اگر وہ دل سے اپنے افکار ونظریات پر یقین رکھتا ہے تو محض زبان سے اس کے خلاف بھی کلمات کہہ سکتا ہے البتہ بعد میں استغفار کر لے، جیسا کہ تمام فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر مؤمن کفار کے ہاتھ لگ جائے اور وہ اس پر تشدد کر کے کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کر دیں اور وہ کہہ لے تو اس کے لیے رخصت ہے لیکن بعد میں استغفار کرنا لازمی ہے۔

(ب) دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر داعی محض زبان سے اپنے موقف کے خلاف بات کرتا ہے تو اسے اس پر ندامت وشرمندگی ہونی چاہئے اور وہ قائد دعوت کے پاس آ کر انہیں اصل صورت حال سے آگاہ کرے تا کہ اس کے بارے میں کسی قسم کے شکوک وشبہات پیدا نہ ہوں۔ حضرت سیدہ عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے۔

ملئی عمار ایمانا الی اخمص قدمیه.

''عمار (سر سے لے کر) پاؤں تک ایمان سے معمور ہیں۔''

(الاستیعاب فی معرفة الاصحاب ج ۲ ص ۴۲۳ ترجمه عمار بن یاسر)

مخالفین کے معاشی حربے

حضرت خباب بن الارتؓ بھی سابقین اولین میں سے تھے، مسلمان ہوئے تو انہیں بہت ظلم وستم سہنا پڑے۔ حضرت خبابؓ فرماتے ہیں کہ میرا عاص بن وائل پر کچھ قرض تھا۔ میں اس کے پاس لینے گیا تو اس نے مجھے کہا ''خدا کی قسم! جب تک تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت) کا انکار نہیں کرتا تب تک میں تمہیں قرض نہیں لوٹاؤں گا۔ فرماتے ہیں میں نے کہا:

لا واللہ لا أکفر بمحمد حتی تموت ثم تبعث.

''اللہ کی قسم! ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، اگر تو مر کر دوبارہ زندہ ہو تو تب بھی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم کے دین) کا انکار نہیں کر سکتا۔''

اس پر اس نے کہا ''جب میں مر کر دوبارہ اٹھایا جاؤں گا تو میرے پاس مال اور اولاد ہوگی تو تمہیں تمہارا قرض ادا کر دوں گا۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿ أَفَرَأَيْتَ الَّذِىْ كَفَرَ بِآيَاتِنَا وَقَالَ لَأُوْتَيَنَّ مَالاً وَّ وَلَدا﴾

''کیا دیکھا تو نے اس شخص کو جو ہماری آیات کا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے ضرور مال واولاد

دی جائے گی۔''

عاص بن وائل کی طرف سے قرض لوٹانے سے انکار پر حضرت خبابؓ کی طرف سے دئے جانے والے جواب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین اس طرح کے مالی اور معاشی حربے بھی استعمال کرتے ہیں تا کہ داعیان حق کو ان کے راستے سے بھٹکایا جائے لیکن وہ اس طرح کے حربوں میں کب آنے والے ہوتے ہیں۔ لہٰذا داعی کو مال ومتاع اکٹھا کرنے کی دوڑ دھوپ کرنے کی بجائے اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دینی چاہئے۔ اگر اس عظیم الشان راستے میں مال ومتاع قربان کرنا پڑے تو اسے برضا ورغبت قربان کر دینا چاہئے، کیونکہ یہ مال ومتاع تو فانی ہے، آج ہے کل نہیں، اس نے تو فنا ہونا ہی ہے۔ اگر حضرت خباب کی طرح اللہ کے دین کی سربلندی کی جدوجہد میں فنا ہو گیا تو اس سے بڑی کوئی سعادت نہیں۔

خواتین پر ظلم وستم اور ان کی استقامت

مشرکین مکہ کے جبر وتشدد کا شکار ہونے والی ایک صحابیہ حضرت زنیرہؓ تھیں، ان سے متعلق ابن اثیر لکھتے ہیں کہ وہ بنو عدی کی لونڈی تھیں اور عمرؓ انہیں تشدد کا نشانہ بناتے تھے، بعض کے نزدیک بنو مخزوم کی لونڈی تھیں اور ابو جہل ان پر تشدد کرتا تھا، یہاں تک کہ وہ بینائی سے محروم ہو گئیں تو ابو جہل نے ان سے کہا: ''لات وعزیٰ نے تمہارے ساتھ ایسا کیا ہے۔''

انہوں نے جواب دیا:

وما يدرى اللات والعزى من يعبدهما؟ ولكن هذا أمر من السماء وربى قادر على ردبصرى. (الکامل لابن اثیر ج ۲ ص ۴۷)

''لات وعزیٰ تو اپنی عبادت کرنے والوں کو بھی نہیں جانتے بلکہ یہ تو خدائی امر ہے اور میرا رب میری بینائی لوٹا دینے پر قادر ہے۔''

دوسرے دن صبح ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بصارت لوٹا دی۔

عیش وعشرت کی زندگی ترک کر دی

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے کہ سابقین اولین میں متعدد حضرات کا تعلق بڑے گھرانوں سے تھا، چنانچہ جس طرح نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا، اسی طرح بڑے گھرانوں سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کو بھی معاف نہیں کیا گیا اور انہیں بھی مصائب جھیلنے پڑے۔ حضرت

مصعب بن عمیر کا تعلق بھی اونچے اور کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔علامہ سہیلی نقل کرتے ہیں:

''مصعب بن عمیر مکہ کے نوجوان، حسین وجمیل اور کمسن تھے، ان کے والدین انہیں انتہائی پیار کرتے، ان کی والدہ اچھے سے اچھے کپڑے پہناتیں، اہل مکہ میں سب سے زیادہ اچھی خوشبو استعمال کرتے اور حضرمی جوتے پہنتے تھے۔'' (الروض الانف ج ا ص ۲۶۹)

اسلام قبول کرنے کے بعد صورت حال یکسر تبدیل ہوگئی۔دیگر مسلمانوں کی طرح انہیں بھی تکالیف اور ایذاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ان کو پیش آنے والے مصائب کا اندازہ درج ذیل الفاظ سے لگایا جاسکتا ہے۔

فلما اسلم اصابه من الشدة ما غیّر لونه واذهب لحمه ونهكت جسمه حتی كان رسول الله صلی الله علیه وسلم ینظر الیه و علیه فروق قدر فعها فیبكی لما كان یعرف من نعمته. (ایضاً)

''جب مسلمان ہوئے تو انہیں سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ان کا رنگ تبدیل ہوگیا، گوشت ختم ہوگیا اور جسم انتہائی کمزور ہوگیا، حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کھال کے ٹکڑے سے جسم ڈھانپتے ہوئے دیکھتے تو ان کی عیش وعشرت والی زندگی یاد کر کے رودیتے تھے۔''

کام کاج کرنے والے اور جفاکش لوگوں کے لئے انقلابی دعوت وتحریک کو قبول کرنے میں اس قدر مسائل ومصائب کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جس قدر عیش وعشرت اور ناز ونعم میں پلنے بڑھنے والے افراد کو کرنا پڑتا ہے، نہ صرف عیش وراحت کی زندگی تلپٹ ہوجاتی ہے بلکہ جبر وتشدد بھی سہنا پڑتا ہے۔چونکہ وہ مشقت جھیلنے کے عادی نہیں ہوتے اس لئے انہیں زیادہ شدت محسوس ہوتی ہے اور یہ ان کی بہت بڑی قربانی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت مصعب بن عمیر کی قبولِ اسلام کے بعد کی حالت دیکھ کر اور ان کی گذشتہ زندگی کو یاد کر کے رودیا کرتے تھے۔لہٰذا داعی کو چاہئے کہ وہ ایسے حضرات کی قربانیوں کی قدر کرے۔ان سے محبت وشفقت کا معاملہ رکھے تاکہ ان کی دل جوئی ہوتی رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دار ارقم میں داخل ہونے کے بعد اسلام قبول کیا جسے مخفی رکھا عثمان بن طلحہ نے ایک دن انہیں نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو ان کی والدہ اور خاندان والوں کو بتادیا، جس پر انہیں قید کردیا گیا:

فاخذوہ فحبسوہ فلم یزل محبوساً الی ان خرج الی الحبشۃ.

(الاستیعاب ج ۱ ص ۴۷۹ ترجمہ مصعب بن عمیر)

''انہوں نے انہیں پکڑ کر قید کر دیا تو وہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے تک قید میں رہے۔''

بااثر لوگوں پر مصائب

نہ صرف اونچے گھرانوں سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو ظلم و جور کا نشانہ بنایا گیا بلکہ وہ حضرات جو قریش کے سرداروں میں شمار ہوتے تھے اور کافی اثر ورسوخ رکھتے انہیں بھی تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ امام بیہقی، عیسیٰ بن طلحہ سے روایت کرتے ہیں:

أن عثمان بن عبيد الله أخا طلحة قرن طلحة مع أبي بكر ليحبسه عن الصلاة ويردَّه عن دينه وحرَّريده من يد أبي بكر، فلم يرعهم إلاّ وهو يصلّي مع أبي بكر.

(دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۲، ص ۱۶۷)

''طلحہ کے بھائی عثمان بن عبید اللہ نے طلحہ کو ابوبکر کے ساتھ باندھ دیا تاکہ اس کو نماز سے روک سکیں، انہیں دین سے منحرف کر سکیں اور انہیں ابوبکر کے قبضے سے آزاد کروا سکیں، لیکن وہ ابوبکر کے ساتھ ہی نماز پڑھتے اور اس سے باز نہ آتے تھے۔''

مخالفین کا بے بنیاد خیال

جب لوگ داعی کی بات قبول کرتے ہیں اور مخالفت کے باوجود اس سے منحرف نہیں ہوتے تو مخالفین یہی سمجھتے ہیں کہ داعی نے انہیں اپنے جال میں پھنسا رکھا ہے اور ان پر جادو کر رکھا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ درحقیقت داعی کے پیش کردہ افکار ونظریات کی حقانیت ان پر واضح ہو جاتی اور ان کی صداقت ان کے دلوں میں گھر کر جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ داعی کا ساتھ نہیں چھوڑتے اور رکاوٹوں اور مخالفت کے باوجود اس پر ڈٹے رہتے ہیں، لہٰذا مخالفین کا یہ خیال بے بنیاد ہوتا ہے کہ داعی نے انہیں اپنے جال میں پھنسا رکھا ہے۔

ابوجہل کی بااثر افراد کو سماجی، سیاسی و معاشی دھمکی

قریش اسلام قبول کرنے والے ہر فرد کو جبر وتشدد کا نشانہ بنانے کی کوشش کرتے تھے چاہے اس کا تعلق نچلے طبقے سے ہو یا کھاتے پیتے اور اونچے گھرانے سے۔ اس طرح ظلم و جور کے علاوہ انہیں دینِ اسلام سے منحرف کرنے کے لئے کئی حربے آزمائے جاتے تھے، چنانچہ ابن ہشام ابوجہل کے

بارے میں لکھتے ہیں۔

اذاسمع بالرجل قداسلم لهٔ شرف ومنعة أنّبه واخزاه قال ترکت دین ابیک وهو خیر منک لنسفهن ولنفیلن رأیک والنضعن شرفک.

(السیرة لابن هشام ج ۱ ص ۲۰۵)

''جب وہ سنتا کہ کوئی شرف ومرتبت اور طاقت وشوکت رکھنے والا آدمی اسلام قبول کر چکا ہے تو وہ اس کے پاس آکر اسے ملامت کرتا، اسے ذلیل ورسوا کرتا اور کہتا'' تو نے اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ دیا ہے حالانکہ وہ تم سے بہتر تھے۔ ہم ضرور تمہیں عقل سے عاری قرار دیں گے، تیری رائے کو کمزور اور غلط قرار دیں گے اور تیرے مرتبے کو گرا دیں گے۔''

اس طرح ابوجہل بااثر افراد کو دھمکاتا اور انہیں معاشرے میں کمزور کرنے اور ان کا مقام ومرتبہ گرا کر ذلیل ورسوا کرنے کی دھمکی دے کر نفسیاتی دباؤ ڈالتا تھا تاکہ وہ اپنے معاشرتی وسماجی شرف ومنزلت اور مفادات کے خاتمے کے خوف سے دینِ اسلام قبول کرنے سے باز رہیں اور اگر قبول کر چکے ہیں تو اس سے منحرف ہو جائیں۔ دراصل یہ ایک ایسا حربہ ہے جس کے ذریعے بااثر افراد کو قبولِ حق سے باز رکھا جا سکتا ہے۔ مکہ کے بیشتر سرداروں کے اسلام قبول نہ کرنے کی وجوہ میں سے ایک بڑی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ اسلام قبول کر کے اور اپنی قوم، قبیلے اور خاندان کی مخالفت مول لے کر اپنا مقام ومرتبہ گنوانا نہیں چاہتے تھے جیسا کہ آگے آ رہا ہے کہ ابوجہل پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی صداقت واضح ہو چکی تھی لیکن وہ قبائلی تعصب اور اپنی سرداری اور شرف ومنزلت کے خاتمے کے خوف سے اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا سردارانِ مکہ اپنے سے کم مرتبہ اور نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد (اسلام قبول کرنے والے غلاموں) کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر خود کو ذلیل ورسوا نہ کرنا چاہتے تھے جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے۔ حالانکہ سماجی ومعاشرتی مقام ومرتبے کے خاتمے کے خوف کے پیشِ نظر حق قبول نہ کرنا بہت بڑی بدبختی اور شقاوت ہے کیونکہ دنیاوی جاہ ومرتبہ فانی ہے جبکہ قبولِ حق کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے ہاں جو ابدی مقام ومرتبہ اور انعام واکرام ملنے والا ہے اس کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

الغرض ابوجہل کسی تاجر کے بارے میں سنتا کہ وہ مسلمان ہو چکا ہے تو اسے دھمکی دیتے ہوئے کہتا:

واللّٰه لنكسدن تجارتک ولنهلكن مالک. (ایضاً)

''خدا کی قسم! ہم ضرور تیرے کاروبار کو بند کرا دیں گے اور تیرے مال کو برباد کر دیں گے۔''

ابو جہل کی یہ دھمکی مذکورہ بالا دھمکی سے بھی زیادہ خطرناک ہے کیونکہ جس آدمی کی معاشی ناکہ بندی کر دی جائے اس کے لئے اس سے بڑی کوئی مصیبت نہیں ہوتی خصوصاً ایسا آدمی جس کا ذریعۂ معاش ہی تجارت ہو اس کے لئے کاروبار بند کرا دینے اور مال و متاع تباہ کر دینے کی دھمکی قیامت صغریٰ ہی ہے الا یہ کہ دعوتِ حق کسی کے دل میں گھر کر چکی ہو، دنیاوی مال و متاع کی اہمیت اس کی نظروں میں گر چکی ہو اور وہ دینِ حق پر اپنا سب کچھ لٹانے کے لیے تیار ہو تو وہ اس طرح کی دھمکیوں سے نہیں گھبراتا بلکہ انہیں خاطر میں ہی نہیں لاتا، تجارت اور دیگر ذرائع معاش کے خاتمے اور مال و متاع کی تباہی تو برداشت کر لیتا ہے لیکن دعوتِ حق کو چھوڑنے کا خیال بھی دل میں نہیں لاتا چنانچہ صحابہ کرامؓ نے سماجی، معاشرتی اور معاشی مصائب و مسائل تو برداشت کئے لیکن دین اسلام سے ایک لمحے کے لئے بھی پیچھے نہ ہٹے بلکہ اس کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔

چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر موقع پر اور ہر شخص کو دعوت دیتے تھے، اس لئے مشرکینِ مکہ کی طرف سے ایذاؤں کا سلسلہ برابر جاری رہا، چنانچہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

وتسلَّط عليه وعلى من اتبعه من آحاد الناس من ضعفائهم الأشداء الأقوياء من مشركي قريش بالأذية القولية والفعلية. (السيرة لابن كثير ج ۱، ص

''آپ اور آپ کے کمزور متبعین پر قریش کے طاقتور اور بااثر مشرکوں کی طرف سے قولی اور فعلی ایذائیں جاری رہیں۔''

امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر آزمائش

انبیاء کرام چونکہ داعیٔ اول ہوتے تھے اس لئے جہاں ان کے متبعین کو تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا وہاں خود ان کو بھی ایذائیں پہنچائی جاتی تھیں، یہ صورت حال خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پیش آئی، ابن ہشام لکھتے ہیں:

حدثني بعض أهل العلم أن أشد مالقي رسول الله صلى الله عليه وسلم من قريش أنه خرج يوما فلم يلقه أحد من الناس الا كذبه و آذاه لاحر ولا عبد فرجع رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى منزله فتدثر من شدة ما أصابه فأنزل الله تعالىٰ عليه '' يَآ أَيُّهَا الْمُدَّثِّر قم فانذر''(السيرة لا بن هشام ج ۱، ص ۱۸۴)

''مجھ سے بعض اہل علم نے یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی طرف سے جو شدید ترین تکلیف پہنچی وہ یہ تھی کہ آپ ایک دن (گھر سے) باہر نکلے تو آزاد اور غلام کوئی فرد ایسا نہ تھا جو آپ سے ملا ہو اور اس نے آپ کی تکذیب نہ کی ہو اور آپ کو ایذا ء نہ پہنچائی ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر لوٹ آئے اور مذکورہ واقعے کی وجہ سے چادر لپیٹ کر لیٹ گئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ''اے چادر لپیٹنے والے، اٹھ اور خبر دار کر۔''

حرکت سے تحریک وجود میں آتی ہے

لوگوں کی طرف سے جھٹلائے جانے اور ایذائیں پہنچائے جانے کے بعد داعی پر غم وملال کی کیفیت طاری ہونا ایک طبعی امر ہے، جس سے چارہ کار نہیں لیکن مایوسی وناامیدی پیدا نہیں ہونی چاہیے اور داعی ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ نہ رہے بلکہ وہ ایک نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ دوبارہ اٹھے اور دعوت دینا شروع کردے کیونکہ مایوسی وناامیدی اور جمود وسکون تو اس راہ میں ہے ہی نہیں بلکہ ہر وقت حرکت میں ہی رہنا پڑتا ہے، تب ''تحریک'' وجود میں آتی، بڑھتی، زور پکڑتی اور پایۂ تکمیل تک پہنچتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت جبرائیل نے آکر حکم خداوندی سنایا کہ ''قُمْ فَانْذِرْ'' (اٹھو اور خبر دار کرو) آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو منزل پر ہر حال میں پہنچنے کا عزم رکھنے والے مسافر کی طرح کچھ دیر کے لیے ستانے کے لئے لیٹے تھے، پھر اللہ تعالیٰ کا حکم آیا کہ اٹھیے اور منزل کی طرف روانہ ہو جایئے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ آپ کبھی بیٹھے نہیں بلکہ دعوت وجہاد کے سلسلے میں مصروف کار رہے۔ مکہ کی دعوتی اور مدینہ کی دعوتی وجہادی زندگی کا ایک ایک دن اس کا بیّن ثبوت ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے اور ابوجہل اور اس کے ساتھی بھی وہاں موجود تھے۔ ابوجہل نے کہا'' کیا کوئی ایسا ہے جو فلاں اونٹ کی اوجھ اٹھالے تا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جب سجدہ میں جائے تو وہ اوجھ ان کی پشت پر رکھ دے۔'' اس وقت قریش میں سے سب سے زیادہ بدبخت عقبہ بن ابی معیط اٹھا اور اوجھ اٹھا لایا:

فقذفه على النبي صلى الله عليه وسلم فلم يرفع رأسهُ (صحيح البخاري كتاب المناقب باب ذكر مالقي النبي صلى الله عليه وسلم)

''وہ اوجھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پر ڈال دی جس کی وجہ سے آپ سر سجدے سے نہ اٹھا سکے۔''

عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں اتنے میں حضرت فاطمہ الزہرائؓ جو اس وقت چار پانچ سال کی تھیں دوڑی ہوئی آئیں اور آپ سے اوجھ کو ہٹایا۔ (صحیح البخاری کتاب المناقب باب ذکر مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایضاً صحیح المسلم کتاب الجہاد والسیر باب مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اذی المشرکین)

نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو تکالیف اور ایذائیں پہنچاتی تھیں، جیسا کہ ابولہب کی بیوی ام جمیل کا طرزِ عمل تھا۔

کانت تحمل الشوک فتطرحهٗ علی طریق النبی صلی الله علیه وسلم لیعقرهٗ واصحابهٗ. (دلائل النبوة ج ۲، ص ۱۸۳)

''ابن عباسؓ وَامْرَأَتُهُ حَمَّالَةَ الْحَطَب کی تفسیر میں فرماتے تھے کہ (ابولہب کی بیوی) کانٹے اٹھا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر ڈال دیتی تھی تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو چبھیں۔''

مقصد رضائے الٰہی ہے

دینِ اسلام کی اشاعت اور اس کے پوری دنیا میں نفاذ اور تمام ادیان باطلہ پر غلبے کی جدوجہد کا مقصد فقط اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا وخوشنودی کا حصول اور اس کے دربار میں سرخرو ہونا ہے۔ جب یہ مقصد پیش نظر ہو تو اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات ومصائب کو جھیلنا آسان ہو جاتا ہے اور داعی ان کو خاطر میں بھی نہیں لاتا بلکہ وہ انہیں بخوشی قبول کرتا ہے اور آگے بڑھتا جاتا ہے، کیونکہ اسے اس بات کا کامل یقین ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت اسے اس کا بہتر بدلہ دیں گے اور جنت اور اس کی لافانی نعمتوں سے نوازیں گے۔ جیسا کہ علامہ سہیلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق روایت کرتے ہیں:

فکان مطلوبه (صلی الله علیه وسلم) رضا ربه وبه کانت تهون علیه الشدائد(الروض الانف السهیلی ج ۱، ص ۱۸۴)

''آپ کا مطلوب ومقصود اپنے رب کی رضا کا حصول تھا چنانچہ اسی سبب سے تمام مصائب و تکالیف کو جھیلنا آپ کے لئے سہل ہو جاتا تھا۔''

داعی کا قتل کیوں؟

عروۃ بن الزبیر کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمرو بن العاص سے پوچھا ''مشرکین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو شدید ترین تکلیف پہنچائی ہو، مجھے اس کے بارے میں بتلایئے، انہوں نے

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں تشریف فرما تھے کہ عقبہ بن ابی معیط آیا، آپ کے کندھے کو پکڑا:

فوضع ثوبه في عنقه فخنقهُ خنقاً شديداً فاقبل ابوبكر حتى اخذ بمنكبه و دفعهُ عن النبي صلى الله عليه وسلم قال اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلاً اَنْ يَقُوْلَ رَبِّىَ اللهُ . الآية(غافر : ٢٨) (صحيح بخاری كتاب المناقب باب مالقى صلى الله عليه وسلم واصحابه من المشركين بمكة،ايضاً المواهب اللدنيه مع شرح الزرقانى ج ا ،ص ٤٦٩)

''پھر آپ کی گردن میں کپڑا ڈال کر لپیٹا اور اسے انتہائی سختی سے دبایا تو ابوبکرؓ آ گئے، انہوں نے اسے کندھے سے پکڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دور ہٹایا اور یہ آیت پڑھی'' کیا تم قتل کرتے ہو ایسے آدمی کو جو کہتا ہے کہ میرا ربّ اللہ ہے۔''

اللہ تبارک وتعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار واعلان کرنا اور اس کی طرف سے عطا کردہ تعلیمات وہدایات اور نظامِ حیات کو اپنانے کی دعوت دینا اور اس کے ساتھ باطل افکار ونظریات اور نظامہائے حیات کی تردید کرنا کیا ایسا ''جرم'' ہے جس کی پاداش میں داعی کو جان سے ماردیا جائے؟ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ ایسا آدمی تو دراصل روحانی وباطنی طور پر مردہ لوگوں میں حرکت پیدا کر کے انہیں نئی زندگی سے ہمکنار کرتا ہے، لہٰذا وہ تو اس بات کا مستحق ہوتا ہے کہ اس پر جان نچھاور کی جائے جیسا کہ صحابہ کرامؓ نے کیا۔

قولی وفعلی نصرت

علامہ قسطانیؒ مذکورہ روایت نقل کرنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی قربانی کا آلِ فرعون کے مؤمن کی جدوجہد سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقد ذكر العلمأ ان ابابكر افضل من مؤمن آل فرعون لان ذاک اقتصر حيث انتصر على اللسان واما ابوبكر رضي الله عنه فاتبع اللسان يداً و نصر بالقول والفعل محمداً صلى الله عليه وسلم.

(المواهب اللدنيه مع شرح الزرقانى ج ا ،ص ٤٦٩، ٤٧٠)

''علماء فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آلِ فرعون کے مؤمن سے افضل ہیں، اس لئے کہ اس نے تو صرف زبانی نصرت وتعاون پر اکتفا کیا جبکہ ابوبکر نے زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھ سے بھی تعاون کیا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی اور فعلی (دونوں طرح) نصرت کی۔''

دعوت کے صرف افکار ونظریات قبول کر لینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کی اشاعت، ترقی اور غلبے کے لئے جدوجہد کرنا اور اپنی تمام صلاحتیں اسی راہ میں خرچ کرنا بھی ضروری ہے، لہٰذا جہاں اس کے لئے وقت نکالا جائے، وہاں جانی و مالی قربانی بھی دی جائے الغرض قولی وفعلی ہر طرح کی نصرت کی جائے۔ اسی صورت میں ایمان وعمل کا افضل درجہ حاصل کیا جا سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کئے گئے اجروثواب کے وعدوں کا مستحق بنا جا سکتا ہے۔

داعی کسی حال میں نہ گھبرائے

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ ابراہیم کے پاس نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ بن ابی معیط اٹھ کر آپ کے پاس آیا۔ آپ کی چادر کو آپ کے گلے میں لپیٹا اور اسے سختی کے ساتھ کھینچا تو آپ گھٹنوں کے بل گر گئے، لوگ چیخ و پکار کرنے لگے ان کا خیال تھا کہ آپ قتل کر دیئے گئے۔ اچانک ابوبکر غصے سے بھرے ہوئے آئے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بازوؤں کو پیچھے سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا ''کیا تم قتل کرتے ہو ایسے آدمی کو جو کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔'' اس کے بعد لوگ آپ سے الگ ہو گئے تو:

فقام رسول الله صلى الله عليه وسلم فصلى،(مصنف ابن ابی شیبه ج ۱۴، ص ۲۹۷)

''آپ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے۔''

عقبہ بن ابی معیط نے آپ کو اس قدر تکلیف اور اذیت پہنچائی کہ وہاں موجود لوگ سمجھنے لگے کہ بس اب مارے گئے، اس کے باوجود جب ابوبکر الصدیقؓ نے آپ کو چھڑوایا تو دوبارہ نماز میں مشغول ہو گئے، اس سے آپ کی ہمت واستقامت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ آپ بالکل نہیں گھبرائے اور نہ پریشان خاطر ہوئے بلکہ دوبارہ بارگاہ رب العالمین میں حاضر ہو گئے، اسی کی یاد میں لگ گئے اور اسی سے فریاد کرنے لگے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ داعی کو کسی بھی حال میں گھبرانا اور حواس باختہ نہیں ہونا چاہئے، چاہے اس پر تشدد کیا جائے یا قاتلانہ حملے ہوں اور جان سے مارنے کی مذموم کوشش کی جائے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز مکمل کر لی تو قریش کے جو سردار کعبہ کے سایہ میں بیٹھے تھے ان کے قریب سے گزرے اور فرمایا:

''اے گروہ قریش! قسم ہے! اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے،

مجھے تمہاری طرف ذبح (ہلاکت وقتل) کیلئے بھیجا گیا ہے،آپ نے حلق کی طرف اشارہ کیا۔'' (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۴ ص ۲۹۷ ایضاًفتح الباری باب مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابہ من المشرکین بمکۃ)

داعی کا متبعین کو تسلی دینا اور دعوت کے غلبہ کی خوشخبری سنانا

سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے ساتھ بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے۔ وہاں مشرکین مکہ میں سے ابوجہل،عقبۃ بن ابی معیط اور امیۃ بن خلف موجود تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دورانِ طواف قرآن کی تلاوت فرمائی تو مذکورہ مشرکین غضب کے مارے آپ پر ٹوٹ پڑے۔ ہاتھا پائی ختم ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لے گئے۔گھر کے دروازہ پر پہنچے تو صحابہ کرامؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

ابشروا فانّ اللہ عزوجل مظہر دینہ ومتمم کلمتہ وناصر نبیہ ان ھولأ الّذین ترون ممایذبح اللہ علی ایدیکم عاجلاً.

(السیرۃ الحلبیۃ ج ۱،ص ۴۸۰،ایضاًفتح الباری ج۷،ص ۱۲۸)

''تمہیں اس بات کی بشارت ہو کہ اللہ عزوجل اپنے دین کو غالب کریں گے،اپنے کلمے کو پورا کریں گے اور اپنے نبی کی نصرت کریں گے،جن کو تم دیکھ رہے ہو انہیں اللہ تعالیٰ بہت جلد تمہارے ہاتھوں ذبح کروائیں گے،فرماتے ہیں پھر ہم اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے،اللہ کی قسم!اللہ تعالیٰ نے انہیں ہمارے ہاتھوں غزوہ بدر میں ذبح کروایا۔''

غلبۂ دین پر یقینِ کامل ناگزیر ہے

مندرجہ بالا ارشادِ نبوی میں صحابہ کرام کو تسلی اور اس بات کی خوشخبری دی جارہی ہے کہ

۱۔ دعوتِ اسلام آخرکار غالب آکر رہے گی۔

۲۔ اللہ تعالیٰ اپنے آخری رسول کی ضرور نصرت فرمائیں گے۔

۳۔ کفار ومشرکین آخرکار مغلوب ہوں گے اور جلد تمہارے ہاتھوں ان کی شکست اور ہلاکت مقدر ہے۔

۴۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کو اپنی دعوت اور فکر نظریے کے غلبے،نصرتِ الٰہی اور کفر کے مغلوب ہونے پر کامل یقین تھا اور یہ یقین آپ اپنے پیروکاروں میں بھی پیدا کر رہے تھے۔

داعی کا اپنے افکار ونظریات کی حقانیت وصداقت،ان کے غالب آنے ،باطل افکار اور نظامہائے

حیات کے مغلوب ہونے اور اللہ تعالیٰ کی نصرت وحمایت پر کامل یقین ہونا ناگزیر ہے۔ خدانخواستہ اگر وہ خود ہی شکوک، وشبہات اور تردد وتذبذب کا شکار ہو تو نہ وہ خود اس راستے پر استقامت کے ساتھ چل سکتا ہے اور نہ دوسروں کو اس پر آمادہ کرسکتا ہے۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ خود یقین سے خالی آدمی دوسروں میں یقین پیدا نہیں کرسکتا۔ اسی طرح خود جمود کا شکار شخص دوسروں میں کبھی بھی حرکت پیدا نہیں کرسکتا، لہٰذا داعی کا یقین کامل سے معمور ہونا ناگزیر ہے۔ داعی کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ ان آیات کو پیش نظر رکھے:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ﴾

(النور : ۵۵)

ترجمہ: ’’تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ وہ ان کو زمین میں اس طرح حکمران بنائے گا جس طرح ان لوگوں کو حکمران بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے اور جس دین کو خدا نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے اس دین کو ان کے لیے مستحکم کردے گا اور اس وقت دشمن کا جو خوف ان کو لاحق ہے، ان کے اس خوف کو امن سے بدل دے گا۔‘‘

﴿ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾

(آل عمران : ۱۳۹)

’’اور تم کم ہمت نہ بنو اور غمگین نہ ہو حالانکہ تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ تم کامل مومن ہو۔‘‘

نظریے پر استقامت واصرار

جب افکار باطلہ کی تردید کی جاتی ہے اور مروجہ فاسد نظامہائے حیات پر دلائل کے ساتھ تنقید کی جاتی اور ان کا رد کیا جاتا ہے تو اس کا شدید ردعمل سامنے آتا ہے اور داعی کو بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یہی وہ وقت ہوتا ہے جب اس کی جرأت، استقامت اور اپنے نظریے پر پختگی کا امتحان ہوتا ہے۔ داعی پر لازم ہوتا ہے کہ وہ ان مشکل حالات میں جرأت واستقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی قسم کی مداہنت اختیار نہ کرے اور اپنی دعوت اور نظریات پر ڈٹ جائے۔ چنانچہ حافظ ابن عبدالبرؒ مذکورہ بالا واقعہ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ مشرکین بیٹھے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں داخل ہوئے تو وہ لوگ آپ کی طرف اٹھ کھڑے ہوئے:

كانوا اذا سألوه عن شيء صدقهم فقالوا الست تقول فى آلهتنا كذا و كذا قال بلىٰ. (الاستيعاب فى معرفة الاصحاب ج ا ، ص ۳۳۱)

''وہ جس چیز کے بارے میں پوچھتے تو آپ ان کی تصدیق کرتے ،وہ کہنے لگے کیا تم ہمارے معبودوں کے بارے میں فلاں فلاں باتیں کرتے ہو۔ آپ نے جواب میں فرمایا'' کیوں نہیں (کہتا ہوں)۔''

ابن ہشام کے مطابق آپ کا جواب یہ ہوتا:

نعم انا الذى اقول ذلك(السيرة لا بن هشام ج ا ،ص ۱۸۴)

''ہاں! میں ہی ایسا کہتا ہوں۔''

الغرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نظریے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہتے تھے چاہے مخالفین سے جتنا ہی ناپسند کیوں نہ کریں۔

صبر واستقلال اور اس کے ثمرات

قریش کے ظلم وستم کے مقابلے میں مسلمانوں نے جس ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

لقى المسلمون من كفار قريش و حلفائهم من العذاب و الاذى و البلاء عظيماً ورزقهم الله من الصبر على ذلك عظيماً ليدخر لهم ذلك فى الاخرة ويرفع به دجاتهم فى الجنة و الاسلام فى كل ذلك يفشو ويظهر فى الرجال والنساء .(الدرر ص ۴۷، ايضاً جوامع السيرة ص ۵۴)

''مسلمانوں کو قریش کے کفار اور ان کے حلیفوں کی طرف سے دی گئی بہت بری سزاؤں ، ایذاؤں اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا اور اللہ تعالیٰ نے بھی انہیں اس پر صبر کرنے کی عظیم دولت سے نوازا تا کہ آخرت میں اس کا بدلہ ذخیرہ کر لے اور جنت میں ان کے درجات بلند کرے۔ (صورت حال یہ تھی کہ)اسلام ان تمام حالات کے باوجود مردوں اور عورتوں میں پھیل رہا تھا۔''

اگر ایک طرف مسلمانوں کو کفار کی طرف سے بڑی بڑی سزاؤں اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا تو دوسری طرف اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی انہیں صبر عظیم کی نعمت سے سرفراز فرمایا کہ وہ سب کچھ برداشت کرتے رہے لیکن دین اسلام سے ایک قدم پیچھے نہ ہٹے، دراصل مصائب وآلام پر صبر کرنا

اور اپنے عقائد ونظریات پر ثابت قدم رہنا کوئی معمولی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور اس کی توفیق سے ہی داعی کو یہ نعمت حاصل ہوتی ہے، پھر جب وہ صبر واستقامت کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس کی برکت سے دعوت رکنے کی بجائے بڑھتی جاتی ہے۔

قریش کے ظلم وجور کے باوجود دینِ اسلام کی روز افزوں اشاعت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر دعوت برحق ہو تو مخالفین اس کو دبانے کے لئے جو بھی حربہ اور ذریعہ استعمال کریں، انہیں اس میں کامیابی نہیں مل سکتی بلکہ جوں جوں ان پر ظلم وستم بڑھایا جاتا ہے اور وہ استقامت کا مظاہرہ کرتے ہیں تو لوگ اس طرف متوجہ ہوتے ہیں اور ان کے افکار ونظریات پر غور وفکر کرتے ہیں۔ چنانچہ دعوت کی مقبولیت بڑھتی جاتی ہے، لہٰذا داعی کو چاہئے کہ وہ مصائب وآلام، جبر وتشدد اور حالات کی سنگینی سے نہ گھبرائے بلکہ ان حالات کا پامردی سے مقابلہ کرے کیونکہ ظلم کی تاریک رات ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے، یہ ضرور ختم ہو کر رہے گی۔

داعی کی پکار

جوں جوں دعوت کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، مخالفین کی طرف سے ہونے والا ظلم وستم بھی بڑھتا جاتا ہے اور ان پر اس قدر تشدد کیا جاتا ہے کہ وہ پکار اٹھتے ہیں ''خدایا کب ظلم کی یہ اندھیری رات ختم ہوگی اور ہمیں ان مصائب وآلام سے چھٹکارا ملے گا۔'' جب صحابہ کرامؓ پر بھی جبر وتشدد بڑھا تو وہ بھی فریاد کرنے لگے۔ مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ۔ (البقرۃ:۲۱۴) (اللہ کی مدد کب آئے گی) اس کے جواب میں فرمایا گیا:

اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ (البقرۃ:۲۱۴) (سن لو! اللہ کی مدد عنقریب آنے والی ہے۔)

انبیاء کرام علیہم السلام پر آزمائش

قیس بن ابی حازم حضرت خباب بن الارت سے روایت کرتے ہیں:

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (قریش کی طرف سے پہنچنے والی تکالیف کا) شکوہ کیا، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے سایہ میں تکیے کی ٹیک لگا کر تشریف فرما تھے، میں نے عرض کیا کہ آپ اللہ سے ہمارے لئے (نصرت) کیوں نہیں مانگتے؟ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا پھر فرمایا:

لقد کان من قبلکم لیُمشط بمشاط الحدید مادون عظامه من لحم

أو عصب، مایصرفه ذلک عن دینه، ویوضع المنشار علی مفرق رأسه فیشق باثنین مایصرفه ذلک عنه دینه، و لَیُتمنّ الله هذا الأمر حتی یسیر الراکب من صنعاء إلی حضرَ موت مایخاف إلا الله عزوجل" زادبَیان "والذئبَ علی غنمه"

(صحیح البخاری کتاب المناقب باب مالقی النبی صلی الله علیه وسلم واصحابه من المشرکین ایضاًالسیرة لا بن کثیر ج ا ،ص ۴۹۶ایضاً دلائل النبوة للبیهقی ج۲ ص ۳۱۵)).

اللہ کی قسم! تم سے پہلی امتوں کے لوگوں کو پکڑا جاتا، ان کے لئے ایک گڑھا کھودا جاتا اور انہیں اس میں ڈال کر ان پر آرا چلایا جاتا تو ان کے دو ٹکڑے ہو جاتے لیکن یہ چیز انہیں اپنے دین سے باز نہ رکھ سکتی، یا ان پر لوہے کے کنگھے چلائے جاتے جن سے ان کا گوشت اتر جاتا لیکن پھر بھی یہ چیز انہیں اپنے دین سے باز نہ رکھ سکی، اللہ تعالیٰ اس امر (دین) کو ضرور کامل کریں گے یہاں تک کہ (ایسا زمانہ آئے گا کہ) ایک مسافر صنعاء سے حضرموت تک سفر کرے گا اور اسے اللہ کے سوا کسی چیز کا خوف نہ ہوگا، یا اسے اپنی بکریوں پر بھیڑیئے کے حملے کا خوف ہوگا۔"

من کان قبلکم (تم سے پہلے کے لوگ) سے کون لوگ مراد ہیں، اس سے متعلق علامہ عینیؒ لکھتے ہیں:

اراد بهم الانبیاء الّذین تقدموا واتباعهم (عمدة القاری ج۱۶، ص ۳۰۴)

"من کان قبلکم سے مراد انبیاء سابقین اور ان کے متبعین اور پیروکار ہیں۔"

یعنی داعیانِ حق پر اہلِ باطل کی طرف سے ظلم وستم ڈھایا جانا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے منتخب اور برگزیدہ بندوں یعنی انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی دعوت حقہ کی پاداش میں اہلِ کفر کے جبر وتشدد کا سامنا کرنا پڑا حتی کہ کئی انبیاء اور ان کے پیروکاروں کو اس راستے میں جان سے ہاتھ دھونا پڑے، لہٰذا اس راستے کے راہیوں کو انہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے تمام مشکلات کو عبور کرنا چاہئے اور ہرگز گھبرانا نہیں چاہئے۔

امام ابن کثیر مذکورہ بالا روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"آپ نے انہیں بتایا کہ تم سے پہلی امتوں کے انبیاء اور ان کے پیروکاروں کو اس سے بھی زیادہ تکالیف دی گئیں لیکن وہ اپنے دین سے منحرف نہیں ہوئے۔ اس کے ساتھ آپ نے انہیں اس بات کی بشارت دی کہ اللہ تعالیٰ اس امر (دعوتِ اسلام) کو عنقریب پورا کریں گے، اسے ظاہر کریں گے، اس کا اعلان اور اشاعت ہوگی اور اللہ تعالیٰ اسے مختلف ممالک اور اطراف عالم میں غالب کریں گے یہاں

تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضر موت تک سفر کرے گا اسے اللہ تعالیٰ کا اور بکریوں پر بھیڑیے کے حملے کے علاوہ کسی چیز کا خوف نہیں ہوگا لیکن تم جلد بازی کر رہے ہو۔'' (السیرۃ لابن کثیر ج ا ص ۴۹۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سابق انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام اور ان کے پیروکاروں کو پیش آنے والے مصائب وآلام یاد دلا کر صحابہؓ کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کی ،اس کے ساتھ انہیں اس بات کی خوشخبری بھی دی کہ یہ حالات عارضی ہیں ظلم وستم ختم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی نصرت کریں اور اپنے دین کو دنیا میں ضرور غالب کرے گا۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ داعی کو مخالفین کی طرف سے جس ابتلاء وآزمائش کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہ عارضی ہوتا ہے، اس کے بعد فتح وکامیابی اور سکون اور راحت کا مرحلہ آتا ہے ،لہٰذا اس عارضی عرصے میں استقامت اختیار کرنا ناگزیر ہے اور اللہ تعالیٰ کی نصرت پر یقین رکھنا ضروری ہے۔ اس لیے داعی کو چاہئے کہ وہ ابتلاء وآزمائش کے مرحلے میں اپنے ساتھیوں کو تسلی دے، انہیں ثابت قدم رہنے کی تلقین کرے اور اس بات کی بشارت بھی سنائے کہ یہ مصائب وآلام عنقریب ختم ہوں گے اور اللہ کا دین پوری دنیا میں ضرور غالب ہو کر رہے گا۔

مراتبِ جہاد کی تکمیل

لغوی طور پر جہاد جہد سے ہے جس کا مطلب جدوجہد، سعی اور کوشش کرنا ہے، دین کے کسی بھی شعبے سے منسلک ہو کر جدوجہد کرنا اور اپنی صلاحیتیں اور جان، مال اور وقت صرف کرنا جہاد کا حصہ ہے۔ البتہ قتال بالسیف اس کا اعلیٰ وافضل درجہ ہے اور اسلام کی اصطلاح میں جہاد سے مراد قتال بالسیف ہی ہے۔ تحفظِ دین اشاعت دین، غلبۂ دین ،کیلئے حسب استطاعت سعی کرنا جہاد کا حصہ ہے تاہم چونکہ لوگوں کو مختلف صلاحیتیں مختلف عطا کی گئی ہیں، ان کی قربانیوں کی کمیت اور کیفیت میں بھی فرق ہوتا ہے اس لئے ان کے درجات میں بھی تفاوت ہے، چنانچہ ابن القیم الجوزیہؒ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وأكمل الخلق عند الله من كمل مراتب الجهاد كلها و الخلق متفاوتون في منازلهم عند الله تفاوتهم في مراتب الجهاد .(زادالمعاد ج ٢ ص ٥٦)

''اللہ تعالیٰ کے ہاں جہاد کے تمام مراتب کو پورا کرنے والی شخصیت ہی کامل ترین ہستی ہے، چونکہ مراتب جہاد کے حوالے سے لوگوں میں تفاوت ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے مراتب میں بھی فرق ہے۔''

یعنی جس نے جس قدر قربانیاں دیں اور اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لئے جہاد کیا، اسی قدر وہ جہاد کے مراتب کو طے کرتا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں مقام و مرتبہ پاتا جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امام الانبیاء اور خاتم الانبیاء والرسل ہیں، آپ کی نبوت و رسالت تمام جن و انس کے لئے ہے اور تا قیامت ہے، اس لئے آپ کو دین کی اشاعت و تبلیغ اور اس کے غلبے کے لئے تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے بڑھ کر جدو جہد کرنا پڑی، تکالیف و مشقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور یہ سلسلہ بعثت سے وفات تک جاری رہا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تمام مراتب جہاد کے جامع اور اس میں کامل ترین ہستی ہیں، چنانچہ ابن القیم لکھتے ہیں:

ولهذا كان أكمل الخلق واكرهم على الله خاتم أنبيائه ورسله فإنه كمل مراتب الجهاد وجاهد في الله حق جهاده وشرع في الجهاد من حين بعث إلى أن توفاه الله عزوجل فانه لما نزل عليه "يا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ" (المدثر: ۱-۴) شمر عن ساق الدعوة و قام في ذات الله أتم قيام ودعا الى الله ليلاً و نهاراً وسراً و جهاراً ولما نزل عليه "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" (الحجر: ۹۴) فصدع بأمر الله لا تأخذه فيه لومة لائم فدعا إلى الله الصغير والكبير والحر والعبد والذكر والأنثى والاحمر والأسود والجن والإنس. (زاد المعاد ج ۲ ص ۵۶)

''اسی لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں تمام لوگوں میں اکمل اور اکرم خاتم الانبیاء والرسل صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ آپ نے جہاد کے تمام مراتب و درجات کی تکمیل کی اور کما حقہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کیا، آپ نے اس کی شروعات بعثت سے کی اور وفات تک یہ سلسلہ جاری رہا، جب آپ پر یہ آیت نازل ہوئی ''اے لحاف میں لپٹنے والے، کھڑا ہو پھر ڈر سنا دے، اور اپنے رب کی بڑائی بول، اور اپنے کپڑے پاک رکھ۔'' تو آپ دعوت کیلئے کمر بستہ ہو گئے اور کامل طور پر اللہ (کے دین) کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، رات دن، خفیہ اور اعلانیہ دعوت دیتے رہے اور جب یہ آیت نازل ہوئی ''جس چیز کا آپ کو حکم دیا گیا ہے آپ اس کا اظہار کر دیجئے۔'' تو آپ نے اس کا باقاعدہ کھلم کھلا اظہار کیا اور اس میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کی، پس چھوٹے بڑے، آزاد و غلام، مرد و عورت، عربی و عجمی اور جن و انس کو دعوت دی۔''

یعنی بعثت سے لے کر انتقال تک آپ کی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کرنے کے لئے

جہاد کرتے ہوئے گزری۔ دعوت خاصہ کا حکم ملا تو آپ اس کے لئے کمر بستہ ہو کر دن رات اسی میں لگ گئے ۔دعوتِ عامہ کا حکم ہوا تو کھلم کھلا دعوت دیتے ہوئے معاشرے کے تمام طبقات کو مخاطب کیا۔ پھر اگلے مرحلے میں جہاد یعنی قتال بالسیف کا حکم آیا تو آپ نے جہاد کا حق ادا کرتے ہوئے بالآخر مکہ اور پورے عرب پر اسلام کا پھریرا لہرا دیا، لہٰذا داعی کو چاہئے وہ غلبہ دین کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لے ، ہمہ تن و ہمہ وقت اسی کے لئے مصروف کار رہے، صبح و شام، دن رات، خفیہ اعلانیہ، سردی گرمی، دھوپ چھاؤں، سفر حضر، فراخی تنگدستی، خوشی وغمی الغرض ہر حال میں اسی کی دعوت دے، اسی سے متعلق سوچ و بچار کرے، اسے عام کرنے اور ترقی دینے کے منصوبے بنائے الغرض اپنی زندگی اس کام کے لئے وقف کر دے اور آخری سانس تک جہدِ مسلسل میں مصروف رہے، اسی صورت میں جہاد کے اعلیٰ مراتب تک پہنچ سکتا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں مقام و مرتبہ حاصل کر سکتا ہے۔

آزمائش سنتِ الٰہیہ ہے

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور ان کے متبعین کو جن تکالیف و مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے یہ سنت الٰہیہ ہے، چنانچہ ابن القیم الجوزیہ لکھتے ہیں:

وهذه سنة الله عزوجل في خلقه (زادالمعاد ج ۲ ص ۵۶)

''مخلوق کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی یہی سنت ہے۔''

جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

مَايُقَالُ لَكَ إِلَّا مَاقَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ . (فصلت: ۴۳)

''تجھے وہی کہتے ہیں جو کہہ چکے ہیں سب رسولوں سے تجھ سے پہلے۔''

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ آپ کو جو کچھ کہا جا رہا ہے اور آپ کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ آپ سے پہلے آنے والے انبیاء اور رسولوں کو بھی اسی طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے ساتھ ان کی اقوام نے بھی ایسا ہی سلوک کیا تھا جیسا کہ قریش مکہ آپ کے ساتھ کر رہے ہیں۔لہٰذا ان کی طرف سے کی جانے والی باتوں اور دی جانے والی تکالیف اور ایذاؤں کو برداشت کیجئے اور ہرگز نہ گھبرائیے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللهِ أَلَا إِنَّ

نصر اللہ قریبٌ﴿ (البقرۃ: ۲۱۴)

''اور کیا تم کو یہ خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ تم پرنہیں گزرے حالات ان لوگوں جیسے جو ہو چکے تم سے پہلے کہ پہنچی ان کوسختی اور تکلیف اور جھنجھوڑے گئے یہاں تک کہ کہنے لگا رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے کب آئے گی اللہ کی مدد، سن رکھو اللہ کی مدد قریب ہے۔''

''الٓمّٓ حسب النّاسُ اَنۡ یُّترکُوۡا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡا آمنّا وَھُمۡ لَا یُفۡتنُوۡنَ وَلقدۡ فتنّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِھِمۡ فلیعۡلمنَّ اللہُ الَّذِیۡن صدقُوۡا ولیعۡلمنَّ الۡکاذِبِیۡنَ﴿(العنکبوت: ۱)

''کیا یہ سمجھتے ہیں لوگ کہ چھوٹ جائیں گے اتنا کہہ کر کہ ہم یقین لائے اور ان کو جانچ نہ لیں گے اور ہم نے جانچا ہے ان کو جو ان سے پہلے تھے۔ سو البتہ معلوم کرے گا اللہ جو لوگ سچے ہیں اور البتہ معلوم کرے گا جھوٹوں کو۔''

مذکورہ بالا آیات کے بارے میں ابن القیم الجوزیہ لکھتے ہیں:

''بندے کو ان آیات اور ان میں جو عبرتیں اور حکمت کے خزانے ہیں ان میں غور وفکر کرنا چاہیے، اس لئے کہ جب لوگوں کی طرف رسول بھیجے جاتے ہیں تو ان کی دو حالتیں ہوتی ہیں، یا تو لوگ ایمان لے آتے ہیں اور یا ایمان نہیں لاتے بلکہ برائیوں اور کفر پر ہمیشہ قائم رہتے ہیں، جو ایمان لے آتا ہے، اللہ رب العزت اسے امتحان اور آزمائش میں ڈالتے ہیں۔ آزمائش مبتلائے مصیبت ہونا ہے (یہ آزمائش اس لئے ہوتی ہے) تاکہ سچے اور جھوٹے کا فرق واضح ہو جائے۔ جو ایمان نہیں لاتا وہ یہ خیال نہ کرے کہ اس نے (نعوذ باللہ) اللہ کو عاجز کر دیا اور اس سے بچ کر نکل گیا کیونکہ تمام معاملات اسی کے قبضے میں ہیں۔'' (زاد المعاد ج ۲ ص ۵۷)

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت شروع کی تو لوگوں کے دو گروہ بن گئے، ایک وہ جنہوں نے دعوت قبول کر لی اور صحابیت کا عظیم درجہ حاصل کر لیا جبکہ دوسرے وہ تھے جنہوں نے دعوت قبول کرنے کی بجائے اس کی مخالفت شروع کر دی اور صحابہ کرامؓ کو ایذائیں پہنچائیں۔ صحابہ کرامؓ ابتلا و آزمائش کی بھٹیوں سے گزر کر کامیاب ہوئے اور جہنم سے بچ گئے جبکہ ظلم وستم ڈھانے والے دنیا میں بھی ناکام ہوئے اور آخرت میں ایک ایسے عذاب سے انہیں واسطہ پڑے گا جو کبھی ختم ہو گا اور نہ اس کی شدت میں کسی قسم کی کمی آئے گی۔ داعی یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لے کہ اسے مصائب و آلام کا سامنا کرنا ہی ہے اور اگر وہ اپنے قول وفعل میں سچا اور غلبۂ دین کی جدوجہد میں مخلص ہے تو اسے آزمائش سے

گزر کر اس بات کو ثابت کرنا ہوگا۔

آزمائش سے بہرصورت گزرنا ہے

انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی طرح ان کی اطاعت وپیروی کرنے والوں کو تکالیف کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے، کیونکہ یہ پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں بھرا راستہ ہے جس میں ہر ہر قدم پر ایذائیں پہنچتی ہیں، بلکہ درحقیقت انسان کو ہر حال میں مشقت اٹھانی ہے۔اگر وہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا قائل ہوکر انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی لائی ہوئی تعلیمات کو اختیار کرتا اوران کے پیش کردہ نظام حیات کے قیام کے لیے جدوجہد کرتا ہے تو اسے مخالفت اور جبر وتشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اگر ایمان نہیں لاتا اور اسلامی تعلیمات اور نظامِ حیات کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے تو اگرچہ دنیاوی زندگی بظاہر پرسکون گذرے گی لیکن آخرت میں اسے ہمیشہ اور نہ ختم ہونے والے عذاب کا سامنا کرنا ہوگا جہاں سے وہ کبھی بھی چھٹکارا نہ پائے گا۔اس لئے ایمان لانے اور اسلامی تعلیمات اور نظامِ حیات کے قیام کے لیے جدوجہد کرنے میں ہی نجات ہے۔امام ابن القیم الجوزیہ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جو شخص رسولوں پر ایمان لایا اوران کی اطاعت کی تو ان (انبیاء) کے دشمن بھی ان سے عداوت کرتے اورانہیں ایذائیں دیتے ہیں، پس یہ آدمی انہیں مصائب وآلام میں مبتلا ہوتا ہے، اگر کوئی آدمی رسول پر ایمان لایا اور نہ ان کی اطاعت کی تو اسے دنیا اور آخرت میں بھی سزا ملتی ہے تو اسے بھی مصائب وآلام کا سامنا کرنا پڑتا اور یہ تکالیف بہت بڑی اور ہمیشہ رہنے والی ہوتی ہیں بنسبت انبیاء کرام کے متبعین کے (کہ انہیں فقط دنیا کی اور وہ بھی معمولی تکالیف برداشت کرنا پڑتی ہیں) الغرض تکالیف تو ہر آدمی کو پیش آتی ہیں چاہے وہ ایمان لائے یا نہ لائے لیکن مؤمن کو دین کی خاطر بطور آزمائش تکالیف پیش آتی ہیں پھر دنیا اور آخرت میں اس کا اچھا انجام ہوتا ہے جبکہ ایمان نہ لانے والے کو ابتداً (دنیا میں) تو لذات حاصل ہوتی ہیں لیکن آخرت میں اسے دائمی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

(زادالمعاد ج۲ ص ۵۷)

جب مشقت وتکلیف کا سامنا کرنا ہی ہے تو کیوں نہ انسان ایمان واسلام لاکر دنیاوی تکالیف کو ی برداشت کرلے جو کہ عارضی ہیں اور یوں اخروی اور ہمیشہ رہنے والے عذاب سے بچ جائے۔اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ داعی کو درپیش مشکلات ومسائل کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا چاہئے۔اس

راستے میں پیش آنے والی مشکلات اور ڈھائے جانے والے ظلم وستم کو مصیبت، اللہ کی ناراضگی یا زحمت نہیں سمجھنا چاہئے۔ بلکہ داعی کو اس بات کا کامل یقین ہو کہ یہ سب کچھ اس کے امتحان کے لئے ہو رہا ہے اور کامیابی کے لئے اس مرحلے سے گزرنا ناگزیر ہے۔

آزمائش سے گزرنے والے کا مقام

جب آزمائش سنتِ الٰہیہ ہے اور انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام اور ان کے متبعین کو ضرور اس کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو ظاہر ہے کہ امتحان وآزمائش سے گزرنے والے اور اس کے بعد طاقت وقوت اور غلبہ حاصل کرنے والے کا مقام ومرتبہ بہت بلند ہوگا، امام شافعیؒ سے پوچھا گیا کہ جس کو ابتداً ہی طاقت وغلبہ حاصل ہوگیا وہ افضل ہے یا وہ افضل ہے جو مصائب ومشکلات سے دوچار ہوا، اس کے بعد اسے طاقت وغلبہ حاصل ہوا۔ امام صاحب نے فرمایا:

لا یمکن حتی یبتلی واللہ تعالیٰ ابتلی أولي العزم من الرسل فلما صبروا مکنهم (السیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۲۸۱)

"(افضل وہی ہے) جسے آزمائش میں ڈالا جائے پھر طاقت وغلبہ حاصل ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اولوالعزم رسولوں کو بھی آزمائش میں ڈالا، جب انہوں نے ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا تو انہیں طاقت وغلبہ عطا کیا۔

چونکہ افضل درجہ ابتلاء وآزمائش سے گزرنے کے بعد طاقت وغلبہ حاصل ہونا ہے، اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے رسولوں کو بھی آزمائش میں ڈالا حتی کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ تمام انبیاء اور رسولوں کے سردار اور اللہ تعالیٰ کو تمام مخلوقات میں محبوب ترین ہستی ہیں، انہیں بھی مصائب وآلام اور مخالفین کے جبر وتشدد کا سامنا کرنا پڑا (جیسا کہ تفصیل سے گزر چکا ہے) لہٰذا داعی پر روزِ اول سے ہی یہ واضح ہونا چاہئے کہ:

(۱) اسے آزمائش وامتحان سے گزرنا ہوگا اور یہی افضل درجہ ہے۔

(۲) جب انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام حتی کہ امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی آزمائش سے گزرنا پڑا تو آپ کی اور تمام انبیاء کرام کی سنت پر اسی صورت میں عمل ہوگا جب وہ خود بھی آزمائش سے گزرے گا۔

(۳) طاقت وغلبہ حاصل کرنا اور پوری دنیا میں اسلام کے نظامِ حیات کو نافذ کرنا ہے تو اس

کے لئے قربانیاں دینی پڑیں گی۔ قربانیاں دیے بغیر دین کو غالب کرنے کا تصور اور نظریہ خواب تو ہوسکتا ہے حقیقت نہیں الغرض آزمائش و امتحان سے گزرنا ناگزیر ہے، جیسا کہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

فلا یظن أحد أنه یخلص من الألم البتة وانما یتفاوت أهل الآلام في العقول فأعقلهم من باع ألما مستمرا عظیما بألم منقطع یسیر و أشقاهم من باع الألم المنقطع الیسیر بالألم العظیم المستمر (السیرة الحلبیة ج ۱ ص ۲۸۱)

''کوئی یہ خیال نہ کرے کہ وہ یقینی طور پر تکالیف سے چھٹکارا پانے والا ہے، تکالیف کا سامنا کرنے والے عقول میں متفاوت ہیں، ان میں عقل مندترین آدمی وہی ہے جس نے تھوڑی اور ختم ہونے والی تکالیف کے عوض ایک بڑی اور ہمیشہ رہنی والی تکلیف بیچ دی، بدبخت ترین آدمی وہی ہے جس نے بہت بڑی اور ہمیشہ رہنے والی مصیبت کے بدلے چھوٹی اور ختم ہونے والی تکلیف بیچ دی۔''

جب مصائب و آلام سے خلاصی نہیں اور عقل کا تقاضا بھی یہ ہو کہ معمولی دنیاوی تکالیف برداشت کرکے آخرت کے بڑے عذاب سے بچا جائے تو داعی کو چاہئے کہ وہ دنیا کی عیش وعشرت اور رنگینوں سے ہرگز متاثر نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کے دین کے غلبے کے لئے آزمائشوں کا سامنا کرکے اللہ کی رضا اور اس کی لازوال نعمتیں حاصل کرے اور ابدی عذاب سے اپنے آپ کو بچالے۔

اس موقع پر اس امر کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ داعی کو چاہیے کہ وہ یہ دیکھے کہ کیا دعوت کے نتیجے میں اسے بھی مشکلات ومصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے یا نہیں؟ اگر دعوت کے نتیجے میں اسے مشکلات ومصائب کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تو اسے اس کی وجوہات خصوصاً دعوت کے طریقہء کار پر غور وفکر کرنا چاہیے۔ اگر یہ طریقہء کار نبوی منہج کے مطابق نہیں ہے تو اسے ترک کرکے نبوی طریقہء کار کو اختیار کرنا ہوگا۔

ابتلاء وآزمائش میں رفعِ درجات ہے

علامہ حلبی انبیاء کرام اور ان کے پیروکاروں کو پیش آنے والے مصائب وآلام کو درجات کی بلندی کا باعث قرار دیتے ہیں، چنانچہ اس حوالے سے صاحب ہمزیہ کے اشعار نقل کرنے سے قبل بطور تمہید لکھتے ہیں:

''صاحب الھمزیۃ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ یہ ایذاء رسانی آپ کی شان میں کمی کا باعث ہے بلکہ یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعتِ شان کا سبب اور آپ کی

قدر و منزلت کی بلندی اور اپنے رب کے ہاں آپ کے عظیم الشان مقام و مرتبے کی دلیل ہے، کیونکہ آپ نے اس (ایذاء رسانی) پر انتہائی صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا حالانکہ آپ کو اس بات کا علم تھا کہ آپ مستجاب الدعوات ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کی بات قبول کی جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں میں سب سے زیادہ تکالیف انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کو پہنچتی ہیں اور یہ تو انبیاء سابقین کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔'' (السیرۃ الحلبیۃ ج۱،ص۲۸۱)

صاحبِ ہمزیہ کے اشعار کا خلاصہ یہ ہے کہ ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ خیال مت کرو کہ جس وقت آپ کو تکالیف پہنچیں تو اس سے آپ کی شان میں کمی ہوئی، اس لئے کہ بڑے بڑے امور میں سے جو امر بھی انبیاء کو پیش آیا تو اس سے ان کو جو تکلیف پہنچی وہ محمود ہے کیونکہ درجات کی بلندی کا باعث ہے، اس طرح جو تنگی آئی وہ بھی محمود ہے۔''

علامہ حلبی صاحبِ ہمزیہ کے اشعار کی تشریح کرتے ہوئے تکالیف کے محمود ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لانه لو كان يمس الذهب هو ان من ادخاله النار لما اختير له العرض على النار ، فالا نبياء عليهم الصلاة والسلام كالذهب والشدائد التى تصيبهم كالنار التى يعرض عليها الذهب فان ذلك لايزيد الذهب الاحسنا فكذلك الشدائد لاتزيدالانبياء الارفعة. (السيرة الحلبية ج ١ ،ص ٢٨١)

''اس لئے کہ اگر آگ میں ڈالنے سے سونے پر کوئی برا اثر پڑنا ہوتا تو اسے آگ میں ڈالا ہی نہ جاتا، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سونے کی طرح ہیں اور ان کو پہنچنے والی تکالیف اس آگ کی طرح ہیں جس میں سونا ڈالا جاتا ہے۔ بس جس طرح آگ سونے کے حسن میں اضافہ ہی کرتی ہے (اسے کندن میں تبدیل کر دیتی ہے) اسی طرح انبیاء کرام کو پہنچنے والی تکالیف بھی ان کے لئے بلندئ درجات ہی کا باعث ہوتی ہیں۔''

جیسا کہ ماقبل میں لکھا جا چکا ہے کہ انبیاء کرام کے اتباع کرنے والوں کو بھی مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو یہ تکالیف ان کی شان میں کمی نہیں بلکہ یہ تکالیف و شدائد انہیں کندن بنا دیتی ہیں اور ان کی بلندئ درجات کا سبب بنتی ہیں جس سے عنداللہ ان کا مقام و مرتبہ مزید بلند ہو جاتا ہے اور وہ مقرب بن جاتے ہیں سب سے بڑی بات یہ کہ جبر و تشدد اور ظلم و ستم سہنے کے ساتھ ان میں اپنے

نظریات اور موقف پر استقامت پیدا ہوتی ہے۔اللہ کے سوا ہر چیز کا خوف ختم ہو جاتا ہے،موت کو اپنے آنکھوں سے دیکھ چکے ہوتے ہیں،لہٰذا انہیں اس بات کا کامل یقین ہوتا ہے کہ اگر غلبۂ دین کی اس جدوجہد میں جبر وتشدد سہتے ہوئے انہیں موت آ گئی تو یہ ان کی شہادت ہوگی جو کہ عظیم سعادت ہے،اس لئے انہیں موت کی فکر نہیں ہوتی۔جب موت کا خوف نہیں رہتا تو پھر کسی بھی چیز کا خوف باقی نہیں رہتا اور داعی اپنے نظریات اور طریقۂ کار پر ڈٹ جاتا ہے اور یہی اس دعوت اور داعی کی سب سے بڑی کامیابی ہوتی ہے۔نیز یہ امر جبر کی بھٹی میں پگھلنے کے بعد داعی کے اخلاق،اعمال اور طرزِ زندگی میں مزید نکھار آ جاتا ہے۔اس کی روحانیت،للہیت اور تعلق مع اللہ میں مزید پختگی آ جاتی ہے اور وہ پہلے سے زیادہ،دعوت وتحریک کی ترقی وکامیابی کے لئے متحرک ہو جاتا ہے۔

آزمائش کے باوجود دن رات دعوت کا سلسلہ جاری رہا

جب داعیٔ حق پر آزمائشیں آتی ہیں اور مشکلات ومصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو تب واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے عقائد ونظریات میں کس قدر پختہ اور سنجیدہ ہے اور یہ کہ وہ کس حد تک ثابت قدم رہ سکتا ہے۔کیا مخالفین کے جبر وتشدد کو برداشت کر سکتا اور اپنی دعوت کا سلسلہ جاری رکھ سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ مخالفت اور ظلم وستم سہنے کے باوجود دعوت کو ترک نہ کرنا اور ثابت قدمی کے ساتھ اس کا سلسلہ جاری رکھنا ہی اس کے اخلاص اور اللہ کے دین کے غلبے کے لئے سب کچھ لٹانے کے عزمِ مصمم کی کھلی دلیل ہے۔چنانچہ مشرکین مکہ کے جبر وتشدد کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا سلسلہ جاری رکھا۔

ورسول الله صلى الله عليه وسلم يدعُو إلى الله ليلاً و نهاراً، وسرًّا وجهاراً، لا يصدُّه عن ذلك صادٌّ، ولا يردُّه عنه رادٌّ، ولا يأخذه في الله لومةُ لائم. (امتاع الاسماع ج ا،ص ۱۸)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دن رات،خفیہ اور اعلانیہ دعوت کا سلسلہ جاری رکھا،نہ تو کوئی رکاوٹ ڈالنے والا اس میں رکاوٹ ڈال سکا،نہ کوئی روکنے والا روک سکا اور نہ آپ نے کسی کی ملامت اور طعن وتشنیع کی کوئی پرواہ کی۔''

ترقیٔ دعوت

ان دنوں صورت حال یہ تھی کہ کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے بڑے بڑے منصوبے بنا رہے تھے۔وہ آپس میں مشورے کرتے،مسلمانوں کو تکلیفیں اور ایذائیں دیتے تھے،مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے کسی بات کا جواب نہیں دیتے تھے بلکہ اپنے کام میں مشغول تھے۔

آپ کی مسلسل جدوجہد اور دن رات دعوت دینے کا یہ نتیجہ تھا کہ اسلام روزانہ ترقی کرر ہا تھا۔امام ابن جوزیؒ ابن شہاب الزھری سے نقل کرتے ہیں:

دعا رسول الله صلى الله عليه وسلم الى الاسلام سراً وجهراً فاستجاب لله من شاء من احداث الرجال وضعفاء الناس حتى كثر من آمن به.(الوفاء ج ا ص ١٨١)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خفیہ اور اعلانیہ اسلام کی دعوت دینا شروع کی تو نوجوان مردوں اور کمزور لوگوں نے اسے قبول کیا یہاں تک کہ ایمان لانے والوں کی کثیر تعداد ہوگئی۔''

ساحر مشہور کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے شروع کی گئی اعلانیہ دعوت کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ حج کا موسم آ گیا تو قریش ولید بن مغیرہ (جوان میں سن رسیدہ اور تجربہ کار آدمی تھا) کے پاس جمع ہوئے اور کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی دعوت مسلسل چلا رہے ہیں اور ہم انہیں روکنے میں کامیاب نہیں ہوسکے تو آپ اس سے متعلق مشورہ دیجئے۔ولید بن مغیرہ نے کہا:

''اے گروہ قریش! موسمِ حج آچکا ہے عنقریب تمہارے ہاں عرب کے وفود آئیں گے اور تمہارے اس آدمی کے بارے میں سن چکے ہیں، لہٰذا ان کے بارے میں کسی ایک بات پر متفق ہو جاؤ اور مختلف باتیں نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ ایک دوسرے کو جھٹلاتے اور ایک دوسرے کی تردید کرتے رہو۔''

(ابن ہشام ج۱ص۲۷۱)

قریش نے جواب دیا کہ آپ ہی اس بارے میں کوئی بات طے کیجئے۔اس نے جواب دیا کہ تم اپنی آراء پیش کرو، میں سنتا ہوں پھر کوئی تجویز دے سکوں گا، چنانچہ مختلف افراد نے اپنی آراء پیش کرنا شروع کیں۔کچھ نے کہا ہمارا خیال ہے انہیں کاہن قرار دیا جائے۔ولید نے جواب دیا:

لا والله،ماهو بكاهن، لقد رأينا الكهان، فما هو بزمزمة الكاهن ولا سجعه

''اللہ کی قسم! وہ کاہن نہیں ہے، ہم کاہنوں کو دیکھ چکے ہیں اس کے اندر نہ کاہنوں جیسی گنگناہٹ ہے اور نہ ان کے جیسی قافیہ گوئی۔''

بعض نے کہا ہماری رائے ہے کہ انہیں مجنون (پاگل) کہا جائے، اس پر ولید نے کہا:

لا والله ماهو بمجنون، ولقد رأينا الجنون وعرفناه فما هو بخنقه ولا تخالجه ولا وسوسته. (السيرة لا بن هشام ج ا ،ص ٢٧١)

''اللہ کی قسم! وہ مجنون نہیں ہے، ہم جنون دیکھ چکے ہیں اور اسے پہچانتے ہیں، اس میں نہ تو پاگلوں جیسی دم گھٹنے کی کیفیت ہے، الٹی سیدھی حرکتیں ہیں اور نہ بہکی بہکی باتیں۔''

کچھ نے کہا، ہمارا خیال ہے انہیں شاعر کہا جائے، ولید نے جواب دیا:

ماھو بشاعر، لقد عرفنا الشعر کلہ برجزہ وھزجہ وقریضہ ومقبوضہ ومبسوطہ، فماھو بالشعر، (السیرۃ لا بن ھشام ج ۱، ص ۲۷۱)

''وہ شاعر نہیں ہے، ہم شعر سمجھتے ہیں اور اس کی اقسام رجز، ہزج، قریض، مقبوض، مبسوط جانتے ہیں، اس کا کلام شعر نہیں ہے۔''

بعض کہنے لگے، ہم سمجھتے ہیں کہ انہیں ساحر (جادوگر) کہا جائے، ولید نے جواب دیا:

ماھو بساحر، قد رأینا السحار وسحر ھم فما ھو بنفثھم ولا عقدھم.

(السیرۃ لا بن ھشام ج ۱، ص ۲۷۱)

''وہ ساحر نہیں ہے۔ ہم جادوگروں اور ان کا جادو دیکھ چکے ہیں، وہ نہ تو جھاڑ پھونک کرتا ہے اور نہ گرہ لگاتا ہے۔''

قریش کے ذہین ترین، تجربہ کار، جہاندیدہ اور سن رسیدہ آدمی کی طرف سے قریش کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاہن، شاعر اور ساحر ہونے کی نفی کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ولید بن مغیرہ، اور اس جیسے دیگر افراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور آپ پر نازل ہونے والے کلام'' قرآن کریم'' کی حقیقت سمجھتے تھے، انہیں اس بات کا بخوبی ادراک تھا کہ آپ کی دعوت اور آپ کا کلام کہانت، جنون، شاعری اور جادوگری ہرگز نہیں بلکہ کوئی غیبی اور آسمانی کلام ہے۔

مجنونانہ باتیں؟

درحقیقت جب داعی دعوتِ حقہ لے کر اٹھتا ہے اور لوگوں کو اپنے انقلابی افکار ونظریات اور طریقۂ کار کی دعوت دیتا ہے تو کم فہم اور مخالفین اس پر مختلف تبصرے کرتے اور اپنی آراء کا اظہار کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ آدمی تو پرانی باتیں دوہرا رہا ہے جو اس موجودہ ترقی یافتہ دور میں ناممکن ہے، کوئی کہتا ہے یہ تو مجنونانہ باتیں ہیں جن پر عمل پیرا ہونا اور انہیں عملی شکل دینا موجودہ دور میں ممکن نہیں، حالانکہ اس طرح کی باتیں کرنے والوں کو احساس ہوتا ہے کہ یہ نہ تو پرانی باتیں ہیں، نہ شاعرانہ تخیلات ہیں اور نہ الفاظ کی جادوگری ہے بلکہ یہ تو حقائق ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم اور اس کی طرف سے عائد کردہ بنیادی

فریضہ ہے جس کی ادائیگی کے لئے حسب استطاعت جدوجہد کرنا لازم اور اس میں غفلت وکوتاہی برتنا اور اسے پسِ پشت ڈالنا جرمِ عظیم ہے۔

اگر ایک کام مشکل اور کٹھن ہے اور محنت ومشقت اور ایثار وقربانی کا متقاضی ہے تو کیا محض اس بنا پر اس کے لئے جدوجہد کرنے کو پاگل پن قرار دیا جائے اور اس کی دعوت دینے والے پر ''مجذوب کی بڑ'' کے آوازے کسے جائیں؟ داعی کو یہ بات شروع دن سے ہی ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ اسے اس طرح کی باتیں کہی جائیں گے اور اسے مخالفین کے طعن وتشنیع اور تنقید وتردید کو سننا اور سہنا پڑے گا، بلکہ جب وہ اپنی دعوت کو تسلسل کے ساتھ جاری رکھے گا تو اسے مجنون و پاگل کہا جائے گا اور اس طرح انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام خصوصاً امام الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل ہوجائے گا اور سمجھا جائے گا کہ یہ بھی انبیاء کرام خصوصاً خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر عمل پیرا ہے اور انہی کی سنت کو زندہ کررہا ہے۔

ولید کی طرف سے تمام تجاویز کو ٹھکرائے جانے کے بعد قریش نے اس سے کہا کہ ولید تم ہی بتاؤ ہم اس کے بارے میں کیا رائے قائم کریں؟ ان کے جواب میں ولید نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا:

واللہ إن لقوله لحلاوة، وإن أصله لعذق، وإن فرعه لجناة وما أنتم بقائلين من هذا شيئا إلا عرف أنه باطل، وإن أقرب القول فيه لأن تقولوا ساحر، جاء بقول هو سحر يفرّق به بين المرء وأبيه، وبين المرء واخيه، وبين المرء و زوجه، و بين المرء وعشيرته. (السیرۃ لا بن ھشام ج ۱، ص ۲۷۳)

''اللہ کی قسم! اس کے کلام میں بڑی حلاوت ہے، اس کی جڑ بڑی پائیدار ہے اور اس کی شاخ پھلدار ہے، جو کچھ تم کہو گے یہی سمجھا جائے گا کہ یہ سب باطل ہے، البتہ اس کے بارے میں یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ وہ ساحر ہیں، اس کے کلام میں جادو کی سی تاثیر ہے کہ جس سے وہ اس کو قبول کرنے والے آدمی اور اسکے باپ کے درمیان، اس کے اور اس کے بھائی کے درمیان، اس کے اور اس کے زوج (شوہر یا بیوی) کے درمیان اور اس کے اور خاندان کے درمیان تفریق پیدا کردیتا ہے۔

پروپیگنڈہ مہم

قریش ولید کی رائے پر متفق ہوکر چلے گئے اور موسم حج میں آپ کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا اور اس پر عمل درآمد شروع ہوگیا۔ ابن ہشام لکھتے ہیں:

فجعلوا يجلسون بسبل حين قدموا الموسم لايمربهم أحد إلاحذَّروه إياه وذكروالهم أمره. (السيرة لا بن هشام ج ۱، ص ۱۷۳)

''جب لوگ حج کیلئے آنے لگے تو یہ ان کے راستوں میں بیٹھ گئے اور جو بھی گزرتا اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ڈراتے اور آپ کے متعلق بتاتے۔''

مخالفینِ دعوت کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ داعی اور اس کے افکار و نظریات کے خلاف خوب پروپیگنڈہ کر کے لوگوں کو اس سے متنفر کر کے دور کر دیا جائے تا کہ وہ داعی کے قریب بھی نہ پھٹکیں اور یوں نہ دعوت سنیں گے اور نہ اس سے متاثر ہو کر اسے قبول کریں گے، چنانچہ اس کے لئے باقاعدہ منصوبہ بندی کی جاتی ہے اور پروپیگنڈہ کرنے والی جماعتیں اور گروہ تشکیل دئے جاتے ہیں جو خفیہ اور اعلانیہ طور پر مختلف مواقع اور مقامات پر لوگوں میں جا کر پروپیگنڈہ کرتے ہیں اور مختلف من گھڑت باتیں پھیلا کر داعی اور اس کی دعوت سے متعلق شکوک وشبہات اور غلط فہمیاں پیدا کرنے کی مذموم کوشش کرتے ہیں۔ داعی پر بنیاد پرستی، انتہا پسندی اور دہشت گردی کے الزامات لگا کر انہیں عوام میں غیر مقبول بنانے اور بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ مذکورہ الزامات لگانے والے داعی کے خلاف مختلف کارروائیاں کر کے خود انہیں جرائم کا ارتکاب کر رہے ہوتے ہیں۔

پروپیگنڈہ مہم کا نتیجہ

اگر چہ مخالفین کو اپنے مقصد میں ایک حد تک کامیابی ملتی ہے لیکن حقیقی فائدہ داعی کا ہوتا ہے کہ خود مخالفین کے پروپیگنڈہ کی بدولت داعی کی دعوت اور اس کے افکار ونظریات کی اشاعت ہو جاتی ہے، دور دور کے لوگ جنہیں اس سے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا ان کے کانوں میں بھی یہ آواز پڑ جاتی ہے جیسا کہ ابن ھشام لکھتے ہیں:

فجعل اولئک النفر يقولون ذلک فی رسول الله صلی الله عليه وسلم لمن لقوا من الناس وصدرت العرب من ذلک الموسم بامر رسول الله صلی الله عليه وسلم فانتشر ذكره فی بلاد العرب كلها. (السيرة لا بن هشام ج ۱، ص ۱۷۴)

''ان لوگوں کو جو بھی ملتا اس سے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہی کہنا شروع کیا (کہ وہ جادوگر ہیں) اس موسم میں عرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق سن کر گئے اور یوں آپ کا ذکر پورے عرب میں پھیل گیا۔''

پروپیگنڈہ کا جواب

قریش نے آپ کے خلاف لوگوں کو بھڑکانے اور آپ کی دعوت اور عقائد و افکار سے دور رکھنے کے لئے یہ پروپیگنڈہ مہم چلائی تھی جو کہ بظاہر کامیاب رہی لیکن درحقیقت اسی میں آپ کی دعوت کو ہی فائدہ ہوا کہ ان کے پروپیگنڈہ کی بدولت آپ کے عقائد و نظریات کی عرب کے تمام قبائل میں اشاعت ہوگئی، لہٰذا داعی کو مخالفین کے منصوبہ بندی کے ساتھ پروپیگنڈہ مہم سے خوفزدہ نہ ہونا چاہئے کیونکہ اس سے ان کے افکار و نظریات کی اشاعت ہوگی اور لوگ متوجہ ہو کر ان پر غور و فکر کریں گے، اس طرح اس دعوت کی مقبولیت اور وسعت کی راہ ہموار ہوگی، لیکن یہ امر ملحوظ رہے کہ مخالفین کی پروپیگنڈہ مہم کے دوران بھی داعی اپنی دعوت جاری رکھے اور اپنے افکار و نظریات کو بہترین اسلوب میں اور دلائل و براہین کے ساتھ پیش کرے تاکہ پرپیگنڈہ مہم کی وجہ سے پیدا ہونے والے شکوک و شبہات اور غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے اور مخاطب مطمئن ہو جائے۔

عصر حاضر کے مطابق یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ داعی مخالفین کی ذرائع ابلاغ (میڈیا) پر پروپیگنڈہ مہم سے نہ گھبرائے بلکہ شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے جائز ذرائع ابلاغ کا استعمال کرتے ہوئے اپنی دعوت اور نظریات کو موثر انداز میں پیش کرنے کی پوری کوشش کرے۔

مستہزئین

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے خلاف مختلف حربے آزمانے کے بعد بھی قریش اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے تو انہوں نے جبر و تشدد کے ساتھ استہزاء کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ابن اثیرؒ نے مسلمانوں کے ساتھ استہزاء کرنے والوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ کو سب سے زیادہ تکالیف دینے والوں کی باقاعدہ فہرست دی ہے اور ان کا مختصر تعارف کرایا ہے، حافظ ابن عبدالبرؒ نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو ظلم و ستم اور استہزاء کا نشانہ بنانے والوں کی فہرست دی ہے۔ جن میں وہ بڑے اور اہم نام شامل ہیں جن کا ذکر ابن اثیر نے کیا ہے، ابن اثیر لکھتے ہیں:

وهم جماعة من قريش. (الكامل لا بن اثير ج ۲ ص ۷۴)

''وہ (استہزاء اور تکالیف پہنچانے والوں کا) قریش کا ایک گروہ تھا۔''

پڑوسی کی طرف سے ایذاء

اس گروہ میں سرفہرست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا ابولہب عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب تھا، وہ آپ کو اور آپ کے صحابہ کو ایذائیں پہنچانے اور استہزاء کرنے والوں میں پیش پیش تھا، وہ آپ کی تکذیب، تردید، توہین اور آپ کو تکالیف دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا، ہر وقت آپ کی تاک میں رہتا تھا اور دوسرے مشرکین کو بھی آپ کے خلاف بھڑکاتا رہتا۔ ابن اثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ آپ اور مسلمانوں کے خلاف سخت رویہ رکھتا تھا، تکذیب کرتا اور ہمیشہ ایذائیں دیتا تھا، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر گندگی پھینک دیتا۔ وہ آپ کا پڑوسی تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے:

أی جوار هذا یا بنی عبدالمطلب. (الکامل لا بن اثیر ج ۲ ص ۴۷)

''اے بنی عبدالمطلب! یہ پڑوس میں رہنے کا کون سا طریقہ ہے؟''

اگرچہ خاندانِ ہاشم خصوصاً ابوطالب نے کھل کر ہر موقع پر آپ کا دفاع کیا لیکن ان میں سے ابولہب کا طرزِ عمل بالکل برعکس تھا۔ داعی کو اپنے قریبی رشتہ داروں سے بھی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ سب سے پہلے خاندان کی طرف سے مخالفت اُٹھتی ہے اس لئے اس سے گھبرانا نہ چاہئے اور استقامت کے ساتھ آگے بڑھتے رہنا چاہئے۔

مستقبل کے حکمران

اسود بن عبدیغوث بن وھب بن عبدمناف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خالو کا بیٹا تھا، ابن اثیر لکھتے ہیں کہ یہ استہزاء کرنے والوں میں سے تھا، جب فقراء مسلمانوں کو دیکھتا تو اپنے ساتھیوں سے کہتا:

هؤلا ملوک الارض الذین یرثون ملک کسری. (الکامل لا بن اثیر ج ۲ ص ۴۸)

''یہی لوگ زمین کے بادشاہ ہیں جو کسریٰ کے ملک و بادشاہت کے وارث بنیں گے۔''

جب داعی دعوت لے کر اُٹھتا ہے اور لوگوں کو بتاتا ہے کہ اس کی دعوت پوری دنیا میں غالب آکر رہے گی اور دنیا کی بڑی بڑی بادشاہتوں کی جگہ اس دعوت کو قبول کرنے والوں کی حکومت قائم ہوگی تو مخالفین اس پر تعجب کرنے کے ساتھ ساتھ طعن و تشنیع کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ تو بس مجنونانہ باتیں ہیں۔ خصوصاً جب داعی کی اتباع کرنے والوں میں متعدد لوگوں کا تعلق نچلے اور غریب طبقے سے ہو تو اس استہزاء میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ بطور استہزاء پیروکاروں کو مستقبل کے بادشاہ اور حکمران کہتے

ہیں۔مخالفین کے اس خیال کے برعکس داعی کے دعوے بالآخر درست ثابت ہوتے ہیں اور یہی کمزور و بے نوا لوگ بڑی بڑی بادشاہتوں کا خاتمہ کر کے اپنے عقائد و افکار پر مبنی حکومت بناتے ہیں۔

مقطوع النسل کون؟

عاص بن وائل السہمی جلیل القدر صحابی عمرو بن العاص کا والد تھا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند قاسم کی وفات ہوئی تو اس نے کہا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مقطوع النسل ہیں، ان کا کوئی لڑکا زندہ نہ رہے گا۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ﴾ (ایضاً ص ۴۹)

''بلاشبہ آپ کا دشمن ہی مقطوع النسل ہے۔''

دعوت کا مقابلہ

نضر بن حارث بن علقمہ بن کلدہ بن عبد مناف بھی اسی گروہ میں شامل تھا۔ یہ شیطان صفت آدمی تھا، آپ کو ایذاء پہنچاتا تھا۔ یہ اہل فارس کی کتابیں پڑھتا اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ میل جول رکھتا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی مجلس میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی دعوت دیتے، قرآن پاک کی تلاوت کرتے اور قریش کو سابقہ امتوں کو دیے جانے والے عذاب سے ڈراتے تو آپ کے مجلس سے چلے جانے کے بعد نضر بن حارث لوگوں کو فارس (ایران) کے بادشاہوں کے قصے سناتا اور ان سے کہتا:

واللّٰه ما محمد باحسن حديثاً مني ولا حديثه الا اساطير الاولين اكتتبها كما اكتتبها. (السيرة لابن هشام ج ۲ ص ۸)

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھ سے زیادہ اچھی بات نہیں کرتے، ان کا کلام تو سابقہ لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں جسے اس نے لکھ رکھا ہے جیسے میں نے لکھ رکھا ہے۔''

جب مخالفین داعی کے افکار و نظریات سنتے اور اس کے مؤثر اندازِ بیان کو ملاحظہ کرتے ہیں تو ان میں سے ایسے لوگوں کا داعی کا مقابلہ کرنے کے لئے انتخاب کیا جاتا ہے جو گفتگو اور تحریر و تقریر اور مکالمے و مناظرے کا فن جانتے ہوں، ان کے ذریعے داعی کے ناک میں دم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ لوگ داعی کی بجائے مخالفین کی بات سنیں۔نضر بن حارث اسی طرح کے لوگوں میں سے تھا۔

داعی نوجوان ہی کیوں؟

حجاج کے دونوں بیٹے نبیہ اور منبہ السہمیان بھی اس گروہ میں شامل تھے، ان سے متعلق ابن اثیر لکھتے

ہیں وہ بھی اپنے ساتھیوں کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکالیف پہنچاتے اور آپ کو طعن وتشنیع کا نشانہ بناتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوتی تو آپ سے کہتے:

أما وجد الله من يبعثه غيرك؟ان ههنا من هو اسن منك وايسر.

(الکامل لا بن اثیر ج ۲ ص ۴۹، ۵۰)

''کیا اللہ کو آپ کے علاوہ کوئی دوسرا آدمی مبعوث کرنے کیلئے نہیں ملا؟ یہاں تم سے زیادہ عمر والے اور زیادہ مال ودولت والے موجود ہیں۔''

داعی پر مخالفین کا ایک اعتراض یہ بھی ہوتا ہے کہ اس نوجوان نے یہ دعوت کیوں شروع کی ہے ؟ اگر یہ دعوت برحق اور ضروری ہوتی تو اس کے لئے سب سے پہلے سن رسیدہ، تجربہ کار جہاندیدہ اور علم وعمل میں اعلیٰ درجے پر فائز فرد کو ہی اس کے لئے کھڑا ہونا چاہئے تھے جس کے پاس ذہانت وفطانت ، استعداد وصلاحیت کی عظیم نعمت کے ساتھ ساتھ وسائل وذرائع کی بھی کمی نہ ہوتا کہ وہ ان تمام امور کی بنا پر اس دعوت کو آگے بڑھا سکے اور پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔ اس کی ان خوبیوں کی وجہ سے لوگ جلد اس کی دعوت کو قبول کرتے اور اس کی اطاعت کرتے، اس طرح اسے زیادہ مشکلات ومصائب کا سامنا نہ کرنا پڑتا اور دعوت کو بآسانی کامیاب بنایا جاسکتا تھا۔ اس کے برعکس یہ بے وسیلہ وبے کس نوجوان کیا کرسکیں گے اور کون ان کی اطاعت کرے گا؟

بظاہر تو یہ بڑی معقول بات ہے لیکن سنت الٰہیہ اس طرح نہیں ہے کہ بظاہر سن رسیدہ، تجربہ کار، جہاندیدہ، علم وعمل میں اعلیٰ درجے پر فائز اور بے پناہ وسائل وذرائع رکھنے والے شخصیت کو ہی دعوت واصلاح اور انقلاب کے لئے منتخب کیا جائے۔ علماء محققین کا اتفاق ہے کہ بیشتر انبیاء کرام علیہم السلام کو جوانی میں ہی مبعوث کیا گیا اور دعوت وانقلاب کی ذمہ داری سونپی گئی، نیز بیشتر انبیاء کرام علیہم السلام ایسے تھے جن کے پاس مال ودولت کے ڈھیر تھے اور نہ جاہ وحشمت اور اقتدار وحکومت پر فائز خاندان یا گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، ہاں البتہ اللہ تعالیٰ نے ایسے افراد کو منتخب کیا جو جملہ اخلاقِ حمیدہ کے پیکر اور نبوت ورسالت کے عظیم فریضے کی ادائیگی کا حق ادا کرنے کی قوت وصلاحیت رکھتے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اصحاب کہف سے متعلق فرماتے ہیں:

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى

(الکہف: ۱۳)

اس لئے اگر داعی نوجوان اور وسائل وذرائع سے محروم ہے تو اس پر اس طرح کے اعتراضات کرنا بے سود ہے۔ یہ تو وہ نعمت ہے جو محض فضلِ الٰہی سے عطا ہوتی ہے۔

ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ.

''یہ تو اللہ عالیٰ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔''

دوسری بات یہ ہے کہ اصلاح وانقلاب ایک انتہائی مشکل کٹھن، محنت طلب اور طویل المدت کام ہے۔ جس کے لیے ہمت، جرأت، جفاکشی کے ساتھ ساتھ جوش وجذبے کا ہونا ضروری ہے اور یہ صفات عموماً بوڑھواور بڑی عمر کے افراد کی بنسبت نوجوانوں میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ عموماً سن رسیدہ اور بڑی عمر کے افراد میں نوجوانوں کا ساجوش وجذبہ، ہمت، جرأت اور جفاکشی نہیں ہوتی۔ وہ کافی سے زیادہ محتاط ہوتے ہیں۔ حرکت وعمل کے لیے تیار نہیں ہوتے خصوصاً دعوت کے لیے سفر کرنا ان کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان میں مایوسی اور ناامیدی زیادہ ہوتی ہے جبکہ نوجوان حالات کا ناسازی کے باوجود گھبراتا اور نہ مایوس ہوتا ہے بلکہ عزم اور استقامت کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔

داعی کے دعوؤں کا مذاق

اسود بن المطلب بن اُسد بن عبدالعزی بھی اسی گروہ میں شامل تھا اس کا طرزعمل یہ تھا:

كـان وأصحابه يتغامزون بالنبي صلى الله عليه وسلم وأصحابه ويقولون قد جاء كم ملوك الأرض ومن يغلب على كنوز كسرى وقيصر ويصفرون به ويصفقون.

(ایضاً ص ۵۰)

''یہ اور اس کے ساتھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو کن اکھیوں سے دیکھتے اور ان پر طعن وتشنیع کرتے ہوئے کہتے کہ ''تمہارے پاس بادشاہ آئے ہیں اور یہی لوگ کسریٰ اور قیصر کے خزانوں پر غالب آئیں گے'' وہ سیٹیاں مارتے اور تالیاں بجاتے تھے۔''

داعیِ حق اور اس کے متبعین کے مخالفین کا یہی طرزِعمل ہوتا ہے کہ وہ انہیں طعن وتشنیع کا نشانہ بنانے کے ساتھ ساتھ ان کے دعوؤں کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: کھانے، پینے اور پہننے کو کچھ ملتا نہیں، مالی طور پر کوئی حیثیت ہے نہ سماجی اور معاشرتی طور پر کوئی مقام، لیکن دعوے کرتے پھرتے ہیں اپنی دعوت کی کامیابی اور دنیا پر غالب آنے کے، انہیں نہ تو اپنی حیثیت اور وسائل وذرائع کی کمی کا احساس

ہے اور نہ ملکی و علاقائی اور عالمی حالات سے واقفیت ہے۔ بس بے جا امیدوں اور خوش فہمیوں میں مبتلا ہیں۔ مخالفین کو ان باتوں کا جواب بالآخر مل جاتا ہے جب یہی لوگ کامیاب ہو جاتے ہیں اور اللہ کے دین کو نافذ و غالب کر دیتے ہیں۔

ابن اثیر مذکورہ بالا دشمنانِ اسلام کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

هؤلاء أشد عداوة لرسول الله ﷺ ومن عداهم من رؤساء قريش كانوا أقل عداوة من هؤلاء كعتبة وشيبة وغيرهما وكان جماعة من قريش من أشد الناس عليه فاسلموا تركنا ذكرهم لذلك.(الكامل لا بن اثير ج ۲ ص ۵۱)

''یہ وہ لوگ تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید عداوت رکھتے تھے، ان کے علاوہ دیگر سردارانِ قریش آپ سے ان سے کم عداوت رکھتے تھے جیسے عتبہ اور شیبہ وغیرہ۔ نیز قریش کا ایک اور گروہ بھی آپ سے شدید عداوت رکھتا تھا لیکن بعد میں وہ مسلمان ہو گئے، اس لئے ہم نے ان (دونوں گروہوں) کا تذکرہ نہیں کیا''

باب چہارم

ہجرت اور پابندیاں

اس باب میں پہلے ہجرت کے سال کے چند واقعات کو بیان کیا جائے گا،اس کے بعد ہجرت، پھر پابندیوں کا ذکر کیا جائے گا۔

خطیب اول

امّ المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب جو اڑتیس تھے جمع ہوئے تو ابوبکرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اصرار کیا کہ (بطورِ جماعت) ظاہر ہوا جائے۔ آپ نے فرمایا:

یاابابکر انا قلیل(السیرة لا بن کثیر ج ۱، ص ۴۳۹)

''اے ابوبکر ہم قلیل تعداد میں ہیں۔''

ابوبکر مسلسل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ آپ ظاہر ہوئے۔ مسلمان مسجد حرام میں پہنچ کر اس کے اطراف میں پھیل گئے، جبکہ ابوبکر نے کھڑے ہو کر خطاب کرنا شروع کیا، اس وقت آپ تشریف فرما تھے، یہ پہلے خطیب (مقرر) ہیں جنہوں نے (اعلانیہ) اللہ اور اس کے رسول کی دعوت دی۔ ابوبکر کی تقریر کے دوران مشرکین مکہ ابوبکر اور دیگر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے اور انہیں مارنا پیٹنا شروع کیا اور انہیں شدید مارا پیٹا گیا۔ عتبہ بن ربیعہ نے قریب ہو کر انہیں پرانے جوتوں سے مارنا شروع کیا۔ وہ ابوبکر کے چہرے اور پیٹ پر مارتا رہا جس سے ان کی حالت یہ ہو گئی:

حتی مایُعرف وجهه من أنفه. (ایضاً)

''(اس قدر مارا گیا) کہ ان کے چہرے اور ناک کا پتہ نہ چلتا تھا۔''

ابوبکرؓ پر ہونے والے بے پناہ تشدد کا اندازہ درج ذیل الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے:

وحملت بنو تیم أبا بکر فی ثوب حتی أدخلوه منزله ولا یشکّون فی موته

(السیرة لا بن کثیر ج ۱، ص ۴۴۰).

''ابوبکر کو بنو تیم (ان کا قبیلہ) کے لوگ کپڑے میں ڈال کر لے گئے اور انہیں گھر پہنچایا، انہیں ابوبکر کی موت میں کوئی شک نہ تھا۔''

پھر بنو تیم مسجد حرام میں آئے اور اعلان کیا کہ اگر ابوبکر مر گئے تو واللہ! ہم عتبہ بن ربیعہ کو (ان کے بدلے میں) ضرور قتل کریں گے۔

اپنی جان کی پرواہ نہیں

ابوبکر بے ہوش تھے اور بنو تیم کے لوگ ان سے بات کرنے کی کوشش کررہے تھے، دن ڈھلے افاقہ ہوا اور بولنے کی ہمت ہوئی تو سب سے پہلا سوال یہ کیا:

مافعل رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟(ایضاً)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا بنا؟''

سبحان اللہ! اللہ کے رسول سے کس قدر محبت اور عشق ہے کہ اپنی جان کی پرواہ نہیں، ان کا قبیلہ ان کی زندگی کی فکر کررہا ہے اور اس کی طرف سے اعلان کیا جارہا ہے کہ اگر ان کی موت واقع ہوگئی تو قاتل کو بدلے میں ضرور قتل کیا جائے گا لیکن ابوبکر ہیں کہ ہوش میں آنے کے بعد محبوبِ رب العالمین کا ہی پوچھتے ہیں اور انہی کی سلامتی کی فکر انہیں کھائے جارہی ہے۔

بنو تیم کے لوگوں نے ابوبکر کے مذکورہ جواب پرانہیں بُرا بھلا کہا کہ جس کی وجہ سے تمہیں مارا پیٹا گیا اور یہ حالت ہوئی اب بھی انہی کا پوچھ رہے ہو، تاہم جاتے ہوئے ان کی والدہ امّ الخیر سے کہا، انہیں کچھ کھلاؤ پلاؤ لیکن صورت حال یہ تھی کہ:

فلما خلت به ألحت علیه وجعل یقول مافعل رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم؟(ایضاً)

''جب وہ آپ کے ساتھ اکیلی رہ گئیں تو ان سے (کھانے پینے کے لئے) الحاح وزاری کرنے لگیں لیکن ابوبکر نے کہنا شروع کیا''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا ہوا؟''

لاعلمی کا مظاہرہ (تجاہلِ عارفانہ)

امّ الخیر نے کہا بیٹے! مجھے ان کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔ ابوبکر نے کہا آپ امِّ جمیل کے پاس جائیں اور ان سے پوچھیں۔ یہ امّ جمیل کے پاس آئیں اور ان سے کہا کہ ابوبکر، محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں پوچھ رہے ہیں، کیا تمہیں ان کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟ امّ جمیل نے جواب دیا:

''میں ابوبکر کو جانتی ہوں اور نہ محمد بن عبداللہ کو، ہاں اگر تم چاہو تو میں تمہارے بیٹے کے پاس جاسکتی

سول۔'' (السیرۃ لا بن کثیر ج ۱، ص ۴۴۱)

ام جمیل کے مذکورہ جواب سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر اس طرح کا موقع آئے کہ امیر دعوت یا خود اپنے بارے میں بتانے سے خطرات خدشات لاحق ہونے کا احتمال ہو تو داعی اس بارے میں موقع کی مناسبت سے مبہم بات کرے یا لاعلمی کا مظاہرہ کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ مداہنت بالکل نہیں ہونی چاہئے۔

ام الخیر نے کہا ہاں چلو، وہ انہیں لے کر گھر آئیں، ام جمیل نے ابوبکر کی ناگفتہ بہ حالت دیکھی تو چیخ کر کہا:

''اللہ کی قسم! قومِ قریش نے آپ کو فسق وکفر کی وجہ سے تشدد کا نشانہ بنایا ہے، اللہ تعالیٰ ان سے آپ کا انتقام ضرور لیں گے۔'' (ایضاً)

ام جمیلؓ کی اس بات سے یہ معلوم ہوا کہ صحابیات کو بھی دعوت کی کامیابی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ونصرت کا یقین تھا۔ ابوبکر نے ان سے پوچھا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا ہوا؟''

محتاط طرزِ عمل

ام جمیل نے ام الخیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''یہ آپ کی والدہ ہماری بات سن رہی ہیں۔'' (ایضاً)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ داعی حضرات آپس میں کوئی اہم بات کر رہے ہوں جس کا غیر متعلق لوگوں تک پہنچنا مناسب نہ ہو تو اس میں محتاط رہیں اور کوشش کی جائے کہ دیگر افراد تک نہ پہنچے۔

ابوبکر نے کہا، ان سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تب امّ جمیل نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بخیریت وعافیت ہیں۔ ابوبکر نے پوچھا: وہ اس وقت کہاں ہیں؟ امّ جمیل نے بتایا کہ دارابن الارقم میں تشریف رکھتے ہیں۔ ابوبکر نے کہا:

فإن لله علیّ أن لا أذوق طعاما ولا أشرب شرابا أو آتی رسول الله صلی الله علیه وسلم. (ایضاً)

''اللہ کی قسم جب تک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہیں جاتا تب تک نہ کوئی چیز کھاؤں گا نہ پیوں گا۔''

ساتھیوں کی قدر کی جائے

دونوں خواتین انہیں سہارا دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے ان کا اس طرح استقبال کیا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر جھکے اور انہیں بوسا دیا، مسلمان (صحابہ کرامؓ) بھی ان پر جھک گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی وجہ سے بہت زیادہ غمگین اور آبدیدہ ہوگئے۔'' (ایضاً ص ۴۴۵، ۴۴۱)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ امیرِ دعوت کو اپنے ان ساتھیوں سے زیادہ محبت اور ان کا زیادہ اکرام اور خیال کرنا چاہئے جو زیادہ قربانیاں دینے والے ہوں تا کہ ان کی دل جوئی اور حوصلہ افزائی ہو۔ داعی تو محض اللہ کی رضا کے حصول کے لئے قربانیاں دیتا اور مشقتیں اٹھاتا ہے چاہے داد و تحسین ملے یا نہ ملے، لیکن امیر کو چاہئے کہ وہ ان کی قدر کرے کیونکہ بے قدری کی صورت میں فطری اور طبعی طور پر یہ بات دل میں پیدا ہوتی ہے کہ ہماری قربانیوں کی تو کوئی اہمیت ہے اور نہ ہمیں کوئی پوچھتا ہے۔ اس سے بددلی اور بدمزگی پیدا ہوتی ہے اور داعی اور امیر دعوت کے درمیان عقیدت و محبت کا تعلق قوی نہیں رہتا۔

دعوت کا جذبہ

ابوبکر نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، مجھے زیادہ تکلیف نہیں البتہ فاسق (عتبہ بن ربیعہ) نے میرے چہرے پر جو مارا ہے (اس سے بہت زیادہ تکلیف ہے۔)

وهـذه أمي برَّة بولدها، وأنت مبارك فادعها إلى الله، وادع الله لها عسى الله أن يستنقذها بك من النار. (السيرة لا بن كثير ج ا ،ص ۴۴۱ .ايضاً السيرة الحلبية ج ۱/ ص ۲۸۱، ۲۸۲)

''یہ میری والدہ ہے جو اپنی اولاد سے حسنِ سلوک کرنے والی ہے، آپ مبارک ہستی ہیں، انہیں اللہ کی طرف بلائیے اور اللہ تعالیٰ سے ان کے لئے دعا کیجئے، شاید اللہ تعالیٰ انہیں آپ کے طفیل جہنم کی آگ سے بچالیں۔''

انتہائی تشدد کا نشانہ بننے کے باوجود حضرت ابوبکر الصدیقؓ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مذکورہ درخواست سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں دعوت کے ساتھ کس قدر لگاؤ تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اس طرح کے مشکل ترین لمحات میں بھی داعی اپنی ذمہ داری کو نہ بھولے اور مقصد پیشِ نظر رکھے۔

ناسازگار حالات میں کامیابی

قریش کی طرف سے مسلمانوں پر ظلم و ستم جاری تھا اور جبر و تشدد کی حدود سے تجاوز کیا جا رہا تھا

جیسا کہ ابوبکر الصدیقؓ کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک کے بارے میں ذکر ہوا، ایک طرف تو یہ صورت حال تھی جبکہ دوسری طرف اسلام کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہورہا تھا اور اس کو قبول کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی جس کی وجہ سے اسلام اور اہل اسلام مضبوط ہوتے جارہے تھے، چنانچہ جس دن ابوبکرؓ پر بہیمانہ تشدد کیا گیا اسی روز اسلام کی دعوت کو ایک عظیم کامیابی نصیب ہوئی۔ حضرت حمزہؓ نے بھی اسی دن اسلام قبول کیا جس دن ابوبکر کو زدوکوب کیا گیا اور مارا گیا تھا۔

(السیرۃ لابن کثیر ج۱ص۴۴۱)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر ایک طرف مخالفت اور ظلم وستم بڑھے گا تو دوسری طرف دعوت کی مقبولیت اور قوت میں بھی اضافہ ہوگا۔ لہٰذا مشکلات ومصائب اور ناسازگار حالات کے باوجود داعی کو گھبرانا اور مایوس نہ ہونا چاہئے۔ ظلم وستم سہنے اور تسلسل کے ساتھ دعوت جاری رکھنے کی برکت سے دعوت کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہوگی اور اسے قبول کرنے والوں کی تعداد میں اضافے کی وجہ سے اس کی طاقت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

حضرت حمزہؓ کے اسلام قبول کرنے سے دعوت کو جو طاقت حاصل ہوئی، اس سے متعلق الشیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

پس غالب وقوی شد رسولِ خدا با سلام او بر قریش۔ (مدارج النبوۃ ج۲ص۶۱)

''ان کے اسلام لانے کے سبب رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) قریش پر غالب اور قوی ہوگئے۔''

اسی طرح امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

فكان حمزة (رضي الله عنه) ممن أعز الله (عزوجل) به الدين.

(دلائل النبوة للبيهقي ج ۲، ص ۲۱۴)

''حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے ذریعے اللہ نے دین کو عزت وغلبہ دیا۔''

ابن اسحاق حضرت حمزہؓ کے قبولِ اسلام کا واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک دن ابوجہل صفا کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا تو آپ کو ایذاء پہنچائی، گالیاں دیں، آپ کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا۔ اس کے جواب میں آپ کا طرزِ عمل یہ تھا:

''آپ نے اس کے جواب میں کوئی بات نہیں فرمائی۔'' (السیرۃ لابن ہشام ج۱، ص۱۸۵)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ ابوجہل جیسے لوگوں کی باتوں اور طعن وتشنیع کا کوئی جواب نہ دینا اور خاموشی

سے گزر جانا ہی بہتر ہے کیونکہ ایسے بغض وعداوت رکھنے والے افراد سے مکالمہ ومباحثہ بے سود ثابت ہوتا ہے۔

الغرض عبداللہ بن جدعان کی لونڈی دوراپنے مکان کے پاس کھڑی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی، تھوڑی ہی دیر میں حضرت حمزہؓ شکار سے واپس آتے ہوئے وہاں سے گزرے تو اس نے انہیں سارا واقعہ بیان کیا تو حضرت حمزہ غصے میں آ گئے اور مسجد حرام کی طرف چل پڑے، جب مسجد حرام میں داخل ہوئے تو ابوجہل کے پاس جا کر اس کے سر پر کمان دے ماری اور شدید زخمی کر دیا، پھر کہا:

''کیا تو انہیں برا بھلا کہتا ہے حالانکہ میں بھی ان ہی کے دین پر ہوں۔ میں بھی وہی کہتا ہوں جو وہ کہتے ہیں؟ اگر تمہیں جرأت ہے تو مجھے روک لو۔'' (ایضاً)

ابوجہل کے خاندان کے جو افراد وہاں موجود تھے، اس کے دفاع کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن خود ابوجہل نے انہیں منع کر دیا۔

شبہات کے ازالے کے لیے امیر کی خدمت میں حاضری

اس کے بعد حضرت حمزہ گھر آ گئے اور اپنی اس بات پر قائم رہے لیکن چونکہ یہ سب کچھ اچانک پیش آیا تھا، اس لئے شیطان نے آ کر انہیں گمراہ کرنا چاہا، چنانچہ ان سے کہا:

أنت سيد قريش اتبعت هذا الصابئ وتركت دين آبائك، للموت خير لك مما صنعت،

''تم قریش کے سردار ہو، تم نے اس صابی (بے دین) کی اتباع کر لی اور آباؤ اجداد کا دین چھوڑ دیا تم نے جو کیا ہے اس سے تو موت بہتر ہے۔

چنانچہ حضرت حمزہ نے اس سے متاثر ہو کر اپنے آپ سے کہا: ''تو نے یہ کیا کر لیا ہے؟''

حضرت حمزہ تردد و تذبذب کا شکار ہو گئے، انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ انہوں نے ایسا کر کے ٹھیک کیا ہے یا نہیں؟ اس دوران انہوں نے دعا کی:

''اے اللہ! اگر یہ ہدایت ہے تو میرے دل میں اس کی تصدیق ڈال دے، وگرنہ میں جس مشکل میں پھنس گیا ہوں، اس سے نکلنے کی راہ ہموار کر۔''

حضرت حمزہؓ نے رات اسی حالت میں گزاری کہ شیطان وسوسے ڈالتا رہا، صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

''اے بھتیجے! میں ایک مشکل میں پھنس گیا ہوں، جس سے نکلنے کا کوئی راستہ مجھے معلوم نہیں، میں نہیں جانتا میں نے جس بات کو قبول کیا ہے وہ برحق ہے یا شدید گمراہی، آپ مجھ سے گفتگو کیجئے میری خواہش ہے کہ آپ اس بارے میں مجھ سے بات چیت کریں۔'' (دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۲، ص ۲۱۴)

اس میں یہ سبق ہے کہ اگر نئے ساتھی کو دعوت کے افکار ونظریات سے متعلق شکوک وشبہات اور غلط فہمیاں پیدا ہوں تو وہ امیر دعوت کے پاس حاضر ہو کر ان کے سامنے اپنے اشکالات پیش کرے اور یوں ان کے ازالے کی کوشش کرے، کیونکہ شیطان اور نفس تو یہی چاہتا ہے کہ داعی شکوک وشبہات میں پڑ کر دعوت سے ہٹ جائے اور یوں اسے دنیا وآخرت کی رسوائیوں کا سامنا کرنا پڑے۔

داعی کو مخاطب کا تردد وشک دور کرنا چاہئے

حضرت حمزہؓ کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تشفی کی:

فأقبل رسول الله ﷺ فذكره، ووعظه، وخوّفه، وبشّره. (ایضاً)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف متوجہ ہوئے، انہیں وعظ ونصیحت کی، انہیں آخرت اور جہنم کا خوف دلایا اور (اسلام پر ثابت قدم رہنے پر جنت کی) خوشخبری سنائی۔''

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سننے کے بعد ایمان ان کے دل میں گھر کر گیا اور انہوں نے آپ سے عرض کیا کہ ''میں اس بات کی سچی گواہی دیتا ہوں کہ آپ سچائی پر ہیں۔''

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر کسی رکن نئے یا پرانے ساتھی کے دل میں دعوت اور اس کے افکار ونظریات سے متعلق شکوک وشبہات پیدا ہوں تو امیر اور امیر کو چاہئے کہ وہ اس کے اشکالات کو غور سے سنے، پھر نرمی اور محبت کے ساتھ ان کے جوابات دے۔ دعوت اور اس کے افکار ونظریات کو نہ اپنانے کے نقصانات اور بھیانک انجام سے ڈرائے اور انہیں اپنانے کی صورت میں دنیا وآخرت میں حاصل ہونے والی سعادتوں اور کامرانیوں کی خوشخبری سنائے۔

مفاہمت کی کوشش

جب مخالفین دعوت کے خلاف تمام حربے آزما چکے ہوتے ہیں اور انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ مفاہمت اور مصالحت کے ذریعے اسے روکنے اور دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت حمزہؓ کے قبولِ اسلام کے بعد زور پکڑتی دعوت کو روکنے کے لئے اسی نوعیت کی ایک کوشش کی گئی، جیسا کہ ابن ہشام لکھتے ہیں:

وذلک حین أسلم حمزة ورأوا أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم يزيدون ويكثرون. (السيرة لابن هشام ج ۱، ص ۱۸۵)

''یہ اس وقت کی بات ہے جب حمزہؓ اسلام قبول کر چکے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور وہ کثیر ہوتے جا رہے تھے۔''

عتبہ بن ربیعہ جس کی کنیت ابوالولید تھی، قریش کے سرداروں میں سے تھا، ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں تشریف فرما تھے اور وہ اس وقت قریش کی مجلس میں بیٹھا تھا کہ قریش سے کہا'' اے گروہِ قریش! کیوں نہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جاؤں اور ان کے سامنے کچھ امور رکھوں، شاید وہ کچھ کو قبول کر لیں تو ہم وہ انہیں دے دیں اور (اس کے بدلے) ہمارے (دین کے بارے میں جو فکر دے رہے ہیں اس) سے باز آ جائیں۔'' انہوں نے ابوالولید کو اجازت دی اور کہا کہ تم جا کر بات کرو، چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

يا ابن أخي، إنک منا حيث قد علمت من السطة في العشيرة والمكان في النسب وإنک قد أتيت قومک بأمر عظيم فرقت به جماعتهم وسفهت به أحلامهم وعبت آلهتهم ودينهم وكفرت به من مضى من آبائهم فاسمع مني أعرض عليک أمورا تنظر فيها لعلک تقبل منها بعضها. (السيرة لابن هشام ج ۱، ص ۱۸۵)

''اے بھتیجے! تمہیں خاندان میں جو حیثیت حاصل ہے اور نسب کے لحاظ سے جو مرتبہ ہے وہ آپ کو بخوبی معلوم ہے، تم اپنی قوم کے پاس ایک بہت بڑی بات لائے ہو جس سے تم نے ان کی جمعیت میں تفریق پیدا کر دی ہے، ان کی عقلوں کو حماقت زدہ قرار دیا ہے، ان کے معبودوں اور دین کو عیب ناک کہا ہے اور اس کے ذریعے ان کے آباؤ اجداد کی نفی کی ہے، میں تمہارے سامنے چند امور پیش کر رہا ہوں، انہیں سنو، ان پر غور و فکر کرو، شاید تم ان میں سے کچھ کو قبول کر لو۔''

ابن ابی شیبہؒ روایت کرتے ہیں کہ عتبہ نے کہا'' تم بہتر ہو یا عبدالمطلب؟

فسكت رسول الله صلى الله عليه وسلم

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاموشی اختیار کرنے سے معلوم ہوا کہ بعض اوقات سائل کی بات کا جواب دینا مناسب نہیں ہوتا لہٰذا اس وقت خاموشی اختیار کر لینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

عتبہ نے کہا کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ وہ لوگ تم سے بہتر تھے تو وہ بھی انہی بتوں کی عبادت کرتے تھے جن کی تم برائیاں بیان کرتے ہو، اور اگر تمہارا خیال ہے کہ تم ان سے بہتر ہو تو آپ بولیے ہم سنتے ہیں۔ پھر کہا:

إنـا و الله مـا رأينا سخلة قط أشأم على قومه منک، فرقت جماعتنا و شتت أمرنا وعبـت ديـننا و فضحتنا فی العرب حتی لقد طار فيهم أن فی قريش ساحرا، و أن فی قـريـش كـاهنا، و الله ماننتظر إلا مثل صيحة الحبلى أن يقول بعضنا لبعض بالسيوف حتىٰ تنفانى أيها الرجل ، (مصنف ابن ابی شیبه ج ۱۴، ص ۲۹۶)

''اللہ کی قسم ہم نے کسی نوجوان کو اپنی قوم کیلئے تم سے زیادہ منحوس نہیں پایا، تو نے ہماری اجتماعیت ختم کر دی ہے، انتشار پھیلا دیا ہے، ہمارے دین کو برا بھلا کہا ہے، تم نے ہمیں عربوں میں رسوا کر دیا ہے حتیٰ کہ ان میں یہ مشہور ہو گیا کہ قریش کا ایک فرد جادوگر ہے اور یہ کہ قریش میں ایک کاہن ہے، اللہ کی قسم! ہم تو اس وقت کے منتظر ہیں جب حاملہ کی چیخ و پکار کی طرح آواز ہو گی اور ہم ایک دوسرے کو تلوار کے ساتھ قتل کر رہے ہوں گے یہاں تک کہ فنا ہو جائیں گے۔''

مخالفینِ دعوت کو لاحق خطرات

قریش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوت کے پھیلاؤ اور زور پکڑنے کے نتیجے میں **جو نقصانات** ہوتے نظر آ رہے تھے اور جن چیزوں کا انہیں آئندہ خطرہ تھا ان میں سے دو باتیں اہم تھیں۔

(الف) ان کا خیال تھا کہ پورے عرب میں ان کی بدنامی ہو گئی ہے اور مشہور ہو گیا ہے کہ قریش کا ایک نوجوان ساحر، کاہن اور مجنون ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ باتیں تو خود قریش نے مشہور کی تھیں جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے۔ دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روز بروز پھیلتی دعوت اور زور پکڑتی ہوئی جماعت کے نتیجے میں قریش کو پورے عرب میں ایک طویل عرصے سے حاصل رہنے والی مذہبی سیادت وقیادت کے خاتمے کا خطرہ تھا اور یہ خطرہ بے جا بھی نہ تھا، کیونکہ شرک و بت پرستی پورے عرب میں پھیلی ہوئی تھی اور پورا عرب مذہبی عبادات اور رسوم روایات میں قریش کی اتباع کرتا تھا خصوصاً حج ادا کرنے کے لئے ہر سال عرب کے تمام قبائل قافلوں کی صورت میں مکہ آتے اور قریش کی نگرانی اور سرپرستی میں حج کی رسومات ادا کرتے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ اب اگر توحید کی حامل جماعت روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور اس کی قوت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے تو وہ وقت دور نہیں جب مکہ کی اکثریت اسی دین کو ماننے والی ہو گی تو اس وقت سردارانِ مکہ کا وہ مقام و مرتبہ جو انہیں دینِ ابراہیمی کے پیشوا ہونے کی بنا پر حاصل ہے،

ختم ہو جائے گا اور قبائل عرب کے ہاں ان کی عزت اور شوکت باقی نہ رہے گی، لہٰذا اگر نئی دعوت اور تحریک کو روکا نہ گیا تو ان کی مذہبی سیادت و پیشوائی کا خاتمہ یقینی ہے۔

(ب) قریش سمجھ چکے تھے کہ دن بدن مقبولیت حاصل کرتا گروہ بالآخر ایک مضبوط جماعت کی شکل اختیار کر لے گا، پھر قریش میں دو واضح جماعتیں بن جائیں گی جو مختلف افکار، نظریات، تہذیب وثقافت اور نظامِ حیات کی حامل ہوں گی جن کے مابین تصادم ناگزیر ہے کیونکہ ہر جماعت اپنے افکار ونظریات اور نظامِ حیات کو نافذ اور غالب کرنے کی کوشش کرے گی تو جنگ کی نوبت آجائے گی، اگر ایسا ہوتا ہے تو قریش آپس میں ہی لڑ مر کر ختم ہو جائیں گے، لہٰذا اس نئی دعوت اور تحریک کا سدباب کرنا ضروری ہے۔

قریش کا یہ خدشہ درست ثابت ہوا۔ تاریخ شاہد ہے کہ آسمان نے میدانِ بدر میں وہ منظر بھی دیکھا جب بھائی بھائی کے سامنے، باپ بیٹے کے سامنے، بھتیجا چچا کے سامنے، ماموں بھانجے کے سامنے، داماد سسر کے سامنے الغرض عزیز و اقارب ایک دوسرے کے سامنے نہ صرف صف آراء تھے بلکہ انہوں نے ایک دوسرے کا خون بھی بہایا، قریش کے ستر آدمی جن میں چوٹی کے سردار بھی شامل تھے، مارے گئے اور انتہائی ذلت و رسوائی کے ساتھ ایک کنویں میں پھینک دیے گئے۔ دراصل بوسیدہ و فاسد افکار و نظریات اور نظامِ حیات کے حامل طبقات میں سے دور اندیش افراد دور کی کوڑی لاتے ہیں اور وہ دعوت و تحریک کے مقصد اور انجام کو سمجھ چکے ہوتے ہیں، اس لیے دعوت و تحریک کی کامیابی کی صورت میں انہیں اپنا سارا نظام منہدم ہوتا نظر آ رہا ہوتا ہے، اس لئے شروع دن سے لے کر انجام کار تک وہ اس نظام کو بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں لیکن اس فاسد نظام نے ختم ہونا ہوتا ہے اور صالح نظام کا قائم ہونا ناگزیر ہوتا ہے اس لئے انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

پیشکشیں

اپنے مسائل اور پریشانیوں کا ذکر کرنے کے بعد عتبہ بن ربیعہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کش کرتے ہوئے کہا:

یا ابن أخي، ان كانت انما تريد بما جئت به من هذا الأمر مالا جمعنا لک من أموالنا حتى تكون أكثرنا مالا، و إن كنت تريد به شرفاً سودناک علينا، حتى لا نقطع أمرا دونک، و إن كنت تريد به ملكا ملكناک علينا، و إن كان هذا الذى

یأتیک رئیاً تراه لا تستطیع رده عنه نفسک طلبنا لک الطب، وبذلنا فیه أموالنا حتی نبرئک منه فإنه ربما غلب التابع علی الرجل حتی یداوی منه.

(السیرۃ لابن ھشام ج ۱، ص ۱۸۵)

''اے بھتیجے! اس امر (دعوت) سے تمہارا مقصود مال کا حصول ہے تو ہم تمہارے لئے اس قدر مال و دولت جمع کر دیں گے کہ تم ہم میں سے سب سے زیادہ مالدار بن جاؤ گے، اگر تمہیں مقام و مرتبہ کی خواہش ہے تو ہم تمہیں اپنا سردار بنانے کیلئے تیار ہیں یہاں تک کہ تمہارے بغیر ہم کوئی کام نہ کریں گے، اگر تمہیں بادشاہ بننے کی آرزو ہے تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنالیں گے اور اگر (یہ تمام باتیں نہیں) بلکہ اگر کوئی جن بھوت آ گیا ہے اور تم اس کا سدباب نہیں کر سکتے تو ہم طبیب بلواتے ہیں اور تمہارے شفایاب ہونے تک ہم ہی خرچہ برداشت کرتے رہیں گے کیونکہ بسا اوقات جن بھوت آدمی پر غالب آ جاتا ہے تا آنکہ اس کا علاج معالجہ کرایا جائے۔''

زن، زر اور زمین کا جال

ابن ابی شیبہؒ نے عتبہ بن ربیعہ کے یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں:

إن کان إنما بک الباءۃ فاختر أی نساء قریش و نزوجک عشرا

(مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۴، ص ۲۹۶)

''اگر تمہیں جنسی خواہش (نے ستایا) ہے تو قریش کی جس عورت کو بھی منتخب کریں اس سے تمہاری شادی کروادی جائے گی بلکہ ہم تمہاری دس عورتوں سے بھی شادی کروا سکتے ہیں۔''

کسی بھی انقلابی دعوت اور تحریک کے مخالفین کا یہ وطیرہ ہوتا ہے کہ پہلے تو وہ اسے دبانے کے لئے ہر حربہ استعمال کرتے ہیں لیکن جب ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ مختلف چیزوں کا لالچ دے کر رام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مال و دولت کی پیش کش کی جاتی ہے، اختیار واقتدار اور عہدے اور مناصب پیش کئے جاتے ہیں، نیز جنسی خواہش کی تکمیل کا بہتر بندوبست کرنے کا بھی وعدہ کیا جاتا ہے بالفاظِ دیگر زن، زر اور زمین جس کے ذریعے عام طور پر انسان کو اپنے جال میں پھنسایا جاتا ہے یہ جال بھی داعی پر پھینک کر اسے شکار کرنے کی پوری پوری کوشش کی جاتی ہے لیکن اپنی دعوت اور افکار ونظریات کے ساتھ سچے اور وفادار داعی ان چیزوں پر نظرِ التفات بھی نہیں ڈالتا بلکہ وہ تمام پیشکشوں کو پائے حقارت سے ٹھکراتے ہوئے لوگوں کے سامنے اپنی دعوت، افکار ونظریات

اور مقصد پیش کرتا ہے۔

مخالفین کی بات بھی سنی جائے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوالولید کی گفتگو سنتے رہے جب وہ خاموش ہوا تو آپ نے پوچھا:

أقد فرغت يا أبا الوليد؟(السيرة لابن هشام ج ١ ،ص ١٨٦)

''اے ابوالولید! کیا تم اپنی بات سے فارغ ہو چکے؟''

ابوالولید اپنی بات سے فارغ ہو چکا ہو تو اب آپ نے اپنی دعوت شروع کرتے ہوئے فرمایا

''فاسمع منى ''(اب میری بات سنو)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ فریقِ مخالف کی بات بغور سنی جائے، جب وہ اپنی بات مکمل کر چکے تو پھر اپنی بات شروع کی جائے تاکہ داعئ حق کے بارے میں کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ یہ اپنی ہی بات کرتے رہتے ہیں، ان میں تحمل و برداشت ہے اور نہ دوسرے کا موقف سنتے ہیں۔ جب داعی دوسرے فریق کی بات بغور سن کر اس کا رد کرے گا اور اپنی دعوت پیش کرے گا تو اس کے مثبت اثرات پڑیں گے اور مخاطب اس پر غور وفکر کر سکے گا۔ الغرض آپ نے ابوالولید کے سامنے درج ذیل آیات پڑھیں:

حٰمٓ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ. (فصلت: ١،٥)

''حٰمٓ (یہ کتاب خدائے) رحمان و رحیم (کی طرف سے) اتری ہے۔ ایسی کتاب جس کی آیتیں واضح (المعانی) ہیں یعنی قرآن عربی لوگوں کے لیے جو سمجھ رکھتے ہیں، جو بشارت بھی سناتا ہے اور خوف بھی دلاتا ہے، لیکن ان میں سے اکثروں نے منہ پھیر لیا اور وہ سنتے ہی نہیں اور کہتے ہیں کہ جس چیز کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو اس سو ہمارے دل پردوں میں ہیں۔''

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگلی آیات پڑھتے چلے گئے جبکہ ابوالولید کی حالت یہ تھی:

''جب اس نے آیات سنیں تو خاموش ہو گیا، ہاتھ پشت کے پیچھے کر لئے اور ان پر ٹیک لے کر آپ کی تلاوت سنتا رہا۔''

جب آپ آیت سجدہ پر پہنچے تو سجدہ کیا اور ابوالولید سے فرمایا ''اے ابوالولید! تم نے جو سننا تھا سن لیا، اب آگے تم جانو اور تمہارا کام۔'' (السیرۃ لابن ہشام ج ١، ص ١٨٦، ایضاً دلائل النبوۃ ج ٢، ص ٢٠٤، ٢٠٥)

عتبہ بن ربیعہ نے واپسی پر قریش کو کارگزاری پیش کرتے ہوئے کہا "بخدا! میں نے ایسا کلام سنا ہے جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں سنا، وہ نہ تو شاعری ہے، نہ جادو ہے اور نہ کہانت ہے"۔ پھر انہیں تجویز دیتے ہوئے کہا کہ اے گروہِ قریش! میری بات مانو اور اس معاملے کو مجھ پر چھوڑ دو، اس آدمی کو اس کے حال پر چھوڑ دو، اس کے راستے میں حائل نہ ہو اور اس سے الگ تھلگ ہو جاؤ:

فواللہ لیکونن لقولہ الذی سمعت منہ بناء عظیم فان تصبہ العرب فقد کفیتموہ بغیرکم وان یظھر علی العرب فملکہ ملککم وعزہ عزکم وکنتم اسعدالناس. (السیرۃ للابن ھشام ج ۱ ص ۱۸۶)

"خدا کی قسم! میں نے اس سے جو بات سنی ہے یہ ایک بہت بڑی خبر بن کر سامنے آنے والی ہے (کوئی بڑا واقعہ رونما ہوگا) اگر عرب نے اسے ختم کر دیا تو تمہارا کام دوسروں کے ذریعے پورا ہو جائے گا (اور تمہیں اس میں الجھنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی) اور اگر وہ عرب پر غالب آ گیا تو اس کی بادشاہت وحکومت تمہاری بادشاہت وحکومت ہوگی اور اس کی عزت تمہاری عزت (کا باعث بنے گی) اور اس کی بدولت تم سب سے زیادہ سعادت مند ہو گے۔"

قریش نے عتبہ کی تجویز رد کرتے ہوئے کہا کہ تمہارے اوپر اس کی زبان کا جادو چل گیا ہے۔ اس پر عتبہ نے کہا "اس آدمی کے بارمیں میری تو یہی رائے ہے، باقی تمہیں جو سمجھ آئے کرو۔"

اب یہ دعوت وتحریک رکنے والی نہیں

قریش کے سن رسیدہ، ذہین ترین، تجربہ کار اور جہاندیدہ شخصیات کی مذکورہ بالا کارگزاری اور قریش کو دی جانے والی تجویز سے دو چیزیں روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہیں:

(الف) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھیلتی ہوئی دعوت اور زور پکڑتی ہوئی تحریک کا سدباب کرنا اور اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنا اور اسے بزور روکنا قریش کے بس سے باہر ہو گیا اور انہیں اسی بات کا یقین ہو چلا تھا کہ اب یہ دعوت وتحریک رکنے والی نہیں۔

(ب) عتبہ بن ربیعہ جیسے افراد اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ یہ دعوت زور پکڑے گی اور بالآخر پورا عرب اس کے مقابلے میں آ کھڑا ہوگا تب پتہ چلے گا کہ کون فاتح اور کون مفتوح اور کون غالب اور کون مغلوب ہوتا ہے۔ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے اصحاب مغلوب ومقتول ہوتے ہیں تو قریش کی اس "مصیبت" سے جان چھوٹ جائے گی اور انہیں اپنے جگر گوشوں کو تہ تیغ کرنے

کا داغ نہ اٹھانا پڑے گا اور اگر وہ غالب ہوتے ہیں اور ان کی بادشاہت وحکومت قائم ہو جاتی ہے تو یہ کون سا گھاٹے کا سودا ہے بلکہ یہ تو ان کا اقتدار، عزت اور خوش بختی ہوگی۔

عتبہ بن ربیعہ کی دوسری بات سچ ثابت ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ فتح کر کے پورے عرب پر غلبہ حاصل کر لیا اور قریش کو پورے عرب بلکہ پوری دنیا میں تب سے لے کر آج تک جو عزت وعظمت حاصل ہے وہ آج تک کسی دوسرے قبیلے کے حصے میں نہیں آئی۔ قریش نے عتبہ بن ربیعہ کی تجویز قبول نہ کی اور اسلام اور اہلِ اسلام کے خلاف ظلم وستم اور سازشوں کا سلسلہ جاری رکھا جبکہ ابن اسحاق کے مطابق صورت یہ تھی:

ثـم ان الاسـلام جـعـل يـنـشـر ويـزيـد فـي قـبـائـل قـريـش فـي الـرجـال والـنـسـاء وقـريـش تحبس من قدرت علىٰ حبسه وتفتن من استطاعت فتنته من المسلمين.

(السيرة لابن هشام ج ۱ ص ۱۸۷)

''پھر اسلام قریش کے قبیلوں کے مردوں اور عورتوں میں مزید پھیلنے بڑھنے لگا جبکہ قریش مسلمانوں میں جسے قید کر سکتے تھے اسے قید کر لیتے اور جسے فتنے میں مبتلا کرنے پر قادر ہوتے تو اسے فتنے میں مبتلا کر دیتے تھے''۔

مفاہمت کی ایک اور کوشش

اس صورت حال سے پریشان ہو کر قریش کے تمام بڑے سردار جن میں عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوسفیان بن حرب، نضر بن حارث، ابوالبختری بن ہشام، اسود بن المطلب، زمعہ بن الاسود، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، ابوجہل بن ھشام اور دیگر شامل تھے، جمع ہوئے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دوبارہ مذاکرات کرنے پر اتفاق کیا، چنانچہ مغرب کے وقت مسجد حرام میں جمع ہوئے اور ایک آدمی آپ کو بلانے کے لئے بھیجا۔ اس نے آکر آپ کو پیغام پہنچایا تو آپ بلا تاخیر چل دیے، ابن ہشام لکھتے ہیں:

فـجـاء هـم رسـول الـلـه صـلـى الـلـه عـلـيـه وسلم سريعاً وهو يظن ان قد بدالهم فيما كلمهم فيه بداء وكان عليهم حريصاً يحب رشدهم ويعز عليه عنتهم.

(السيرة لابن هشام ج ۱ ص ۱۸۷)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی جلدی ان کے پاس آئے، آپ سمجھے کہ آپ نے ان سے

جو بات کی تھی شاید انہیں سمجھ آ گئی ہے (آپ جلدی جلدی اس لئے آئے) کیونکہ آپ اس بات پر حریص تھے اور چاہتے تھے کہ وہ راہِ راست پر آ جائیں اور اس کے لئے از راہِ شفقت اپنے آپ کو دشواری میں ڈالتے تھے۔''

دعوت کی تڑپ

اس سے یہ معلوم ہوا کہ داعی کے اندر دوسروں کو راہِ راست پر لانے اور اپنے افکار ونظریات کا قائل کرنے کے لئے جدوجہد کرنے کا زبردست جذبہ ہونا چاہئے۔ اس کے اندر اس بات کی تڑپ ہو کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس راستے پر لایا جائے اور انہیں دنیا وآخرت کے برے اور انتہائی بھیانک انجام سے بچایا جائے، لہٰذا جب، جہاں اور جس وقت بھی اسے لوگوں کے دعوت کی طرف مائل ہونے اور دعوت قبول کرنے کی امید پیدا ہو تو وہ بلا تاخیر دعوت کی اشاعت ومقبولیت کے لئے سرگرم ہو جائے اور ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے پاس بیٹھے تو انہوں نے حسب سابق آپ کی دعوت پر تنقید کی اور اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''تم نے ہماری اجتماعیت ختم کر دی ہے، ہمارے دین میں عیب چینی کی ہے، ہمارے آباء واجداد جو اس دین کے حامل تھے انہیں برا بھلا کہا ہے، الغرض جو بات تم نے پیش کی ہے اس سے بڑھ کر کوئی قبیح چیز نہ ہوگی۔''

اتنا کہنے کے بعد آپ کے سامنے انہیں چیزوں کی پیشکش کی جو وہ عتبہ بن ربیعہ کے ذریعے پہلے بھی کر چکے تھے، آپ نے ان کے جواب میں فرمایا:

مابی ماتقولون ما جئتكم بماجئتكم به اطلب اموالكم ولاالشرف فيكم ولاالملك عليكم ولكن الله بعثنى اليكم رسولا وانزل على كتابا وأمرنى ان اكون لكم بشيراً ونذيراً فبلغتكم رسالات ربى ونصحت لكم فان تقبلوا منى ماجئتكم به فهو حظكم فى الدنيا والآخرة وان تردوه على أصبر لأمرالله حتى يحكم الله بينى وبينكم أو كما قال صلى الله عليه وسلم .(السيرة لابن هشام ج ا ص١٨٧،١٨٨)

''جو کچھ باتیں تم کہہ رہے ہو، یہ میرا مقصد نہیں ہے، میں جو بات آپ کے پاس لایا ہوں میرا مقصد اس کے ذریعے تم سے مال، شرف ومنزلت اور بادشاہت کا مطالبہ کرنا نہیں ہے بلکہ مجھے تو اللہ نے تمہارے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے، مجھ پر کتاب نازل فرمائی ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں

(اس دعوت کو قبول کرنے کی صورت میں اچھے انجام اور جنت میں دخول کی) خوشخبری سناؤ اور (قبول نہ کرنے کی صورت میں برے انجام اور جہنم میں جانے سے) خبردار کروں۔ سو میں نے اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور تمہیں نصیحت کر چکا ہوں۔ اگر تم اسے قبول کرلو گے تو دنیا اور آخرت میں تمہارا حصہ اور نیک بختی ہوگی اور اگر اسے رد کر دیا تو میں اللہ کے حکم پر ثابت قدم رہوں گا یہاں تک اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کر دیں۔''

مذکورہ ارشادِ نبوی سے درج ذیل اہم امور معلوم ہوتے ہیں:

ا۔ آپ کی دعوت کا مقصد کیا ہے اور کون سے امور مقصد میں شامل نہیں۔ آپ نے واضح کیا کہ آپ کوئی (نوذ باللہ) خود ساختہ مفکر اور فلسفی نہیں بلکہ اللہ کے منتخب کردہ رسول ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے کتاب ہدایت دے کر بھیجا ہے، لہٰذا آپ کی دعوت کا مقصد لوگوں کو مروج باطل افکار ونظریات اور فاسد نظام اور معاشرت سے نکال کر اس کتابِ ہدایت میں بیان کردہ افکار ونظریات، اصول وضوابط اور نظامِ زندگی کی طرف لانا ہے تاکہ وہ انہی قوانین اور اصولوں کے مطابق نظام اور معاشرہ تشکیل دیں۔ یہی آپ کی دعوت کا بنیادی اور اہم مقصد ہے جبکہ باقی اموراس کے ذیل میں آتے ہیں۔ باقی رہا مال ودولت، شرف ومنزلت اور بادشاہت، ان کا حصول آپ کی نبوت ورسالت کا مقصد ہے اور نہ آپ اس کے لئے مبعوث کیے گئے ہیں۔ یاد رہے کہ اختیار واقتدار اسلام کا مقصود نہیں ہے لیکن چونکہ اختیار واقتدار کے بغیر کوئی بھی نظام نافذ نہیں ہوسکتا ہے اس لئے اسلام کے نفاذ، اس کی اشاعت اور غلبے کے لئے اقتدار وحکومت ناگزیر ہے، اس کے بغیر چارہ کار نہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ جب آپ کو بادشاہت کی پیشکش کی جارہی تھی تو آپ اسے قبول کر کے حکومت کے ذریعے بآسانی اپنے افکار ونظریات کی اشاعت اور قوانین شریعت کا نفاذ کر سکتے تھے اور یہ بہت ہی آسان صورت تھی تو آپ نے اسے کیوں قبول نہیں کیا؟

اس کا جواب یہ ہے

(الف) آپ کو یہ پیشکش مشروط کی جارہی تھی اور یہ شرط آپ کے مقصد اور بنیادی افکار ونظریات سے متصادم تھی اور انقلابی ایسا اقتدار اور حکومت کبھی قبول نہیں کرتا جو اس کے بنیادی افکار ونظریات سے ٹکرانے والی شرائط کے ساتھ مشروط ہو، کیونکہ ایسی پیشکش قبول کرنا اپنے افکار ونظریات کی نفی کرنے بالفاظ دیگر انہیں لات مارنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا داعی کبھی بھی اس طرح کے اقتدار

اور حکومت کو قبول نہ کرتا ہے اور نہ اس میں شمولیت اختیار کرتا ہے۔ اس کی دعوت، اس کے افکار ونظریات اور اس کا فلسفہ آزاد ہے اس لئے وہ خود بھی آزاد ہے لہٰذا وہ مشروط اور ''محکوم حکومت'' نہیں چاہتا اور نہ اس کا حصہ بننا گوارا کرتا ہے۔

(ب) کسی بھی دعوت اور تحریک کے لئے اقتدار میں آنا اور حکومت سنبھالنے کا ایک وقت ہوتا ہے۔ اس سے پہلے نہ تو وہ اقتدار وحکومت سنبھالنے اور اسے بہتر انداز میں چلانے کی صلاحیت رکھتی ہے اور نہ اس کے لئے ایسا کرنا مفید ہوتا ہے بلکہ نقصان کا باعث ہوتا ہے، کیونکہ جب اربابِ تحریک اقتدار وحکومت سنبھالنے کے بعد اسے چلانے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو لوگوں میں یہ تاثر پختہ ہو جاتا ہے کہ ان کے انقلاب لانے، نظام نافذ کرنے اور اسے کامیاب طریقے سے چلانے کے دعوے کھوکھلے تھے جن کی کوئی حقیقت نہ تھی، لہٰذا وہ ہمیشہ کے لئے ناامید اور مایوس ہو جاتے ہیں، اس لئے جب تک دعوت اور تحریک زوردار دعوت، تعلیم وتربیت اور حکومت پر قابض ہو کر اسے چلانے کے لئے بھرپور تیاری کرنے کے مراحل سے نہیں گذر جاتی تب تک اس کے لئے حکومت پر قابض ہونا موزوں نہیں ہوتا، لہٰذا اگر ان مراحل سے گزرنے میں کچھ زیادہ وقت بھی لگ جائے تو اسے صبر وتحمل کے ساتھ برداشت کیا جائے، بھرپور طریقے سے تیاری جاری رکھی جائے، جب تحریک کی مرکزی قیادت یہ سمجھے کہ وہ حکومت پر قابض ہونے اور اسے چلانے کی اہلیت حاصل کر چکے ہیں تو توکل علی اللہ کرتے ہوئے اس مرحلے میں داخل ہوا جائے۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیثیت اور منصب کو بھی واضح کر دیا کہ وہ تو نذیر اور بشیر ہیں، لوگوں پر خیر وشر واضح کر دینا اور اللہ تعالیٰ کے احکامات ان تک پہنچا دینا ان کی ذمہ داری ہے جو وہ پوری کر رہے ہیں، انہیں قبول کرنا یا رد کرنا مخاطب کا کام ہے، لہٰذا داعی کو چاہئے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو کما حقہ ادا کرنے کی کوشش کرتا رہے، اس میں سستی وکاہلی کا مظاہرہ نہ کرے، باقی رہا لوگوں کا قبول کرنے یا نہ کرنے کا معاملہ تو یہ ان پر چھوڑ دے، کیونکہ داعی اپنا فریضہ ادا کر چکا ہے۔

۳۔ آپ نے واضح فرما دیا کہ اگر قریش کے سردار آپ کی دعوت مسترد کرتے ہیں تو آپ ثابت قدمی کے ساتھ اسے جاری رکھیں گے تا آنکہ اللہ تعالیٰ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا ئیں، لہٰذا داعی کو چاہئے کہ وہ بااثر افراد وشخصیات کی طرف سے دعوت کو مسترد کیے جانے کے باوجود اسے جاری رکھے، آخری سانس تک تسلسل کے ساتھ اسی جدوجہد میں لگا رہے، پھر وہ وقت بھی آئے گا جب یہ

دعوت کامیابی حاصل کرے گی اور اللہ کا دین غالب ہوگا اور باطل افکار ونظریات اور مخالفین مغلوب ہوں گے۔

الغرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا جواب پر قریش نے آپ سے کہا کہ''اگر تم ہماری یہ باتیں قبول نہیں کرتے تو ایک کام کرو تم جانتے ہو کہ ہمارا شہر کس قدر تنگ ہے اور معیشت کی ہم لوگوں کو کیسی کمی ہے، جس خدا نے تم کو رسول بنا کر بھیجا ہے اُس سے سوال کرو کہ اطراف شہر کے پہاڑوں کو یہاں سے ہٹادے تا کہ ہمارا شہر وسیع ہوجائے اور شام وعراق کی طرح اس میں نہریں جاری کردے،اور ہم میں بعض گزشتہ لوگوں کو بھیجے جس میں قصی بن کلاب ضرور ہوں۔تا کہ ہم اُن سے دریافت کریں کہ تمہاری باتیں حق ہیں یا نہیں اگر انہوں نے تمہاری تصدیق کردی اور تمہاری دعاء کی وجہ سے خدا نے یہ کردیا جو ہم نے سوال کیا ہے تو ہم لوگ تمہاری تصدیق کریں گے اور ہمیں یہ بھی معلوم ہوجائیگا کہ خدا کے نزدیک تمہارا بڑا درجہ ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ''یہ میرا کام نہیں ہے، میں جس لیے بھیجا گیا ہوں وہ میں نے تم کو پہنچا دیا ہے اگر قبول کرو تو دین ودنیا میں تمہارا ہی فائدہ ہے نہ قبول کرو تو صبر کروں گا حتی کہ اللہ تعالی ہمارا تمہارا فیصلہ کرے۔''

قریش نے کہا کہ''اچھا اگر تم ہمارے لئے دعا نہیں کرتے تو کم از کم یہ دعاء کرو کہ تمہارا خدا تم کو بڑے بڑے باغات اور بڑے بڑے محل دے۔سونا اور چاندی کا بہت سا خزانہ دیکر تم کو بڑا دولتمند بنادے تا کہ ہم تمہاری فضیلت سے واقف ہوں!ابھی تو تم ہماری طرح بازاروں میں جاتے ہو۔ہماری طرح معاش کی تلاش کرتے ہو۔پھر ہم کیسے سمجھ لیں کہ تم اللہ کے بھیجے ہوئے رسول ہو جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے۔''

انکار پر غم وافسوس

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کی مجلس سے اٹھ کر چل پڑے تو عبداللہ بن امیہ بن مغیرہ جو آپ کی پھوپھی عاتکہ بنت عبدالمطلب کا بیٹا تھا آپ کے ساتھ ساتھ چل پڑا اور کہنے لگا کہ''قریش نے جتنی باتیں پیش کی ہیں تم نے ایک کو بھی قبول نہیں کیا۔میں تم پر کبھی ایمان نہ لاؤں گا حتی کہ اگر تم سیڑھی کے ذریعے آسمان پر میرے سامنے چڑھ جاؤ، پھر چار فرشتے بھی تمہارے ساتھ آئیں اور تمہاری حقانیت وصداقت کی تصدیق کریں تو تب بھی میں ایمان نہ لاؤں گا''یہ کہہ کر وہ چل دیا، پھر آپ گھر کی طرف

روانہ ہو گئے، اس وقت آپ کی حالت یہ تھی:

وانصرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی اھلہ حزیناً آسفاً لمافاتہ مماکان یطمع بہ من قومہ حین دعوہ ولمارای من مباعدتھم ایاہ. (السیرۃ لابن ھشام ج ا ص ۱۸۹)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں گھر لوٹے کہ آپ غمگین تھے اور قوم کے بلانے پر آپ کو ان سے امید جو پیدا ہوئی تھی، اس کے ختم ہونے اور ان کے آپ سے مزید دور ہونے پر آپ کو افسوس تھا۔''

جب داعی کو مخالفین کی طرف سے بات چیت کی دعوت ملے تو اسے یہ امید اور توقع ہو جاتی ہے کہ شاید انہیں دعوت سمجھ آ گئی ہے یا وہ اشکالات پیش کر کے ان کی تشفی چاہتے ہیں تو اس طرح شاید یہ بات چیت ان کی ہدایت کا ذریعہ بن جائے لیکن جب وہ بات چیت کرنے کے بعد دیکھتا ہے کہ یہ تو اپنی پرانی باتوں اور باطل موقف پر اڑے ہوئے ہیں بلکہ مزید بے ہودہ مطالبات پیش کر رہے ہیں جن کا مقصد تحقیق حال نہیں بلکہ امتحان ہے تو اسے اس صورت حال کی وجہ سے غم اور افسوس ہوتا ہے، اسی طرح بعض اوقات داعی دعوت کے سلسلے میں جاتا ہے اور بظاہر بڑے سمجھدار، ذہین اور باصلاحیت لوگوں سے مخاطب ہونے جا رہا ہوتا ہے اور اسے قوی امید ہوتی ہے کہ اس کی بات بغور سنی جائے گی اور مخاطبین اس پر لبیک کہتے ہوئے میدان عمل میں کود پڑیں گے لیکن جب وہ گفتگو کرنے کے بعد دیکھتا ہے کہ مخاطبین تو ٹس سے مس بھی نہیں ہوئے یا متاثر ہوئے ہیں اور تحسین بھی کی ہے لیکن عمل وحرکت کے لئے تیار نہیں تو اسے غم وافسوس ہوتا ہے اور یہ چیز طبعی اور فطری ہے لیکن جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ اس داعی کا یہ فریضہ ہے کہ وہ دوبارہ اٹھے اور اشاعتِ دعوت میں مشغول ہو جائے۔

دعوت دلائل وحقائق کی بنیاد پر قبول کی جائے

مشرکین کے مطالبات تسلیم نہ کیے جانے میں جو حکمت الٰہیہ ہے، اس سے متعلق علامہ سہیلی لکھتے ہیں:

وذکر ماسألہ قومہ من الآیات وازالۃ الجبال عنھم وانزال الملئکۃ علیہ وغیر ذلک جھلاً منھم بحکمۃ اللّٰہ تعالیٰ فی امتحانہ الخلق وتعبدھم بتصدیق الرسل وأن یکون ایمانھم عن نظر وفکر فی الادلۃ فیقع الثواب علیٰ حسب ذٰلک.

(الروض الانف ج ا ص ۱۸۶، ۱۸۷)

''آپ کی قوم نے آپ سے نشانیاں دکھانے، پہاڑوں کوان کی جگہ سے ہٹانے،فرشتوں کواتارنے وغیرھا جیسے جومطالبات کیے تھے یہ دراصل ان کا اللہ تعالیٰ کی حکمت سے جہالت کی وجہ سے تھا، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا امتحان لینا چاہتے ہیں اور یہ کہ وہ رسولوں کی تصدیق کرتے ہیں یا نہیں، نیز اللہ تعالی چاہتے ہیں کہ لوگ دلائل میں غور وفکر کر کے ایمان لائیں اور اسی بنیاد پر انہیں ثواب ملے۔''

کسی بھی دعوت،فکر اور نظریے کو دلائل اور حقائق کی بنیاد پر قبول کیا جائے تو وہ مفید اور کارآمد ہوتا ہے۔ دلائل وحقائق کے ساتھ بصیرت حاصل ہوتی ہے جس کے بعد آدمی اسے قبول کر کے اس پر ڈٹ جاتا ہے، پھر مسائل ومشکلات اور مخالفین کے جبر وتشدد کے باوجود وہ ان افکار ونظریات کونہیں چھوڑتا، اس کے برعکس جو آدمی غور وفکر کیے بغیر دعوت قبول کر لیتا ہے تو وہ ثابت قدم نہیں رہتا خصوصاً آزمائش کے وقت اس کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں اور وہ ادھر ادھر بھٹک جاتا ہے۔

ابن کثیر لکھتے ہیں:

وھذاالمجلس الذی اجتمع علیه ھؤلاء الملأ مجلس ظلم وعدوان وعناد ولھذا اقتضت الحکمة الالھیة والرحمة الربانیة ألاّیجابوا الیٰ ماسألوا الان الله علم انھم لایؤمنون بذلک فیعاجلھم بالعذاب. (السیرة لابن کثیر ج ا ص ۴۸۲)

''سردارانِ قریش کی یہ مجلس ظلم وعناد پرمبنی تھی، اس لیے حکمتِ الٰہیہ اور رحمت ربانیہ کا تقاضا یہ تھا کہ ان کے مطالبات تسلیم نہ کیے جائیں اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم میں تھا کہ وہ ایمان نہ لائیں گے تو نتیجتاً انہیں عذاب میں مبتلا کرنا پڑے گا۔''

ہجرت

دعوتِ حق کو قبول کرنے والے پر اس قدر مصائب آتے ہیں کہ اسے انفرادی طور پر عبادات اور احکاماتِ الٰہیہ پر عمل پیرا ہونے پر تکالیف دی جاتی ہیں، دعوت وتبلیغ کی اجازت دی جاتی ہے اور نہ اپنے عقائد وافکار کا کھلم کھلا اظہار کرنے دیا جاتا ہے، الغرض داعی کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے، زمین ان پر تنگ کر دی جاتی ہے اور ان کے لئے اپنے شہر اور ملک میں جینا محال ہو جاتا ہے تو اس وقت انہیں ہجرت کرنا پڑتی ہے۔ جب مسلمان کثیر تعداد میں ہوگئے اور اسلام کا کھلم کھلا ظہور ہو گیا تو قریش نے اپنے اپنے قبیلے کے مسلمانوں کو تشدد کا نشانہ بنایا، انہیں سخت ایذائیں پہنچائیں تاکہ وہ اپنے دین سے پھر جائیں۔

حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے ابن اثیر لکھتے ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو آزمائش میں دیکھا اور یہ کہ وہ خود تو اللہ تعالیٰ کے ہاں مقام ومرتبہ اور اپنے چچا ابو طالب کی حمایت کی وجہ سے (ایک حد تک) عافیت میں ہیں لیکن اپنے اصحاب کا دفاع کرنے پر قدرت نہیں رکھتے تو آپ نے انہیں ہجرت کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا:

لو خرجتم الی أرض الحبشة فان فیها ملکا لایظلم أحد عنده حتي یجعل الله لکم فرجا و مخرجا مما أنتم فیه. فخرج المسلمون الی أرض الحبشة مخافة الفتنة وفرارا الی الله بدینهم.(الکامل لابن اثیر ج ۲ ص ۵۱)

:''اگر تم حبشہ کی طرف نکل جاؤ (تو بہتر رہے گا) اس لئے کہ وہاں ایسے بادشاہ کی حکومت ہے کہ جہاں کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا، (وہاں رہو) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اس مصیبت سے نکالنے کے لئے راستہ نکالیں اور آسانی فرمائیں۔''

چنانچہ مسلمان فتنے سے بچنے اور دین کے تحفظ کے لئے ملکِ حبشہ چلے گئے۔اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ وقت ضرور آئے گا جب موجودہ مشکلات کم اور بالآخر ختم ہو جائیں گے اور ہجرت کرنے والے حضرات دوبارہ جمع ہوں گے، چنانچہ آپ کا یہ ارشاد سچ ثابت ہوا اور یہ مہاجرین مدنی دور میں فتوحات کے دوران حبشہ سے لوٹے لہٰذا داعی کو چاہیے کہ وہ وقتی اور عارضی مشکلات اور ہجرت سے نہ گھبرائے بلکہ اس بات پر یقین رکھے کہ یہ مشکلات ضرور ختم ہوں گی اور وہ اپنے علاقے میں جا کر اللہ کے دین کو سر بلند کر سکیں گے۔

فلسفہءہجرت

علامہ سہیلی حبشہ کی طرف کی جانے والی ہجرت پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کا فلسفہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اس واقعے میں وطن سے نکلنے کا مسئلہ معلوم ہوتا ہے اگر چہ وہ وطن مکہ جیسا فضیلت والا شہر ہی کیوں نہ ہو، یہ اس وقت ہے جب نکلنے کا مقصد دین کا تحفظ ہو، اگر چہ اہل اسلام کی طرف نہ جایا جائے کیونکہ اہل حبشہ نصاریٰ (عیسائی) تھے مسیح علیہ السلام کی عبادت کرتے اور انہیں اللہ کا بندہ تسلیم نہ کرتے تھے، دیکھئے! کہ اللہ نے کس طرح (قرآن میں ''اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ'' کے الفاظ کے ساتھ) اس ہجرت کی وجہ سے ان کی تعریف وتوصیف بیان فرمائی ہے

حالانکہ وہ بیت اللہ سے نکل کر دارِ کفر کی طرف گئے تھے، یہ (تعریف وتوصیف) اس لئے کہ انہوں نے اپنے دین کو تحفظ دینا چاہا اور انہیں اس بات کی امید تھی کہ رب العزت کی عبادت کرنے میں حائل رکاوٹ ختم ہو جائے گی اور وہ اطمینان سے اس کا ذکر کر سکیں گے، یہ حکم ہمیشہ باقی رہنے والا ہے جب کبھی بھی منکر کسی علاقے میں غالب آ جائے اور اہل ایمان کو حق پر قائم رہنے کی وجہ سے ایذائیں پہنچائی جائیں، باطل حق کے خلاف سخت گیر ہو جائے، (ہجرت کرنے کی صورت میں) اس بات کی امید ہو کہ دوسرے علاقے میں چاہے وہ کوئی بھی علاقہ ہو، ان کے دین میں حائل رکاوٹ ختم ہو جائے گی اور رب کی عبادت کا اظہار کیا جا سکے گا، پس اس وقت اہل ایمان پر ہجرت لازم ہو جاتی ہے اور اس طرح کی ہجرت کا حکم باقی رہے گا یہ تا قیامت ختم ہونے والی نہیں'' (الروض الانف ج۱،ص ۲۱۳)

یعنی اگر داعی کے لئے ایسے حالات پیدا کر دیے جائیں کہ اس کے لئے اپنے علاقے اور قوم میں رہنا مشکل اور جینا دوبھر ہو جائے تو اسے ایک ایسے علاقے کی طرف چلے جانے کی اجازت ہے جہاں اسے اپنے افکار ونظریات اور اعمال وعبادات پر کاربند رہنے کی آزادی ہو۔ اسی طرح اگر داعی کو کسی علاقے میں اس قدر رکاوٹوں اور مشکلات کا سامنا ہے جن کا مقابلہ کرنا انتہائی مشکل ہے تو اسے چاہئے کہ وہ فی الحال ایسے علاقے میں چلا جائے جہاں مشکلات کم اور دعوت کی اشاعت کے مواقع زیادہ ہوں، جب اس علاقے میں دعوت کی ایک حد تک اشاعت ہو چکی ہوگی اور اس کا ایک حلقۂ اثر بن چکا ہوگا تو پھر دوبارہ انہی علاقوں میں واپس آ کر دعوت کی اشاعت کے لئے جدوجہد کرنا آسان ہوگا، لیکن اگر اپنے علاقے اور ملک میں ایسی مشکلات نہیں ہیں اور کام کرنے کے مواقع موجود ہیں تو اپنے علاقے اور ملک میں ہی رہ کر کام کرنے کو ترجیح دینی چاہیے اور دیگر علاقوں اور ممالک کی طرف ہجرت نہ کرنی چاہیے کیونکہ داعی کا بنیادی فریضہ اپنے علاقے اور ملک میں تبدیلی اور انقلاب لانا ہے، اس لیے کہ یہ فریضہ الاقرب فالاقرب کی ترتیب سے عائد ہوتا ہے جیسا کہ ہم ماقبل میں آیت ''وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ'' (الشعراء:۲۱۴، ۲۱۶) (اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈر سنا دو۔) کے تحت ذکر کر چکے ہیں کہ دعوت کی ابتداء قریبی لوگوں سے کرنے کا حکم ہے، لہذا داعی ابتدائی طور پر اپنے علاقے اور ملک میں تبدیلی اور انقلاب کا ذمہ دار ہے، دیگر علاقوں اور ممالک میں تبدیلی اور انقلاب لانا انہی علاقوں اور ممالک کے لوگوں کا فرض ہے، البتہ جب داعی اپنے علاقے اور ملک میں تبدیلی اور انقلاب لانے میں کامیاب ہو جائے تو دیگر علاقوں اور ممالک کی طرف بڑھنا

بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ الحاصل جو حضرات ہجرت سے متعلق احادیث پڑھنے کے بعد اپنے ملک کو چھوڑ کر دیگر ممالک میں تبدیلی اور انقلاب کے لیے ہجرت کرنے کے قائل ہیں یا ہجرت کر جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ان احادیث پر عمل کر رہے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل محل نظر ہے جس پر انہیں نظرثانی کرنی چاہیے۔

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتحِ مکہ کے بعد ہجرت سے متعلق ارشاد فرمایا تھا کہ ''لاہجرۃ بعد الفتح'' (صحیح البخاری کتاب المغازی باب مقام النبی صلی اللہ علیہ وسلم بمکۃ زمن الفتح) (فتحِ مکہ کے بعد ہجرت نہیں) شارحین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ چونکہ فتح کے بعد مکہ دارالسلام بن چکا ہے اس لیے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا جو حکم تھا وہ ختم ہوگیا ہے۔ باقی دارالحرب سے ہجرت کرنے کا حکم تاقیامت باقی رہے گا، یہ کبھی منسوخ نہ ہوگا۔

حبشہ کی طرف دوسری ہجرت

حبشہ پہنچنے کے بعد مسلمان وہاں مکمل مذہبی آزادی کے ساتھ رہنے لگے تھوڑے عرصے بعد انہیں یہ غلط اطلاع پہنچی کہ مکہ کے کفار مسلمان ہو چکے ہیں، وہ یہ خبر سن کر مکہ روانہ ہو گئے۔ مکہ کے قریب پہنچے تو انہیں پتہ چلا کہ قریش تو اب بھی کفر پر قائم ہیں بلکہ وہ تو پہلے سے بھی زیادہ مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھا رہے ہیں۔ اس لیے اکثر حضرات واپس لوٹ گئے، البتہ کچھ مسلمان مکہ میں مقیم ہو گئے، بے پناہ جبر وتشدد کے نتیجے میں صحابہ کرام کو دوبارہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ (الکامل فی التاریخ ج ۲ ص ۵۳)

دعوت کا سلسلہ ٹوٹنے نہ دیا جائے

بے پناہ جبر وتشدد کے نتیجے میں صحابہ کرام کو دوبارہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنا پڑی، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود کیا کر رہے تھے، اس سے متعلق ابن اثیر لکھتے ہیں:

والنبی صلی اللہ علیہ وسلم مقیم بمکۃ یدعو الی اللہ سراً و جھراً.

(الکامل لابن اثیر ج ۲، ص ۵۳)

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں مقیم رہے اور خفیہ اور اعلانیہ لوگوں کو دعوت الی اللہ دیتے رہے۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ انتہائی مشکل حالات میں بھی امیر اور مرکزی قیادت دعوت کا سلسلہ جاری رکھے۔ خفیہ یا اعلانیہ جو بھی صورت بن پائے دعوت کا سلسلہ ٹوٹنے نہ دیں۔

مشرکین مکہ کا ظلم وستم پہلے سے زیادہ بڑھ گیا تھا اور وہ حضرات صحابہؓ جو دوسری مرتبہ حبشہ نہیں گئے

،انہوں نے بہت ظلم وستم اٹھائے اور صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا:

فوجدوا البلاء والاذی علی المسلمین کالذی کان واشد فبقوا صابرین علی الظلم والاذی حتی اذن اللہ لھم بالھجرۃ الی المدینۃ فھاجر والیہ.(الدرر ص ۶۲)

''انہیں پہلے کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ شدید آزمائشوں اور ایذاؤں کا سامنا کرنا پڑا،لیکن وہ ظلم اور ایذاؤں پر صبر کرتے رہے یہاں تک اللہ تعالیٰ نے انہیں مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دی تو وہ لوگ وہاں ہجرت کر کے چلے گئے۔''

اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جو حضرات کسی وجہ سے دوسرے علاقے میں منتقل نہ ہوسکیں وہ ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں اور اپنے نظریات پر ڈٹے رہیں۔

مہاجرین کا امیر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حبشہ کی طرف بھیجا تو انہوں نے باقاعدہ جماعت کی شکل اختیار کرلی،چنانچہ ایک روایت کے مطابق اس کے امیر حضرت عثمان بن مظعون تھے۔علامہ حلبی لکھتے ہیں:

وکان امیراً علیھم (السیرۃ الحلبیۃ ج ا،ص ۳۰۹)

''وہ(عثمان بن مظعونؓ)ان کے امیر تھے۔''

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر داعی حضرات مرکز سے دور کسی مقام میں ہجرت کر کے جائیں یا دعوت کے لئے ان کی تشکیل کی جائے تو وہ باقاعدہ جماعت کی صورت میں جائیں اور ان میں سے ایک آدمی امیر ہونا چاہئے جسے مرکزی قیادت مقرر کردے تو زیادہ بہتر ہے یا پھر ارکانِ جماعت باہمی مشورہ سے کسی ایک کو امیر بنالیں۔

جب صحابہ کرامؓ حبشہ میں پرامن طور پر اور مکمل مذہبی آزادی کے ساتھ رہنے لگے تو قریش کو پریشانی لاحق ہوئی۔انہوں نے صحابہ کرام کو حبشہ سے نکلوانے اور واپس مکہ لانے کا منصوبہ بنایا،چنانچہ اس مقصد کے لئے شاہِ حبشہ نجاشی سے بات چیت کرنے اور اسے مسلمانوں کو اپنے ملک سے نکالنے کے لئے راضی کرنے کے لئے اپنے دونمائندے عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ کو بھیجا چنانچہ یہ دونوں حبشہ پہنچے،نجاشی کے وزیروں،مشیروں،درباری علماء اور بادشاہ کے دیگر مقربین کو ہدایا اور تحائف دے کر اپنا ہمنوا بنالیا اور انہیں اس بات پر آمادہ کرلیا کہ جب یہ دونوں نجاشی کے سامنے اپنا مدعا بیان کریں تو یہ لوگ ان کی تائید کریں گے۔چنانچہ یہ دونوں نمایندے نجاشی کے دربار میں حاضر ہوئے اور آدابِ

دشاہی بجالانے کے بعد اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو اہلِ دربار نے ان کی تائید کی ،لیکن عادل اور رحم دل بادشاہ نے مہاجرین کا موقف سنے بغیر انہیں قریش کے نمائندوں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا اور اگلے دن مہاجرین کو دربار میں طلب کیا۔

نظریاتی پختگی کی دلیل

جب ان کے پاس نجاشی کا قاصد آیا تو یہ تمام حضرات جمع ہوئے اور ایک دوسرے سے مشورہ کرتے ہوئے کہنے لگے ''تم کیا کہو گے؟ کہنے لگے ہم کیا کہیں گے؟:

نقول واللہ مانعرف وما نحن علیه من امر دیننا وماجاء نا به نبینا صلی اللہ علیه وسلم کائن فی ذلک ما کان. (دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۲، ص ۳۰۲)

'' واللہ! ہم وہی بات کہیں گے جو ہم جانتے ہیں، جس دین پر ہم قائم ہیں اور جو (عقائد و نظریات) ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں، چاہے اس (حق گوئی) کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔''

یہ ان حضرات کی اپنے عقائد ونظریات پر پختگی ،استقامت اور جرأت وشجاعت کی روشن دلیل ہے کہ جن عقائد ونظریات کو اختیار کرنے کی وجہ سے انہیں اپنی قوم کی طرف سے جبر وتشدد کا سامنا کرنا پڑا اور بالآخر انہیں اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا کہ وہ ایک مختلف قوم، مذہب اور زبان رکھنے والے ملک میں پناہ لے کر رہ رہے ہیں لیکن بادشاہ کے دربار میں جا کر اپنے عقائدوافکار کو چھوڑنے پر ہرگز تیار نہیں بلکہ اپنا موقف دوٹوک الفاظ میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔داعیٔ حق کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ مشکل سے مشکل ترین حالات میں نہ گھبراتا ہے نہ اپنے افکار ونظریات کو چھوڑتا ہے بلکہ جرأت واستقامت کے ساتھ دوٹوک الفاظ میں بیان کرتا ہے،چنانچہ اس کی ثابت قدمی کی بدولت دعوت کی اشاعت ومقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے کہ داعیانِ اسلام کا موقف سننے کے بعد نجاشی انتہائی متاثر ہوا اور بعد میں اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔

مرکز سے دور جماعت میں بھی اتحاد اور اتباع

دعوت قبول کرنے والوں کی اس طرح تعلیم وتربیت کرنا اور ان کے اندر اس طرح نظم وضبط پیدا کرنا ضروری ہے کہ مرکز اور مرکزی قیادت سے دور رہ کر بھی ان میں نظم وضبط اور اجتماعیت برقرار رہے اور وہ انتشار وافتراق کا شکار نہ ہوں، چنانچہ جب مہاجرین نجاشی کے دربار میں جانے لگے تو حضرت جعفر نے دیگر صحابہ کرامؓ سے کہا:

انا خطیبکم الیوم فاتبعوہ حتی دخلوا علی النجاشی (دلائل البیھقی ج ۲، ص ۲۹۸)
''آج کے دن میں تمہارا خطیب ہوں، انہوں نے ان کی پیروی کی یہاں تک کہ وہ نجاشی کے پاس پہنچے۔''

مؤثر خطابت

دعوت کو موثر طریقے سے پیش کرنا ضروری ہے تاکہ مخاطب اس سے متاثر ہو، خصوصاً جب معاملہ پیچیدہ ہو اور مخاطب وقت کی ایک بڑی اور علوم و معارف سے آشنا شخصیت ہو تو داعیوں میں سے سمجھدار ساتھی متکلم بنے اور وہی بات چیت کرے تاکہ صحیح اسلوب کے ساتھ گفتگو کرے اور سوالات کے درست جوابات بھی دے سکے۔ ایک دوسری روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:

قال لنا جعفر لا یتکلم منکم احدٌ انا خطیبکم الیوم.

(دلائل النبوۃ للبیھقی ص ۲، ۲۹۹)

ہمیں جعفر نے کہا ''تم میں سے کوئی بات نہ کرے آج کے دن میں تمہارا خطیب (متکلم) ہوں۔''

حضرت جعفرؓ کا اپنے ساتھیوں کو یہ تجویز پیش کرنا کہ میں تمہارا متکلم ہوں، اس لئے تھا کہ انہیں اپنے اوپر اعتماد تھا کہ وہ بہتر طور پر نجاشی کے سامنے مہاجرین کی نمائندگی کر سکیں گے، چنانچہ انہوں نے واقعی نمائندگی کا حق ادا کر دیا جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ لہٰذا قادر الکلام ساتھی کو متکلم بنانا ضروری ہے تاکہ مخاطب کے سامنے دعوت کا صحیح خاکہ اور نقشہ پیش کیا جا سکے۔

حزب اللہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کا ہی نتیجہ تھا کہ صحابہ کرامؓ نے ایک نظم اور جماعت کی شکل اختیار کر لی تھی اور خود انہیں اس بات کا خوب احساس تھا، چنانچہ ہجرت کے بعد جب حضرت جعفر اور ان کے رفقاء نجاشی شاہ حبشہ کے دربار میں بلائے گئے تو حضرت جعفر دوسرے حضرات کے ساتھ شاہ حبشہ سے ملاقات کیلئے شاہی محل کے دروازے پر پہنچے، مہاجرین کے آگے آگے جعفر بن ابی طالب تھے تو انہوں نے آواز لگائی:

جعفر بالباب یستاء ذن ومعہ حزب اللہ (السیرۃ الحلبیۃ ج ۱، ص ۳۲۲)

جعفر داخل ہونے کی اجازت چاہتا ہے اور اس کے ساتھ حزب اللہ (اللہ کی جماعت) موجود ہے۔''

ابن القیم الجوزیہ نے حضرت جعفرؓ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

يستأذن عليك حزب الله. (زاد المعاد ج ۳ ص ۲۹)

حزب اللہ (اللہ کی جماعت) داخل ہونے کی اجازت چاہتی ہے''۔

بادشاہوں کو بھی خاطر میں نہ لانا

جب فرزندانِ اسلام نجاشی کے دربار میں گئے تو انہوں نے مروجہ شاہی آداب کے مطابق بادشاہ کو سجدہ کیا اور نہ اس کے سامنے جھکے، بادشاہ اور اہل دربار کے لئے یہ بات بڑی حیران کن اور تعجب خیز تھی، چنانچہ نجاشی نے پوچھا ''مجھے سجدہ کرنے اور آداب وسلام جو کئے جاتے ہیں، ان کے کرنے میں کیا چیز مانع ہے؟'' حضرت جعفرؓ نے جواب دیا:

انا لانسجد الا الله عز و جل

''اس لئے کہ ہم اللہ عزوجل کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔''

نجاشی نے پوچھا ''ایسا کیوں ہے؟ حضرت جعفرؓ نے جواب دیا:

''اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف ایک رسول بھیجا ہے، اس نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم صرف اللہ عزوجل کے سامنے ہی سجدہ ریز ہوں، اس نے ہمیں بتایا ہے کہ اہل جنت کا سلام ''السلام'' ہے، ہم نے اسی (الفاظ اور طریقے) کے ساتھ آپ کو سلام کیا ہے جو ہم ایک دوسرے کو کرتے ہیں۔''

(السیرۃ الحلبیۃ ج۱،ص۳۲۲)

حضرت جعفرؓ کے ان الفاظ سے ان کی نظریاتی پختگی، جرأت، اللہ پر توکل اور اپنے اوپر اعتماد خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں۔ حضرت جعفرؓ سمیت نجاشی کے دربار میں حاضر ہونے والے مہاجرین نہ تو بادشاہ کے رعب ودہشت کے رعب میں آئے نہ دربار کی رنگینیوں اور اہلِ دربار کی شان وشوکت سے متاثر ہوئے بلکہ انہوں نے بادشاہ کو بھی اپنے ایک ساتھی جیسی اہمیت دیتے ہوئے اسے اسی طرح سلام کیا جس طرح آپس میں کرتے تھے۔ گویا وہ بادشاہ کی بادشاہت کو بھی خاطر میں نہ لائے اور اپنے نظریات اور موقف پر ڈٹے رہے، لہٰذا داعی کو چاہئے کہ وہ وقت کے بادشاہوں اور حاکموں سے مرعوب ہو اور نہ کسی اعلیٰ عدالت کی طرف سے طلبی پر کرسیٔ انصاف پر براجمان شخصیت کے رعب ودبدبے میں آئے بلکہ وہ جرأت واستقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں اپنا موقف بیان کرے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت جعفرؓ نے نجاشی سے کہا:

''آپ ان سے پوچھئے کہ ہم آزاد ہیں یا غلام جو اپنے اپنے آقاؤں سے بھاگ آئے ہوں کہ ہم واپس لوٹ جائیں؟''

عمرو نے جواب دیا کہ ایسا نہیں بلکہ یہ لوگ آزاد ہیں۔ حضرت جعفر نے کہا:

''آپ ان سے پوچھئے کہ کیا ہم نے ناحق کسی کا خون بہایا ہے کہ ہم سے قصاص لینا چاہتے ہیں یا ہم نے ناحق طریقے سے لوگوں کے اموال قبضے میں لیے ہیں کہ ہم پر ان کی ادائیگی لازم ہو؟'' (السیرۃ الحلبیۃ ج ۱، ص ۳۲۵)

اس پر عمرو نے کہا نہیں، ایسا نہیں ہے۔

مروجہ اخلاقی قوانین اور اصولوں کی خلاف ورزی سے گریز

حضرت جعفرؓ کی طرف سے کئے جانے والے سوالات اور عمرو بن العاص کی طرف سے دیے جانے والے جوابات سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی حضرات ان امور سے بچیں جن کی وجہ سے وہ مروجہ اصول وضوابط کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہوں، مثلاً اگر مہاجرین میں سے کوئی واقعی بھاگا ہوا غلام ہوتا، یا کسی نے ناحق قتل کیا ہوتا، یا کوئی کسی قریشی کا مقروض ہوتا تو صاف ظاہر ہے کہ سفیرانِ قریش مروجہ اصولوں کے مطابق اسے جواز بنا کر نجاشی سے متعلقہ آدمی کو حوالے کرنے کا مطالبہ کر سکتے تھے، لیکن چونکہ ایسی کوئی بات نہ تھی اس لئے وہ نجاشی سے ایسا کوئی مطالبہ نہ کر سکے۔

چونکہ مہاجرین کسی بھی لحاظ سے قریش کے مجرم نہ تھے اور ان کا جرم صرف توحید کی دعوت کو قبول کرنا، شرک و بت پرستی کو ترک کرنا اور دینِ اسلام کی اشاعت وتبلیغ کرنا تھا اور یہ نظریاتی اختلاف تھا اس لئے سفیرانِ قریش مہاجرین کو واپس مکہ لانے میں ناکام ٹھہرے، لہٰذا داعی حضرات کی یہ پوری کوشش ہونی چاہئے کہ وہ بھرپور طریقے سے اپنی دعوت چلائیں۔ اپنے افکار ونظریات کا پرچار کریں، باطل افکار ونظریات اور نظامِ حیات پر تنقید کریں لیکن ایسے امور سے گریز کریں جن کے ساتھ مروجہ اخلاقی ومعاشرتی اصولوں کی خلاف ورزی ہوتی ہو، کیونکہ اگر کسی داعی خصوصاً مرکزی حضرات نے اس طرح کے کسی کام کا ارتکاب کرلیا تو مخالفین اور اربابِ اقتدار اسے جواز بنا کر نہ صرف اسی ایک فرد کے خلاف کاروائی کریں گے بلکہ وہ ذرائع ابلاغ کے ذریعے پوری جماعت کے خلاف پروپیگنڈہ کر کے اس کے خلاف بھی کاروائیاں کر سکتے ہیں اور مختلف پابندیاں عائد کر سکتے ہیں۔

دراصل انقلابی دعوت اور تحریک کے مخالفین اور اربابِ اقتدار اربابِ دعوت وتحریک کے خلاف

کاروائی کرنے کے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ پھر جب انہیں اس طرح کا بہانہ ہاتھ آجاتا ہے تو وہ ذرائع ابلاغ پر دعوت وتحریک پر دہشت گردی اور انتہا پسندی کا لیبل چسپاں کر کے اور ارباب دعوت وتحریک کو دہشت گرد، انتہا پسند، شر پسند اور ملکی امن وامان کو خراب کرنے والا باور کرا کر انہیں گرفتار کر کے پابند سلاسل کرتے اور بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنا کر دعوت وتحریک کو سبوتاژ کرنے کی مذموم کوشش کرتے ہیں، اس لئے داعی حضرات کو چاہئے کہ وہ حتی الامکان ان امور سے گریز کریں تا کہ مخالفین اور ارباب اقتدار کو ایسا کرنے کا بہانہ اور موقع نہ ملے۔ ہاں اگر اس کے باوجود ارباب اقتدار کی طرف سے بلا جواز پابندیاں لگائی جاتی ہیں، انہیں گرفتار کر کے پابند سلاسل کیا جاتا ہے اور جبر وتشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے (اور ایسا ہونا انقلابی دعوت وتحریک کے مراحل میں ہونا ناگزیر ہے جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے) تو الگ بات ہے۔ اس کا دعوت کو یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ عوام کے سامنے داعی حضرات کی مظلومیت اور ارباب اقتدار کا ناروا ظلم وجبر عیاں ہوجاتا ہے یوں دعوت اور داعی حضرات سے متعلق ان کے دلوں میں ہمدردی اور حمایت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، جو کہ ان کی دعوت میں شمولیت کا باعث بنتے ہیں۔

اسلامی نقلاب کی ایک جھلک

نجاشی نے مہاجرین سے ان کی قوم کی طرف سے مخالفت وعداوت، ہجرتِ حبشہ اور قریش کے انہیں واپس بھیجنے کے مطالبے کی وجہ دریافت کی تو حضرت جعفر نے مختصر، جامع اور فصیح وبلیغ انداز میں نجاشی کے سامنے اصل صورت حال واضح کرتے ہوئے کہا:

ایّها الملک کنّا قوماًاهل جاهلية نعبد الاصنام ونأكل الميتة ونأتى الفواحش ونقطع الارحام ونسيئ الجوار ويأكل القوىُ منّا الضعيف فكناعلىٰ ذلک حتىٰ بعث الله الينا رسولاً منّا نعرف نسبه وصدقه وامانته وعفافه فدعانا الى الله لنوحده ونعبده ونخلع ما كنا نعبدنحن وأبآء نا من الاصنام وامرنا بصدق الحديث واداء الامانة وصلة الرحم وحسن الجوار والكفّ عن المحارم والدّماء ونهانا عن الفواحش وقول الزور واكل مال اليتيم وأمَرنا ان نعبدالله وحده لانشرک به شيأ وامرنا بالصلوٰة والصيام

.(السيرة لابن هشام ج ا ص ۲۱۵،۲۱۶ ایضاًالكامل فى التاريخ ج ۲، ص ۸۰)

''اے بادشاہ! ہم ایک جاہلیت والی قوم تھے، بتوں کی پرستش کرتے تھے، مُردار کھاتے تھے، ہر قسم کی بے حیائیوں اور گناہوں میں آلودہ تھے، ہم میں سے جو طاقتور ہوتا وہ کمزور کو پھاڑ کھاتا، ہم اس حال

میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جس کے خاندان ونسب وحسب سے اور جس کی سچائی، امانت داری اور عفت و پاک بازی سے ہم پہلے سے واقف تھے انہوں نے ہم کو یہ دعوت دی کہ ہم صرف ایک اللہ پر ایمان لائیں اور اسی کی عبادت کریں اور ہم اور ہمارے باپ دادا جن بُتوں اور پتھروں کو پوجتے تھے اس کو بالکل چھوڑ دیں اور ان سے قطع تعلق کریں، انہوں نے ہم کو سچ بولنے امانت ادا کرنے رشتہ داری کا خیال کرنے، پڑوسی سے اچھا سلوک کرنے، ناجائز وحرام باتوں اور ناحق خون سے پرہیز کرنے کا حکم دیا، بے حیائی کے کاموں، جھوٹ فریب، یتیم کا مال کھانے، پاک دامن و پاکباز عورتوں پر الزام لگانے سے منع فرمایا، انہوں نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم صرف ایک اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ ٹھہرائیں انہوں نے ہمیں نماز، زکوٰۃ اور روزوں کا حکم دیا۔''

پھر انہوں نے اس طرح کے اور ارکانِ اسلام بیان کئے اور مزید کہا ''ہم نے ان کی تصدیق کی ان پر ایمان لائے اور جو طریقہ اور تعلیم وہ اللہ کی طرف سے لائے ہیں اس کی پیروی کی صرف ایک اللہ کی عبادت اختیار کی اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کیا جو انہوں نے حرام کیا اس کو حرام مانا جو انہوں نے حلال کیا اس کو حلال تسلیم کیا۔ اس پر ہماری قوم ہماری دشمنی پر کمر بستہ ہوگئی انہوں نے ہم کو طرح طرح کی تکلیفیں پہونچائیں اور ہم کو اس دین سے پھیرنے کے لئے مختلف آزمائشوں میں ڈالا اور اس کی کوشش کی کہ اللہ کی عبادت چھوڑ کر ہم پھر بتوں کی عبادت کو اختیار کرلیں اور جن گناہوں اور جن جرائم کو پہلے ناجائز سمجھتے تھے پھر جائز اور حلال سمجھنے لگیں۔ جب انہوں نے ہمارے ساتھ بہت زور زبردستی کی ہم پر ظلم کیا ہمارا جینا دوبھر کر دیا اور ہمارے دین کے راستہ میں دیوار بن کر کھڑے ہوگئے تو ہم آپ کے ملک میں پناہ لینے کے لئے آئے اور اس کے لئے آپ ہی کا انتخاب کیا، آپ کے جوار اور پناہ کی خواہش کی اے بادشاہ! ہم یہاں یہ امید لے کر آئے ہیں کہ ہم پر کوئی ظلم نہ کیا جا سکے گا۔''

داعی کو دعوت کا نصاب یاد ہونا چاہئے

نجاشی نے یہ پوری تقریر سکون و وقار سے سنی اور کہا کہ

هل معك مما جاء به عن الله من شيء؟ (السيرة لابن هشام ج ۱ ص ۲۱۶)

''تمہارے نبی، اللہ کے پاس سے جو کچھ لائے ہیں اس کی کوئی چیز تمہارے پاس ہے؟

حضرت جعفرؓ نے کہا کہ ہے، نجاشی نے کہا کہ مجھے وہ پڑھ کر سناؤ۔ حضرت جعفرؓ نے سورہ مریم کی بتدائی آیتیں تلاوت کیں تو ''نجاشی رو پڑا اور اس کے آنسوؤں سے اس کی داڑھی تر ہوگئی اس کے

دربار کے پادریوں پر بھی گریہ طاری ہوگیا یہاں تک کہ ان کے (مذہبی) صحیفے آنسوں سے بھیگ گئے۔'' (السیرۃ لابن ھشام ج ا ص ۲۱۶)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ داعی کو دعوت کا نصاب اچھی طرح یاد ہونا چاہیے تاکہ وہ دعوت کے افکار ونظریات بہتر انداز آگے پہنچا سکے اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب داعی دعوت کے تعلیمی وتربیتی نظم میں باقاعدہ جڑے دعوت کا نصاب محنت اور دلچسپی سے پڑھے اور سمجھے۔

حق گوئی و بیباکی

دوسرے دن نجاشی کا قاصد دوبارہ بلانے آیا تو مہاجرین ایک دوسرے سے کہنے لگے اگر نجاشی نے تم سے عیسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں پوچھا تو تم اس کے جواب میں کیا کہو گے، سب نے کہا:

نقول و اللہ ما قال اللہ وماجاء نابہ نبینا کائنافی ذلک ماھو کائن .

(السیرۃ لابن ھشام ج ا ص ۲۱۶)

''ہم وہی بات کہیں گے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں کہی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں (جن عقائد ونظریات) کا حکم دیا ہے۔''

نجاشی نے پوچھا کہ تم حضرت مسیحؑ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ جعفر بن ابی طالبؓ نے جواب دیا''ہم ان کے بارے میں وہی کہتے ہیں کہ جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تعلیم دی: ہے وہ اللہ کے بندے ہیں اس کے رسول ہیں اور اس کی روح اور کلمہ ہیں جو اس نے کنواری پاکباز مریم پر القا کیا۔'' یہ سن کر نجاشی نے اپنا ہاتھ زمین پر مارا اور ایک تنکا اٹھا کر کہا کہ'' خدا کی قسم جو کچھ تم نے بیان کیا ہے حضرت عیسیٰ اس سے اس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں ہیں۔''

جب نجاشی کے سامنے معاملہ واضح ہوگیا اور وہ مطمئن ہوگیا تو اس نے قریش کے نمائندوں سے کہا:

انطلقا فو اللہ لا اسلمھم الیکما ابداً.(السیرۃ الحلبیۃ ج ا ، ص ۳۲۵)

''تم دونوں چلے جاؤ، واللہ میں ان لوگوں کو کبھی بھی تمہارے حوالے نہیں کرسکتا۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کسی بڑی شخصیت خصوصاً اربابِ اقتدار کے افکار ونظریات اربابِ دعوت کے نظریات سے متصادم ہوں تو دعاۃ اس کی پرواہ نہ کریں اور اس کے سامنے دوٹوک الفاظ میں اپنے نظریات اور موقف بیان کردیں۔ وقت کے حاکم کے خیالات نہیں اللہ تعالیٰ کے احکام اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ہدایات کو پیشِ نظر رکھیں۔ اگر حاکمِ وقت نجاشی کی طرح سلیم

الفطرت، عقل وفہم اور علم وشعور رکھنے والا آدمی ہے تو داعیانِ حق کی حق گوئی و بیباکی سے ضرور متاثر ہوگا اور اس کے دل میں ان کے بارے میں نرم گوشہ پیدا ہوگا۔

مقامِ ہجرت میں بھی دعوت

داعی ہر وقت اور ہر جگہ داعی ہوتا ہے، وہ کبھی قول سے دعوت دیتا ہے تو کبھی فعل سے، وہ تو بس موقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ کب دعوت دے، بلکہ مواقع نکالتا ہے، اسے اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ اپنے علاقے اور ملک میں موجود ہے یا دوسرے علاقے اور اجنبی ملک میں رہ رہا ہے حتیٰ کہ وہ جلاوطنی کی زندگی میں بھی اس فریضے کو فراموش نہیں کرتا اور دعوت کی ذمہ داری ادا کرتا رہتا ہے، اس لیے مہاجرین کے بارے میں یہ بات قرین قیاس ہے کہ انہوں نے کسی نہ کسی شکل (قولاً یا فعلاً) دعوت کا سلسلہ جاری رکھا ہوگا۔ ابن اسحاق کی بیان کردہ درج ذیل روایت سے بھی اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

ثم قدم علی رسول الله صلی الله علیه وسلم وهو بمکةعشرون رجلاًاو قریبا من ذلک من النصاریٰ حین بلغهم من الحبشة. (السیرة لابن هشام ج ۲ ص ۳۰)

''پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مکہ میں بیس افراد حاضر ہوئے، جب انہیں حبشہ میں آپ کے بارے میں معلوم ہوا۔''

ساتھیوں کی اذیت برداشت نہیں

حبشہ سے لوٹنے والوں میں حضرت عثمان بن مظعونؓ بھی شامل تھے، وہ مکہ میں ولید بن مغیرہ کی امان میں داخل ہوئے، جب انہوں نے مسلمانوں کو دی جانے والی تکالیف اور ان پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم کا مشاہدہ کیا تو اپنے آپ سے کہا:

والله ان غدوّی ورواحی آمنا بجوار رجل من أهل الشرک وأصحابی وأهل دینی یلقون من الاذیٰ فی الله مالایصیبنی لنقص کبیر. (السیرة الحلبیة ج ۱ ص ۳۱۲)

''اللہ کی قسم! میں تو ایک مشرک آدمی کی پناہ میں صبح وشام امن میں رہ رہا ہوں جبکہ میرے ساتھی اور ہم دین، اللہ کے راستے میں تکالیف اٹھا رہے ہیں جو مجھے نہیں پہنچ رہیں یہ (میرے اندر) ایک بڑا نقص ہے۔''

حضرت عثمان کو پناہ کی صورت میں مشکلات اور ایذاؤں کا سامنا کرنا نہیں پڑ رہا تھا جبکہ دیگر

حضرات کو تکالیف دی جا رہی تھیں تو ان کی ایمانی غیرت نے یہ گوارہ نہ کیا کہ وہ خود تو پُر امن اور پر سکون رہیں اور اس کے ہم عقیدہ و ہم فکر بھائی تکالیف اٹھاتے رہیں بلکہ انہوں نے تکالیف نہ پہنچنے کو اپنے دین وایمان میں کمی کی علامت قرار دیا کہ شاید یہ میری دینی کمزوری ہے کہ مجھے تکالیف کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا کیونکہ میرا دین وایمان کامل ہوتا تو مجھے بھی ضرور ان حالات کا سامنا کرنا پڑتا۔ حضرت عثمان کے اس طرزِ فکر وعمل سے واضح ہوتا ہے کہ:

(۱) انہیں اپنے دین وایمان کی تکمیل کی کس قدر فکر تھی۔ ان کی یہ فکر مراتب جہاد کی تکمیل کے تقاضے کے عین مطابق تھی، جیسا کہ ہم ماقبل میں ذکر کر چکے ہیں۔

(۲) اپنے ساتھیوں کا کس قدر خیال اور ان کے ساتھ ہمدردی ومحبت تھی۔

(۳) اللہ کے دین کے لئے مصائب ومشکلات اٹھانے اور ایثار وقربانی کا کس قدر قوی جذبہ تھا، لہٰذا داعی کو چاہئے کہ وہ:

(الف) اپنے ایمان وایقان کی تکمیل کے لئے زیادہ سے زیادہ فکر مند ہو، اس پر غور وفکر کرے کہ اسے اللہ کے راستے میں مشکلات ومصائب کیوں پیش نہیں آ رہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ میں مراتب جہاد کی تکمیل کے تقاضوں پر عمل پیرا نہ ہوں اور اسی وجہ سے مجھے ان حالات کا سامنا نہ کرنا پڑ رہا ہو؟

(ب) اپنے ساتھیوں کے ساتھ انتہائی محبت وہمدردی کا معاملہ رکھے، ان کی خاطر مشکلات برداشت کرنا پڑیں تو برضا ورغبت برداشت کرے۔

(ج) اللہ کے دین کے غلبے کے لئے ایثار وقربانی کا قوی جذبہ ہو۔

احسان کی قدر کی جائے

حضرت عثمان ولید کے پاس آئے اور اس سے کہا ''اے ابو عبد شمس! تو نے پناہ کا اپنا عہد نبھالیا اب میں تمہارے عہد کو واپس (منسوخ) کرتا ہوں۔'' ولید نے انہیں حالات کی سنگینی کا احساس دلاتے ہوئے کہا کہ تم میری پناہ میں ٹھیک رہ رہے ہو۔ اگر تم نے یہ ختم کر دی تو قوم تمہیں نہیں چھوڑے گی اور تکالیف دے گی۔ اس پر حضرت عثمان بن مظعون ؓ نے کہا:

''نہیں اللہ کی قسم! کوئی میرے درپے ہوگا اور نہ ایذاء دے گا، مگر میں اللہ کی پناہ اور امان پر راضی ہوں اور اس کے علاوہ کسی دوسرے کی پناہ میں نہیں جانا چاہتا۔'' (السیرۃ الحلبیہ ج ۱ص ۳۱۲)

ولید نے کہا اگر تم نے میری امان ختم کرنی ہے تو جیسے میں نے تجھے اعلانیہ امان دی تھی، اسی طرح تم

اسے اعلانیہ ختم کرو، چنانچہ دونوں مسجد حرام میں آئے اور ولید نے امان کے خاتمے کا باقاعدہ اعلان کیا۔

اس کے بعد حضرت عثمانؓ مسجد حرام میں قریش مکہ کی مجلس میں بیٹھ گئے یہاں عقائد کے حوالے سے لبید نے شرک پرمبنی شعر پڑھا اور حضرت عثمان نے مخالفت کی تو اس پر ایک قریشی اٹھ کھڑا ہوا اور حضرت عثمان کی آنکھ زخمی کردی، ولید دور کھڑا دیکھ رہا تھا، اس نے حضرت عثمان سے کہا: ''اے بھتیجے! ایسا کیوں نہ ہو، واللہ! تمہاری آنکھ اس پہنچنے والی تکلیف سے بے نیاز تھی، تم ایک محفوظ پناہ گاہ میں تھے، تم اس سے نکل چکے حالانکہ تم ان تکالیف سے بچے ہوئے تھے۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

بل کنت الی الذی لقیت فقیرا واللہ ان عینی الصحیحۃ التی لم تلطم لفقیرۃ الی مثل ما أصاب أختھا فی اللہ عزوجل ولی فیمن ھو أحب الیّ منکم أسوۃ وانی لفی جوار من ھو أعزّ منک. (السیرۃ الحلبیۃ ج ا ص ۳۱۲، ایضاً دلائل النبوۃ ج ۲، ص ۲۹۲،۲۹۳)

''بلکہ مجھے جو تکلیف پہنچی ہے میں اس کا محتاج تھا، اللہ کی قسم! میری صحیح سالم آنکھ جسے زخمی نہیں کیا گیا یہ زخمی ہونے والی آنکھ کی طرح اللہ کے راستے میں کسی تکلیف کی محتاج ہے، میرے سامنے تو اس ہستی کا نمونہ ہے جو مجھے تم سے زیادہ محبوب ہے اور میں ایسی ذات کی پناہ میں ہوں جو تم سے زیادہ شان وشوکت والی ہے۔''

حضرت عثمانؓ اللہ کے راستے میں پہنچائی جانے والی ایذاء پر نہ صرف صبر کررہے ہیں بلکہ وہ صحیح سالم آنکھ کو بھی اس بات کا محتاج قرار دے رہے ہیں کہ اسے بھی اللہ کے راستے میں زخمی ہونے والی آنکھ کی طرح زخمی کیا جائے۔ اللہ اللہ! کیا جذبہ اور تڑپ ہے اللہ کے دین کی اشاعت وسربلندی اور غلبے کے لئے ایثار وقربانی کی؟ ایسے جلیل القدر اور عظیم الشان لوگوں کے بارے میں خالقِ دو جہاں ''رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ'' کا مژدہ جان فزا کیوں نہ سنائے۔ الغرض داعی مصائب ومشکلات کو نہ صرف برداشت کرے بلکہ وہ اپنے آپ کو ان کا محتاج سمجھے اور اس بات پر یقین رکھے کہ جوں جوں وہ قربانیاں دے گا توں توں مراتب جہاد کی تکمیل ہوگی اور اجر آخرت میں اضافہ در اضافہ ہوگا۔

امیرِ دعوت کے خاتمے کے لئے دولت کا لالچ

داعیٔ انقلاب کے عقائد ونظریات کی بدولت باطل افکار ونظریات کے حامل افراد، گروہوں اور طبقات کو اپنے عقائد ونظریات، نظام حیات اور اس سے وابستہ مفادات پر زد پڑتی نظر آتی ہے تو وہ دعوت کے سد باب کے لئے ہر ممکن ذریعہ استعمال کرتے ہیں لیکن جب انہیں ہر طرف سے ناکامی کا

سامنا کرنا پڑتا ہے تو ان کا آخری حربہ یہی ہوتا ہے کہ امیر دعوت کا کام تمام کر دیا جائے تا کہ ''نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری'' اس مقصد کے لئے بے پناہ دولت صرف کی جاتی ہے، امیر دعوت کے سر کی قیمت مقرر کر کے اس کی تشہیر کر دی جاتی ہے تا کہ دولت کے پجاری لوگوں کو اس کام کے لئے آمادہ کیا جا سکے چنانچہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی افراد، گروہ اور تنظیمیں اس کام کے لئے سرگرم ہو جاتی ہیں، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ جب تک چاہتے ہیں ان کی سازشیں اور منصوبے ناکام ہوتے رہتے ہیں، ہاں جب اللہ تعالیٰ امیر دعوت کو شہادت کے عظیم الشان مرتبے پر فائز کرنا چاہتے ہیں تو تب مخالفین اسے راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، چنانچہ حضرت عمر کے قبولِ اسلام کے سبب سے متعلق ایک روایت یہ بھی آئی ہے کہ ایک دن ابوجہل نے قریش سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا: ''اے گروہِ قریش! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمہارے معبودوں کو برا بھلا کہا، تمہاری عقلوں کو حماقت زدہ قرار دیا اور اس کا خیال ہے کہ تمہارے آباؤ اجداد جہنم میں ہیں۔

''سنو! جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کرے گا میں اسے سرخ اور سیاہ اونٹنیاں اور چاندی کے ایک ہزار اوقیہ دوں گا۔'' (السیرۃ الحلبیۃ ج۱،ص ۳۱۷)

حضرت عمرؓ ننگی تلوار اٹھائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے چل پڑے راستے میں نعیم بن عبداللہ (جو مسلمان تھے) سے ملاقات ہوئی تو نعیم نے انہیں کہا ''کہاں کا ارادہ ہے؟ عمرؓ نے بتایا تو انہوں نے کہا پہلے اپنے گھر کی خبر تو لے لو۔ کہا وہ کیا؟ نعیم نے بتایا تیری بہن اور تیرا بہنوئی سعید بن زید اسلام قبول کر چکے ہیں۔ حضرت عمر وہاں سے سیدھا بہنوئی کے گھر آئے۔ حضرت عمر فرماتے ہیں جب ایک یا دو آدمی مسلمان ہو جاتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ایک ایسے آدمی کے ساتھ جوڑ دیتے تھے جس کے پاس کھانے پینے کا سامان بہم ہوتا، وہ اسی کے پاس رہتے، اس کے ہاں کھانا کھاتے، فرماتے ہیں آپ نے میرے بہنوئی کے ساتھ بھی دو آدمی جوڑ دیے تھے، جب میں بہنوئی کے گھر پہنچا اور دروازہ کھٹکھٹایا تو پوچھا کون؟ میں نے جواب دیا ابن الخطاب۔ مزید فرماتے ہیں:

قد کان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اذا اسلم الرجل والرجلان ممن لاشئ لهٗ ضمّهما رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم الی الرجل الذی فی یدہ السعة فینا لا من فضل طعامه. (دلائل النبوۃ ج۲، ۲۱۶)

''ایسے افراد جن کے پاس (کھانے پینے کو) کچھ نہ ہوتا تھا جب ان میں ایک یا دو مسلمان ہو

جاتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کی یہ ترتیب تھی کہ) انہیں مالی طور پر وسعت رکھنے والے آدمی کے ساتھ جوڑ دیتے تھے، تو وہ دونوں اس کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔''

داعی ایک دوسرے سے تعاون کریں

ارکانِ دعوت کے درمیان نظم وضبط اور ایک دوسرے سے محبت وتعاون کے جذبات کا پایا جانا ضروری ہے، لہٰذا امیر دعوت کو چاہئے کہ وہ ایسی ترتیب بنائے جس کے ذریعے یہ چیزیں ان کے اندر پیدا ہوں۔ جو حضرات سماجی ومعاشی طور پر کمزور ہوں ان کا خیال رکھنا چاہئے، مخیّر ارکانِ دعوت کو ان کے مسائل حل کرنے اور ان پر خرچ کرنے کی تلقین کرنی چاہئے، اسی طرح دعوت قبول کرنے کے نتیجے میں جن حضرات کو مالی مشکلات پیش آرہی ہیں یا ان کے رہائش اور ذریعۂ معاش کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا ہے تو اسے بھی حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ ان کی دلجوئی ہو اور وہ اپنے آپ کو بے یارو مددگار اور لاوارث سمجھ کر مایوسی وناامیدی کا شکار ہو کر دعوت اور دعوتی نظم سے دور ہو کر اس سے کٹ کر نہ رہ جائیں بلکہ حسبِ استطاعت انہیں سہارا دینے اور جوڑے رکھنے کی بھرپور سعی کی جائے ۔حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

المؤمن للمؤمن کالبنیان یشدّبعضه بعضاً ثم شبّک بین اصابعه.(صحیح البخاری کتاب الادب باب تعاون المؤمنین).

''ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے لئے دیوار کی مانند ہے کہ ایک دوسرے کے ذریعے قوت حاصل کرتے ہیں۔ پھر آپ نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کر کے دکھایا۔''

داعیہ کی جرأت واستقامت

عمر اپنے بہنوئی سعید بن زید پر جھپٹے، ان کی ڈاڑھی پکڑی، زمین پر گرایا اور ان کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گئے، ان کی بہن اپنے شوہر کو چھڑانے کے لئے آئی تو انہیں ایسا تھپڑ رسید کیا کہ چہرہ زخمی ہو گیا اور خون بہنا شروع ہو گیا، جب انہوں نے خون دیکھا تو وہ رونے لگیں اور انہیں غصہ بھی آیا تو کہا:

اتضربنی یا عدوّ اللہ علیٰ ان اوحّد اللہ لقد اسلمنا علیٰ رغم انفک یا ابن الخطاب ماکنت فاعلاً فافعل فقد اسلمتُ.(شرح الزرقانی ج ۲، ص ۵)

''اے اللہ کے دشمن! کیا تو اس بات پر مجھے مارتا ہے کہ میں ایک اللہ کو مانتی ہوں، تیری ناک خاک آلود ہو، ہم تو اسلام لا چکے ہیں، اے ابن خطاب! تو جو کچھ کرنا چاہتا ہے کر گزر میں تو اسلام لا چکی۔''

حضرت عمرؓ کے جبر وتشدد سہنے کے باوجود ان کی بہن کی جرأت ایمانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عقائد ونظریاتِ حقہ پر انہیں اس قدر یقین تھا، ایمان اس قدر ان کے دلوں میں گھر کر چکا تھا اور اللہ کی توحید و وحدانیت نے ان کے اندر اس قدر جرأت وشجاعت پیدا کر دی تھی کہ وہ ہر قسم کا ظلم وستم بخوشی سہہ بھی رہی تھیں اور آئندہ پیش آنے والی ہر مصیبت کا سامنا کرنے کیلئے بھی تیار تھیں، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے سخت گیر بھائی سے بالکل نہیں ڈریں اور نہ کسی طرح خوفزدہ ہوئی ہیں بلکہ انتہائی جرأت کے ساتھ اپنے قبولِ اسلام کا برملا اظہار کر رہی ہیں۔

حلقہ ہائے تعلیم وتربیت

علامہ زرقانی لکھتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا ''مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں بتلایئے! اس وقت یہ لوگ جو اس کی بہن کے گھر میں (چھپے ہوئے) تھے باہر نکل آئے، یعنی سعید بن زید اور خباب بن الارت جو ان دو آدمیوں میں سے ایک تھے جنہیں مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت سعید کے سپرد کر دیا تھا۔''

كان خباب يقرؤهم القرآن. (شرح زرقانی ج ۲، ص ۷)

''خباب انہیں قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے۔''

كان القوم جلوساً يقرؤن صحيفة معهم قال فلما سمعوا صوتي تبادروا واختفوا وتركوا أو نسوا الصحيفة من ايديهم (عيون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسير ج اول ص ۲۱۶)

''(گھر کے اندر موجود) لوگ بیٹھے ایک صحیفہ پڑھ رہے تھے جب انہوں نے میری آواز سنی تو ڈر کے مارے بھاگے اور چھپ گئے اور صحیفہ وہیں چھوڑ گئے یا بھول گئے۔''

کمزور افراد کو بااثر اور مخیّر حضرات کے ساتھ جوڑنے کے تین مقاصد تھے:

(۱) ان کا معاشی مسئلہ حل کرنا

(۲) حلقہ ہائے تعلیم وتربیت قائم کرنا۔

(۳) مخیّر حضرات میں انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا کرنا۔

دعوت کے ابتدائی سالوں میں تعلیم وتربیت کے حلقوں کا قیام ناگزیر ہے جس میں نئے ارکانِ دعوت کو دعوت کا مکمل نصاب پڑھایا جائے اور ان کی روحانی واخلاقی اور فکری ونظریاتی تربیت کی

جائے۔انہیں اپنے اعمال اورافکار ونظریات کی اصلاح کے ساتھ ساتھ دعوت کی اشاعت اوراسلامی معاشرت اورنظام نافذ کرنے کے لئے انتہائی محنت اورجذبے کے ساتھ آگے بڑھنے کے لئے تیارکیاجائے۔تعلیم وتربیت حاصل کرنے کے بعد ہی ارکانِ دعوت داعی بن کر دعوت کی اشاعت اوراس کی ترجمانی کا کام بہتر طور پر سرانجام دے سکتے ہیں۔

مخالفین کوبھی دعوت کانصاب دیا جائے

حضرت عمرؓ نے وہ صحیفہ دیکھنا چاہاتوان کی بہن نے صاف اوردوٹوک الفاظ میں ان پرواضح کیا''تو ناپاک ہے جاؤغسل کرویاوضوکر،اس لئے کہ یہ ایسی کتاب ہے جسے صرف پاکیزہ لوگ ہاتھ لگا سکتے ہیں''وہ غسل کیلئے نکلےتو خباب بھی باہرنکل آئے اورکہا''کیا تو ایک کافرکواللہ کی کتاب دیتی ہے؟کہا ہاں!مجھےاللہ سےامید ہے کہ وہ میرے بھائی کوہدایت دیں گے۔''(شرح الزرقانی ج ۲،ص ٦)

فاطمہ کااپنے بھائی کوصحیفہ اس امید پر دینا کہ شاید وہ ایمان لے آئیں،اس بات کا ثبوت ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں کی بھی خواہش ہوتی تھی کہ لوگ ایمان لے آئیں،چنانچہ وہ اس کے لئے اپنے دائرہ کار کےاندررہتے ہوئے حسب استطاعت وسائل دعوت بھی استعمال کرتی تھیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگرکوئی مخالفِ دعوت ،دعوت کانصاب اورکتاب(لٹریچر) مانگے تواسے اس امید پر دے دیاجائے کہ شاید مطالعے کے بعداس پردعوت کی حقانیت اورصداقت واضح ہوجائے اوروہ دعوت قبول کرلے،کیونکہ تسلی کے ساتھ اور پرسکون ہوکر کتاب پڑھی جائےتواس پرآدمی غوروفکر کرسکتا ہے،جس کے نتیجے میں اس کااثرضرورہوتا ہے۔

اگرداعی مخالف کولٹریچر دیتا ہےتواسے تاکید کرے کہ اسے توجہ سے پڑھواوراس پرغوروفکر کروکہ اس میں بیان کردہ عقائدونظریات برحق ہیں یانہیں؟اگرمخالف بھی دعوتی لٹریچرغوروفکر کے ساتھ پڑھےتو وہ اس نتیجے پرضرورپہنچے گاکہ یہ افکارونظریات برحق ہیں۔پھرامید ہے کہ وہ دعوت کوقبول بھی کرلے گا جیسا کہ حضرت عمرؓ نے کیا تھا۔

حضرت عمرؓ دارارقم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکرمشرف بہ اسلام ہوئے۔

جماعت کااظہارنہ کرنے کی حکمت

اسلام قبول کرنے کے بعدعمر نے عرض کیا''اے اللہ کے رسول!ہم اپنا دین کیوں مخفی رکھیں

حالانکہ ہم حق پر ہیں، وہ اپنے دین کا کھلم کھلا اظہار کرتے ہیں حالانکہ وہ باطل پر ہیں۔'' اس پر آپ نے انہیں فی الحال کھلم کھلا جماعت کا اظہار نہ کرنے کی حکمت سمجھاتے ہوئے فرمایا:

یاعمر إنا قلیل قد رأیت ما لقینا.

''اے عمر! ہم اس وقت تھوڑے لوگ ہیں اور جو تکالیف ہمیں پہنچی ہیں آپ انہیں جانتے تو ہیں۔''

تین سال تک خفیہ طور پر دعوت دینے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چوتھے سال کھلم کھلا دعوت دینے کا سلسلہ شروع کر دیا لیکن جماعت کا اظہار اس طرح نہیں ہوا کہ آپ اپنے صحابہ کے ساتھ باقاعدہ ایک جماعت کی شکل میں عوامی مقامات پر آئے ہوں اور کھلم کھلا عبادات ادا کرتے ہوں۔ جب حضرت عمرؓ جیسی بااثر، جری اور شجاع شخصیت نے اسلام قبول کر لیا تو اس کے بعد جماعت کا اظہا کیا گیا، لہٰذا اظہارِ دعوت کے ساتھ ساتھ اظہارِ جماعت ضروری نہیں ہے۔ جماعت کا بحیثیت جماعت اظہار کے لئے موزوں وقت کا انتظار ناگزیر ہے، کیونکہ عجلت اور جلد بازی میں اس کے منفی نتائج بھی سامنے آ سکتے ہیں

فکر اور عمل کا رخ تبدیل ہو جاتا ہے

حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

فوالذی بعثک بالحق لایبقی مجلس جلستُ فیہ بالکفر إلاأظهرت فیه الإیمان.

''قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر مبعوث کیا ہے میں جس مجلس میں بھی کفر کی حالت میں بیٹھتا رہا ہوں، اس میں اپنے ایمان کا اظہار ضرور کروں گا۔''

دعوت قبول کرنے کے بعد داعی کا ذہن اور فکر و عمل کا رخ بالکل تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر دعوت قبول کرنے والا آدمی بہادر، دلیر اور سخت گیر ہے تو دعوت قبول کرنے کے بعد اس کے فکر و عمل کا رخ تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ جس جرأت و شجاعت اور بیباکی کے ساتھ باطل کی حمایت کرتا اور اہلِ حق کے خلاف کاروائیاں کرتا تھا دعوت قبول کر لینے کے بعد اس کی ان خوبیوں کا رخ تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ انتہائی اخلاص، محنت اور جرأت کے ساتھ دعوت کی اشاعت اور اس کی تبلیغ کے لئے کوشاں ہو جاتا ہے۔ یہی طرزِ عمل حضرت عمرؓ نے اختیار کیا کہ آپ سے عرض کیا کہ جس جس جگہ بیٹھ کر وہ کفر کیا کرتے تھے انہی مجالس میں بیٹھ کر اپنے ایمان کا اظہار کریں گے اور یوں گذشتہ زندگی کی تلافی کریں گے۔

جیسا کہ ماقبل میں بھی لکھا جا چکا ہے کہ سابقین اولین نے پیش آنے والی مشکلات کو خندہ پیشانی

سے قبول کیا اور انہیں اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتے تھے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قبول اسلام کے بعد اپنے اسلام کا اظہار کرنا چاہا تو اس کی وجہ یہ بتائی:

واحببت ان یظھر اسلامی و اَن یصبنی مایصیب من اسلم من الضرر والاھانۃ.(السیرۃ الحلبیہ ج ۱،ص ۳۱۵)

''مجھے یہ بات محبوب ہے کہ (لوگوں کے سامنے) میرا اسلام ظاہر ہو اور مجھے بھی اس نقصان اور توہین آمیز سلوک کا سامنا کرنا پڑے جن کا مسلمانوں کو سامنا کرنا پڑا ہے۔''

جیسا کہ ماقبل میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ آزمائش وابتلاء درجات کی بلندی کا باعث ہے۔ دراصل حضرت عمرؓ اپنے اسلام کا اظہار کر کے اور مصائب ومشکلات کا سامنا کر کے اپنے سے پہلے اسلام قبول کرنے کے نتیجے میں مصائب ومشکلات برداشت کرنے والے صحابہ کرامؓ کا رتبہ اور فضیلت حاصل کرنا چاہتے تھے،لہٰذا داعی کو چاہئے کہ وہ صحابہ کرام کی طرح اپنے سے پہلے دعوت قبول کرنا والے حضرات کا رتبہ اور فضیلت حاصل کرنے کی کوشش کرے اور پیش آنے والے مصائب وآلام کو درجات کی بلندی کا باعث سمجھے۔

دعوت کا بطورِ جماعت اظہار

حضرت عمرؓ سے ان کے لقب ''الفاروق'' کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب مخفی رہ رہے تھے۔ جب میں نے اسلام قبول کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، یارسول اللہ! کیا ہم حق پر نہیں ہیں، زندہ رہیں یا مر جائیں؟ فرمایا کیوں نہیں، قسم ہے! اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، آپ حق پر ہیں زندہ رہو یا مر جاؤ۔ میں نے کہا پھر چھپنا کس بات کا؟ پھر عرض کیا:

''قسم ہے! اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، ہم ضرور باہر (اعلانیہ) نکلیں گے۔ پس ہم دو صفیں بنا کر نکلے ایک میں حمزہ اور دوسری میں مَیں تھا۔ اس جماعت کے چلنے کی وجہ سے زمین سے غبار اڑ رہا تھا۔'' (السیرۃ الحلبیۃ ج۱،ص ۳۱۹)

ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ مسلمان باہر نکلے، عمر اُن کے آگے تھے، ان کے ہاتھ میں تلوار تھی، وہ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کی ندا کرتے جاتے ہیں، جب مسجد حرام میں داخل ہوئے تو انہوں نے چیخ کر قریش کو سنواتے ہوئے کہا:

''تم میں سے جس کسی نے بھی (ہمارے خلاف) حرکت کی تو میں اپنی تلوار کے ساتھ اس کا کام تمام کردوں گا۔''

پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے ہو گئے، اس وقت آپ نے اور مسلمانوں نے طواف کیا، پھر کعبہ کے گرد نماز پڑھی اور اونچی آواز میں قرآن پڑھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کا طواف کیا اور اعلانیہ ظہر کی نماز پڑھائی۔

''اسی دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام ''الفاروق'' رکھا کہ اللہ نے میرے ذریعے حق و باطل کے درمیان تفریق پیدا کردی۔'' (السیر ۃالحلبیۃ ج ا،ص ۳۱۹)

یوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کا طواف کرتے اور انفرادی طور پر نماز بھی پڑھتے تھے ،لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ آپ صحابہ کرامؓ کی جماعت کے ساتھ اعلانیہ مسجد حرام میں آئے ،صحابہ کرام کو نماز پڑھائی اور انہوں نے بآواز بلند قرآن کی تلاوت کی۔اس سے پہلے ایسا اس لئے نہ ہو سکا کہ معتد بہ تعداد ہونے کے باوجود مسلمانوں کی تعداد کفار کے مقابلے میں بہت کم تھی اور اس جماعت میں بڑے بڑے گھرانوں کے افراد کے شامل ہونے کے باوجود حضرت حمزہ اور حضرت عمرؓ جیسے بااثر ،طاقتور اور کسی سے نہ ڈرنے اور حق پر مر مٹنے والے شجاع وبہادر کی ضرورت تھی، چنانچہ جیسے ہی یہ دونوں طاقتور شخصیات مشرف بہ اسلام ہوگئیں تو صحابہ کرام دوصفوں میں ان کی قیادت میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت وسیادت میں مسجد حرام پہنچے اور یوں دعوت کا بطور جماعت اظہار ہوا۔

حلقہ جات

حضرت صہیب سے روایت ہے:

لما اسلم عمر جلسنا حول البیت حلقاً (السیرۃ الحلبیۃ ج ا ،ص ۳۱۸)

''جب عمرؓ مسلمان ہوئے تو ہم بیت اللہ کے اردگرد حلقے بنا کر بیٹھے۔''

سرداروں کو بھی مصائب

اسلام قبول کرنے پر نہ صرف کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد نے مشرکینِ مکہ کے ظلم وستم سہے بلکہ سرداروں اور بااثر شخصیات کو بھی اس امتحان سے گزرنا پڑا ہے، حضرت عمرؓ مسلمان ہوئے تو سردارانِ قریش میں سے ہونے کے باوجود آپ کو بھی اس مرحلے سے گزرنا پڑا، چنانچہ اسلام قبول کیا تو مشرکین نے آپ کے قتل کے ارادے سے آپ کے گھر پر ہلہ بول دیا۔امام بخاری ابن عمرؓ سے

روایت کرتے ہیں کہ "اسلام قبول کرنے اور اس کے اعلانیہ اظہار کے بعد مشرکین مکہ کی کثیر تعداد نے ہمارے گھر کا محاصرہ کر لیا، جو عمرؓ کو قتل کرنے کے ارادے سے آئے تھے۔ عمرؓ اپنے گھر میں خوفزدہ بیٹھے تھے کہ ان کے پاس عاص بن وائل السہمی آئے اور ماجرا پوچھا، تو انہوں نے بتایا:

زعم قومک انهم سیقتلونی ان اسلمت قال لا سبیل الیک بعد انْ قال آمنت. (صحیح البخاری کتاب المناقب باب اسلام عمربن الخطاب ایضاًشرح الزرقانی ج ۲، ص ۹)

"تمہاری قوم مجھے قتل کرنا چاہتی ہے کیونکہ میں مسلمان ہو چکا ہوں، کہا کہ جب میں نے امن دے دیا کسی کی آپ تک رسائی نہیں ہوگی۔"

مؤثر اشخاص کے قبولِ دعوت سے دعوت میں قوت

معاشرے کے بااثر اور بڑی حیثیت و مقام کے حامل افراد اگرچہ کم ہی دعوتِ حقہ کو قبول کرتے ہیں لیکن اس کے کافی مثبت نتائج سامنے آتے ہیں، چونکہ ان کی عقل و دانش، عاقبت اندیشی اور معاملہ فہمی لوگوں میں مانی ہوئی ہوتی ہے اس لئے ان کے دعوت قبول کرنے کے بعد لوگ اس دعوت کے بارے میں سنجیدگی سے غور و فکر کرتے ہیں اور یوں یہ دعوت مقبولیت حاصل کرتی جاتی ہے۔ امام بخاری حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں:

مازلنااعزة منذاسلم عمر. (صحیح البخاری کتاب المناقب باب اسلام عمربن الخطاب)

"جب سے عمرؓ اسلام لائے تب سے ہم معزز اور قوی ہو گئے۔"

موثر شخصیات کی شمولیت کے دوررس نتائج

ابن ہشام، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کرتے ہیں:

ان اسلام عمر کان فتحاً و ان هجرته کانت نصراً و ان امارته کانت رحمةً

(السیرة لابن هشام ج ا ص ۳۴۲)

"عمرؓ کا قبولِ اسلام، اسلام کی فتح ہے، ان کی ہجرت اسلام کی نصرت کا ذریعہ اور ان کی امارت (زمانۂ خلافت) رحمت کا باعث ہے۔"

حضرت عمرؓ جیسے شخصیات کے دعوت قبول کرنے کے دوررس نتائج نکلتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ وقتی طور پر دعوت کو طاقت ملتی ہے اور اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ آئندہ چل کر بھی یہ اپنی صلاحیتیں دعوت کی اشاعت و توسیع اور اس کے غلبے کے لئے بھرپور طریقے سے صرف کرتے رہتے

ہیں جس کی بدولت دعوت روز بروز ترقی کرتی جاتی ہے اور اسے کامیابیاں حاصل ہوتی جاتی ہیں، جن کا سلسلہ دعوت کے افکار ونظریات پر مبنی نظام کے قیام کے بعد تک بھی جاری رہتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ؓ کی زمانہ خلافت کی خدمات تاریخ اسلام کا روشن ترین باب ہے۔

دعوت کا واضح ظہور

حضرت عمرؓ کے اسلام قبول کرنے کے بعد نبوت کے چھٹے سال میں دعوتِ اسلام کس مرحلے میں تھی اس سے متعلق حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھویؒ لکھتے ہیں:

وفیھا عزّ الاسلام وابتشر المسلمون باسلام عمر رضی اللہ عنہ وظھر الاسلام ظھوراً۔ (بذل القوۃ ص ۲۳، ۲۴)

''چھٹے سال میں اسلام مقام ومرتبہ پا چکا تھا، عمرؓ کے قبولِ اسلام پر مسلمانوں کو خوشی حاصل ہوئی تھی، اسلام کا واضح طور پر ظہور ہو چکا تھا۔''

بھائی چارہ

ارکانِ جماعت مختلف طبقات سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے درمیان خاندانی وسماجی اور مالی واقتصادی حیثیت میں تفاوت ہوتا ہے، اس لئے امیر دعوت پر یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ ایسے **اقدامات** کرے جن کے ذریعے ان کے درمیان پایا جانے والا تفاوت کم ہو، وہ ایک دوسرے کے قریب ہوں، ان میں اخوت و بھائی چارگی قائم ہو اور کمزور حیثیت والے بااثر افراد کا سہارا لے سکیں، انہی امور کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام میں مواخات (بھائی چارہ) قائم کیا۔ مشہور تو یہی ہے کہ مواخات ہجرتِ مدینہ کے بعد مدینہ میں مہاجرین اور انصار کے درمیان قائم کی گئی ہے، لیکن سیرت نگاروں نے مکی زندگی میں بھی مواخات کا ذکر کیا ہے، چنانچہ علامہ حلبیؒ لکھتے ہیں:

وبعض المھاجرین کان اقوی من بعض بالمال والعشیرۃ فآخی بین الاعلیٰ والادنیٰ لیرتفق الادنیٰ بالاعلیٰ ویستعین الاعلیٰ بالادنیٰ۔ (السیرۃ الحلبیۃ ج ۱، ص ۴۱۴)

''بعض مہاجرین بعض سے خاندانی اور مالی اعتبار سے زیادہ طاقتور تھے تو آپ ﷺ نے اعلیٰ اور ادنیٰ کے درمیان مواخات قائم کی تاکہ ادنیٰ اعلیٰ سے نفع حاصل کرے اور اعلیٰ ادنیٰ سے مدد حاصل کر سکے۔''

یعنی اس میں دونوں افراد کا فائدہ ہے کہ کمزور کا معاشی مسئلہ حل ہو جائے گا اور تحفظ بھی ملے گا جبکہ اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والے کو کمزور کا تعاون حاصل رہے گا اور وہ وقتاً فوقتاً اس کے ساتھ کام کاج

میں شریک رہے گا۔ نیز اس طرح تعلیم وتعلم اور باہمی مذاکرے کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔ علامہ حلبی لکھتے ہیں:

''ہجرت سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں یعنی مہاجرین کے درمیان حق پر (قائم رہنے) اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کی بنیاد پر مواخات قائم کی، چنانچہ ابوبکر اور عمر کے درمیان بھائی چارگی قائم فرمائی۔'' (السیرۃ الحلبیۃ ج ا ص ۴۱۴)

ارکانِ دعوت کو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک کریں، ایک دوسرے کا خیال کریں اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوں خصوصاً مخیّر حضرات کو معاشی طور پر کمزور ساتھیوں کا خصوصی طور پر خیال کرنا چاہیے اور ان کے معاشی مسائل حل کرنے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے۔

داعی حسبِ استطاعت دعوت دے

دعوت قبول کرنے والے ہر فرد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس دعوت کو آگے پھیلائے اور اس کے لئے حسبِ استطاعت وسائل و ذرائع اختیار کرے، اگر کمزور ہے اور اعلانیہ دعوت دینے کی ہمت نہیں رکھتا تو مخفی دعوت دے اور طاقتور اور با اثر ہو تو بلا خوف وخطر اعلانیہ دعوت دے تا کہ صدائے حق زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اور دور دور تک پہنچے اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہو کر قبول کرنے پر آمادہ ہوں، جیسا کہ امام ابن جوزیؒ نقل کرتے ہیں:

كان أبوبكر و عثمان و سعيد بن زيد و أبو عبيدة بن الجراح يدعون إلى الإسلام سرا و كان عمر و حمزة يدعوان علانية فغضبت قريش لذلك. (صفة الصفوة لا بن جوزى، ص ۱۴)

''ابوبکر، عثمان، سعید بن زید اور ابوعبیدۃ بن الجراح مخفی طور پر اسلام کی دعوت دیتے جبکہ عمر اور حمزہ دونوں علانیہ دعوت دیتے تھے، جس سے قریش غضبناک ہو گئے۔''

مقاطعہ (معاشرتی اور اقتصادی پابندیاں)

جب دعوتِ حقہ پھیلتی جاتی ہے اور اسے مقبولیت مل رہی ہوتی ہے تو اس کے مخالفین کی بے چینی بھی بڑھتی جاتی ہے اور وہ اس کے خلاف ہر ممکن حربہ استعمال کرتے ہیں، داعیانِ حق پر ظلم وستم بڑھا دیا جاتا ہے، انہیں انواع واقسام کی سزائیں دی جاتی ہے الغرض جو ان کے بس میں ہوتا ہے وہ کرتے

ہیں۔امیرِ دعوت کا کام تمام کرنے کے لئے مسلسل منصوبے بنائے جاتے ہیں خصوصاً جب دعوت کی مقبولیت میں اضافے کے ساتھ ساتھ بااثر افراد کی شمولیت سے وہ طاقت پکڑ رہی ہو تو مخالفین کا غیض وغضب بڑھ جاتا ہے اور وہ دعوت کا راستہ روکنے کے لئے بے چین ہو جاتے ہیں، پھر کچھ ہوتا نظر نہیں آتا تو امیرِ دعوت اور اس کے احباب ورفقاء کا کلی مقاطعہ (بائیکاٹ) کا فیصلہ کرلیا جاتا ہے اور سماجی ومعاشرتی، معاشی واقتصادی اور سیاسی پابندیاں عائد کردی جاتی ہیں، جیسا کہ علامہ حلبی لکھتے ہیں:

''کفارِ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے پر اتفاق کرلیا اور کہا کہ اس نے ہمارے بچوں اور عورتوں کو خراب کر دیا ہے۔ دگنی دیت جمع کرلو اور اس کو قریش کا کوئی آدمی ہی قتل کرے تاکہ ہم سب سکون پاسکیں۔ خاندان عبدالمطلب نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔''

(السیرۃ الحلبیۃ ج۱ص۳۲۱)

مقاطعہ کیوں؟

ابن اسحاق روایت کرتے ہیں:

فلمّا رأت قريش انّ اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم قدنزلوا بلدا اصابوا امناً وقراراً و انَ النجاشى قد منع من لجأ اليه منهم و ان عمر قد اسلم فكان هو و حمزة بن عبدالمطلب مع رسول الله واصحابه و جعل الاسلام يفشو فى القبائل اجتمعوا وائتمروا اَن يكتبوا كتاباً يتعاقدون فيه على بنى هاشم علىٰ ان لا ينكحو اليهم ولا ينكحوهم ولا يبيعوهم شيئاً ولا يبتاعوا منهم.

(السيرة لابن هشام ج ٢ ص ايضاً الكامل فى التاريخ ج ٢ ص٨٧)

''جب قریش نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ایک ایسے ملک میں چلے گئے ہیں جہاں انہیں امان اور قرار (ٹھکانہ) ملا، نجاشی نے پناہ گزینوں کو تحفظ دیا ہے، عمرؓ اسلام قبول کر چکے ہیں، وہ اور حمزہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کے ساتھ مل گئے ہیں اور اسلام قبائل میں پھیلتا جارہا ہے تو وہ جمع ہوئے اور آپس میں مشورہ کیا کہ ایک عہد نامہ لکھا جائے جس میں بنو ہاشم کے خلاف معاہدہ کیا جائے کہ ان سے شادی بیاہ کا معاملہ نہ کیا جائے گا اور ان سے خرید وفروخت نہ کی جائے گی۔''

الغرض مقاطعہ کا فیصلہ ہوا اور اس کا عہد نامہ تیار کرنے اور کعبے میں لٹکانے کے بعد مسلمانوں کے

ساتھ جو کچھ ہوا، امام بیہقی، ابن اسحاق سے روایت کرتے ہیں کہ ''پھر وہ مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے، انہیں قید کیا، ایذائیں پہنچائیں تو ان کی آزمائش سخت ہوگئی اور بڑھتی گئی اور وہ جھنجھوڑ کر رکھ دیئے گئے۔ پھر (ابن اسحاق نے) شعب ابی طالب میں داخل ہونے کا طویل قصہ نقل کیا ہے اور یہ کہ انہیں وہاں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا:

''یہاں تک کہ بھوک کی وجہ بچوں کے چلانے کی آوازیں گھاٹی سے باہر تک سنی گئیں، حتیٰ کہ اکثر قریشیوں نے انہیں پہنچنے والی تکالیف کو ناپسند کیا اور ظالمانہ معاہدہ پر اپنی ناراضگی کا اظہار بھی کیا۔'' (دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۲، ص ۳۱۵)

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے اصحاب اور ابو طالب کی ترغیب پر خاندانی عصبیت کی بنیاد پر آپ کے ساتھ شعب ابی طالب محصور میں رہنے والے رشتے دار شاید پر سکون زندگی گزار رہے تھے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انہیں باقاعدہ طور پر محصور کر دیا گیا تھا، ان سے تمام تعلقات منقطع کر دیئے تھے اور معاشی طور پر کئی پابندیاں عائد کر دی تھیں، چنانچہ صاحب امتاع الاسماع لکھتے ہیں:

فصاروا فی شعب ابی طالب محصورین مضیّقاً علیهم اشد التضییق نحواً من ثلاث سنین وقد قطعوا عنهم المیسرة والمادّة فکانوا لایخرجون الّا من موسم الیٰ موسم حتی بلغهم الجهد. (امتاع الاسماع ج ۱، ص ۲۵)

''وہ لوگ تقریباً تین سال تک شعب ابی طالب میں انتہائی تنگ حالات میں محصور رہے، انہوں (مشرکین مکہ) نے آٹے اور گندم کی رسائی بند کر دی تھی، وہ لوگ ہر سال صرف حج کے موقع پر باہر نکل سکتے تھے یہاں تک انہیں انتہائی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔''

اسی طرح حافظ ابن عبدالبرؒ لکھتے ہیں:

''انہوں نے ان کے لئے بازار تک بند کر دیے، اس طرح بازاروں میں گندم، گھی تک نہ چھوڑا، جو چیز بھی بکنے کے لئے آتی وہ پہلے پہنچ جاتے اور ان (تاجروں) سے پہلے خرید لیتے۔''

(الدرر ص ۵۷)

مشرکین مکہ نے بازاروں میں آنے والی چیزیں مہنگے داموں میں خرید کر ان کی قیمتیں بڑھا دیں اور ان قیمتوں پر شعب ابی طالب کے محصورین کے لئے خریداری کرنا ممکن نہ تھا، اس لیے وہ خرید نے

سے رہ جاتے۔ یہ روایت تو شعب ابی طالب کے محصورین پر آنے والے مصائب و آلام کی ایک ادنیٰ سی جھلک ہے ورنہ جن حضرات نے عملاً ان مشکلات کو جھیلا وہ خود بھی ان کی شدت کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتے تھے۔

مقاطعہ کے زمانے میں دعوت

شعب ابی طالب میں محصور ہونے اور بے پناہ مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے دعوت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مشن تھا اور اس کے لئے وہ اس قدر مصائب جھیل رہے تھے، اس کی کیا صورت حال تھی؟ یاد رہے کہ ان حالات کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا سلسلہ جاری رکھا، جیسا کہ ابن ہشام لکھتے ہیں:

ورسول الله ﷺ على ذلك يدعو قومه ليلاً و نهاراً، وسراً و جهاراً، منادياً بأمر الله لا يتقي فيه أحداً من الناس. (السيرة لابن هشام ج ۲ ص ۵)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے باوجود اپنی قوم کو دن رات اور خفیہ اور اعلانیہ دعوت دیتے رہے، اللہ کے امر کی منادی کرتے رہے اور اس میں آپ کسی آدمی سے نہ ڈرتے تھے۔''

دعوت کا سلسلہ جاری رکھنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ اب آپ کو کوئی خطرہ لاحق نہ تھا اور پُر امن رہ رہے تھے، کیونکہ مشرکین مکہ کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے منصوبے کے بعد ہی ابو طالب اور ان کے خاندان کو شعب ابی طالب میں محصور ہونا پڑا اور یہ خطرہ ٹلا نہیں بلکہ برقرار تھا اور ابو طالب آپ کے لئے بہت فکرمند رہتے تھے۔ علامہ حلبی لکھتے ہیں:

''ابو طالب ہر رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بستر پر لیٹنے کا کہتے (آپ لیٹ جاتے) جب سب لوگ سو جاتے تو آپ اپنے بیٹوں یا بھتیجوں میں سے کسی کو کہتے کہ آپ کی جگہ لیٹ جائیں، یہ اس خوف سے کہ کہیں کوئی بدخواہ اچانک آپ کو قتل نہ کر دے۔'' (السيرة الحلبية ج ۱، ص ۳۲۶)

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے مقصد سے محبت اور لگن اور اپنے بنیادی فریضے کی ادائیگی کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کی یہ روشن دلیل ہے کہ پورا خاندان محصور ہے، کھانے کو کچھ ملتا نہیں، بازاروں میں اشیاء صرف کی قیمتیں قوتِ خرید سے باہر ہیں جس کی وجہ سے کچھ خرید نہیں سکتے، بھوک کی وجہ سے بڑے نڈھال اور بے حال جبکہ بچے چلا رہے ہیں، جن کی آوازیں گھاٹی سے باہر شہر مکہ میں سنائی دے رہی ہیں، مشکلات اس قدر ہیں کہ اکثر قریش بھی ان پر بے چین ہیں اور ہونے والے معاہدے کو

ظالمانہ قرار دے کر اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ ادھر آپ کے دشمنوں نے ابھی ہتھیار نہیں رکھے، تاک میں رہتے ہیں اور ابو طالب کو ہر وقت آپ کی جان کی سلامتی کی فکر رہتی ہے لیکن آپ ہیں کہ اپنے مشن اور کام میں لگے ہوئے ہیں، دن رات، خفیہ اور اعلانیہ دعوت دے رہے ہیں اور کسی قسم کا کوئی خوف نہیں۔

داعی کو چاہئے کہ وہ ہر قسم کی پابندیوں اور محاصروں کے باوجود اپنا کام جاری رکھے۔ دن ہو یا رات، خفیہ ہو یا اعلانیہ کسی نہ کسی شکل میں اپنی دعوت جاری رکھے، اس سے ذرا بھی پیچھے نہ ہٹے کیونکہ مخالفین اسی لئے ظلم وستم ڈھاتے ہیں اور قتل وغارت گری کے منصوبے بھی اسی لئے بناتے ہیں کہ داعی ان مشکلات میں گھر کر دعوت سے باز آجائے۔ اگر داعی دعوت ترک کر دیتا ہے تو ان کا مقصد تو پورا ہو گیا، لہٰذا دعوت تسلسل سے جاری رہے البتہ اس کی ترتیب اور شکلیں تبدیل کی جاسکتی ہیں۔

دعوت پر پابندیاں اور اس کا مستقبل

جیسے جیسے کوئی دعوت یا تحریک مقبول ہوتی جاتی ہے اور بااثر افراد کی شمولیت کی وجہ سے زور پکڑتی جاتی ہے ویسے ویسے اس کی مخالفت کی شدت میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے، پھر ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے کہ دعوت نظریاتی وفکری طور پر مضبوط ہو چکی ہے لیکن مخالفین اس پر مختلف پابندیاں لگا دیتے ہیں جو کہ بعض اوقات کئی سالوں پر محیط ہوتی ہیں، اس دوران اگرچہ بظاہر یہی لگتا ہے کہ دعوت ختم ہو گئی یا اربابِ دعوت منتشر ہو گئے ہیں یا وہ متحرک نہیں ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ اس کا سلسلہ کسی دوسری ترتیب اور نظم کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ اس لئے دعوت کے ساتھ قلبی تعلق رکھنے والے یا خود داعی حضرات کو چاہیے کہ وہ ان ظاہری حالات کی وجہ سے دعوت کے مستقبل کے حوالے سے مایوس نہ ہوں بلکہ مرکزی قیادت کی طرف سے جاری کردہ ترتیب اور نظم کے مطابق کام کرتے رہیں، اس مدت کو عبوری اور عارضی سمجھیں اور اس بات پر یقین رکھیں کہ یہ عارضی پابندیاں بالآخر ختم ہوں گے اور اربابِ دعوت، دعوت کے لیے دوبارہ نئے سرے سے نئے عزم کے ساتھ اعلانیہ اٹھ کھڑے ہوں گے اور غلبۂ دین کی جدوجہد کو آگے بڑھائیں گے جیسا کہ شعب ابی طالب سے نکلنے کے بعد صرف تیسرے سال میں نصرت حاصل ہوگئی اور مدینہ میں دعوت کا مرکز قائم ہوا، جہاں سے جہاد کا سلسلہ شروع ہوا اور ۸ھ میں مکہ فتح کر لیا گیا۔

الحاصل پابندی کے زمانے کے دوران (۱) نہ تو مایوسی وناامیدی پیدا ہو (۲) اور نہ اربابِ دعوت

دعوت چھوڑیں بلکہ متبادل ترتیب اور نظم کے ساتھ کام جاری رکھیں۔

قریش کے کچھ باضمیر اور درددل رکھنے والے افراد کے دل میں اس ظالمانہ معاہدہ کے خلاف نفرت پیدا ہوئی اور انہوں نے اسے ختم کروانے کے لیے کوشش شروع کر دی، اس حوالے سے ہشام بن عمرو بن ربیعہ پیش پیش تھے۔ اس دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بذریعہ وحی ابو طالب کو یہ بتا چکے تھے کہ معاہدے کے کاغذ کو دیمک چاٹ کر ختم کر چکی ہے، چنانچہ ابو طالب نے قریش کو بتلایا اور اسے دیکھا گیا تو واقعی ایسا تھا، اس لیے اسے پھاڑ کر پھینک دیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خاندان سمیت شعب ابی طالب سے نکل کر اپنے گھروں میں آئے۔

بااثر داعیوں کی تشکیل

حضرت طفیل بن عمرو الدوسیؓ بہت بڑے شاعر، ذہین ترین اور اپنی قوم کے سردار تھے۔ مکہ میں آئے تو مشرکین مکہ نے انہیں کہا کہ تم ہمارے شہر میں آئے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے ہاں ایک آدمی ہے جس سے تمہیں بچنا ہوگا، اس کے کلام میں جادو کی سی تاثیر ہے، اس لیے ہمارا مشورہ ہے کہ:

فلاتکلمنه و لاتسمعن منه شیئًا .(السیرة لابن هشام ج ۲ ص ۲۴)

''تم اس سے کوئی بات کرو اور نہ اس کی بات سنو۔''

حضرت طفیل بن عمرو الدوسیؓ فرماتے ہیں مشرکین کی باتیں سننے کے بعد میں نے عزم کر لیا کہ میں آپ سے کوئی بات کروں گا اور نہ کوئی بات سنوں گا، چنانچہ صبح کانوں میں روئی ڈال کر مسجدِ حرام گیا تا کہ آپ کی بات سنائی نہ دے۔ آپ کعبہ کے پاس کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ میں قریب کھڑا ہو گیا اور آپ سے ایک عمدہ کلام سنا تو اپنے آپ سے کہا کہ جب تم سمجھدار، شاعر اور اچھی بری بات کی تمیز کر سکتے ہو تو ان کی بات سننے میں کیا حرج ہے۔ آپ نماز سے فارغ ہوئے اور گھر کی طرف چل پڑے، میں بھی پیچھے چل پڑا۔ آپ سے ملا، آپ کی دعوت سنی اور مسلمان ہو گیا تو آپ سے عرض کیا:

''اے اللہ کے نبی! میں اپنی قوم کا سردار ہوں، میں ان کی طرف واپس لوٹ جاتا ہوں میں انہیں اسلام کی دعوت دوں گا، آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ میرے لئے (کوئی چیز) بطور مدد پیدا کر دیں۔'' (عیون الاثر ج ۱ ص ۲۴۰)

آپ نے دعا فرمائی، پھر میں اپنی قوم کی طرف روانہ ہو گیا۔

دعوت کا طریقۂ کار

مایوس نہ ہونا چاہیے اور دعوت مسلسل دینی چاہیے۔ اس لیے کہ دعوت کے ابتدائی زمانے میں بہت کم لوگ دعوت کو قبول کرتے ہیں جبکہ اس کو مسترد کرنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔ داعی کو طعن و تشنیع کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو بعض اوقات دل میں مایوسی پیدا ہوتی ہے اور ہمت جواب دینے لگتی ہے، اس لئے داعی پر لازم ہے کہ وہ اس طرح کے حالات کا سامنا کرنے کے لئے پہلے ہی ذہنی طور پر تیار ہو اور مایوس اور نا امید نہ ہو۔ حضرت طفیل فرماتے ہیں پھر میں نے قومِ دوس کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے اسے قبول کرنے میں سستی و کاہلی کا مظاہرہ کیا تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مکہ حاضر ہوا اور ان سے عرض کیا، اے اللہ کے نبی! دوس میں زنا عام ہے اور یوں وہ مجھ پر غالب آئے ہوئے ہیں ۔میری دعوت قبول نہیں کر رہے آپ ان کے لئے بددعا کیجئے۔ آپ نے بددعا کی بجائے دعا کرتے ہوئے فرمایا ''اے اللہ! قومِ دوس کو ہدایت عطا فرما۔'' پھر مجھ سے ارشاد فرمایا:

ارجع الیٰ قومک فادعھم وارفق بھم

''تم اپنی قوم میں لوٹ جاؤ، انہیں دعوت دو اور ان سے (دعوت میں) نرمی کا معاملہ کرو۔''

فرماتے ہیں:

فلم ازل بارض دوس ادعوھم الی الاسلام . (السیرۃ لابن ھشام ج ۱ ص ۲۵)

''میں قومِ دوس کو اسلام کی دعوت دیتا رہا۔''

یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت فرمائی اور بدر، احد اور خندق کے غزوات بھی گزر گئے تو میں اپنی قوم کے مسلمانوں کے ساتھ غزوۂ خیبر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ابن حزم لکھتے ہیں:

''حضرت طفیل اپنے علاقے میں مقیم (رہ کر دعوت دیتے) رہے یہاں تک کہ غزوۂ خندق کے بعد اپنی قوم کے تقریباً ستر خاندانوں کے افراد کو لے کر آئے اور خیبر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی۔'' (جوامع السیرۃ ص ٦٧)

اگر داعی اپنی قوم کے علاقے یا جہاں اس کی تشکیل کی گئی تھی وہاں سے مایوس ہو کر مرکز آئے تو امیرِ دعوت اور مرکزی قیادت کو چاہیے کہ وہ اس کی حوصلہ افزائی کریں اور اسے دوبارہ جا کر نرمی اور مزید بہتر

انداز اور اسلوب کے ساتھ دعوت جاری رکھنے کی ہدایات دیں۔ جب وہ استقامت کے ساتھ مسلسل دعوت دیتا رہے گا تو لوگ ضرور متاثر ہوں گے اور دعوت میں شمولیت اختیار کریں گے۔ جیسا کہ حضرت طفیلؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر عمل کیا تو قومِ دوس کے دہائیوں خاندان مسلمان ہو گئے۔

مفاہمت کی آخری کوشش

مقاطعہ کے ختم ہونے کے بعد نبوت کے دسویں سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرپرست اور معاون اور آپ کے چچا ابو طالب وفات پا گئے۔ جب ابو طالب کی وفات کا وقت قریب آیا تو قریش کے سردار ایک بار پھر ابو طالب کے پاس آئے اور ان سے کہا:

''آپ ہمارے بڑے اور سردار ہیں، آپ ہمارے ساتھ اپنے بھتیجے کے بارے میں انصاف کیجئے، آپ اسے حکم دیجئے کہ وہ ہمارے معبودوں کو سب وشتم کرنے سے باز آ جائیں اور ہم اس کا اور اس کے معبود کا پیچھا چھوڑ دیتے ہیں۔'' (الکامل لا بن اثیر، ج ۲، ص ۴۳)

ابو طالب نے آپ کو بلوایا اور کہا ''یہ لوگ آپ کی قوم کے سردار ہیں، وہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ آپ ان کے معبودوں کے سب وشتم سے باز آ جائیں اور وہ آپ کے معبود کا پیچھا چھوڑ دیں گے۔'' ابو طالب نے کہا ''اے بھتیجے! آپ اپنی قوم سے کیا چاہتے ہیں؟ امام بیہقی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یاعم! انما ارید منهم کلمة تذل لهم بها العرب وتؤدی الیهم بها الجزیة العجم کلمة واحدة. (دلائل النبوة للبیهقی ج ۲، ص ۳۴۵)

''اے چچا! میں ان سے ایک ایسا کلمہ قبول کروانا چاہتا ہوں جس کے ذریعے عرب ان کے آگے جھک جائیں گے اور عجم انہیں جزیہ ادا کریں گے، وہ ایک ہی کلمہ ہے۔''

ابوجہل نے کہا ''یہ کیا ہے؟ آپ پر میرا باپ قربان، ہم ایک یہ کلمہ کیا دس کلمات قبول کرنے کیلئے تیار ہیں۔''

آپ نے فرمایا ''تم لا الٰہ الا اللہ کہہ دو۔'' اس پر انہوں نے نفرت کا اظہار کیا اور کہا ''تم اس کے علاوہ کوئی دوسرا مطالبہ کرو۔'' آپ نے فرمایا:

''اگر تم سورج لا کر بھی میرے ہاتھ میں رکھ دو تو میں اس کے علاوہ کوئی دوسرا مطالبہ نہ کروں گا۔'' (الکامل لابن اثیر، ج ۲، ص ۴۴)

سردارانِ قریش غصہ میں آ گئے اور غصہ کی حالت میں کھڑے ہو گئے۔اور یہ کہتے ہوئے چلے گئے ''اللہ کی قسم! ہم تمہیں اور تمہارے معبود کو جو تمہیں اس بات کا حکم دیتا ہے، ضرور سب وشتم کریں گے۔'' اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

وَانْطَلَقَ الْمَلَأُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَ اصْبِرُوْا عَلٰى آلِهَتِكُمْ

''سرداروں کے ایک گروہ نے چلتے ہوئے کہا چلو اور اپنے معبودوں پر ڈٹ جاؤ۔''

دل قبول کرتا ہے، زبان انکار کرتی ہے

ابو طالب نے اپنی وفات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قریش کو وصیت کرتے ہوئے کہا کہ میں تمہیں محمد کے ساتھ بھلائی کرنے کی وصیت کرتا ہوں، مزید کہا:

وقد جاء بأمر قبله الجنان وأنكره اللسان مخافة الشنان أى البغض وهو لغة فى الشنآن وايم الله كأنى أنظر الى صعاليك العرب وأهل البر فى الاطراف والمستضعفين من الناس قد أجابوا دعوته وصدقوا كلمتهُ وعظموا أمره فخاض بهم غمرات الموت فصارت رؤساء قريش وصناديدها أذنابا ودورها خرابا وضعفاؤها أربابا. (ایضاً)

''وہ ایسی بات لے کر آئے ہیں جسے دل تو قبول کرتا ہے لیکن زبان ملامت وبغض کے خوف سے انکار کرتی ہے۔اللہ کی قسم! میں دیکھ رہا ہوں کہ عرب کے نچلے درجے کے لوگوں اور اطراف کے علاقے کے اور کمزور لوگ ان کی دعوت کو قبول کریں گے، ان کی بات کی تصدیق کریں گے، اس کی بات کی تعظیم کریں گے، سختیوں میں کود پڑیں گے۔پس قریش کے سردار اور بڑے بڑے لوگ پیچھے رہ جائیں گے۔ ان کے گھر برباد ہوں گے اور کمزور لوگ مالک بن جائیں گے۔''

چونکہ ابو طالب بعثت سے لے کر اب تک دعوت کے مراحل کا مسلسل مشاہدہ کرتے آرہے تھے اس لئے وہ چشم تصور سے دیکھ رہے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کیا کیا کامیابیاں اور فتوحات حاصل کر رہی ہے اور آئندہ حاصل کرے گی، چنانچہ ان کی مذکورہ تمام دور اندیشانہ باتیں درست ثابت ہوئیں۔چونکہ انہیں آپ کی دعوت کی کامیابی کا یقین تھا اس لئے آخر میں قریش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کی ترغیب دیتے ہوئے کہا:

یامعشر قریش کونوا له ولاة ولحزبه حماة، والله لایسلک أحد منكم سبيله

الارشد ولا یأخذأحد بهدیه الاسعد. (السیرة الحلبیة ج ۱، ص ۳۳۵، ایضاً الروض الانف ج ۱، ۲۵۹، ایضامدارج النبوة ج ۲ ص ۲۷، ۲۸)

''اے گروہ قریش! تم اس کے والی اور اس کی جماعت کے حامی بن جاؤ، اللہ کی قسم! تم میں سے جو بھی ان کے (بتائے ہوئے) راستے پر چلے گا ہدایت پا جائے گا اور جو بھی اس کے طریقے کو اختیار کرے گا سعادت مند ہو جائے گا۔''

ابو طالب کے قبولِ اسلام سے انکار میں حکمت

اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات حکیم ہے، اس کے ہر کام میں حکمت پنہاں ہوتی ہے۔ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی موثر و بلیغ دعوت کو معتد بہ افراد نے قبول کر لیا تھا جن میں چھوٹے بڑے، مرد عورتیں، غلام آزاد، امیر غریب، تاجر مزدور الغرض ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے حتی کہ آپ کے انتہائی قریبی رشتہ دار بھی ان میں شامل تھے۔ ابو طالب نے ہر مشکل گھڑی میں آپ کا ساتھ دیا، ہمیشہ آپ کے لئے ڈھال بنے رہے اور مشرکین مکہ کی مخالفت کی پروانہیں کی لیکن انہوں نے بذاتِ خود اسلام قبول نہیں کیا، کیا اس میں کوئی حکمت تھی؟ علامہ حلبی لکھتے ہیں:

لو اسلم ابو طالب و بادر اقرباؤه و بنوعمه الی الایمان به لقیل قوم ارادوا الفخر برجل منهم وتعصبوا لهٗ فلما بادر الیه الاباعد وقاتلوا علیٰ حبه من کان منهم حتی ان الشخص منهم یقتل اباه واخاه علم ان ذلک انما هو عن بصیرة صادقة ویقین ثابتٍ. (السیرة الحلبیة ج ۱، ص ۳۳۳)

''اگر ابو طالب مسلمان ہو جاتے اور دیگر اقرباء اور چچا زاد بھائی ابتداء میں ایمان لے آتے تو یہ اعتراض کیا جا سکتا تھا کہ یہ قوم (قریش خصوصاً بنو ہاشم) اپنے ایک آدمی کے ذریعے فخر حاصل کرنا چاہتی ہے اور وہ قومی عصبیت کی بنیاد پر ایسا کر رہی ہے، لیکن جب دور پار کے لوگوں نے اسلام قبول کیا اور آپ کی محبت میں (مخالفین سے) قتال کیا یہاں تک کہ ایک آدمی اپنے باپ اور بھائی کو بھی قتل کرنے پر تیار تھا تو لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ یہ اقدام سچی بصیرت اور یقین محکم کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔''

یعنی اگر ابو طالب اور آپ کے دیگر قریبی رشتہ دار ابتدا ہی میں اسلام قبول کر لیتے تو قبائل عرب اور دیگر اقوام کو یہ اعتراض کرنے کا موقع مل جاتا کہ قریش خصوصاً خاندانِ ہاشم اپنے ایک آدمی کی ایک فکر کی بدولت اپنی سرداری اور بادشاہت قائم کرنا چاہتا ہے تبھی تو فوراً اس نئے دین اور عقائد کو قبول

کرلیا ہے،لیکن جب ابوطالب نے اول سے آخر تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل حمایت جاری رکھنے اورآپ کے لئے شعب ابی طالب میں تین سال تک محصور رہنے جیسے مشکل ترین حالات کا سامنا کرنے کے باوجود اسلام قبول نہ کیا،اسی طرح انتہائی قریبی رشتہ داروں میں سے بھی کافی حضرات ابتداءً مسلمان نہ ہوئے ،جبکہ دیگر خاندانوں اوراقوام کے افراد مسلمان ہو گئے اورانہوں نے مصائب وآلام برداشت کیے، گھربار،خاندان،مال ومتاع اورعلاقہ بھی اس مقصد کے لئے چھوڑ دیا یہاں کہ میدان کارزار میں اپنے باپ بھائیوں اور دیگر قریبی رشتہ داروں کوبھی قتل کرنے سے گریز نہ کیاتو لوگوں کو یقین ہوگیا کہ یہ سب کچھ کسی خاندانی،قومی،لسانی یا علاقائی عصبیت کی بنا پر نہیں بلکہ اسلام کے عقائد ونظریات کی حقانیت وصداقت پر یقینِ کامل کی بنا پر کیا جارہا ہے۔ اس کے بعد اپنوں نے بھی بصیرت اوریقین کے ساتھ ہی اسلام قبول کیااوراس کے حامی وناصر بن گئے۔

عام الحزن

ابوطالب کی وفات کے کچھ دن بعد آپ کی زوجۂ مطہرہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی انتقال کرگئیں۔آپ کوان دونوں کی وفات سے انتہائی صدمہ اٹھانا پڑا، چنانچہ آپ اس سال کوغم کے سال سے موسوم کرتے تھے۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سال کوغم کا سال قرار دیتے تھے،آپ گھر میں رہنے لگےاور باہر نکلنا کم کردیا۔''(السیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۳۳۰)

یہ ایک طبعی عمل ہے کہ ہر مشکل گھڑی میں کام آنے والے اوردُکھ درد بانٹنے والے لوگ دنیا سے رخصت ہوجائیں تو آدمی کی طبعیت پر بوجھ پڑتا ہے،وہ کچھ دن گھر میں بیٹھ رہتا ہےاور باہر نکلنے کواس کا جی نہیں چاہتا،لیکن یہ کیفیت آدمی پر عارضی طور پر طاری ہوتی ہےاوروہ تھوڑے ہی دنوں میں اپنی سابقہ حالت پرلوٹ آتا ہے۔

باب پنجم

نصرت

مصائب کا لگا تار سلسلہ

چونکہ ابو طالب آپ کیلئے ظاہری طور پر ایک بڑا سہارا اور ڈھال تھے، اس لئے جیسے ہی ان کی وفات ہوئی مشرکین مکہ کا آپ پر ظلم وستم بڑھ گیا۔ ان دونوں حضرات کی وفات کے بعد مشرکین کی طرف سے آپ کو تکالیف پہنچانے کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہو گیا۔

ثم ان خدیجه و ابا طالب ماتافی عام و احدٍ فتتا بعت علیٰ رسول الله صلی الله علیه وسلم المصائب. (اسد الغابه ج ا ،ص ۲٦)

''پھر حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب ایک ہی سال میں وفات پا گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مصائب کا لگا تار سلسلہ شروع ہو گیا۔''

علامہ حلبی لکھتے ہیں:

''جب ابو طالب کی وفات ہوئی اور قریش نے آپ کو ایسی تکالیف پہنچائیں جن کی ابو طالب کی زندگی میں توقع نہیں کی جا سکتی تھی تو آپ طائف روانہ ہوئے اور اس وقت آپ اپنے قریبی رشتہ داروں اور خاندان کے افراد خصوصاً ابولہب اور اس کی بیوی ام جمیل کی طرف سے پہنچنے والی ایذاؤں کی وجہ سے غمگین اور پریشانِ خاطر تھے۔'' (السیرۃ الحلبیۃ ج ا ص ۳۳٦)

ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد بڑھنے والے ظلم وستم کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پریشان ضرور ہوئے لیکن ہمت نہیں ٹوٹی، چنانچہ آپ نے دعوت کو وسعت دینے اور دیگر علاقوں کی اقوام سے حمایت حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا۔

سفر طائف، بیرونی دعوت

یوں بھی آپ کی دعوت اب ایسے مرحلے پر پہنچ چکی تھی کہ اسے دیگر علاقوں تک پھیلایا جائے

اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس میں شامل کر کے اس کے غلبے کی جدوجہد کو تیز کیا جائے۔ اس وقت اگر چہ مسلمانوں کو سخت مخالفت اور مصائب ومشکلات کا سامنا تھا لیکن دعوت کی جڑیں کافی مضبوط ہو چکی تھیں نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی تکالیف اور ایذاؤں کا سامنا کر رہی تھیں بلکہ اللہ کے دین کی خاطر حبشہ جیسے دور دراز علاقے کی طرف ہجرت کرنے کی صعوبت بھی اٹھا رہی تھیں۔ آپ کے گرد ایک ایسی جماعت جمع ہو گئی تھی جو اللہ کے لئے آپ کے ہر حکم کو بجالانے اور ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار تھی بلکہ عملاً دے رہی تھی، ایسے میں اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ یہ دعوت دوسرے علاقوں تک پہنچے اور وہاں بھی اس کے ہمنوا اور حامی پیدا کیے جائیں جو اس کے دست و بازو بنیں اور اسے پروان چڑھائیں۔ جب ابو طالب کی وفات کے بعد مشرکین مکہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت بڑھ گئی۔ آپ ان کی عداوت سے پریشان خاطر ہوئے تو مکہ سے قریبی شہر طائف میں جانے کا قصد کیا تا کہ وہاں کے لوگوں کو دعوتِ اسلام دے کر اپنا ہمنوا اور معاون بنایا جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے دسویں سال شوال المکرّم میں اپنے خادم زید بن حارثہؓ کے ساتھ طائف تشریف لے گئے۔

بیرونی دعوت کا مقصد

سفرِ طائف کی غرض یہ تھی:

''ابوطالب کی وفات کے بعد آپ کو پہلے سے زیادہ شدید تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف میں رہنے والے ثقیف قبیلے کے پاس جانے کا اس امید پر ارادہ کیا کہ وہ آپ کو ٹھکانہ دیں گے۔'' (دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۲، ص ۴۱۵)

علامہ حلبی نقل کرتے ہیں:

يلتمس من ثقيف الاسلام رجأ ان يسلموا و ان يناصروه على الاسلام و القيام معهٗ علىٰ من خالفهٗ من قومه. (السيرة الحلبية ج ۱، ص ۳۳۶)

''آپ (طائف تشریف لے گئے) بنو ثقیف سے اسلام کی جستجو (طلب) کرتے ہوئے۔ اس امید پر کہ وہ اسلام قبول کرلیں گے اور اسلام کیلئے آپ کی مدد کریں گے اور آپ کی قوم (قریش) میں سے جو آپ کے مخالفین ہیں، ان کے خلاف آپ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں گے۔''

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ واضح ہو گیا کہ سفرِ طائف کے یہ مقاصد تھے:

۱۔ اہلِ طائف دعوتِ اسلام قبول کرتے ہوئے مسلمان ہو جائیں۔

۲۔ دینِ اسلام کی اشاعت وتبلیغ میں آپ کی نصرت واعانت کریں (یہی وجہ ہے کہ ابن ہشام نے اس طرح باب باندھا ہے **سفر الرسول الیٰ ثقیف یطلب النصرة**)(**السیرة لا بن هشام ج ۲/ص** ۱۹ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ ثقیف کی طرف طلبِ نصرت کیلیے سفر)

۳۔ دینِ اسلام کے مخالفین کے خلاف آپ کا ساتھ دیں۔

بیرونی دعوت میں بااثر شخصیات کو دعوت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف کے تین بڑے سرداروں سمیت مقام نخلہ کے تمام بااثر افراد کے پاس تشریف لے گئے اور جس مقصد کیلئے ان کے پاس آئے تھے اس پر ان سے بات چیت کی۔

وذكر انه صلى الله عليه وسلم اقام بنخلة اياماً بعد ان اقام بالطائف عشرة ايام وشهرا لايدع احداً من اشرافهم (السيرة الحلبيه ج ۱، ص ۳۴۲)

''کہا جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طائف میں چالیس روز قیام کرنے کے بعد چند روز مقامِ نخلہ میں مقیم رہے، وہاں آپ نے کسی باحیثیت اور مقام ومرتبہ رکھنے والے آدمی کو نہ چھوڑا (سب کو دعوت دی)''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ جب داعی دیگر علاقے میں دعوت کے لئے جائے تو کوشش کرے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں خصوصاً بااثر شخصیات سے ملاقات کر کے ان تک دعوت پہنچائے۔

بیرونی دعوت میں لوگوں کا ردِعمل

حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھویؒ لکھتے ہیں کہ دسویں سال شوال کی ستائیسویں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف میں قبیلہ ثقیف کے سرداروں کے پاس تشریف لے گئے چھبیس دن مقیم رہے لیکن ''انہوں نے نہ آپ کی نصرت کی، نہ تعاون کیا بلکہ آپ کو تکالیف پہنچائیں۔''

(بذل القوة فی حوادث سنی النبوة ص ۳۰)

طائف کے سرداروں نے آپ کی دعوت قبول کرنے کی بجائے جو ردِعمل دکھایا وہ یہ تھا کہ آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے نہ صرف صاف انکار کیا بلکہ آپ کے خلاف منفی پروپیگنڈہ کر کے لوگوں کو آپ کے خلاف بھڑکا دیا۔ انہوں نے آپ کے ساتھ توہین آمیز سلوک کیا اور جس مقصد کے لئے آپ ان کے پاس تشریف لے گئے تھے پوری قوم میں اس کو پھیلا دیا، پھر آپ پر تشدد کے لیے باقاعدہ منصوبہ بنایا۔ امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

''وہ آپ کے راستے میں دوصفوں میں بیٹھ گئے جب آپ ان صفوں کے درمیان سے گزرنے لگے تو انہوں نے آپ کو پتھر مارنا شروع کر دیے، ایک قدم بھی آگے بڑھاتے تو پتھر مارتے وہ آپ کو پتھر مارتے رہے یہاں تک کہ آپ کے پاؤں خون آلود کر دیے۔''

(دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۲، ص ۴۱۵)

بڑی مشکل سے آپ کو ان سے نجات ملی۔ اس وقت آپ کی حالت یہ تھی:

فخلص منهم وهما يسيلان الدماء، فعمد إلى حائط من حوائطهم واستظل في ظل حبلة منه، وهو مكروب موجع تسيل رجلاه دماً. (دلائل النبوة للبيهقي ج ۲، ص ۴۱۵)

''آپ نے ان سے اس حال میں چھٹکارا پایا کہ آپ کے دونوں پاؤں سے خون بہہ رہا تھا۔ آپ ایک باغ میں داخل ہو گئے اور ایک بیل کے سائے میں بیٹھ گئے، اس وقت آپ انتہائی کرب اور درد سے دوچار تھے اور آپ کے پاؤں سے خون بہہ رہا تھا۔''

عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ نے آپ کی یہ حالت دیکھی تو اپنا ایک نصرانی غلام ''عداس'' کو انگور کا خوشہ ایک تھال میں رکھ کر آپ کی خدمت میں بھیجا، آپ نے تناول کیا اور اس سے پوچھا تم کہاں کے رہنے والے ہو، اس نے بتایا کہ میرا تعلق نینوی شہر سے ہے۔ آپ نے فرمایا یہ تو میرے بھائی اور نبی ''یونس'' کا شہر ہے، چنانچہ'' جب آپ نے عداس کو یونس علیہ السلام کے بارے میں نازل ہونے والی وحی کے بارے میں بتلایا تو وہ آپ کے پاؤں میں گر پڑا اور آپ کے قدم مبارک چومنے لگا حالانکہ دونوں پاؤں سے خون بہہ رہا تھا۔'' (ایضاص ۴۱۶)

عداس کے آقا عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ نے عداس کے اس طرزِ عمل پر اس سے کہا:

اياک ان يفتنک عن نصرانيتک فانه رجل خدّاع (الدرر ص ۶۷)

''اس سے بچو کہیں تمہیں عیسائیت سے نہ ہٹادے، اس لئے کہ یہ بڑا (نعوذ باللہ) دھوکے باز آدمی ہے۔''

محبت کے غم

الشیخ عبدالحق دہلویؒ مذکورہ واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

از ینجا معلوم میگردد کہ طریق حق ومنصب نبوت چہ وعروہ شدید است البلاً علی قدر الولاء الانبیاء اشدثم الامثل فالامثل۔ (مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۷۰)

''اس سے یہ معلوم ہوا کہ حق کا راستہ اور نبوت کا منصب کس قدر مشکل ہے۔ محبت اور دوستی کے

بقدر مصائب آتے ہیں، سب سے زیادہ انبیاء کو مصائب پیش آتے ہیں، اس کے بعد ان سے دوسرے درجے والوں پر، پھر اس سے کم درجے والوں پر۔''

زخمی حالت میں رب کے حضور حاضری

طائف سے واپسی پر آپ کو سخت امتحان سے گزرنا پڑا اور انتہائی شدید تکالیف سے دوچار ہونا پڑا، جن کو برداشت کرنا آپ ہی کا حصہ تھا۔ ایسی حالت میں کہ شدید زخمی ہیں اور خون بہہ رہا ہے آپ نے انتہائی ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا کیونکہ یہ انبیاء کرام علیہم السلام کا شیوہ رہا ہے، اس انتہائی نازک وقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور دعا سے پہلے اللہ عزوجل کے حضور سجدہ ریز ہوئے، علامہ زرقانی نقل کرتے ہیں:

فاتیٰ ظلَ شجرة فصلّی رکعتین قبل الدعا لیکون اسرع اجابةٍ ولیزول غمّهُ وهمّه بمناجاة ربه فیها (شرح الزرقانی ج۲، ص۶۶)

''آپ درخت کے سائے میں آئے اور دعا سے پہلے دو رکعت نماز پڑھی تاکہ وہ جلد قبول ہو اور نماز میں رب کے آگے مناجات کرنے سے آپ کا غم و پریشانی جاتی رہے۔''

رب کائنات سے مناجات

دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد یہ دعا کی

اللهم الیک اشکو ضعف قوتی وقلة حیلتی وهوانی علی الناس، یاارحم الرحمین أنت رب المستضعفین وانت ربی إلی من تکلنی، الی بعیدیتجهمنی أم إلی عدو ملکته امری؟ ان لم یکن بک غضب علی فلاابالی ولکن عافیتک هی اوسع لی. (السیرة لابن هشام ج ۱ ص ۵۲)

''الٰہی اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں میں تحقیر کے بارے میں تیرے سامنے فریاد کرتا ہوں۔ تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، درماندہ اور عاجزوں کا مالک تو ہی ہے اور میرا مالک بھی تو ہی ہے۔ مجھے کس کے سپرد کیا جاتا ہے؟ کیا بےگانہ ترش رو کے، یا اس دشمن کے جو کام پر قابو رکھتا ہے؟ اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں تو مجھے اس کی پرواہ نہیں لیکن تیری عافیت میرے لئے زیادہ وسیع ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی کرب کی حالت میں بھی اللہ رب العالمین سے ہی شکوہ کناں ہیں

اور اسی کے سامنے ہی فریاد کر رہے ہیں۔ آپ عرض کر رہے ہیں کہ یا الٰہی اگر تو مجھ پر ناراض نہیں تو مجھے کسی چیز کی پروا نہیں ہے اور یہ تکالیف اور مشکلات کچھ حیثیت نہیں رکھتیں، میں انہیں خاطر میں بھی نہیں لاتا مجھے تو بس تیری رضا چاہئے۔

داعی کو چاہئے کہ وہ انتہائی جبر وتشدد کے بعد بھی اپنے آقا ومولا سے تعلق جوڑے رکھے۔ اسی کے سامنے مناجاۃ کرے، اسی کے آگے اپنی صورت حال رکھے، اسی سے نصرت وتعاون مانگے۔ جبر وتشدد کی پرواہ نہ کرے، اسے بس ایک ہی فکر ہو کہ آقا ومولا ناراضی ہے یا نہیں۔ اگر وہ راضی وخوش ہے تو اس کا بیڑا پار اور مقصد حاصل ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ سے شکوہ صبر کے منافی نہیں

مذکورہ دعا نقل کرنے کے بعد اس کی تشریح کرتے ہوئے علامہ زرقانی لکھتے ہیں۔

الشکوی الیہ عزوجلّ لاتنافی امرہ بالصبر فی التنزیل لان إعراضہ عن الشکوی لغیرہ و جعلھا الیہ وحدہ ھو الصبر. (شرح الزرقانی ج ۲، ص ۶۳)

''اللہ عزوجل سے شکوہ کرنا قرآن پاک میں نازل شدہ صبر کرنے کے حکم کے منافی نہیں ہے کیونکہ غیر سے شکوہ کرنے سے اعراض کرنا اور اسے فقط اللہ وحدہ لاشریک کے لئے مخصوص کرنے کا نام ہی صبر ہے۔''

یعنی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ رب العزت کے سامنے ہی فریاد کی ہے تو یہ صبر کے قرآنی حکم کے منافی نہیں ہے کیونکہ مشکل حالات میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسری ذات اور ہستی سے فریاد نہ کرنا بھی صبر کے زمرے میں آتا ہے، لہٰذا داعی کو چاہئے کہ وہ غیر اللہ کی بجائے رب العالمین سے ہی فریاد کر کے صبر کرے۔

آئندہ نسلوں کے بارے میں امید

آپ کے پاس جبرائیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور اہل طائف کو سزا دینے کے بارے میں استفسار کرتے ہوئے عرض کیا کہ ''اگر آپ کا حکم ہو تو ان اہل طائف کو دونوں پہاڑوں کے درمیان ختم کر دیا جائے۔'' آپ نے فرمایا:

بل ارجو اَن یخرج اللہ تعالیٰ من اصلابھم من یعبد اللہ وحدہ و لا یشرک بہ شیأً. (صحیح المسلم کتاب الجھاد والسیر باب مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اذی المشرکین)

''نہیں بلکہ مجھے امید ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ ان کی نسل میں سے ایسے لوگ پیدا کرے جو اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں۔''

جب فرشتے نے آپ کی یہ بات سنی تو کہا ''آپ ویسے ہیں جیسے اللہ نے آپ کا نام رؤف ورحیم رکھا ہے۔''

مستقبل میں دعوت کی کامیابی اور غلبے کا یقین

طائف سے واپس آنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ آنے لگے تو آپ کے خادم حضرت زید بن حارثہؓ نے آپ سے عرض کیا کہ آپ مکہ میں کیسے جائیں گے، حالانکہ وہ لوگ آپ کو نکال چکے ہیں؟ یعنی انہوں نے آپ کو اپنے شہر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس پر آپ نے زید سے فرمایا:

یازید اِن اللہ جاعل لما تری فرجاً و مخرجاً و انّ اللہ ناصر دینه و مظهر نبیه

(زاد المعاد ج ص ۳۳)

''اے زید! عنقریب اللہ تعالیٰ کشادگی وفراخی پیدا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی نصرت کریں گا اور اپنے نبی کو غالب کریں گا۔''

دعوتی زندگی کے مشکل ترین موڑ سے گزرنے کے بعد آپ کے اس ارشادِ گرامی سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ اس مشکل ترین گھڑی سے نہ گھبرائے، نہ مایوس ہوئے اور نہ دعوت کے مستقبل کے حوالے سے ناامید ہوئے بلکہ آپ اب بھی پر اُمید تھے، آپ کو دعوت کا مستقبل روشن نظر آ رہا تھا، آپ کو کامل یقین تھا کہ نصرتِ الٰہیہ ضرور شامل حال ہوگی اور اس دعوت کو ضرور غلبہ حاصل ہوگا، لہٰذا داعی مشکل سے مشکل ترین حالات میں بھی نہ گھبرائے اور نہ مایوس ہو بلکہ اسے دعوت کے روشن مستقبل پر یقین ہونا چاہئے اور پُر امید ہو کہ دعوت کی نصرت ضرور ہوگی اور وہ بالآخر ضرور غالب ہوگی۔

سفرِ طائف کے بعد مکہ میں دوبارہ دعوت

داعیٔ حق کی شان یہ ہے کہ دعوت ہی اس کا اوڑھنا بچھونا ہوتا ہے اور وہ کبھی اس سے غافل ہوتا ہے اور نہ کبھی ایسا معاہدہ کرتا یا شرائط قبول کرتا ہے جو دعوت میں مانع ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے لوٹے اور حرا پہنچے تو آپ نے مطعم بن عدی کی طرف ایک آدمی بھیجا تا کہ وہ آپ کو امان دے اور آپ اپنے رب کا پیغام پہنچا سکیں۔ مطعم بن عدی نے آپ کو امان دے دی تو

آپ نے وہاں کیا طرزِ عمل اختیار کیا؟ ملاحظہ ہو:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہو کر مقیم ہو گئے اور دعوت الی اللہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔'' (امتاع الاسماع ج ا،ص ۲۸)

آپ نے کسی مصالحت ومفاہمت کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے اپنی دعوت پھر سے شروع کر دی اور اپنی ذمہ داری کو پوری تندہی سے انجام دینے لگے،لہٰذا داعی کو چاہیے اگر کوئی آدمی اسے اپنی پناہ میں لیتا ہےتو وہ غیر مشروط ہو یعنی ایسی شرائط اور پابندیاں عائد نہ کی جائیں جو دعوت میں رکاوٹ بنیں۔

معراج

اہل طائف کے انکار کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر قبائل کو بھی دعوت دینا شروع کر دی،اس زمانے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو معراج کروائی جس میں جہاں آپ کو آپ کے مقام ومرتبہ سے آگاہ کیا گیا وہاں مستقبل کے حوالے سے بھی آپ کو بہت تسلی دی گئی کہ اس دین کو عنقریب ''معراج'' حاصل ہونے والی ہےاور اس کو تھوڑے ہی عرصے میں عروج ملنے والا ہے۔

معراج میں انبیاء کرام صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقاتوں میں حکمتیں

معراج میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ مخصوص انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے ملاقاتیں کروائی گئیں،جس کا ایک خاص مقصد تھا،جیسا کہ علامہ بدرالدین عینیؒ لکھتے ہیں:

فان قلت ما الحكمة فى الاقتصار علىٰ هوء لاء الانبياء المذكورين فيه دون غيرهم منهم قلت للاشارة الى ماسيقع لهٗ صلى الله عليه وسلم مع قومه مع نظير ما وقع لكل منهم. (عمدة القارى جز ١٧، ص ٢٧)

''اگر تم کہو کہ آسمانوں میں انہی چند حضرات انبیاء کرام کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کیلئے خاص کرنے میں کیا حکمت ہے؟ تو میں کہوں گا کہ اس سے ان خاص حالات کی طرف اشارہ تھا جو آپ کو بعد میں وقتاً فوقتاً آپ کی قوم کی طرف سے پیش آنے والے تھے جیسا کہ ان انبیاء میں سے ہر ایک کو پیش آئے۔''

یعنی ان انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو جو حالات پیش آئے تھے اور دورانِ دعوت ان کی قوموں نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا تھا۔ان کے ساتھ ملاقات کروانے میں اسی بات کی طرف اشارہ تھا کہ آپ کو بھی انہی جیسے حالات کا سامنا کرنا پڑا ہے اور آئندہ بھی کرنا پڑے گا اور جس طرح ان انبیاء

اور رسولوں کی اقوام نے ان کے ساتھ سلوک کیا تھا، آپ کی قوم بھی آپ کے ساتھ اسی طرح کا طرزِ عمل اختیار کر رہی ہے اور آئندہ بھی کرے گی۔ گویا جہاں آپ کو گذشتہ مشکل حالات کے حوالے سے تسلی دی جارہی اور دلجوئی کی جارہی ہے وہاں آئندہ پیش آنے والے حالات کے لئے آپ کو پہلے سے تیار کیا جارہا ہے۔

ہجرت کی طرف اشارہ

علامہ سہیلیؒ نے انبیاء کرام علیہم السلام سے ہونے والی ملاقاتوں میں ممکنہ حکمتوں پر تفصیل سے لکھا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اسراء کا واقعہ مکہ میں پیش آیا اور مکہ اللہ کا حرم، جائے امن اور اس کے رہائشی اللہ کے پڑوسی ہیں اس لئے کہ اسی مکہ میں اللہ کا گھر ہے۔ سب سے پہلے آسمان میں حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات کرائی گئی، حضرت آدم اللہ کے امان میں تھے تو ان کو ان کے دشمن ابلیس نے اس سے نکالا:

''یہ قصہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں سے پہلی حالت سے مشابہ ہے جب آپ کو آپ کے دشمنوں نے اللہ کے حرم اور اس کے گھر کے پڑوس سے نکالا، اس سے آپ کو دکھ، پریشانی اور غم اٹھانا پڑا۔'' (ایضاً)

یعنی اس ملاقات میں ہجرت کی طرف اشارہ تھا کہ جس طرح حضرت آدم نے اپنے دشمن ابلیس کی وجہ سے آسمان اور جنت سے زمین کی طرف ہجرت فرمائی۔ اسی طرح آپ بھی مشرکینِ مکہ کی عداوت وعناد اور کفر کی وجہ سے مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت فرمائیں گے اور حضرت آدم کی طرح آپ کو اپنے محبوب وطن کی جدائی طبعاً ناگوار گزرے گی۔

یہود کی مخالفت کی طرف اشارہ

دوسرے آسمان میں حضرت عیسیٰ اور یحییٰ علیہما الصلوٰۃ والسلام سے ملاقات کروائی گئی جس میں یہ حکمت تھی:

''یہ دونوں حضرات یہود کے باعث آزمائش سے گزرے، عیسیٰ علیہ السلام کو یہود نے جھٹلایا، انہیں ایذائیں پہنچائیں اور انہیں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اٹھالیا۔ البتہ یحییٰ کو انہوں نے قتل کر دیا، اس طرح مکہ سے مدینہ منتقل ہو جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امتحان کا دوسرا مرحلہ پیش آیا اور یہ امتحان یہود کے باعث تھا کہ انہوں نے آپ کو ایذائیں دیں، آپ

کے خلاف کھڑے ہو گئے اور آپ کو قتل کرنے کی غرض سے آپ پر بھاری پتھر گرانے کی سازش کی۔'' (ایضاً)

یعنی اس ملاقات میں یہود کی تکالیف اور ایذا رسانیوں کی طرف اشارہ تھا کہ یہود آپ کے درپے آزار ہوں گے اور آپ کے قتل کے لئے طرح طرح کے مکر اور حیلے کریں گے مگر جس طرح اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو یہود کے شر سے محفوظ رکھا اسی طرح اللہ تعالیٰ آپ کو بھی ان کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت سے قبل آخری زمانہ میں دجال کے مقابلے کے لئے آسمان سے اتریں گے اس وقت آپ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی بن کر آئیں گے، امت محمدیہ میں ایک مجدد ہونے کی حیثیت سے شریعت محمدیہ کو نافذ کریں گے ۔ نیز قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمام اولین وآخرین کو لے کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ آپ سے شفاعت کبریٰ کی درخواست کریں گے۔ ان وجوہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کرائی گئی۔

فتح و غلبے کی طرف اشارہ

تیسرے آسمان میں حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات کروائی گئی جس میں یہ حکمت تھی:

و أما لقاؤه ليوسف فى السماء الثالثة فانه يؤذن بحالة ثالثة تشبه حال يوسف و ذلک ان يوسف ظفر باخوته بعد ما أخرجوه من بين ظهر انيهم فصفح عنهم و قال لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الاية و كذلک نبينا عليه السلام أسر يوم بدر جملة من أقاربه الذين أخرجوه فيهم عمه العباس و ابن عمه عقيل فمنهم من أطلق و منهم من قبل افدء ه ثم ظهر عليهم بعد ذلک عام الفتح فجمعهم فقال لهم أقول ما قال أخى يوسف لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ. (يوسف: ۹۲)(الروض الانف ج ۱، ص ۲۵۰)

''تیسرے آسمان میں یوسف علیہ السلام سے ملاقات میں تیسری حالت کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کی حالت بھی یوسف علیہ السلام کے مشابہ ہوگی، وہ یہ کہ انہوں نے اپنے بھائیوں کی طرف سے نکالے جانے کے بعد ان پر کامیابی حاصل کی، تو ان سے درگزر فرمایا اور فرمایا آج تم پر کوئی ملامت نہیں اسی طرح ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس غزوۂ بدر میں آپ کے عزیز و اقارب جن میں آپ کے چچا عباس اور چچازاد عقیل شامل تھے، قید ہو کر آئے تو بعض کو تو چھوڑ دیا اور بعض سے فدیہ لیا۔ پھر فتح مکہ کے موقع پر ان پر غلبہ حاصل ہوا تو انہیں جمع کیا اور فرمایا'' آج تم پر کچھ الزام نہیں۔''

یعنی یوسف علیہ السلام کی طرح آپ بھی اپنے بھائیوں یعنی قریبی رشتہ داروں سے تکلیف اٹھائیں گے، بالآخر آپ غالب آئیں گے اوران سے درگزر فرمائیں گے، جیسا کہ غزوۂ بدر میں آپ کو فتح حاصل ہوئی، جبکہ قریش مغلوب ہوئے، پھر فتح مکہ کے دن آپ نے قریش کوانہی الفاظ سے مخاطب کیا جن سے یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو مخاطب کیا تھا۔

رفعتِ شان کی طرف اشارہ

چوتھے آسمان پر حضرت ادریس علیہ السلام سے ہونے والی ملاقات میں کیا حکمت تھی، علامہ سہیلیؒ لکھتے ہیں:

''حضرت ادریس علیہ السلام کی ملاقات مین نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی چوتھی حالت کی طرف اشارہ تھا اور یہ آپ کی علو شان ہے یہاں تک کہ آپ سے سلاطین خوفزدہ ہوگئے اور آپ نے ان کوخطوط لکھے اورانہیں اپنی اطاعت کی دعوت دی۔'' (الروض الانف ج ۱ص ۲۵۰)

حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں **ورفعناہ مکانا علیا** آیا ہےتوان سے ملاقات میں اس طرف اشارہ تھا کہ آپ کو بھی اللہ تعالیٰ رفعتِ منزل اورعلّو مرتبت عطافرمائے گا۔

قریش اورعرب نفرت کے بعد محبت کریں گے

پانچویں آسمان میں حضرت ہارون علیہ السلام سے ملاقات ہوئی جس میں یہ حکمت تھی:

''پانچویں آسمان پرحضرت ہارون علیہ السلام جو کہ اپنی قوم میں محبوب شخص تھے کی ملاقات میں اس طرف اشارہ تھا کہ قریش اورتمام عرب آپ سے (ایک عرصے تک) نفرت کرتے رہنے کے بعد آپ سے محبت کریں گے۔'' (الروض الانف ج ۱ص ۲۵۰)

چنانچہ تقریباً اکیس سال تک قریش آپ کی مخالفت اورآپ سے بغض وعداوت کا مظاہرہ کرتے رہے بالآخر فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوگئے اورآپ سے محبت کرنے اورآپ کی اتباع کرنے لگے۔

شام کی فتح کی طرف اشارہ

چھٹے آسمان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، جس کی حکمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ سہیلیؒ لکھتے ہیں:

ولقاؤہ فی السماء السادسة لموسی یؤذن بحالة تشبه حالة موسی حین أمر بغزو الشام فظهر علی الجبابرة الذین کانوا فیها وأدخل بنی اسرائیل البلد الذی خرجوا منه

بعد اهلاك عدوهم و كذلك غزى رسول الله صلى الله عليه وسلم تبوك من أرض الشام وظهر على صاحب دومة حتى صالحه على الجزية بعد أن أتى به أسيرا و افتتح مكة و دخل أصحابه البلد الذى خرجوا منه.(الروض الانف ج ١ ص ٢٥١)

''چھٹے آسمان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہونے والی ملاقات میں اس طرف اشارہ تھا کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو ملک شام میں سرکشوں سے جہاد و قتال کا حکم دیا گیا اور انہوں نے ان پر غلبہ پایا، بنی اسرائیل جس شہر سے نکالے گئے تھے دشمنوں کو ہلاک کرتے ہوئے دوبارہ ان کو وہیں داخل کیا اور اللہ نے آپ کو فتح دی۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ملک شام کے علاقے تبوک میں جہاد و قتال کے لئے داخل ہوں گے چنانچہ آپ شام میں غزوۂ تبوک کیلئے تشریف لے گئے، دومۃ الجندل پر غلبہ پایا اور اس کا رئیس گرفتار ہو کر آیا تو اس نے جزیہ دے کر صلح کی درخواست کی، آپ نے اس کی صلح کی درخواست منظور فرمائی، نیز آپ نے مکہ کو فتح کیا اور اپنے اصحاب کو اسی شہر میں داخل کیا جہاں سے ان کو نکالا گیا تھا۔''

جس طرح حضرت موسیٰ کے بعد حضرت یوشع کے ہاتھ پر ملک شام فتح ہوا، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت عمر کے ہاتھ پر پورا ملک شام فتح ہو کر اسلام کے زیرِ نگین آیا۔

حجۃ الوداع کی طرف اشارہ

ساتویں آسمان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہونے والی ملاقات میں دو حکمتیں تھیں، جن میں سے دوسری حکمت یہ ہے کہ ''اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں سے آخری حالت حجۃ الوداع کی طرف اشارہ تھا کہ آپ وفات سے قبل حج بیت اللہ فرمائیں گے اور اس وقت آپ کے ساتھ ستر ہزار مسلمان بھی حج ادا کریں گے۔ علماء تعبیر کے نزدیک حضرت ابراہیم کے ساتھ ہونے والی اس ملاقات میں حج (وداع) کی بشارت ہے، اس لئے کہ وہی (ابراہیم علیہ السلام) ہی اس کے داعی اور کعبہ کے پوشیدہ قواعد (بنیاوں) کو اٹھانے والے (تعمیر کرنے والے) ہیں۔'' (ایضاً)

دعوت وتحریک کی ترتیب کی طرف اشارہ

معراج کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام سے ملاقاتیں کروا کر آئندہ پیش آنے والے حالات کی طرف اشارات دئے گئے، مختلف انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو اپنے اپنے زمانے میں مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑا اور ان کی اقوام نے مختلف نوعیتوں

کا برتاؤ کیا، چنانچہ آپ کی جو حالت جس نبی سے مشابہ تھی ،اس سے ملاقات کروائی گئی جس میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ آپ کو جس ترتیب سے مختلف احوال سے دوچار ہونا پڑا اسی ترتیب سے پہلے آسمان سے لے کر ساتویں آسمان تک انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام سے ملاقاتیں کروائی گئیں مثلاً بعثت کے بعد دعوت شروع کرنے کے بعد آپ کو آپ کی قوم نے مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کردیا تھا، گویا یہ آپؐ کی پہلی حالت تھی جو حضرت آدم علیہ السلام کی جنت سے دنیا کی طرف نکالنے جانے یعنی ہجرت کے مشابہ تھی تو سب سے پہلے، پہلے آسمان میں حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات کرائی گئی۔

اسی طرح بعد میں پیش آنے والے احوال جس ترتیب سے جس نبی کے احوال کے مشابہ تھے اسی سے ملاقات کرائی گئی، یہاں تک کہ ساتویں آسمان میں بانیٔ حج حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام سے ملاقات کرائی گئی جو آپ کی آخری حالت حجۃ الوداع کی طرف اشارہ تھا۔ گویا آپ کے سامنے آپ کی دعوت وتحریک کی ترتیب پیش کی گئی اور یوں آپ کو تسلی دی گئی کہ بتدریج حالات میں بہتری آئے گی اور آپ کو کامیابی، فتح اور غلبہ حاصل ہوگا ،لہٰذا گھبرانے اور دلبرداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں، جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی. (الضحی: ۵)

''اور البتہ پچھلی بہتر ہے تجھ کو پہلی سے۔''

لہٰذا داعی کو چاہئے کہ وہ مخالفین کی مخالفت ،ظلم وستم، جبر وتشدد، رکاوٹوں اور سازشوں سے خوفزدہ ہو اور نہ ناامید و مایوس ہو بلکہ اس بات پر یقین رکھے کہ دعوت وتحریک میں یہ مراحل آتے رہتے ہیں ،حالات بتدریج بہتری کی طرف بڑھتے رہتے ہیں اور بالآخر فتح و غلبے کا مرحلہ ضرور آتا ہے۔

قبائل کو دعوت دینے کا مقصد، غلبۂ دین کے لیے طلبِ نصرت

قبائل کو دعوت دینے کا بنیادی مقصد غلبۂ دین کی راہ ہموار کرنا تھا، کیونکہ اگرچہ مکہ میں معتد بہ افراد اسلام قبول کر چکے تھے لیکن وہاں کے بااثر افراد اور سرداروں کی اکثریت آپ کی مخالفت کر رہی تھی، بلکہ مکہ میں دینِ اسلام کا غلبہ تو درکنار وہاں صحابہ کرامؓ کے لئے پرامن زندگی گزارنا بھی ناممکن بنا دیا گیا تھا۔ اس لئے ایسے افراد اور قبیلے کی ضرورت تھی جو آپ کو مکمل تحفظ دے سکیں اور آپ کی دعوت کو لے کر آگے بڑھیں۔ علامہ زرقانی لکھتے ہیں:

(ولمّا اراد اللّٰہ تعالٰی اظھار دینہ) انتشارہ بین الناس ودخولھم فیہ (واعزاز نبیہ)

تصییرہ عزیزاً معظَماً عند جمیع الناس ومنع من یریدہ بسوءٍ بعد مالقی من قومہ (و انجاز موعدہ) تعالیٰ (لہٗ) صلی اللہ علیہ وسلم ای نصرہ علیٰ اعدائہ فھو تفسیر لما قبلہ وقد قال اللہ تعالیٰ ''وَيَأْبَى اللهُ اِلَّا اَنْ يُتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ. (التوبۃ: ۳۲،۳۳)(شرح الزرقانی ج ۲، ص ۷۲)

''جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے اظہار یعنی اس کے لوگوں کے درمیان پھیلنے اور لوگوں کے اس میں داخل ہونے کا ارادہ کیا، اپنے نبی کو طاقتور کرنا چاہا یعنی انہیں لوگوں کے ہاں صاحب عزت وعظمت بنانا چاہا، قومِ قریش کی طرف سے دی جانے والی تکالیف کے بعد انہیں برائی کا ارادہ رکھنے والے کے شر سے تحفظ دینا چاہا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیئے گئے وعدے کو پورا کرنا چاہا یعنی آپ کو دشمنوں کے خلاف نصرت ومدد دینا چاہی (اور یہ ماقبل کی تفسیر ہے۔) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اللہ اپنے نور کو ضرور پورا کرے گا اگر چہ کافر اسے ناپسند کریں، اللہ وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ وہ اس کو تمام ادیان (باطلہ) پر غالب کردیں اگر چہ مشرک بُرا منائیں۔''

مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوا کہ قبائل کو دعوت دینے کا بنیادی مقصد ایسے لوگوں کی مدد ونصرت حاصل کرنا تھا جو نہ صرف اسلام قبول کریں بلکہ وہ دینِ اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ اور غلبے کا باعث بنیں اور یہ کہ اللہ نے اس کا پہلے سے ہی اپنے نبی سے وعدہ کررکھا تھا۔ امام بیہقی، ابن شہاب زہری سے روایت کرتے ہیں:

کان رسول اللہ ﷺ فی تلک السنین یعرض نفسہ علی قبائل العرب في کل موسم، ویکلم کل شریف. (دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۲، ص ۴۱۴)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سالوں میں ہر موسم حج میں قبائل عرب کے سامنے اپنی دعوت پیش کرتے تھے اور ہر قوم کے صاحب عزت وشرف آدمی سے بات کرتے۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اربابِ دعوت دعوتِ عامہ کے زمانے میں مختلف اقوام، گروہوں اور طبقات کے سرکردہ اور بااثر افراد سے ملاقاتیں کریں اوران تک اپنی دعوت پہنچا کر دعوت میں شمولیت اور نصرت اور حمایت پر آمادہ کرنے کی کوشش کریں۔

قبائل کو حکمِ الٰہی سے دعوت دی گئی

جیسا کہ ماقبل میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام اور دی گئی ترتیب کے مطابق اپنی دعوت کو آگے بڑھا رہے تھے، چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے قبائل کو دعوت دینے کا حکم دیا تو آپ اس پر عمل پیرا ہوئے۔ ابن عباسؓ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں:

''جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قبائل عرب کو دعوت دینے کا حکم دیا تو آپ مجھے اور ابوبکر کو ساتھ لے گئے، یہاں ہم عربوں کی مجالس میں سے ایک مجلس میں پہنچے تو ابوبکر آگے ہوئے وہ خیر کے ہر کام میں پیش پیش ہوتے تھے اور قبیلوں کے انصاب کے بارے میں ماہر آدمی تھے انہوں نے سلام کیا اور پوچھا تمہارا کس قبیلے سے تعلق ہے، انہوں نے جواب دیا کہ قبیلۂ ربیعہ سے۔'' (دلائل النبوۃ ج ۲ ص ۴۲۲، ۴۲۳)

ابوبکر اور ان کے درمیان سوال وجواب کا تبادلہ ہوا۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا:

(الف) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکمِ الٰہی کے مطابق دعوت کا کام انجام دے رہے تھے اور ہر موقع پر آپ کی رہنمائی کی جا رہی تھی۔

(ب) بہتر یہ ہے کہ جب داعی کسی سے ملاقات کے لیے جائیں تو دو یا تین ساتھیوں کی جماعت کی صورت میں جائیں۔

(ج) رہبر کا ہونا بہتر ہے کیونکہ وہی مخاطب فرد، گروہ یا جماعت کے حالات وواقعات کے بارے میں صحیح طور پر بتا سکتا ہے اور اس کی بنا پر ان کی ذہنی وفکری سطح کو سامنے رکھ کر دعوت دی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ آپ ابوبکرؓ کو ساتھ لے گئے جو کہ قبائلِ عرب کے انساب کے ماہر تھے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں ان سے بات چیت کرنے کے بعد ہم آگے بڑھ گئے اور دوسرے قبیلے کے پاس پہنچے جن سے ابوبکر نے پوچھا، تمہارا کس قوم سے تعلق ہے؟ انہوں نے بتایا کہ شیبان بن ثعلبہ سے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہوئے اور عرض کیا کہ ''آپ پر میرے ماں باپ قربان، یہ شریف لوگوں میں سے ہیں۔''

جنگی صلاحیت

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا ''تمہاری کتنی تعداد ہے؟''

مفروق نے جواب دیا:

أنا لنزيد على ألف، ولن تغلب ألف من قلة.

''ہم ایک ہزار سے زائد ہیں اور ایک ہزار تو قلت کی وجہ سے کبھی مغلوب نہیں ہوتے۔''

ابوبکر نے پوچھا:

وكيف المنعة فيكم؟ (تمہارے اندر دفاع کی کس قدر صلاحیت ہے؟)

مفروق نے جواب دیا:

علينا الجهد ولكل قوم جهد. (ایضاً ص ۴۲۴)

''ہمارے اوپر جدوجہد کرنا لازم ہے، اور ہر قوم پر جدوجہد ہی کرنا لازم ہے۔''

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا:

كيف الحرب بينكم وبين عدوكم؟

تمہارے اور تمہارے دشمن کے درمیان جنگ کیسے ہوتی ہے (اور کیا نتیجہ نکلتا ہے؟) مفروق نے جواب دیا:

إنا لأشد ما نكون غضباً حين نلقى وإنا لأشد ما نكون لقاء حين نغضب، و إنا لنؤثر الجياد على الأولاد، والسلاح علياللقاح، والنصر من عند الله يُديلنا مرة ويُديل علينا أخرى.

''جب دشمن سے ہمارا آمنا سامنا ہوتا ہے تو ہم غضبناک ہوتے ہیں اور جب ہم غضبناک ہوتے ہیں تو ہم سختی کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں، بلاشبہ ہم تیز رفتار گھوڑوں کو اولاد پر اور اسلحہ کو بہت دودھ دینے والی اونٹنیوں پر ترجیح دیتے ہیں، نصرت و فتح تو خدا کی طرف سے ہوتی ہے، کبھی جنگ کا پانسہ ہمارے حق میں اور کبھی ہمارے دشمن کے حق میں پلٹتا ہے۔''

مفروق نے کہا شاید آپ قریشی ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا:

''تمہیں یقیناً یہ بات پہنچی ہوگی کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ سنو! وہ یہی ہیں۔''

مفروق نے جواب دیا ''ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ وہ اس طرح کی باتیں کرتا ہے۔'' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر کہا:

فإلى ماتدعو يا أخا قريش؟ (دلائل النبوة ج ۲ ص ۴۲۵)

''اے قریشی! تم کس چیز کی دعوت دیتے ہو؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور بیٹھ گئے تو ابوبکر نے اپنے کپڑے کے ساتھ آپ پر سایہ کیا۔

تعارفی بات رہبر کرے

اس سے یہ معلوم ہوا کہ ابتدائی تعارفی بات چیت تو رہبر ہی کرے البتہ مقصودی بات اور دعوت، داعی اور امیر دے کیونکہ امیر اور داعی ہی اپنی بات اور دعوت صحیح طور پر اور زیادہ مؤثر اسلوبِ بیان میں واضح کر سکتا اور مخاطب کو سمجھا سکتا ہے۔ یاد رہے کہ حضرت ابوبکرؓ رہبر بھی تھے اور بہترین داعی بھی۔

دعوت کسی کی محتاج نہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

''میں تمہیں اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کا بندہ اور رسول ہے اور یہ کہ تم مجھے تحفظ دو گے اور میری نصرت کرو گے، اس لئے کہ قومِ قریش نے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی، اس کے رسولوں کو جھٹلایا اور باطل پر مصر رہنے کی وجہ سے حق سے روگردانی اختیار کی ہے، اللہ بے پروا ہے اور صاحبِ حمد ہے۔'' (ایضاً)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں چار چیزیں بیان فرمائی ہیں:

(الف) بنیادی عقائد، توحید و رسالت کو بیان کیا۔

(ب) ان سے تحفظ دینے اور نصرت کرنے کا مطالبہ کیا۔

(ج) قریش کے طرزِ عمل پر روشنی ڈالی۔

(د) جہاں آپ نے اپنی دعوت دی اور ان کے سامنے اپنے مطالبات رکھے وہاں قریش کے طرزِ عمل کا ذکر کر کے یہ فرمایا کہ ''واللہ ھو الغنی الحمید'' آپ نے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ اگر تم نے قومِ قریش والا طرزِ عمل اختیار کیا تو اللہ کو اس کی کوئی پرواہ نہیں، وہ کسی دوسری قوم کے ذریعے اپنے دین اور رسول کی نصرت و مدد کرے گا۔ یعنی دعوتِ اسلام کسی کی محتاج نہیں بلکہ لوگ اس کے محتاج ہیں۔

مفروق بن عمرو نے دوبارہ پوچھا:

وإلام تدعونا يا أخا قريش، فو الله ماسمعت كلاماً أحسن من هذا.

''اے قریشی! آپ اور کس بات کی دعوت دیتے ہیں۔ اللہ کی قسم! میں نے آج تک اس سے بہتر کلام نہیں سنا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں درج ذیل آیت تلاوت فرمائی:

قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ. (الانعام ۱۵۱)

''کہہ کہ (لوگو) آؤ! میں تمہیں وہ چیز پڑھ کر سناؤں جو تمہارے پروردگار نے تم پر حرام کی ہیں۔''

مفروق نے سہ بارہ پوچھا: اور کس بات کی دعوت دیتے ہو؟ بعض راویوں نے اس کے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں:

فو الله ما هذا من كلام أهل الأرض. (دلائل النبوة ج ۲ ص ۴۲۵)

''اللہ کی قسم! یہ تو اہل زمین کا کلام نہیں ہوسکتا۔''

مخالفین کے سوالات کے جوابات دیے جائیں

مفروق کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار سوال کرنے اور آپ کے جواب مرحمت فرمانے سے معلوم ہوا کہ اگر مخاطب تحقیقِ حال کی غرض سے داعی سے اس کے افکار ونظریات کے بارے میں بار بار پوچھتا اور وضاحت چاہتا ہے تو داعی کو انتہائی صبر وتحمل سے سوالات سن کر اس کے جوابات دینے چاہییں، وہ مخاطب کے بار بار سوال کرنے پر اکتائے اور نہ غصے اور اشتعال کا مظاہرہ کرے کیونکہ ایسا کرنا داعی کی شان کے منافی اور دعوت کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے۔

مفروق اور ان کے ساتھیوں نے آپ کی دعوت سن لی تو مفروق نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

''اے قریشی! اللہ کی قسم! آپ نے پاکیزہ اخلاق اور اچھے اعمال کی دعوت دی ہے۔ بلاشبہ تمہاری قوم نے ناحق کیا ہے کہ انہوں نے تمہاری تکذیب کی ہے اور تمہارے خلاف ہوگئے ہیں۔''

(دلائل النبوۃ ج ۲ ص ۴۲۵)

دراصل مفروق اس بات چیت میں ایک دوسرے سردار ہانی بن قبیصہ کو شریک کرنا چاہتے تھے اس لئے ان کی طرف اشارہ کر کے آپ کو بتلایا کہ یہ ہمارے بزرگ اور دینی امور کے ذمہ دار ہیں، ہانی نے آپ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

''اے قریشی! میں نے آپ کی بات سنی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم نے ایک ہی مجلس میں (جبکہ اس سے پہلے اور بعد میں کوئی مجلس نہ ہوئی) اپنا دین چھوڑ کر تیرے دین کی اتباع کر لی تو یہ غلط رائے

اور نا عاقبت اندیشی ہوگی، جلد بازی میں ٹھوکر لگتی ہے، نیز پیچھے ہماری قوم ہے اور ہم ان (سے رائے لئے بغیر) کوئی عہد کرنا بہتر نہیں سمجھتے، تاہم ہم واپس جاتے ہیں اور آپ بھی، ہم بھی اس معاملے پر غور وفکر کرتے ہیں اور تم بھی غور وفکر کرلو۔'' (ایضاً)

اقدام کے لیے محدود نصرت قابل قبول نہیں

دراصل وہ مثنیٰ بن حارثہ کو شریک کرنا چاہتے تھے چنانچہ ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے بڑے اور جنگی امور کے ذمہ دار ہیں۔ مثنیٰ نے بات چیت کرتے ہوئے کہا ''اے قریشی! میں نے آپ کی بات سن لی ہے اور اپنا دین ترک کرنے اور تمہاری اتباع کرنے کے معاملے کا جواب وہی ہے جو ہانی بن قبیصہ نے دیا ہے۔ دراصل ہم دو دریاؤں یمامہ (یمن کے قریب ایک شہر کا نام ہے) اور سمامہ کے درمیان رہتے ہیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: ان دونوں دریاؤں سے کیا مراد ہے؟ اس نے جواب دیا کہ کسریٰ کے اور عرب کے دریا، کسریٰ کے دریاؤں کا یہ معاملہ ہے کہ ان کی حدود میں جرم کا ارتکاب کرنے والے کیلئے معافی ہے اور نہ اس کا عذر قبول کیا جاتا ہے، البتہ میاہِ عرب کی حدود میں مجرم کا جرم معاف اور اس کا عذر قبول کرلیا جاتا ہے، مزید بتایا کہ ہم وہاں ایک معاہدے کے تحت رہ رہے ہیں، جس کی شرائط میں سے یہ ہے کہ ہم نہ تو خود کسی جرم کا ارتکاب کریں گے اور نہ ایسا کرنے والے کو پناہ دیں گے۔

''میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس بات کی آپ دعوت دیتے ہیں یہ بادشاہوں کو پسند نہ آئے گی، اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کو صرف عرب علاقے کی حدود میں پناہ دینے اور نصرت کرنے کیلئے تیار ہیں۔'' (ایضاً)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما أسأتم في الرد إذ أفصحتم بالصدق وإن دين الله لن ينصره إلا من حاطه من جميع جوانبه أرأيتم أن لم تلبثوا إلا قليلاً حتى يورثكم الله أرضهم وديارهم وأموالهم ويفرشكم نساء هم أتسبحون الله وتقدسونه؟ (ایضاً)

''تم نے برا ردِ عمل نہیں دکھایا اس لئے کہ صاف گوئی سے کام لیا ہے، اللہ کے دین کی نصرت وہی کرے گا جو ہمہ جہت اس کی نصرت کرنا چاہے گا، تمہارا کیا خیال ہے جب تھوڑا ہی عرصہ نہ گزرے گا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان کی زمینوں، شہروں اور مال و دولت کا مالک بنا دے گا اور ان کی عورتوں کو تمہاری

بیویاں بنادے گا، کیا تم اللہ کی تسبیح و تقدیس کرو گے؟''

کامل نصرت درکار ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مثنیٰ بن حارثہ اور دیگر سرداروں کے مثبت ردِعمل کی تعریف کرنے کے باوجود ان کی طرف سے جزوی تعاون کی پیش کش قبول نہیں کی اور واضح کر دیا کہ اللہ کے دین کی نصرت و حمایت کے لئے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو غیر مشروط طور پر اور ہمہ جہت تعاون کریں، اللہ کے دین کی سر بلندی کے لئے کسی کا خوف دل میں نہ لائیں، اللہ کے رسول کی غلامی اختیار کریں اور کسی دوسرے کے اختیار و اقتدار سے مکمل آزاد ہوں، دینِ اسلام کو غالب کرنے اور کفر کا مقابلہ کرنے کے لئے جانی و مالی ہر قسم کی قربانی دیں۔

چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین تھا کہ کلی طور پر نصرت کرنے والی جماعت اللہ تبارک وتعالیٰ ضرور عطا کریں گے، اس لئے آپ نے انہیں بتایا کہ اگرچہ تم اس وقت مکمل تعاون پر آمادہ نہیں اور کسریٰ کی بادشاہت وحکومت سے ڈر رہے ہو لیکن جب انصار اس دعوت کو قبول کریں گے اور دینِ اسلام کو جزیرۂ عرب میں فاتح و غالب کرنے کے بعد روم و فارس کا رخ کریں گے اور اس وقت تک تم بھی اسلام میں داخل ہو چکے ہو گے تو وہ وقت بھی آئے گا جب مجاہدین اسلام روم کے ساتھ ساتھ فارس کی شہنشاہیت پر کاری ضرب لگا کر اس کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے، ان کی حکومت واقتدار پر ان کا قبضہ ہو جائے گا، ان کی دولت وخزانے مالِ غنیمت کے طور پر ان میں تقسیم کر دیے جائیں گے، زمینیں تقسیم کر دی جائیں گی، ان کا خراج مسلمانوں کے پاس آیا کرے گا، عام مرد اور عورتوں کے ساتھ ساتھ شاہی خاندانوں کے مرد غلام اور عورتیں (شہزادیاں) باندیاں بنالی جائیں گی اور یوں مسلمانوں کی بیویاں بن جائیں گی۔

صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشن گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ داعی کو اپنی دعوت کے روشن مستقبل اور کامیابی وفتح پر اس قدر یقین ہونا چاہئے، گویا آئندہ پیش آنے والے حالات کو بچشمِ خود دیکھ رہا ہے، اسے دعوت کی کامیابی میں کسی قسم کا تردد اور شک نہ ہونا چاہئے بلکہ وہ پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ مخاطب کو فتح و غلبے کی خوشخبری سنائے۔

باصلاحیت ارکانِ دعوت

سیدنا علیؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد ہم اوس وخزرج کی مجلس میں پہنچے، (ان کو دعوت دینے کے

بعد) ہم مجلس سے اٹھنے نہ پائے تھے کہ انہوں نے آپ کی بیعت کرلی، فرماتے ہیں کہ:

فلقد رأيت رسول الله ﷺ وقد سر بما كان من أبي بكر و معهم بأنسابهم . (ايضاً)

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ ابوبکر کی کارکردگی اوران کے انساب کے علم کی وجہ سے خوش تھے۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ امیر کے ساتھ اگر باصلاحیت اور صاحبِ علم افراد ہوں تو اس سے اشاعت دعوت میں آسانی ہوتی ہے اور بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

قبائل کو دعوت دینے میں انتھک جدوجہد

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل کو دعوت دینا شروع کی تو آپ ایک ایک قبیلے کے پاس گئے اور انہیں اسلام لانے، اہل اسلام اور آپ کو تحفظ دینے اور نصرت کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ آپ کی انتھک جدوجہد کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے لگا جاسکتا ہے۔ابن القیم الجوزیہ لکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم (اظہارِ دعوت کے بعد) لوگوں کو دس سال تک اسلام کی دعوت دیتے رہے، ہر سال موسمِ حج میں حج کے مقامات میں حجاج کی رہائش گاہوں میں جاتے اور مختلف موسموں میں لگنے والے بازاروں عکاظ، مجنہ اور ذی الحجاز میں جا کر لوگوں کو اس بات کی دعوت دیتے کہ وہ آپ کو تحفظ دیں تاکہ آپ لوگوں تک اپنے رب کا پیغام پہنچا سکیں تو اس کے بدلے ان کیلئے جنت ہے، آپ کو کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جو آپ کی نصرت کرتا اور آپ کی بات قبول کرتا، یہاں تک کہ آپ (دعوت دینے کے لئے) ایک ایک قبیلے اور ان کے ٹھکانوں کے بارے میں پوچھتے تھے اور انہیں دعوت دیتے ہوئے فرماتے:

يـأيهـا الـنـاس قـولـوا: لا إله إلا الله تفلحوا وتملكوا بها العرب وتذل لكم بها العجم فإذا آمنتم كنتم ملوكا في الجنة. (زادالمعاد ج۳،ص ۳۹)

''لا الہ الا اللہ کہہ دو، کامیاب ہو جاؤ گے، عربوں کے بادشاہ بن جاؤ گے اور عرب تمہارے سامنے جھکیں گے، جب تم ایمان لے آؤ گے تو جنت میں بادشاہ ہو گے۔''

ہر قوم، علاقے اور طبقے میں دعوت

علامہ مقریزی لکھتے ہیں:

''واقدی نے ان قبائل میں سے ہر قبیلے کا قصہ نقل کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کندہ قبیلے سے اپنی دعوت کا آغاز کیا، انہیں اسلام کی دعوت دی، پھر قبیلہ کلب کے پاس آئے، پھر

بنی حنیفہ کے پاس، پھر بنی عامر کے پاس آئے۔آپ دعوت دیتے ہوئے فرماتے تھے'' کون ہے جو مجھے اپنی قوم کے پاس لے جائے تاکہ وہ مجھے تحفظ دیں، یہاں تک کہ میں اپنے رب کا پیغام پہنچا دوں،اس لئے کہ قریش نے مجھے اپنے رب کا پیغام پہنچانے سے روک دیا ہے۔''

(امتاع الاسماع ج ا ص ۳۱)

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ داعی ہر قوم، علاقے، طبقے اور ہر گروہ کے پاس جائے اور ان تک اپنی دعوت پہنچائے اور انہیں قبول کرنے کے ساتھ ساتھ اربابِ دعوت کا ساتھ دینے اور ان کی نصرت وحمایت کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے۔ مرکزی قیادت کو چاہئے کہ ہر قوم، علاقے اور طبقے کو دعوت دینے کے لئے جماعتیں تشکیل دے، بلکہ بار بار تشکیلیں کی جائیں کیونکہ بیشتر لوگ پہلی بار اور ایک ہی دفعہ میں قائل نہیں ہوتے، جب بار بار داعی ان کے پاس جائیں گے تو وہ رفتہ رفتہ دعوت کی طرف متوجہ ہوں گے اور اسے قبول کرنے اور اس کی حمایت کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔

دعوت کے مقابلے میں پروپیگنڈہ مہم

جب آپ قبائل کو دعوت دے رہے ہوتے تھے تو اس وقت ابولہب آپ کے پیچھے پیچھے پھرتا تھا اور لوگوں کو کہتا جاتا تھا:

لاتسمعوا منه فانه كذاب (امتاع الاسماع ج ا، ص ۳۱)

''اس کی بات مت سنو، یہ جھوٹا آدمی ہے۔''

ابن اسحاق ربیعہ بن عباد سے روایت کرتے ہیں وہ ایک دفعہ موسم حج کے دوران اپنے والد کے ساتھ منیٰ میں تھے تو وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کو دعوت دیتے ہوئے دیکھا، آپ ارشاد فرما رہے تھے:

''اے فلاں قبیلہ! میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ تم اسی کی عبادت کرو، اس کا کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور اس کے سوا جن بتوں کی عبادت کرتے ہو انہیں چھوڑ دو، میرے اوپر ایمان لے آؤ، میری تصدیق کرو، مجھے تحفظ دو تاکہ اللہ تعالیٰ کا پیغام جو اس نے مجھے دے کر بھیجا ہے، لوگوں تک پہنچا دوں۔''۔ (السیرۃ لابن ہشام ج ۲ ص ۵۳)

کہتے ہیں کہ آپ کے پیچھے پیچھے ایک خوبصورت اور قیمتی لباس پہننے والا آدمی پھر رہا تھا، جب آپ اس طرح دعوت دے کر فارغ ہوتے تو وہ فوراً لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتا:

''اے فلاں قبیلہ! یہ شخص تمہیں اس بات کی دعوت دے رہا ہے کہ تم لات وعزیٰ کی غلامی کا طوق اپنی گردنوں سے اتار دو اور بنی مالک کے جن جو تمہارے حلیف ہیں انہیں چھوڑ دو اور بدعت اور گمراہی اختیار کرلو، لہٰذا اس کی اطاعت کرو اور نہ اس کی بات سنو۔'' (السیر ۃ لابن ھشام ج ۲ ص ۵۴)

کہتے ہیں، کہ میں نے اپنے باپ سے پوچھا کہ یہ پیچھے پھرنے اور ان کی تردید کرنے والا کون آدمی ہے تو انہوں نے بتایا:

''یہ ان کا چچا عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب یعنی ابولہب ہے۔'' (السیرۃ لابن ھشام ج ۲ ص ۵۴)

منفی پروپیگنڈے کا ظاہری اثر

ابولہب آپ کے پیچھے پیچھے پھرتا اور آپ کے خلاف منفی پروپیگنڈہ کرتا جاتا تو لوگوں کا ردعمل یہ ہوتا:

فیردون علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أقبح الرد ویؤذونہ ویقولون أسرتک و عشیرتک أعلم بک حیث لم یتبعوک (زادالمعاد ج ۳، ص ۳۹)

''وہ آپ کی بہت برے طریقے سے تردید کرتے، آپ کو ایذائیں پہنچاتے اور کہتے تھے کہ تمہارا خاندان اور قبیلہ تمہیں اچھی طرح جانتا ہے تبھی انہوں نے تمہاری اتباع نہیں کی۔''

حافظ ابن عبدالبرؒ لکھتے ہیں کہ مختلف قبائل کے لوگ کہتے:

قومہ اعلم بہ و کیف یصلحنا من افسدقومہ؟ (الدرر ص ۶۵)

''اس کی قوم اس کے بارے میں زیادہ بہتر طور پر جانتی ہے، بھلا جس آدمی نے اپنی قوم میں بگاڑ پیدا کر دیا ہے، وہ ہماری کیا اصلاح کرے گا؟''

منفی پروپیگنڈے سے مرعوب نہ ہونا چاہئے

ابولہب اور دیگر لوگوں کی پروپیگنڈہ مہم سے کون متاثر ہوتا اور کون نہیں ہوتا تھا، اس کا اندازہ درج اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

فیصغی الیھم من لا تمییز لہٗ من احیاء العرب و امّا الالبّاء فانھم اذا سمعوا کلامہ صلی اللہ علیہ وسلم و تفھّموہ شھدوا بانّ ما یقولہ حق و صدق و انّ قومہ یفترون علیہ الکذب فیسلمون. (امتاع الاسماع ج ۱، ص ۳۱)

''قبائلِ عرب میں سے جنہیں (اچھے اور برے کی) تمیز نہیں تھی وہ ان باتوں کی طرف کان دھرتے اور جو صاحبِ عقل وفہم تھے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سنتے اور سمجھتے تو اس بات کی گواہی

دیتے تھے کہ آپ جو فرماتے ہیں وہ حق اور سچ ہے اور آپ کی قوم آپ کے خلاف جھوٹ بولتی ہے چنانچہ وہ مسلمان ہو جاتے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اگر مخالفین دعوت اور داعی کے خلاف منفی پروپیگنڈہ کریں تو داعی کو اس سے متاثر و مرعوب نہ ہونا چاہئے اور ان حالات میں اپنا کام جاری رکھنا چاہئے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابولہب کے پروپیگنڈہ سے متاثر اور مرعوب نہ ہوتے اور اپنی دعوت جاری رکھتے تھے۔ اہل شعور منفی پروپیگنڈے کے باوجود اس دعوت کی حقانیت سے متاثر ہو کر اسے ضرور قبول کر کے اس کی نصرت وحمایت کریں گے، اگرچہ کم فہم اور جھوٹے پروپیگنڈہ سے متاثر ہونے والے اس سے اعراض کریں گے اور بھیڑ چال چلتے ہوئے دیگر انکار کرنے والے سرداروں اور بااثر افراد کی طرح اسے قبول نہ کریں گے۔

شراکتِ اقتدار سے مشروط نصرت ناقابل قبول ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ بنی عامر بن صعصعہ کے پاس آئے اور انہیں دعوت دی تو ان کے ایک آدمی بحیرہ بن فراس نے کہا:

واللہ، لو أني أخذت هذا الفتى من قريش، لأكلت به العرب.

(السيرة لابن هشام ج۲ ص۵۵)

''واللہ! اگر میں قریش کے اس نوجوان کو ساتھ لے لوں تو پورے عرب کو کھا جاؤں (فتح کرلوں)۔''

درحقیقت بحیرہ بن فراس دعوت کی تہہ تک پہنچ چکا تھا اور اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ جو بھی اس آدمی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت قبول کرے گا اور اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوگا وہ اس کی ماتحتی میں آگے بڑھے گا اور فتوحات حاصل کرتا ہوا دنیا پر چھا جائے گا۔ بحیرہ نے درست کہا تھا، صحابہ کرام (مہاجر وانصار) نے آپ کی دعوت قبول کی، جان و مال کی قربانی دی، دعوت و جہاد کا علم بلند کیا، غزوہ بدر سے فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا، فتح مکہ کے ساتھ پورے پورے جزیرۂ عرب پر اسلام کی حکومت قائم ہوگئی، غزوۂ تبوک سے جزیرۂ عرب سے باہر جہاد کو توسیع دی گئی، پھر خلفاء راشدین کے زمانے میں مسلمان پوری دنیا پر چھا گئے یا بقول بحیرہ ''عرب کو لقمۂ تر'' بنانے کے بعد عجم کو بھی کھانے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نصرت کی مشروط پیشکش کرتے ہوئے کہا:

أرأيت إن نحن بايعناك على أمرك، ثم أظهرك الله على من خالفك، أيكون لنا الأمر من بعدك؟ (ايضا)

''آپ کی کیا رائے ہے کہ اگر میں آپ کی بیعت کرلوں پھر اللہ آپ کو آپ کے مخالفین پر غالب کردیں تو کیا آپ کے بعد اقتدار و اختیار ہمیں مل سکے گا؟''

آپ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:

الأمر إلى الله يضعه حيث يشاء. (ايضا)

''اقتدار و اختیار اللہ کا ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیرہ کی اقتدار کے ساتھ مشروط تعاون کی پیشکش کو مسترد کردیا اور واضح کردیا کہ اقتدار و حکومت کا اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ حقیقی حاکم و فرمانروا اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، نبی اور رسول اس کا خلیفہ اور جانشین ہوتا ہے، وہ بذاتِ خود اقتدار کے حوالے سے کوئی اختیار نہیں رکھتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کرتے ہوئے حکومت چلاتا ہے۔ اسی طرح حکومتِ الٰہیہ کا سربراہ (امیر المومنین) بھی اللہ تعالیٰ کا نائب ہوتا ہے، وہ مطلق العنان حاکم نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہوتا ہے۔ الغرض آپ نے واضح کردیا کہ میری اس دعوت کا مقصد اقتدار اور حکومت کا حصول نہیں ہے، جو اس بنا پر تعاون پر تیار ہوتا ہے کہ اسے اقتدار میں شریک کیا جائے گا تو اسے قبول نہیں کیا جاتا۔

درحقیقت غلبۂ دین کی دعوت و تحریک کا مقصد لوگوں کی اصلاح کرکے اور انہیں راہ راست اور صراطِ مستقیم پر گامزن کرکے اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ دین کے ساتھ جوڑنا، ان کی دنیا و آخرت کو سنوارنا اور جہنم کے عذاب سے بچا کر رب العالمین کی رضا اور جنت کے حصول کے راستے پر لگانا ہے، لیکن چونکہ اس مقصد کی تکمیل غلبے اور اقتدار و حکومت کے بغیر ممکن نہیں ہے، اس لیے اس کا حصول ناگزیر ہوجاتا ہے، یعنی اقتدار و حکومت مقصد تو نہیں البتہ مقصد کی تکمیل کا ناگزیر ذریعہ ہے، لہٰذا غلبۂ دین کی دعوت اور تحریک اپنے مقصد کی تکمیل اور دعوت و جہاد کی توسیع کے لئے اقتدار اور حکومت تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے اور حاصل بھی کرتی ہے لیکن اربابِ دعوت و تحریک اقتدار و حکومت کو مقصد بناتے ہیں اور نہ ان کی جدوجہد کا محور و مرکز اقتدار و حکومت کا حصول ہوتا ہے، لہٰذا اس دعوت و تحریک میں ایسے افراد کی کوئی جگہ نہیں جن کا مقصد اقتدار و حکومت ہو اور وہ اس امید پر دعوت قبول کریں اور اس جدوجہد میں شریک ہوں کہ کل جب یہ دعوت غالب ہوگی اور اربابِ دعوت حکومت قائم کریں گے تو اس میں

ان کا بھی حصہ ہوگا۔

اسی طرح اربابِ دعوت وتحریک ایسے بااثر اور طاقتور افراد، گروہوں اور جماعتوں کی اقتدار وحکومت میں شریک کرنے یا حصہ دینے کی شرط کے ساتھ مشروط نصرت وتعاون کی پیش کش قبول نہ کریں۔ اربابِ دعوت صرف ایسے بااثر اور طاقتور لوگوں کی نصرت وتعاون قبول کریں جو دعوت کوفکر وبصیرت کے ساتھ قبول کریں، ایک عرصہ تک تعلیمی وتربیتی حلقوں میں شریک رہ کر دعوت وتحریک کے بنیادی افکار ونظریات کو سمجھیں اور اپنے اندر دین سے وابستگی اور نظریاتی پختگی پیدا کریں، سمع وطاعت کے خوگر ہو جائیں اور اپنے آپ کو مرکزی قیادت کے حوالے کر دیں وہ جیسے اور جس انداز میں ان سے کام لینا چاہے یہ اسی ترتیب اور تشکیل کے مطابق کام کریں۔

ان امور کی پابندی انتہائی ضروری ہے کیونکہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ بعض تحریکوں نے غیر تربیت یافتہ بااثر افراد سے تعاون لیا اور ان کے ذریعے حکومت قائم کرنے کی کوشش کی تو ان افراد نے تحریک کو استعمال کر کے اسے ایک طرف پھینک دیا اور اپنی شخصی حکومت قائم کر لی بلکہ بعد میں اربابِ دعوت کو جبر وتشدد کا نشانہ بنایا اور ان پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے۔

الغرض بحیرہ بن فراس نے اقتدار میں شرکت کے بغیر تعاون سے انکار کر دیا اور کہا:

أفنهدف نحورنا للعرب دونک، فإذا أظهرک الله کان الأمر لغيرنا! لا حاجة لنا بأمرک، فأبوا عليه. (السيرة لابن هشام ج ۲ ص ۵۵)

''ہم آپ کیلئے اپنی جانیں عرب کے سامنے پیش کریں پھر جب خدا آپ کو غالب کر دیں تو اقتدار دوسروں کو ملے؟ ہمیں اس چیز کی ضرورت نہیں ہے، پھر انہوں نے قبولِ دعوت سے انکار کر دیا۔''

بنو عامر حج کے بعد اپنے علاقے میں واپس گئے اور اپنے ایک سن رسیدہ اور جہاندیدہ آدمی کو روداد سنائی کہ ہمارے پاس قریش کے چند نوجوان آئے تھے، جن میں بنی عبدالمطلب کے ایک نوجوان کا دعویٰ تھا کہ وہ نبی ہے۔ اس نے ہمیں اس بات کی دعوت دی:

يدعونا إلى أن نمنعه ونقوم معه، ونخرج به إلى بلادنا

''ہم اس کو تحفظ دیں، اس کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں اور اسے اپنے علاقے میں لے جائیں۔''

اس بزرگ نے افسوس سے دونوں ہاتھ سر پر رکھے اور کہا ''اے بنی عامر! کیا اس کی تلافی ممکن ہے؟ کیا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں فلاں کی جان ہے، کسی اسماعیلی نے آج تک ایسا دعویٰ

نہیں کیا، وہ برحق ہیں۔'' (السیرۃ لابن ہشام ج ۲ ص ۵۵)

با اثر شخصیات کو دعوت

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ قبائل کی طرف سے دعوت قبول نہ کیے جانے کے باوجود آپ نے دعوت کا سلسلہ جاری رکھا۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا سلسلہ اسی طرح جاری رکھا، موسم حج میں جب کبھی لوگ جمع ہوتے تو آپ ان قبائل کے پاس آ کر انہیں اللہ اور اسلام کی طرف بلاتے، اپنے آپ کو ان پر پیش کرتے، اللہ کی طرف سے آپ کو جو ہدایت اور رحمت عطا کی گئی ہے اس کی دعوت دیتے، آپ جب بھی عرب کے نامور اور صاحب شرف اور با اثر شخص کے مکہ مکرمہ آنے کے بارے میں سنتے تو اس کے پاس آ کر اسے اللہ کی طرف بلاتے اور اپنی تعلیمات کی اسے دعوت دیتے۔''

(السیرۃ لابن ہشام ج ۲ ص ۵۵)

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ داعی کو اثر و رسوخ رکھنے والے افراد پر خصوصی توجہ دینی چاہیے، چاہے یہ اثر علمی، قومی، لسانی، علاقائی و ثقافتی ہو یا مالی و اقتصادی، تجارتی اور انتظامی ہو۔ اگر با اثر افراد دعوت قبول کر لیں یا کم از کم ان کی اخلاقی حمایت حاصل کر لی جائے یا اس سے بھی کم درجے میں ان کے دل میں محض دعوت اور اربابِ دعوت سے متعلق نرم گوشہ پیدا ہو جائے تو اس کے کافی مثبت نتائج سامنے آتے ہیں خصوصاً ان کے ماتحتوں اور حلقۂ اثر میں کام کرنے اور دعوت کی اشاعت و تبلیغ میں آسانی ہو جاتی ہے، جبکہ بصورتِ دیگر کئی مشکلات اور رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔

دوسرے کا نظریہ جزوی طور پر درست ہو تو تحسین کی جائے

یثرب کے قبیلے عمرو بن عوف کا ایک آدمی سوید بن الصامت جو اپنی قوم میں ''الکامل'' کے لقب سے مشہور اور بہت بڑا شاعر تھا، وہ حج کیلئے مکہ آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ملاقات کی اور اسے اسلام کی دعوت دی تو اس نے کہا کہ ''شاید آپ کے پاس وہی تعلیمات ہیں جو میرے پاس ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تمہارے پاس کیا (تعلیمات) ہیں۔'' (السیرۃ لابن ھشام ج ۲ ص ۵۶)

سوید بن الصامت نے کہا مجلّہ لقمان یعنی لقمان کی حکمت۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اعرضها علیَّ ''بیان کرو۔''

اس نے بیان کیا تو آپ نے فرمایا:

إن هـذا كـلام حسن والذی معی أفضل من هذا، قرآن أنزله الله تعالى علیَّ، هو هدی ونور فتلا علیه رسول الله ﷺ القرآن، ودعاه إلى الإسلام. (ایضاً)

"بلاشبہ یہ بہت ہی عمدہ کلام ہے لیکن جو میرے پاس ہے وہ اس سے افضل ہے، وہ قرآن ہے جو اللہ تعالیٰ نے میرے اوپر نازل کیا ہے، وہ ہدایت اور نور ہے۔ پھر آپ نے قرآن کی تلاوت کی اور اسے اسلام کی دعوت دی۔"

اس نے جواب میں کہا کہ بلاشبہ یہ عمدہ کلام ہے۔سوید بن الصامت واپس یثرب چلے آئے۔ یہاں قبائلی جھگڑے میں قبیلہ خزرج کے ہاتھوں مارے گئے ۔انصار کا کہنا تھا کہ وہ قتل ہونے سے قبل مسلمان ہو چکے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوید بن الصامت کی طرف سے بیان کردہ حکمت لقمان (علیہ السلام) کا انکار نہیں کیا بلکہ اس کی تحسین کی لیکن اس کے ساتھ یہ بھی واضح کر دیا کہ افضل تعلیمات وہدایات اورزندگی گزارنے کے اصول وقوانین پر مشتمل کتاب ہدایت وہی ہے جو میرے اللہ تعالیٰ نے میرے اوپر نازل کی ہے،اب ہدایت صرف اس کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہے ،لہٰذا تم بھی حکمت لقمان جاننے کے باوجود اسی کو اختیار کرو۔

داعی کو چاہئے کہ اگر مخاطب کوئی ایسی بات پیش کرتا ہے جو جزوی طور پر درست ہوتو اس کی تصویب کی جائے لیکن اس پر واضح کیا جائے کہ آپ کے پاس نامکمل اور ادھوری تعلیمات اور اصول ہیں جبکہ ہم آپ کے سامنے مکمل اور جامع نظریات اور قابل عمل لائحہ عمل پیش کر رہے ہیں جو قرآن وسنت کے مطابق ہے ، اسی کو اختیار کرنے میں ہی کامیابی کی ضمانت ہے اور اسی طریقے سے ہی غلبۂ دین کی جدوجہد کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جاسکتا ہے ،لہٰذا اسی راستے اور لائحہ عمل کو اپنایا جائے اور اقامتِ دین کی جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے ہمارا ساتھ دیا جائے ۔ داعی مخاطب پر اپنے نظریات اور لائحہ عمل کی افضلیت وترجیح دلائل کے ساتھ اور مؤثر اسلوب بیان میں واضح کرے۔

انصار کے قبولِ اسلام کی ابتداء

ابن ہشام انصار کے قبولِ اسلام کی ابتداء سے متعلق لکھتے ہیں:

فلما اراد الله عزوجل اظهار دینه واعزاز نبیه صلی الله علیه وسلم وإنجاز موعده له خرج رسول الله صلی الله علیه وسلم فی الموسم الذی لقیه فی

النفر من الانصار .(السیرۃ لابن هشام ج ۲ ص ۵۷)

''جب اللہ تعالی نے اپنے دین کے غلبے اور اپنے نبی کو معزز بنانے اور (نصرت کا) اپنا وعدہ پورا کرنے کا ارادہ کرلیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس موسم (حج) میں (دعوت کے لیے) نکلے جس میں انصار کے چند افراد سے ملاقات ہوئی تھی۔''

دوسرے قبائل کی طرح یثرب سے دو قبیلے اوس وخزرج بھی حج کیلئے آتے تھے۔۱۰ نبوی میں وہ بھی آئے ہوئے تھے۔ جب انصار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کو دعوت الی اللہ دیتے ہوئے دیکھا اور آپ کے احوال پر غور وفکر کیا تو ایک دوسرے سے کہنے لگے:

''اے قوم! تمہیں یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ یہ وہی (نبی) ہیں جن کے بارے میں یہود تمہیں بتاتے رہتے ہیں، پس (اس کی دعوت قبول کرنے میں) تم سے کوئی پہل نہ کرے۔''

(زادالمعاد ج ۳ ص ۴۰)

دعوت مناسب وقت میں اور اطمینان سے دی جائے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسب معمول موسم حج میں قبائل کو دعوت دے رہے تھے کہ مذکورہ افراد سے ملاقات ہوگئی، ابن اسحاق، عاصم بن عمر بن قتادہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انصار سے ملاقات ہوئی تو آپ نے ان سے فرمایا ''کیا تم بیٹھو گے؟ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے کہا کیوں نہیں۔ وہ آپ کے پاس بیٹھ گئے تو'' آپ نے انہیں اللہ کی طرف دعوت دی، اسلام پیش کیا اور قرآن کی تلاوت فرمائی۔'' (السیرۃ لابن ہشام ج ۲ ص ۵۸)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ داعی کو چاہئے کہ وہ کوشش کرے کہ مخاطب کو اطمینان وسکون کے ساتھ دعوت دے، مخاطب سے ایسے وقت میں مخاطب ہو جب وہ فارغ ہو، بات سننے کے لئے تیار ہو اور اس پر غور وفکر کر سکے، اگر ایسا نہیں ہے تو داعی کو چاہئے کہ وہ اس وقت کا انتظار کرے اور جب موزوں اور مناسب وقت ملے تو اس میں مخاطب سے بات چیت کرے۔ یہ اس لیے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مخاطب مصروف ہوتا ہے، یا اس کے پاس وقت کم ہوتا ہے اور وہ جلدی میں ہوتا ہے یا کسی پریشانی میں مبتلا ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ داعی کی دعوت کو توجہ سے سنتا ہے اور نہ اس پر غور وفکر کر سکتا ہے، اس لئے وہ اسے قبول نہیں کرتا اور آئندہ وہ دعوت پر غور وفکر کرتا ہے اور نہ داعی کی دعوت سنتا ہے کیونکہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتا ہے کہ'' وہ اس دعوت کو پہلے سے سن چکا ہے جو اس کے لئے قابل قبول

نہ تھی، اب بھی وہی دعوت دی جا رہی ہے لہٰذا اس پر کیوں توجہ دی جائے۔''

ایک روایت میں اس طرح آیا ہے کہ انصار کے چھ افراد نے اسلام قبول کرنے کے بعد آئندہ سال دوبارہ آنے کا وعدہ کیا تا کہ وہ مزید لوگوں کو دعوت کے ذریعے مسلمان کر کے اپنے ساتھ لا سکیں۔ علامہ سمہودی لکھتے ہیں:

ثم امرهم صلى الله عليه وسلم ان يدعوا قومهم الىٰ دينهم. (وفاء الوفا، ج ۱ ص ۲۲۲)

''پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنی قوم کو دین کی دعوت دینے کا حکم دیا۔''

جب نئے ساتھی دعوت قبول کریں اور اپنے علاقے میں جائیں تو انہیں اپنے علاقے کے لوگوں کو دعوت دینی چاہئے اور ان تک دعوت حقہ اور اس کے افکار و نظریات پہنچائیں، دعوت اس قدر محنت سے دی جائے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ جائے اور کوئی قبیلہ اور خاندان ایسا نہ رہے جس تک دعوت نہ پہنچی ہو۔

بیعت عقبۂ اولیٰ

دوسرے سال وعدے کے مطابق موسمِ حج میں انصار کے بارہ آدمی آئے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گھاٹی میں ملاقات کر کے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ عقبہ اولیٰ ہے، ابن ہشام لکھتے ہیں:

فبايعوا رسول الله صلى الله عليه وسلم علىٰ بيعة النساء وذلك قبل ان تفترض عليهم الحرب (السيرة لابن هشام ج ۲، ص ۶۹ ايضا، صفة الصفوة لابن جوزى ج ۱، ص ۵۱)

''انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی (بیعت النساء) اور یہ جنگ (جہاد) کی فرضیت سے قبل تھی۔''

اسی طرح صاحب امتاع الاسماع نقل کرتے ہیں:

فبا يعوه عند العقبة على الاسلام كبيعة النساء وذلك قبل ان يؤمر بالقتال (امتاع الاسماع ج ۱، ص ۳۴)

'انہوں (انصار) نے آپ سے قبولِ اسلام کی بیعت کی عورتوں کی بیعت کی طرح، کیونکہ یہ واقعہ قتال کا حکم نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔''

بیعت النساء سے کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت اس روایت سے ہوتی ہے۔ امام بخاریؒ حضرت

عبادہ بن صامتؓ سے روایت کرتے ہیں کہ'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے اس بات کی بیعت لی کہ'' اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کروگے، چوری نہ کروگے، زنا نہ کروگے، اپنی اولاد کو قتل نہ کروگے، اپنے ہاتھ پاؤں (اپنی طرف) سے گھڑ کر کوئی بہتان نہ لاؤ گے اور کسی بھی خیر کی بات میں میری نافرمانی نہ کروگے۔'' (صحیح البخاری کتاب الایمان باب بعد باب حلاوۃ الایمان)

اہم مواقع پر قائد مرکزی قیادت کو ساتھ رکھے

جس وقت انصار کے ۱۲/ افراد نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اس وقت آپ اکیلے نہ تھے بلکہ آپ کے بااعتماد ساتھی بھی آپ کے ہمراہ تھے۔''اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابوبکرؓ اور علیؓ موجود تھے۔'' (امتاع الاسماع ج ۱ ص ۳۴)

اس لئے قائد دعوت کو چاہئے کہ اس طرح کے اہم مواقع پر اپنے بااعتماد اور مرکزی قیادت کے ارکان کو ساتھ رکھے تاکہ اہم امور میں ان سے مشاورت کی جاسکے اور اس کی روشنی میں بہتر فیصلہ کیا جاسکے، نیز اہم مواقع پر مرکزی قیادت کو اعتماد میں لینے کے لیے بھی ساتھ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

دیگر علاقوں میں تعلیم وتربیت کا نظام

بیعت عقبۂ اولیٰ کے بعد انصار واپس یثرب چلے گئے اور زور وشور سے دعوت شروع کردی اور اسلام کی اشاعت کرنے لگے۔ جب کافی تعداد مسلمان ہوگئی تو ان کی طرف سے رسول ﷺ سے درخواست کی گئی کہ ان کے ہاں کسی معلم کو بھیجا جائے تاکہ نومسلم حضرات کی تعلیم وتربیت کا نظم قائم کیا جائے اہل یثرب نے آپ کو خط میں لکھا:

''اسلام ہمارے ہاں پھیل چکا ہے۔ آپ اپنے اصحاب میں سے ایسا آدمی بھیجیں جو ہمیں قرآن پڑھائے، اسلام سمجھائے' اس کا طریقہ اور مسائل (احکام) سکھائے اور نماز میں ہماری امامت کرائے۔'' (السیرۃ الحلبیۃ ج ۲ ص ۱۶۴)

باصلاحیت داعی کی تشکیل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کی درخواست پر حضرت مصعب بن عمیرؓ کی تشکیل فرمائی۔ (وفاء الوفاء، ج ۱ ص ۲۲۴)

یہ آپ کی جانب سے غالباً پہلے داعی تھے جنہیں ایک دوسری قوم اور علاقے میں دعوت کیلئے بھیجا گیا۔ حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی لکھتے ہیں:

وفيها بعث رسول الله صلى الله عليه وسلم مصعب بن عمير القرشي العبدری الصحابی رضي الله تعالىٰ عنه الىٰ اهل المدينة ليقرئهم القرآن ويعلمهم الصلوٰة و شرايع الاسلام فعلمهم و اقرأهم حتى كثر المسلمون بالمدينة. (بذل القوة ص ٣٨)

اسی (نبوت کے بارہویں) سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصعب بن عمیر القریشی العبدری کو اہل مدینہ کی طرف بھیجا تا کہ وہ انہیں قرآن پڑھائیں، نماز اور اسلام کے احکام سکھائیں چنانچہ انہوں نے اہل مدینہ کو ان امور کی تعلیم دی اور انہیں (قرآن) پڑھایا، یہاں تک کہ مدینہ میں مسلمانوں کی تعداد کثیر ہوگئی۔"

اس میں یہ سبق ہے کہ جب دیگر علاقوں کے افراد دعوت قبول کرلیں اور وہاں تعلیم وتربیت کا نظم قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو ایسے دعاۃ کی تشکیل کی جائے جو دیگر علاقے اور قوم میں جا کر تعلیم وتربیت کا نظم قائم کرسکے اسے بحسن وخوبی چلاسکیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ مدینہ کی تعلیم وتربیت کے لیے مصعب بن عمیر جیسی باصلاحیت اور جلیل القدر شخصیت کا تقرر فرمایا جنہوں نے دعوتی اور تعلیمی وتربیتی امور کو ذمہ داری سے انجام دیا بلکہ اس کا حق ادا کردیا اور اسلام کی نصرت وحمایت اور فتوحات وغلبے کی راہ ہموار کی۔

دعوت قبول کرنے والے مختلف گروہوں میں اتحاد کی ضرورت

حضرت مصعب بن عمیرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دی گئی ہدایات کے مطابق کام کررہے تھے، چنانچہ نمازوں کی جماعت کی امامت بھی وہی کرواتے تھے۔ ابن اسحاق روایت کرتے ہیں:

انه كان يصلى بهم وذلک ان الاوس والخزرج كره بعضهم ان يؤمه بعض.

(السيرة لابن هشام ج ٢ ص ٦١)

"وہی انہیں نمازیں پڑھاتے تھے، یہ اس لئے کہ اوس اور خزرج کے بعض لوگوں نے یہ ناپسند کیا کہ دوسرے (قبیلے کے لوگ) ان کی امامت کریں۔"

دراصل اوس اور خزرج کے قبیلے ایک طویل عرصے سے ایک دوسرے کے حریف چلے آرہے تھے، چند ہی سال قبل ان کے درمیان بعاث نامی خون ریز جنگ بھی ہوچکی تھی۔ اب اگر چہ دونوں قبیلوں کے معتد بہ افراد اسلام قبول کرچکے تھے اور دعوت مزید پھیلتی جارہی تھی لیکن چونکہ ابھی یہ نیا نیا معاملہ تھا اس لئے اگر کسی ایک قبیلے کے فرد کو امامت کی ذمہ داری سونپی جاتی تو اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں قومی

اور قبائلی تعصب دوبارہ سے بیدار ہو کر فساد کا باعث نہ ہو، اس لئے حکمت اور مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ تیسرے قبیلے اور قوم کا فرد ہی امامت کروائے جس پر دونوں قبیلے متفق ہوں اور اس کی اقتدا میں ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر نماز ادا کریں، لہٰذا امیر دعوت اور مرکزی قیادت کو چاہیے کہ اگر کسی علاقے، قوم یا گروہ میں اس طرح کی صورت حال ہو تو حکمت سے کام لیتے ہوئے وہاں غیر جانبدار اور باصلاحیت ارکانِ دعوت کو ان کا رہنما بنایا جائے اور اسے یہ ذمہ داری سونپی جائے کہ وہ تمام طبقات کو جوڑ کر رکھے، ان میں اتحاد و اتفاق قائم کرے اور انتشار و افتراق کا باعث بننے والے امور سے انہیں گریز کرنے کی تاکید و تلقین کرنے کے ساتھ ساتھ اتحاد و اتفاق کے ثمرات اور نتائج سے آگاہ کرتا رہے۔

دعوتی امور کی انجام دہی مرکز کی اجازت اور ترتیب پر ہو

مرکز سے مراد عمارت نہیں مرکزی قیادت ہے اس لئے اہم دعوتی امور کو مرکز یعنی مرکزی قیادت کی اجازت و مشورے سے انجام دیا جائے۔ مرکزی قیادت کے مشورے اور اجازت کے بغیر ارکان اپنی طرف سے کوئی نئی ترتیب شروع نہ کریں کیونکہ اس طرح افتراق و انتشار پیدا ہوتا ہے اور جماعتی نظم میں خلل واقع ہوتا ہے۔

حضرت مصعب بن عمیرؓ کے یثرب میں قیام اور دعوت کے دوران اوّلین جمعے کے قیام کے بارے میں مختلف روایات آئی ہیں۔ بعض میں آیا ہے کہ حضرت مصعب بن عمیرؓ نے انصار کے مشورے پر جمعہ قائم کیا تھا یعنی یہ انصار کا اجتہاد تھا۔ بعض کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خط لکھ کر اس کا حکم دیا تھا اور بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ حضرت مصعب بن عمیر اور انصار نے اس کام کا عزم کر کے آپ سے اجازت طلب کی تھی۔ علامہ حلبی ان مختلف روایات میں تطبیق دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی مخالفت اور تضاد نہیں:

لانہ یجوز ان یکون ھذا العزم علی ذلک حصل منھم اولاً ثم ارسلوا لہٗ صلی اللہ علیہ وسلم یستأذنونہ فی ذلک فاذن لھم فیہ فقد جاء الوحی موافقہ لما اختاروہٗ. (السیرۃ الحلبیۃ ج ۱، ص ۴۰۶)

''اس لئے کہ یہ جائز ہے کہ اولاً انہوں (انصار) نے ہی اس بات کا عزم کیا ہو، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پیغام بھیجا اور آپ سے اس بارے میں اجازت طلب کی تو آپ نے انہیں اجازت مرحمت فرمائی، پھر انہوں نے جو عمل اختیار کیا اس کی موافقت میں وحی بھی آ گئی۔''

یعنی انصار نے حضرت مصعب بن عمیر کی امامت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بعد ہی جمعہ قائم کیا تھا۔ علامہ حلبیؒ کے قول سے معلوم ہوا کہ یثرب میں پہلا جمعہ آپ کی اجازت سے قائم ہوا البتہ پہلے انصار کی طرف سے اس کا ارادہ کیا گیا اور آپ سے اجازت مانگی گئی تو آپ نے دے دی، لہٰذا دیگر علاقوں میں مرکز المراکز (مرکزی قیادت) کی اجازت کے ساتھ کوئی ترتیب اختیار کی جا سکتی ہے۔

مہمان داعیوں کا خیر مقدم اور تعاون

مصعب بن عمیرؓ نے اسعد بن زرارہ کے ساتھ مل کر دعوت شروع کر دی۔ اسعد بن زرارہ انہیں مختلف لوگوں کے پاس لے جاتے تو بعض لوگوں کا یہ ردعمل ہوتا۔

''اے سعد! تمہیں ہم سے کیا سروکار، تم اس مسافر آدمی کو لے آئے ہو، اس کی وجہ سے ہمارے کم عقل اور کمزور لوگ بے وقوف بن رہے ہیں۔ ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں ''تم اس اکیلے مسافر اور دھتکارے ہوئے آدمی کو ہمارے گھروں میں کیوں لائے، یہ ہمارے کم عقلوں کو باطل بات کے ساتھ بیوقوف بنا رہا ہے اور انہیں اس کی طرف دعوت دیتا ہے۔'' (السیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۴۰۷)

اس میں یہ سبق ہے کہ جب مرکز کی طرف سے داعیوں کی تشکیل کی جائے تو وہ جس علاقے میں جائیں وہاں کے ارکانِ دعوت کو ان کا خیر مقدم کرنا چاہیے، انہیں قیام کی سہولت فراہم کرنی چاہئے اور سب سے اہم بات یہ کہ دعوت میں ان کی رہبری کرتے ہوئے بھرپور نصرت وتعاون کرنا چاہیے، کیونکہ باہر سے آنے والے داعیوں کو علاقے کے لوگوں کے مزاج، خیالات اور اخلاق واطوار کے بارے میں معلومات نہیں ہوتیں اور نہ ہی اس علاقے کے لوگ دیگر علاقوں سے آنے والے اجنبی حضرات کی باتوں پر کان دھرتے ہیں، اس لئے مقامی ارکانِ دعوت کا یہ فریضہ ہوتا ہے کہ وہ رہبر کا کردار ادا کرتے ہوئے داعیوں کی لوگوں سے ملاقاتیں کروائیں، ان کے بیانات کروائیں اور اگر اپنے ہی خاندان، قبیلے، قوم اور علاقے کے لوگ اعتراض کریں تو خاموشی کے ساتھ ان کی باتیں سنیں اور اپنا کام جاری رکھیں، مخالفین کی تنقید، تنقیص اور طعن وتشنیع کی پرواہ نہ کریں۔

دو اہم شخصیات کا قبول اسلام

ایک دن حضرت اسعد بن زرارہؓ، حضرت مصعب بن عمیرؓ کو قبیلہ بنی عبدالاشہل اور قبیلہ بنی ظفر کو دعوت دینے کے لئے گئے، ایک باغ میں بیٹھے تو مسلمان ان کے پاس جمع ہو گئے۔ وہاں تھوڑے فاصلے پر دو بڑی شخصیات حضرت سعد بن معاذؓ اور حضرت اسید بن حضیرؓ موجود تھے انہوں نے، مصعب

بن عمیر کی آمد کے بارے میں سنا تو سعد بن معاذؓ نے اسید بن حضیرؓ سے کہا کہ ''تم جا کر انہیں روکو اور انہیں یہاں آنے سے منع کرو، اگر اسعد بن زرارہ میرے خالہ زاد نہ ہوتے تو میں خود انہیں جا کر منع کرتا۔''

دعوت کا انداز

حضرت اُسیدؓ ان دونوں کے پاس پہنچے اور بولے: ''تم دونوں ہمارے یہاں کیوں آئے ہو؟ ہمارے کمزوروں کو بیوقوف بناتے ہو؟ یاد رکھو! اگر تمہیں اپنی جان کی ضرورت ہے تو ہم سے الگ ہی رہو۔'' حضرت مصعبؓ نے کہا: ''کیوں نہ آپ بیٹھیں اور کچھ سنیں۔ اگر کوئی بات پسند آجائے تو قبول کرلیں پسند نہ آئے تو چھوڑ دیں۔'' اب حضرت مصعبؓ نے اسلام کی بات شروع کی اور قرآن کی تلاوت فرمائی، چنانچہ حضرت اُسید نے اسلام قبول کرلیا، پھر بولے! میرے پیچھے ایک اور شخص (حضرت سعد بن معاذؓ) ہے اگر وہ تمہارا پیروکار بن جائے تو اس کی قوم کا کوئی آدمی پیچھے نہ رہے گا اور میں اس کو ابھی تمہارے پاس بھیج رہا ہو۔

اس کے بعد حضرت اُسید حضرت سعدؓ کے پاس پہنچے۔ حضرت سعدؓ نے ان سے دریافت کیا کہ تم نے کیا کیا؟ انہوں نے کہا: ''میں نے ان دونوں سے بات کی تو واللہ مجھے کوئی حرج تو نظر نہیں آیا ویسے میں نے انہیں منع کر دیا ہے۔ پھر حضرت سعد اٹھے اور ان دونوں کے پاس پہنچے اور اُسعد بن زُرَارَہ کو مخاطب کر کے بولے: ''خدا کی قسم اے ابوامامہ! اگر میرے اور تیرے درمیان قرابت کا معاملہ نہ ہوتا تو تم مجھ سے اس کی امید نہ رکھ سکتے تھے۔ ہمارے محلے میں آکر ایسی حرکتیں کرتے ہو جو ہمیں گوارا نہیں۔'' حضرت مصعبؓ نے حضرت سعد سے کہا: ''کیوں نہ آپ تشریف رکھیں اور سُنیں۔ اگر کوئی بات پسند آگئی تو قبول کرلیں اور اگر پسند نہ آئی تو ہم آپ کی ناپسندیدہ بات کو آپ سے دُور ہی رکھیں گے۔'' حضرت سعد نے کہا: ''انصاف کی بات کہتے ہو۔'' پھر بیٹھ گئے۔ حضرت مصعبؓ نے ان پر اسلام پیش کیا اور قرآن کی تلاوت کی۔ حضرت سعدؓ نے اسلام قبول کرلیا۔

بااثر افراد کو اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنا چاہیے

حضرت سعد بن معاذؓ اپنے قبیلے کے پاس آئے اور ان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ اے بنو عبدالاشہل! میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ کہنے لگے ''آپ ہمارے سردار، ہم میں سب سے بہتر رائے رکھنے والے اور بابرکت پاسبان ہیں'' ان کے اس جواب پر انہوں نے کہا:

فإن كلام رجالكم ونسائكم على حرام حتى تؤمنوا بالله وبرسوله

(السيرة لابن هشام ج ٢ ص ٦٤)

''تمہارے مردوں اور عورتوں سے میری بات چیت حرام ہے تا آنکہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ۔''

سعد بن معاذ کے اس طرزِ عمل کی برکت سے بنی عبدالاشھل کے تمام لوگ اسی روز مسلمان ہو گئے ۔ابن ہشام روایت کرتے ہیں کہ ''شام تک بنی عبدالاشھل کا کوئی ایک مرد اور عورت نہ تھی جو مسلمان نہ ہوئے ہوں۔'' (السیرۃ لابن ھشام ج ۲ ص ۶۴)

اس بہت بڑی کامیابی کے حصول کے بعد حضرت مصعب بن عمیرؓ حضرت اسعد کے گھر لوٹ آئے اور دعوت کا سلسلہ جاری رکھا، ابن ہشام لکھتے ہیں:

فاقام عنده يدعو الناس الى الاسلام حتى لم تبق دار من دور الانصار الا وفيها رجال ونساء مسلمون. (ايضاً)

''وہ انہی کے پاس مقیم رہے، لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، یہاں تک کہ انصار کے محلوں میں سے کوئی ایک محلہ ایسا نہ تھا جہاں مرد اور عورتیں مسلمان نہ ہوئی ہوں۔''

انصار کی طرف سے آئندہ سال زمانہ حج میں خدمت نبوت میں حاضری کا وعدہ ہو چکا تھا۔ اس لیے حضرت مصعب بن عمیرؓ مسلمانوں کا قافلہ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کیلئے مکہ آئے پھر مصعب بن عمیرؓ حج کیلئے انصار مسلمانوں سمیت مکہ لوٹے۔ ان کے ساتھ مشرکین حاجی بھی تھے۔ مکہ آئے اور رسول ﷺ کو اسلام قبول کرنیوالوں کے بارے میں بتلایا تو آپ اس سے بہت خوش ہوئے۔''

بیعت نصرت، فتح و کامرانی کا پیش خیمہ

انصار کا اتنی بڑی تعداد میں اسلام قبول کرنا اور نصرت کے لئے بیعت پر تیار ہو جانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی فتح و کامرانی اور غلبے کا پیش خیمہ تھا، جیسا کہ ابن ہشام لکھتے ہیں:

فواعدوا رسول الله ﷺ العقبة، من أوسط أيام التشريق، حين أراد الله بهم ما أراد من كرامته، والنصر لنبيه وإعزاز الإسلام وأهله وإذلال الشرك وأهله. (السيرة لابن هشام ج ٢ ص ٦٥)

''انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقبہ میں ایام تشریق میں ملاقات کا وقت طے کرلیا، اس وقت اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت، اپنے نبی کی نصرت، اسلام اور اہل اسلام کے غلبے اور شرک اور اہل شرک کی تذلیل کا ارادہ فرما چکے تھے۔''

یعنی جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسلام کی فتح و غلبے کا ارادہ کرلیا تو اس وقت نصرت کی راہ ہموار کردی اور انصار کو اسی عظیم کارِ خیر کے لئے منتخب فرما کر آپ کی خدمت میں بھیج دیا۔

درحقیقت دعوت وتحریک کی فتح و غلبے کا ایک وقت ہوتا ہے، جب دعوت وتحریک اس قابل ہو جاتی ہے کہ وہ فاسد نظام کو منہدم کر کے اس کی جگہ بہتر اور صالح نظام نافذ کر کے اسے چلا سکے گی تو اس وقت نصرت کا حصول موزوں بلکہ ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ دعوت فتح و غلبے سے پہلے کے مراحل طے کر چکی ہوتی ہے اور اب آخری مرحلے یعنی نصرت حاصل کر کے صالح نظام کے نفاذ کے لئے اقتدار کے حصول کا مرحلہ باقی ہوتا ہے، جس کی طرف بڑھنا اس وقت انتہائی ضروری ہوتا ہے چونکہ تقریباً بارہ سال تک دعوت اور تعلیم وتربیت کے نتیجے میں آپ کی دعوت اس آخری مرحلے میں داخل ہونے کے لئے تیار تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا سامان پیدا فرما دیا۔

بیعت عقبۂ ثانیہ کی اہمیت

چونکہ عقبۂ ثانیہ میں ہونے والی بیعت ہی اسلام کی شان وشوکت کے ظہور اور غلبے کا باعث بنی تھی، اس لئے صحابہ کرام اسے بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ امام بخاری، کعب بن مالک ؓ سے روایت کرتے ہیں:

ولقد شهدت مع النبی صلی الله علیه وسلم لیلة العقبة حین تو اثقنا علی الاسلام وما احبّ ان لی بها شهد بدر و ان کانت بدر اذکر فی الناس منها. (صحیح البخاری کتاب المناقب باب وفود الانصار الی النبی صلی الله علیه وسلم بمکة)

''میں لیلۃ العقبہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ موجود تھا جب ہم نے اس پر عہد ومعاہدہ کیا تھا، اور مجھے یہ بات پسند نہیں کہ اس کی بجائے بدر میں موجود ہوتا اگرچہ بدر کا لوگوں میں زیادہ تذکرہ کیا جاتا ہے اور وہ زیادہ مشہور ہے۔''

حضرت کعب بن مالک ؓ بیعت عقبہ ثانیہ کو غزوۂ بدر پر کیوں ترجیح دیتے تھے۔ علامہ بدرالدین عینی مذکورہ روایت کی تشریح کرتے ہوئے اس کی وجہ بیان کرتے ہیں:

لان هذه البیعة کانت فی اول الاسلام و منها فشا الاسلام وتاکدت اسبابه وا

ساسه. (عمدة القاری جز ۱۷، ص ۱۳)

''اس لئے کہ یہ بیعت اسلام کے ابتدائی زمانے میں تھے، اسی کی وجہ سے اسلام پھیلا اور اس کے اسباب وذرائع اور بنیادیں مضبوط ہوئیں۔''

حضرت کعب بن مالکؓ اسلام کی اشاعت وغلبے کا باعث بننے والی بیعت کو ترجیح کیوں نہ دیں، اس مقصد کے لئے آپ ایک عرصے تک قبائل کو دعوت دیتے رہے، ایام حج اور سالانہ لگنے والے بازاروں میں ایک ایک قبیلے کے پاس گئے اور اس سے نصرت طلب کی لیکن آپ کو مثبت جواب نہ ملا، اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت اہل مدینہ کے لئے مقدر کی ہوئی تھی اس لئے وہ اس کے لئے تیار ہو گئے اور اس کا حق ادا کر دیا۔

بیعت کو مخفی رکھنے کی حکمت

بیعت عقبہ ثانیہ کو مخفی رکھا گیا تھا۔ علامہ قسطلانی لکھتے ہیں:

وكانت سراً عن كفار قريش (المواهب اللدنيه مع شرح الزرقانی ج ۲، ص ۸۹)

''یہ بیعت کفارِ قریش سے مخفی کی گئی تھی۔''

اس تاریخ ساز بیعت کو اس لئے مخفی رکھا گیا تھا تا کہ کفارِ قریش کو اس کے بارے میں پہلے سے پتہ نہ چلے کیونکہ اگر انہیں اس کا پہلے سے علم ہو جاتا تو وہ اس کو روکنے کی بھر پور کوشش کرتے اور عین ممکن تھا کہ وہ یثرب سے آئے ہوئے مشرکین کو انصار کے خلاف بھڑکانے یا خود انصار کو بزور اس بیعت سے باز رکھنے کی مذموم سعی کرتے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر چہ دعوت کھلم کھلا دی جائے لیکن اس کے اہم معاملات اور ایسے امور جن کے مستقبل میں دور رس نتائج نکلنے والے ہوں انہیں مخالفین سے مخفی رکھا جائے تا کہ وہ وقت سے پہلے ان کو ختم کرنے کی سازش اور منصوبہ بندی نہ کر سکیں۔

مخبر مقرر کرنے کی وجہ

بعض روایات میں آیا ہے کہ بیعت عقبہ ثانیہ کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ اور علیؓ بھی تھے اور بعض روایات کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف حضرت عباسؓ تھے۔ علامہ حلبیؒ ان دنوں روایات میں تطبیق دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک یہ روایت (کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف عباس تھے) اس روایت کہ آپ کے ساتھ ابوبکر اور علی تھے، کے خلاف نہیں ہے اس لئے کہ عباسؓ نے علیؓ کو گھاٹی کے ایک

سرے پر بطور مخبر مقرر کیا تھا اور ابو بکر کو گھاٹی کے دوسرے سرے پر بطور مخبر مقرر کیا تھا اور اس وقت آپ کے ساتھ صرف عباس تھے۔'' (السیرۃ الحلبیۃ ج۱ ص۴۱۰)

باخبر رہنے کی ضرورت

اس سے یہ معلوم ہوا کہ نہ صرف اہم دعوتی امور یا بالفاظ دیگر لائحہ عمل کو مخالفین سے مخفی رکھا جائے بلکہ ایسے مواقع کی نگرانی کے لئے با قاعدہ مخبر بھی مقرر کیے جائیں اور انہیں مختلف جگہوں پر تعینات کیا جائے۔ یاد رہے کہ ایک عام اصلاحی دعوت یا تحریک کے لئے تو شاید ان امور کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی لیکن ایک صحیح انقلابی دعوت اور تحریک کے لئے مخالفین کے عزائم اور ان کی حرکات وسکنات پر نظر رکھنا ناگزیر ہے، کیونکہ ایک انقلابی دعوت اور تحریک پر یوں تو شروع دن سے ہی مخالفین کی نظر ہوتی ہے لیکن جب یہ رفتہ رفتہ پھیلتی اور زور پکڑتی جاتی ہے تو مخالفین اس سے خطرہ محسوس کرنے لگتے ہیں اور انہیں اپنا سیاسی معاشی اور سماجی مستقبل تاریک ہوتا ہوا نظر آ رہا ہوتا ہے، اس لئے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اس سے پہلے کہ یہ تحریک کامیاب ہو کر ان کے مفادات کے محافظ نظام کو منہدم کر کے اس کے ساتھ ان کا بھی صفایا کر دے، اس کا ''بندوبست'' کر لیا جائے، چنانچہ ظاہری ذرائع و وسائل استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ زیر زمین سازشوں کے تانے بانے بھی بنے جاتے ہیں اور مروج نظام کا سہارا لیتے ہوئے اور اس کی خفیہ انتظامی مشینری کو استعمال کرتے ہوئے تحریک اور اربابِ تحریک کو نشانہ بناتے ہیں، مقامی اور مرکزی قیادت کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی جاتی ہے اور متحرک اور مستعد ارکانِ تحریک کا کام تمام کرنے کی باقاعدہ مہم شروع کر دی جاتی ہے۔

نیز سب سے اہم بات یہ کہ تحریک کے ارکان کو جاسوسی کے لئے خرید کر تحریک میں نقب لگانے کی مذموم سعی کی جاتی ہے، ان تمام امور کے پیشِ نظر دعوت وتحریک کے مخالفین کی سازشوں اور منصوبوں پر نظر رکھنا، انہیں ناکام بنانا، اسی طرح دعوت وتحریک کے اندر موجود مخالفین کے ''آدمیوں'' پر بھی کڑی نظر رکھنا ضروری ہے۔

اہم مواقع پر جامع اور مختصر گفتگو کی جائے

امام بیہقی، حضرت عامر سے روایت کرتے ہیں کہ بیعت عقبہ ثانیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عباسؓ کے ساتھ تشریف لائے تو آپ نے فرمایا:

''تمہارا متکلم گفتگو کرے لیکن بات لمبی نہ کرے، اس لئے کہ مشرکین نے تمہارے پیچھے جاسوس لگا

رکھے ہیں اگر انہیں تمہارے بارے میں معلوم ہو گیا تو وہ تمہیں رسوا کر سکتے ہیں۔''

(دلائل النبوۃ ج ۲، ص ۴۵۰)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ ایسے اہم مواقع پر اس طرح کا طرزِ عمل اختیار کرتے ہوئے جامع، مختصر اور محتاط انداز میں گفتگو کی جائے۔

سوچ سمجھ کر نصرت کی بیعت کی جائے

جب تمام حضرات بیٹھ گئے تو حضرت عباس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا:

''اے گروہِ خزرج! (اوس اور خزرج دونوں قبائل موجود تھے اور زیادہ تعداد اہل خزرج کی تھی اور ویسے بھی اہلِ عرب اوس پر بھی خزرج کا اطلاق کیا کرتے تھے) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہمارے اندر جو مقام و مرتبہ حاصل ہے تمہیں معلوم ہے، ہماری قوم میں جو لوگ ہماری طرح (شرک پر قائم) ہیں، ہم نے انہیں ان سے تحفظ دیا ہے، وہ اپنی قوم میں باعزت اور اپنے شہر میں محفوظ ہیں، وہ صرف تمہارے ہاں جانے پر رضامند ہوئے ہیں۔''

پھر انہیں متنبہ کرتے ہوئے کہا:

فان كنتم ترون أنكم وافون له بما دعوتموه اليه وما نعوه ممن خالفهُ فأنتم وما تحملتم من ذلك و ان كنتم ترون انكم مسلموه و خاذلوه بعد الخروج به اليكم فمن الآن تدعونه فانه فى عز و منعة من قومه وبلده،(السيرة الحلبية ج ا ،ص ۴۱۰)

''اگر تم سمجھتے ہو کہ انہیں جس چیز کی دعوت دے رہے ہو، اسے پورا کر سکو گے اور ان کے مخالفین سے ان کا دفاع کر سکو گے تو تم اس ذمہ داری کو اٹھاؤ، اور اگر تم سمجھتے ہو کہ جب یہ تمہارے پاس آ جائیں گے تو تم انہیں (دشمنوں) کے سپرد کر دو گے اور انہیں رسوا کر دو گے تو ابھی سے انہیں چھوڑ دو، اس لئے کہ وہ اپنی قوم اور اپنے شہر میں باعزت اور باحفاظت ہیں۔''

حضرت عباسؓ کی اس تقریر کے جواب میں حضرت براء بن معرور نے کہا:

''اللہ کی قسم! جو کچھ ہم زبان سے کہہ رہے ہیں، اگر ہمارے دلوں میں اس کے علاوہ کوئی دوسری بات ہوتی تو ہم ضرور (صاف صاف) کہہ دیتے لیکن ہمارا وفاداری اور اس بیعت کو سچا کر دکھانے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرنے کا (پختہ) ارادہ ہے۔'' (ایضاً ص ۴۱۰)

نصرت کے نتیجے میں ممکنہ مشکلات کا بخوبی ادراک ہونا چاہیے

ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضرت عباس نے کہا:

قد أبى محمد النّاس كلّهم غير كم فان كنتم أهل قوة وجلد و صبر بالحرب واستقلال بعد اوة العرب قاطبة ترميكم عن قوس واحدة فأروا رأيكم وائتمر وابينكم ولا تفرقوا الاعن ملأمنكم واجتماع فان أحسن الحديث أصدقه. (ایضاً)

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمہارے علاوہ سب سے انکار کر دیا ہے، اگر تم اہل قوت وطاقت، جنگ میں استقامت دکھانے والے اور تمام عرب کی دشمنی مول لینے میں استقلال کا مظاہرہ کرنے والے ہو کیونکہ وہ تمہیں ایک ہی کمان سے نشانہ بنائیں گے (متحد ہو کر حملہ آور ہوں گے) تم اپنی کوئی ایک رائے قائم کرو، آپس میں مشورہ کرو اور کوئی متفقہ فیصلہ کر لو، اس لئے کہ سب سے بہتر وہی بات ہے جو سچائی پر مشتمل ہو۔''

کامیابیوں کی کنجی

اس میں یہ سبق ہے کہ بیعت عقبہ ثانیہ جیسے اہم موقع اور مرحلے پر (یعنی جب نصرت وتعاون کا باقاعدہ معاہدہ اور بیعت کی جارہی ہو تو) اس کی اہمیت، حیثیت، سنگینی اور اس کے نتیجے میں پیش آنے والے ممکنہ مشکلات اور مسائل سے بخوبی آگاہ ہونا ضروری ہے۔ حضرت عباسؓ اگرچہ اس وقت خود مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن وہ اس امر سے بخوبی آگاہ تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہ صرف دعوت قبول کرنا بلکہ نصرت وتعاون کی بیعت کرنا اور انہیں اپنے علاقے اور شہر میں لے جانا کس قدر کٹھن اور جان لیوا معاملہ ثابت ہوسکتا ہے، کیونکہ وہ دیکھ چکے تھے کہ قریش جو آپ کی قوم تھی خصوصاً خاندانِ ہاشم جس کے آپ چشم و چراغ تھے، اس کے اکثر لوگوں نے آپ کی دعوت قبول نہ کی تھی، بلکہ ابولہب جیسے انتہائی قریبی رشتے داروں نے آپ کو جھٹلایا، آپ کو ایذائیں پہنچائیں، آپ کے پیروکاروں کے لئے مکہ کی زمین تنگ کر دی گئی، انہیں دو مرتبہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنا پڑی، مخالفت اور عداوت اس قدر بڑھی کہ آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تو خاندان عبدالمطلب کو شعب ابی طالب میں تین سال تک محصور ہونے پر مجبور کر دیا گیا، ابوطالب کی وفات کے بعد آپ کو طائف جانا پڑا جہاں آپ کو اس قدر جبر وتشدد کا نشانہ بنایا گیا جس کا اس سے پہلے دس سال تک آپ کو سامنا نہ کرنا پڑا، یہ حالات سامنے رکھنے کے باوجود آپ کی نصرت کرنا اور اپنے شہر لے جانا پورے عرب سے جنگ مول

لینے اور اپنے آپ کو ان کے سامنے لقمۂ تر کے طور پر پیش کرنے کے مترادف ہے، اگر نصرت کرنے والا اس طرح کے مستقبل کا سامنا کرنے کی اہلیت، جرأت اور جذبہ رکھتا ہے اور اپنے عزم میں پختہ ہے تو یہ تحریک اور امیرِ تحریک کی تحریکی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی ہوتی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے گا کہ یہ ''کامیابیوں کی کنجی'' ہوتی ہے تو بے جانہ ہوگا۔

الغرض نصرت کرنے کا عزم رکھنے والے افراد کو نصرت کا مطلب ومفہوم، اہمیت، اس کے دوررس نتائج اور ممکنہ مشکلات ومصائب کا بخوبی ادراک ہونا چاہئے تاکہ وہ ذہنی، نفسیاتی اور جسمانی طور پر پہلے سے ہی تیار رہوں۔ ان امور کے پیشِ نظر ہی حضرت عباسؓ نے انصار کو مخاطب کرتے ہوئے مذکورہ بالا گفتگو کی۔

نصرت کے حوالے سے دو اہم باتیں

جب عباس بات کر چکے تو انصار نے انہیں کہا ''ہم آپ کی بات سن چکے، اے اللہ کے رسول! آپ ارشاد فرمایئے اور اپنے لئے اور اپنے رب کے لئے جو چاہتے ہیں ہم سے شرائط منوا لیجئے۔ ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

''آپ اپنے لئے جو (عہد) چاہیں لیں اور اپنے رب کے لئے جو چاہیں شرط رکھیں۔''

(ایضاً ص ۴۱۰)

اس کے جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أشترط لربي عزوجل أن تعبدوه ولا تشركوا به شيئا ولنفسي أن تمنعوني مما تمنعون منه أنفسكم وأبناء كم و نساء كم. (ایضاً ص ۴۱۰)

''رب عزوجل کے لئے شرط یہ ہے کہ اسی کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، میری اپنی ذات کے لئے شرط یہ ہے کہ تم مجھے اسی طرح تحفظ دو گے جس طرح تم اپنی اپنی اولاد اور عورتوں کا تحفظ کرتے ہو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے سامنے دو باتیں پیش فرمائیں:

(الف) عقائد ونظریات کو مکمل طور پر قبول کیا جائے۔ یعنی تحریک کے بنیادی افکار کو دل ودماغ سے قبول کیا جائے اور اس میں کسی قسم کا ابہام، تردد یا ملاوٹ نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ نصرت حاصل کرکے انہی افکار ونظریات کی بنیاد پر مبنی نظام نافذ کیا جائے گا۔ اگر انہیں سمجھنے یا قبول کرنے میں کوئی

کمی یا جھول ہوتو آئندہ نافذ کیے جانے والے نظام پر بھی شکوک وشبہات اورتحفظات وخدشات کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔

(ب) امیر دعوت اورمرکزی قیادت کومکمل تحفظ دیا جائے اوران کا دفاع اسی طرح کیا جائے جیسے اپنے جگر گوشوں یعنی اہل واولاد کا کیا جاتا ہے۔نصرت کے حوالے سے یہی نکتہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ بیعت کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے کہ دعوت کے افکار ونظریات پر مبنی نظام کے نفاذ کے لئے مطلوبہ قوت کے حصول میں اربابِ دعوت سے مکمل تعاون کیا جائے۔

حضرت براء بن معرور نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ مبارک پکڑا اورعرض کیا:

نعم والذی بعثک بالحق لنمنعنک مما نمنع به أزرنا أی نساء نا وأنفسنا لأن العرب تکنی بالا زار عن المرأة وعن النفس فنحن والله أهل الحرب وأهل الحلقة، أی السلاح ورثنا ها کابرا عن کابر (السیرة الحلبیة ج ١ ص ٤١٠)

''جی ہاں!قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کوحق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، ہم آپ کی اسی طرح حفاظت اور دفاع کریں گے جس طرح ہم نے اپنی عورتوں اوراپنی جانوں کی کرتے ہیں۔اللہ کی قسم!ہم جنگجواوراسلحہ رکھنے والےلوگ ہیں اور یہ سلسلہ نسل درنسل چلاآرہاہے۔''

مشکلات کےادراک کے باوجودنصرت

جس وقت حضرت براء بن معرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات چیت کررہے تھے، اسی دوران ابوالہیثم بن التیہان نے آپ کومخاطب کرتے ہوئے عرض کیا:

نقبله علی مصیبة المال وقتل الاشراف .(السیرة الحلبیة ج ١ ص ٤١٠)

''ہم اس (معاہدے) کو مال ومتاع کے تباہ ہونے اور بڑے بڑے سرداروں کے قتل ہونے (کے خدشے) کے باوجودقبول کرتے ہیں۔''

انصار نے اپنے اس وعدے کونبھایااورخوب نبھایا، ہرمشکل موقع اورموڑ پر مال خرچ کیااورانفاق مال کی لازاول مثالیں قائم کیں۔اللہ اوراس کے رسول کے لئے جانیں بھی نچھاور کیں۔بڑے بڑے سرداروں، بوڑھوں، جوانوں حتی کہ کمسنوں نے بھی اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیےاوراللہ تعالیٰ کی رضااور جنت کےحصول کے مستحق قرار پائے۔

اس بات چیت کے دوران چونکہ آوازیں اونچی ہورہی تھیں اس لئے حضرت عباس نے تنبیہ

کرتے ہوئے کہا ''اپنی آواز آہستہ (پست) کرو کیونکہ ہماری جاسوسی کے لئے جاسوس تعینات کئے گئے ہیں۔''

یک جان دو قالب

ابوالہیثم نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے عرض کیا:

''اے اللہ کے رسول! ہمارے اور یہود کے درمیان کچھ معاہدے ہیں جنہیں ہم ختم کرنا چاہتے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ اگر ہم ایسا کرلیں اور اللہ آپ کو غلبہ دے دیں تو آپ اپنی قوم کی طرف لوٹ جائیں اور ہمیں چھوڑ دیں۔'' (ایضاً)

ابوالہیثم کی اس بات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا:

بل الدم الدم الهدم الهدم أنا منكم و أنتم مني أحارب من حاربتم وأسالم من سالمتم.(السيرة لابن هشام ج٢ ص٦٨)

''آپ لوگوں کا خون میرا خون ہے، آپ کی بربادی میری بربادی ہے، میں تم سے ہوں اور تم مجھ سے ہو، جس سے تم جنگ کرو گے اس سے میں جنگ کروں گا اور جس سے تم صلح کرو گے اس سے میں صلح کروں گا۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کچھ لوگ اربابِ دعوت کی نصرت پر آمادہ ہوتے ہیں اور اس کے لیے جان و مال کی قربانی دینے پر تیار ہوتے ہیں تو اربابِ دعوت کو چاہیے کہ وہ انصار کو اپنی طرف سے بھی مکمل اعتماد میں لیں اور انہیں اس بات کی یقین دہانی کروائیں کہ انہیں اکیلا نہ چھوڑا جائے بلکہ اربابِ دعوت اور انصار ہمیشہ ''یک جان دو قالب'' رہیں گے۔

جب ابوالہیثم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ امور اور شرائط پر رضامند ہوگئے تو انہوں نے انصار سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

يا قوم هذا رسول الله حقاً، اشهد بالله انه لصادق و انه اليوم في حرم الله وامنه بين ظهري قومه وعشيرته فاعلموا انكم ان تخرجوه ترعكم العرب عن قوس واحدة فان كانت طابت انفسكم بالقتال في سبيل الله وذهاب الاموال والاولاد فادعوه الىٰ ارضكم فانه رسول الله حقاً وان خفتم خذلانه فمن الآن. (مغازی رسول الله صلى الله عليه وسلم لعروة بن الزبير ص ١٢٥)

''اے میری قوم! یہ اللہ کے برحق رسول ہیں، میں ان کی سچائی کی گواہی دیتا ہوں، وہ بلاشبہ آج کل اللہ کے حرم اور اپنی قوم اور خاندان کی امان میں ہیں، تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اگر تم انہیں اپنے علاقے میں لے جاتے ہو تو عرب متحد ہو کر تمہارے خلاف جنگ کریں گے، لہٰذا اگر تم بخوشی اللہ کے راستے میں قتال کرنے اور اموال اور اولاد کو لٹانے پر تیار ہو تو انہیں اپنے علاقے میں چلنے کی دعوت دو، اس لئے کہ یہ اللہ کے برحق رسول ہیں اور اگر تمہیں (ان کا ساتھ چھوڑ کر) رسوا کرانے کا خوف لاحق ہو تو ابھی سے (واضح کردو اور ایسا اقدام نہ کرو)۔''

دراصل ابوالہیثم حضرت عباس کی طرح انصار کو بیعتِ نصرت کی اہمیت اور اس کے ممکنہ نتائج پر متنبہ کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ اس کا بخوبی ادراک کرلیں اور آئندہ پیش آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر طرح سے تیار ہو جائیں اور اگر انہیں کوئی خدشات یا تحفظات ہیں تو اس کا کھل کر اظہار کردیں۔

کس بات پر بیعت کی جارہی ہے؟

اسعد بن زرارہ جو انصار میں کم عمر تھے، انہوں نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور انصار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

رويداً يا أهل يثرب! إنّا لم نضرب إليه أكباد المطي إلا و نحن نعلم أنه رسول الله، إن إخراجه اليوم مفارقة العرب كافة، وقتل خياركم، وان تعضكم السيوف، فإما أنتم قوم تصبرون على عض السيوف إذا مستكم، وعلى قتل خياركم على مفارقة العرب كافة فخذوه وأجركم على الله، وإما أنتم تخافون من أنفسكم خيفة فذروه فهو أعذر لكم عند الله عزوجل.

(دلائل النبوة للبيهقي ج ۲، ص ۴۴۳، ایضاالسيرة الحلبية ج ۱ ص ۴۱۱)

''ذرا ٹھہر جاؤ اے اہل یثرب! ہم آپ کی خدمت میں اونٹوں کے کلیجے مار کر (لمبا چوڑا سفر کر کے) اس یقین کے ساتھ حاضر ہوئے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ آج انہیں یہاں سے لے جانے کے معنی سارے عرب سے دشمنی، چیدہ چیدہ سرداروں کا قتل اور تلواروں کی مار کے ہیں اب اگر تم تلواروں کے کاٹ کھانے پر، اپنے بہترین لوگوں کے قتل ہو جانے اور پورے عرب کی مخالفت مول لینے پر استقامت دکھا سکتے ہو تو انہیں لے جاؤ، اس کا اجر تمہیں اللہ سے ملے گا اور اگر تم اس بات سے ڈرتے

ہو کہ ایسا نہ کر سکو گے تو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو، یہ تمہارے لئے اللہ کے ہاں ایک بڑا عذر ہوگا۔"

امام ابن جوزیؒ نے اسعد بن زرارہؓ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

ایھاالناس، ھل تدرون علی ماتبایعون محمداً؟ انکم تبایعون علی ان تحاربواالعرب والعجم والجن والانس فقالوانحن حرب لمن حارب ومسلم لمن سالم .(المنتظم فی تاریخ الملوک والامم ج ۳ ص ۸۲)

''لوگو! معلوم ہے تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ پر کس بات کی بیعت کررہے ہیں؟ تم ان سے عرب وعجم اور جن وانس سے جنگ کرنے کی بیعت کررہے ہو، انہوں نے جواب دیا'' ہم اس سے جنگ کریں گے جس سے آپ جنگ کریں گے اور اس سے صلح کریں گے جس سے آپ صلح کریں گے۔''

حضرت اسعد کے اس خطاب کے جواب میں انصار نے جواب دیا'' اے اسعد! اپنا ہاتھ نیچے کرو اللہ کی قسم! ہم اس بیعت کو چھوڑنے والے ہیں اور نہ (بیعت کرنے کے بعد) اس کو ختم کرنے کا مطالبہ کریں گے۔''

بیعت کی شرائط

سمع وطاعت

امام بخاری حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت کرتے ہیں:

دعاناالنبی صلی اللہ علیہ وسلم فبایعنا فقال فیمااخذعلیناان بایعنا علی السمع والطاعة فی منشطناومکرھنا وعسرنا ویسرناواَثرة علینا واَلّا ننازع الامر اھلہ الا ان تروکفراًبواحاعندکم من اللہ فیہ برھان.(صحیح البخاری کتاب الفتن باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم سترون بعدی اموراً تنکرونھا ایضاً صحیح المسلم کتاب الامارة باب وجوب طاعة الامراء)

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بلایا ہم نے آپ سے بیعت کی (عبادہ) فرماتے ہیں آپ نے ہمارے اوپر جو شرائط رکھیں وہ یہ تھیں کہ ہم آپ سے اس بات کی بیعت کریں کہ پسندیدگی اور ناپسندیدگی، تنگی اور آسانی میں سنیں اور اطاعت کریں گے، اگرچہ ہمارے اوپر دوسروں کو ترجیح دی جائے، نیز یہ کہ ہم اولوالامر (حاکم) سے تنازع نہ کریں گے۔ (آپ نے فرمایا) ہاں مگر اس میں

ایسا کفر دیکھو جس کی تمہارے پاس اللہ کی طرف سے پختہ دلیل ہو (تب تنازع کر سکتے ہو)۔''

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے روایت ہے:

وعلى الأمر بالمعروف و النهي عن المنكر وعلى أن تقولوا في الله لا تأخذكم فيه لومة لائم. (دلائل النبوة للبيهقي ج ٢، ص ٤٤٣)

''تم مجھ سے اس بات کی بیعت کرو کہ معروف کا حکم کرتے اور منکر سے روکتے رہو گے اور یہ کہ حق بات کرو گے اور اس میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف زدہ نہ ہو گے۔''

امام مسلم ابو بکر بن ابی شیبہ کے حوالے سے حضرت عبادہ بن ثابت سے روایت کرتے ہیں:

وعلى ان نقول بالحق اينما كنالانخاف فى الله لومة لائم. (صحيح المسلم كتاب الامارة باب وجوب طاعة الامرا)

''اس بات پر بیعت کرو کہ ہم جہاں کہیں ہوں گے حق بات کریں گے اور اس میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف زدہ نہ ہوں گے۔''

امام نووی آخری جملے کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

معناه نامربالمعروف وننهى عن المنكر فى كل زمان ومكان الكبائر والصغائر لانداهن فيه احداً ولانخاف ولانلتفت الى الآئمة ففيه القيام بالامر بالمعروف والنهى عن المنكر واجمع العلماء على انه فرض كفاية.

(شرح النووى لصحيح المسلم كتاب الامارة باب وجوب طاعة الامرا)

''اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ہر زمانے اور ہر جگہ، چھوٹے ہوں یا بڑے معروف کا حکم کرتے اور منکر سے روکتے رہیں گے، اس میں نہ کسی سے مداہنت کریں گے، نہ خوفزدہ ہوں گے اور نہ حکام کی طرف التفاف کریں گے۔ اس سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قائم کرنے کا حکم معلوم ہوتا ہے۔ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) فرض کفایہ ہے۔''

جہاد فی سبیل اللہ

ابن ہشام ابن اسحاق سے روایت کرتے ہیں:

وكانت بيعة الحرب حين اذن الله لرسوله فى القتال شروطاً سوىٰ شرطه

علیهم فی العقبة الاولیٰ. کانت الاولی علیٰ بیعة النساء و ذلک انّ الله تعالیٰ لم یکن اذن لرسوله صلی الله علیه وسلم فی الحرب فلمّا اذن الله لهٗ فیها وبایعهم فی العقبة الاخیرة علیٰ حرب الاحمر والاسود اخذ لنفسه واشترط علی القوم لربّه.

(السیرة لا بن هشام ج ۲ ص ۷۵،۷۶)

''یہ جنگ (جہاد) کی بیعت تھی اس وقت اللہ نے اپنے رسول کو قتال کی اجازت دے دی تھی اور یہ (بیعت) عقبہ اولیٰ کی شرائط کے علاوہ، بطور شرط تھی۔ عقبہ اولیٰ میں بیعت النساء تھی۔ اس لئے کہ اس وقت تک اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ کی اجازت نہ دی تھی، جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کی اجازت دے دی اور آپ نے ان (انصار) سے آخری عقبہ میں سرخ وسیاہ سے جنگ کرنے کی بیعت لی تو آپ نے اپنے لیے اور رب تعالیٰ کے لیے یہی شرط رکھی۔''

ابن اسحاق، عبادہ بن صامت (جو کہ عقبہ ثانیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مقرر کردہ بارہ نقباء میں سے تھے) سے روایت کرتے ہیں:

بایعنا رسول الله صلی الله علیه وسلم بیعة الحرب و کان عبادة من الاثنی عشر الذین بایعوه فی العقبة الاولیٰ علیٰ بیعة النساء علی السمع والطاعةفی عسرنا و یسرنا ومنشطنا ومکرهنا واثرة علینا وان لا ننازع الامر اهله وان نقول بالحق اینما کنا لانخاف فی الله لومة لائم. (ایضاص ۷۶)

''ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ (جہاد) کی بیعت کی تھی، عبادہؓ ان بارہ افراد میں سے تھے، جنہوں نے عقبہ اولیٰ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت النساء کی تھی اور وہ اس بات پر تھی کہ وہ تنگی اور آسانی میں پسندیدگی اور ناپسندیدگی میں اور دوسروں کو ترجیح دیے جانے کی صورت میں بھی سنیں اور اطاعت کریں گے، نیز یہ کہ اولوالامر سے نہ جھگڑیں گے، جہاں کہیں بھی ہوں گے حق کہیں گے اور ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔''

ابن اسحاق روایت کرتے ہیں کہ جب انصار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت ہونے کے لیے جمع ہو گئے تو عباس بن عبادہ بن نضلہ نے انصار کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

یا معشر الخزرج هل تدرون علام تبایعون هذا الرجل.

(السیرة الحلبیة ج ۱ ص ۳۱۱،ایضاعیون الاثر ج ۱،ص ۲۷۵)

''اے گروہ خزرج! تمہیں معلوم ہے کہ تم اس آدمی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سے کس بات کی بیعت کر رہے ہو؟''

انہوں نے جواب دیا ہاں ہمیں معلوم ہے، پھر انہوں نے خود وضاحت کرتے ہوئے کہا:

انکم تبایعونه علی حرب الاحمر والاسود من الناس.

''اے گروہِ خزرج! تم ان سے سرخ و سیاہ سے جنگ کرنے کی بیعت کر رہے ہو۔''

علامہ حلبی آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

فکانت هذه البیعة علی حرب الاسود و الاحمر، أی العرب و العجم.

(السیرة الحلبیة ج ۱، ص ۴۱۱، ایضاً الدرر ص ۷۹)

''یہ اسود اور احمر یعنی عرب اور عجم سے جنگ کرنے کی بیعت تھی۔''

نصرت

جیسا کہ ماقبل میں بارہا ذکر کیا جا چکا ہے کہ قبائل کو دعوت دینے کا مقصد ان سے نصرت طلب کرنا تھا چنانچہ بیعت عقبہ ثانیہ میں نصرت کرنے کی شرط بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے سامنے پیش کی تھی جو انہوں نے قبول کر لی۔ حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں:

فبایعو رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم علی ان یمنعوه مما یمنعون منه انفسهم ونسائهم وابنائهم وان یرحل الیهم هو واصحابه. (الدرر ص ۷۴)

انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر بیعت کی کہ وہ آپ کا اس طرح تحفظ کریں گے جس طرح اپنی جانوں، عورتوں اور بچوں کا کرتے ہیں۔ اور آپ اور آپ کے اصحاب ان کی طرف کوچ کریں گے۔''

علامہ حلبی لکھتے ہیں کہ بعض روایات میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں:

وعلیٰ ان تنصرونی اذا قدمتُ علیکم بیثرب. (السیرة الحلبیة ج ۱، ص ۴۱۴)

''تم میری اس بات پر بیعت کرو کہ جب میں یثرب آؤں گا تو تم میری نصرت کرو گے۔''

نصرت کا بدلہ

انصار نے آپ سے عرض کیا اے اللہ کے رسول! اگر ہم نے اس عہد کو پورا کیا تو ہمیں اس کے بدلے میں کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا

رضوان الله والجنة قالوا رضينا، ابسط فبسط يده صلى الله عليه وسلم فبايعوه.

(ایضاً ص ۱۱۴)

''اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت' انصار نے عرض کیا ہم اس پر راضی ہیں۔اس کے بعد بیعت ہوئی۔''

ابن ہشام ابن اسحاق سے روایت کرتے ہیں:

جعل لهم على الوفاء بذلك الجنة. (السيرة لا بن هشام ج ۲ ص ۷۵،۷۶)

''ان سے اسے نبھانے پر جنت کا وعدہ کیا۔''

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جاچکا ہے کہ دعوت وتحریک کا مقصد اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا اور جنت کا حصول ہے، امیر دعوت پر لازم ہے کہ وہ نصرت وتعاون کرنے والے افراد، گروہوں اور جماعتوں پر واضح کردے کہ نصرت کا بدلہ اور صلہ اللہ کی رضا اور جنت ہے، کسی قسم کے دنیاوی مفاد کے صلے کی نیت کی جائے اور نہ اس کی امید اور لالچ کیا جائے۔الغرض مشروط اور کسی دنیاوی مفاد کے صلے کی امید کے بغیر نصرت کی جائے۔

داعی کی عہدوں اور مناصب پر نظر نہ ہو

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار میں سے بارہ نقیب مقرر کرنے کے بعد انصار کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''موسیٰ (علیہ السلام) نے بارہ نقیب منتخب کیے تھے، کوئی دل میں یہ خیال نہ کرے اس پر دوسروں کو ترجیح دی گئی۔اس لیے یہ انتخاب جبرائیل نے (حکم خداوندی کے مطابق) کیا ہے۔''

(السیرۃ الحلبیہ ج ا ص ۴۱۱)

اس سے دعوت اور تحریک کے انتظامی ڈھانچے کے حوالے سے یہ اہم بات معلوم ہوئی ہے کہ عہدوں اور مناصب پر نظر رکھنے اور تکاثر یعنی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے اور بڑے سے بڑا عہدہ اور منصب حاصل کرنے کی دوڑ نہیں ہونی چاہیے۔ایک نظریاتی انقلابی تحریک خصوصاً جب وہ اسلامی ہو اس میں تو اس چیز کا تصور ہی نہیں ہونا چاہیے۔ایک اسلامی انقلابی تحریک کے ارکان امارت ومسؤلیت کے اسلامی اصولوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔ان کے اذہان پر غلبۂ دین کی جدوجہد کو ترقی دینے، اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کرنے اور اسے غالب کرنے کے لئے اپنی جان، مال اور وقت خرچ کرنے کا جذبہ چھایا ہوا ہو، ان کی کارکردگی پر عہدوں اور مناصب کی تبدیلی کا کوئی اثر نہ پڑنا چاہیے، وہ امیر

دعوت کے عہدے پر فائز ہوں یا ادنیٰ کارکن ،مرکزی قیادت میں ان کا شمار ہو یا مقامی سطح پر کوئی چھوٹا عہدہ،ان کی کارکردگی یکساں ہونی چاہیے۔

حب جاہ کے نقصانات

داعی امارت کے شرعی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے غلبۂ دین کی جدوجہد میں مشغول رہے۔ یادرہے کہ:

(الف) اسلامی اصولوں کے مطابق ''امارت'' عہدہ یا منصب نہیں بلکہ ایک بھاری ذمہ داری ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مسؤلیت (ذمہ داری و جوابدہی) قرار دیا ہے۔ارشاد نبوت ہے:

الا کلکم راع و کلکم مسؤل عن رعیته.

(صحیح البخاری کتاب الاحکام باب قول الله اطیعو الله)

''تم میں سے ہر شخص جوابدہ ہے اور اسے اپنے ماتحتوں کے بارے میں جواب دینا ہوگا''.

(ب) اسلامی تعلیمات کے مطابق عہدہ طلب کرنا جائز نہیں ،منصب کے طالب کو مطلوبہ منصب سپرد نہیں کیا جاتا۔ارشاد نبوی ہے:

یاعبدالرحمن لاتسأل الامارة .

(صحیح البخاری کتاب الاحکام باب من سال الامارة)

''اے عبدالرحمٰن امارت کا سوال مت کرو۔''

ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انا لانولی هذامن ساله و لامن حرص علیه .

(صحیح البخاری کتاب الاحکام باب مایکره من الحرص علی الامارة)

''ہم سوال کرنے والے اور حرص کرنے والے کو یہ امر سپرد نہیں کرتے۔''

درحقیقت حب مال کے بعد دوسرا بڑا مرض حب جاہ ہے۔جس کی وجہ سے انسان بڑی ذلتیں اٹھاتا اور رسوائیوں کا سامنا کرتا ہے ۔اس مرض کی وجہ سے بے شمار دنیاوی اور دینی نقصانات ہوتے ہیں۔دنیاوی معاملات میں بڑی بڑی لڑائیاں ،فسادات اور جنگوں کا باعث حب جاہ بنتی ہے۔اسی طرح دینی طور پر اس کے خطرناک اور بھیانک نتائج سامنے آتے ہیں جن کا مشاہدہ آج کل ہر مسلمان اپنے اردگرد کے ماحول میں کر رہا ہے ۔مختلف طبقات میں عدمِ اتحاد، دینی اصلاحی اور سیاسی جماعتوں میں

انتشار اور افتراق کی بنیادی وجہ بھی یہی مرض ہے۔ جماعتوں میں گروہ بندی اور ایک ہی جماعت کے کئی حصوں اور ٹکڑوں میں بکھرنے کی بنیادی وجہ بھی یہی بیماری ہے ،لہٰذا اسے دل ودماغ سے نکالنا از حد ضروری ہے۔ جس کے لئے تعلیمی تربیتی حلقوں میں اس حوالے سے گفتگو کرنا اور ارکان کی تربیت کے دوران ان کے دل ودماغ سے اس کا نکالنا ناگزیر ہے۔

بیعت کے بعد انصار آپ سے رخصت ہونے لگے تو عرض کیا:

اگر رسول خدا با مابر آید ومتوجہ آن دیار گردد زہی سعادت، حکم حکم اوست، ہر چہ فرماید بجان ما بندۂ فرمان بریم۔ (مدارج النبوۃ ج ۲ص ۷۷)

''اگر اللہ کے رسول ہمارے ہاں تشریف لے چلیں اور ہمارے شہر میں رونق افروز ہوں تو زہے سعادت، آپ کا ہی حکم چلے گا، جو کچھ بھی فرمائیں گے ہم دل وجان سے بندۂ فرمان ہوں گے (ہر حکم کی تعمیل کی جائے گی)۔

فی الحال قتال کی اجازت نہیں

بیعت ہو جانے کے بعد انصار نے عرض کیا ''قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر مبعوث کیا اگر آپ چاہیں تو ہم صبح اہل منیٰ (مشرکین) پر اپنی تلواروں کے ساتھ ٹوٹ پڑیں۔''

آپ نے فرمایا:

لم نؤمر بذلک. (ابن هشام ج ۲ ص ۱۷)

'''مجھے (فی الحال) اس کا حکم نہیں دیا گیا۔''

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے ان شرائط کے ساتھ بیعت لی:

(الف) سمع وطاعت کا مظاہرہ کرنا ہوگا، یعنی آپ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو احکام انہیں دیں گے وہ ان کی ہر حال میں تعمیل کریں گے، بالفاظِ دیگر وہ اب اپنے آپ کو محکوم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی حاکم سمجھیں گے۔ آپ کے بعد آئندہ بھی سمع وطاعت کا مظاہرہ کریں گے اور جب تک حاکم کفر بواح نہیں کرتا وہ اس کے احکام پر عمل پیرا ہوتے رہیں گے۔

(ب) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو انجام دیتے رہیں گے۔ اس میں کسی زمانے یا جگہ کی قید نہیں بلکہ جس وقت اور جہاں اس کا تقاضا ہوگا معروف کا حکم کرتے اور منکر سے روکتے

رہیں گے۔اس معاملے میں نہ تو مداہنت اور نہ نام نہاد مصلحت کا شکار ہوں گے اور نہ حکام سے خوفزدہ اورمرعوب ہوں گے بلکہ اسے خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس ذمہ داری کوبھرپورطریقے سے نبھائیں گے۔

(ج) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرامؓ کی نصرت ومدد کریں گے،انہیں ٹھکانہ دیں گے،ان کا تحفظ اور دفاع کریں گے،اوراسی میں کسی قسم کی کمی نہ کریں گے۔

(د) نصرت وتعاون کے نتیجے میں چاہے پورا عرب بلکہ پوری دنیا (عرب وعجم) مخالفت اورعداوت پراتر آئے یہاں تک کہ جنگ کے لئے تیار ہوجائے تو جنگ کریں گے۔

بیعتِ نصرت جنگ کا معاہدہ تھا؟

شیطان بیعت نصرت کے دوررس نتائج واثرات کاادراک کرچکا تھا،اس لیےاس نے اسے جنگ کرنے کا معاہدہ قرار دیااور جب بیعت ہوچکی تو اس نے پہاڑ کی چوٹی پر چلاتے ہوئے کہا:

یامعشر قریش هذه بنو الاوس و الخزرج تحالف علی قتالکم.(مغازی رسول الله لعروة بن الزبیر ص ۱۲۵)

''اے گروہِ قریش!یہ بنواوس اور بنوخزرج تمہارے خلاف جنگ کرنے کا حلف اٹھا چکے ہیں۔''

افشاءراز سےگھبرانا نہ چاہیے

شیطان کے قریش کومتنبہ کرنے سے متعلق علامہ حلبی لکھتے ہیں کہ انصار اس آواز سے گھبرائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا:''اس آواز سے تم خوفزدہ نہ ہو یہ اللہ کا دشمن ابلیس ہے۔''پھر آپ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا:

اسمع ای عدوّ الله اما و الله لا افزعن (السیرة الحلبیة ج ۱، ص ۴۱۲)

''اے اللہ کے دشمن سن لے،اللہ کی قسم ہم کبھی گھبرانے والے نہیں ہیں۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اس طرح کے موقع پر اگر انصار کو جاسوسی ہونے اور قبل از وقت راز فاش ہونے اوران پکڑے جانے کا خوف لاحق ہو تو امیر دعوت اورمرکزی قیادت کواس سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ وہ انہیں تسلی دے اوراللہ پربھروسہ کرتے ہوئے اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی جائے۔

بیعت کے بعد انصار رات کو ہی اپنے ٹھکانوں کی طرف چلے گئے تھے،صبح ہوئی تو قریش کے

بڑے اور اہم سردار قبیلۂ خزرج کے لوگوں کے پاس آئے اور ان سے کہا:

''اے گروہ خزرج! ہمیں یہ اطلاع ملی ہے کہ تم نے گزشتہ رات ہمارے اس آدمی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سے ملاقات کی ہے اور تم اس سے ہمارے خلاف جنگ کرنے کی بیعت کا وعدہ کر چکے ہو، اللہ کی قسم عرب کے قبائل میں سے جس کے ساتھ بھی ہماری جنگ ہوئی ہم سے زیادہ شدید جنگ کرنے والا کوئی نہیں۔'' (زادالمعاد ج۔ص۔)

قبیلہ خزرج میں سے جو لوگ ابھی تک مشرک تھے انہوں نے صفائی پیش کی اور کہا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوا اور نہ ہمیں ایسی کسی بات کا علم ہے۔ اسی طرح عبداللہ بن ابی سلول جسے اپنی سرداری پر بڑا غرور تھا، وہ بھی کہنے لگا'' یہ درست بات نہیں ہے اور ایسا کچھ نہیں ہوا اور نہ میری قوم ایسی ہے کہ وہ اس جیسا کام کرے، اگر میں یثرب میں ہوں تو وہ مجھ سے مشورہ کیے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتی۔''

مشرکین یثرب کی طرف سے تسلی دینے اور انکار کے باوجود قریش کو مصدقہ اطلاعات مل چکی تھیں کہ انصار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کر چکے ہیں چنانچہ انہوں نے انصار کی گرفتاری کے لئے ان کی تلاش شروع کر دی، انصار مدینہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے اس لیے انہیں نہیں پکڑ سکے، البتہ صرف ایک صحابی حضرت سعد بن عبادہؓ ان کے ہاتھ چڑھے تو انہوں نے ان کے ساتھ انتہائی برا سلوک کیا۔ انہیں پکڑ کر مارتے پیٹتے ہوئے مکہ لے گئے، وہاں بھی زدوکوب کرتے رہے، مطعم بن عدی اور حارث بن حرب نے آ کر انہیں چھڑوایا تو وہ مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ادھر انصار نے انہیں غیر موجود پا کر ان کی رہائی سے متعلق آپس میں مشورہ کیا، پھر دیکھا تو سعد ان کی طرف آ رہے ہیں۔

انصار کی عظمت

انصار نے اسلام کیلئے جو قربانیاں دیں، اس کی اس سے قبل کی پوری انسانی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ یہ انصار ہی تھے کہ جب تمام قبائل عرب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کرنے اور مدد و نصرت سے انکار کر دیا تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو نہ صرف قبول کیا بلکہ مدد و نصرت کیلئے بھی تیار ہو گئے (جیسا کہ مفصل بیان ہو چکا ہے) یہی وجہ ہے کہ ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں اپنے جذبات و احساسات اور ان سے محبت و الفت کا اس طرح اظہار فرمایا:

لو أن الانصار سلكوا وادياً أو شعباً لسلكت فی وادی الانصار ولولا الهجرة

لکنت امراً من الانصار .

(صحیح البخاری کتاب المناقب باب قول النبی ﷺ لولا الھجرۃ الکنت من الانصار)

''انصار جس وادی اور گھاٹی میں چلیں گے تو میں بھی انصار والی وادی میں چلوں گا، اگر ہجرت (کا حکم اور اس کی فضیلت) نہ ہوتی تو میں بھی انصار میں سے ہونا پسند کرتا۔''

اگر چہ بیعت عقبہ ثانیہ سے قبل اوس وخزرج کی ایک بڑی تعداد مسلمان ہو چکی تھی اور تمام قبائل اس سے متعارف ہو چکے تھے، لیکن پورے شہر مدینہ میں انہوں نے اس کا کھل کر مظاہرہ نہ کیا، تاہم بیعتِ نصرت کے بعد انہوں نے ایسا کیا، جیسا کہ علامہ حلبی لکھتے ہیں:

''جب انصار مدینہ لوٹے تو انہوں نے اسلام کا اظہار کر دیا یعنی مکمل اور کھلم کھلا اس کا اظہار کر دیا، ورنہ یہ بات تو گزر چکی ہے کہ اس بیعت کے لئے آنے سے پہلے ہی ان میں اسلام پھیل چکا تھا۔''

(السیرۃ الحلبیۃ ج۱ص۴۱۳)

پختہ ذہن لوگوں کو دعوت دینے کا طریقہ

بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد انصار مدینہ لوٹ آئے تو اس وقت تک جو بوڑھے لوگ ابھی تک مسلمان نہ ہوئے ان میں سے عمرو بن الجموح بھی تھے، جن کا شمار خاندانِ ابوسلمہ کے سرداروں میں ہوتا تھا۔ ان کے فرزند معاذ بن عمرو مسلمان ہو چکے تھے اور بیعت میں بھی شریک تھے۔ عمرو بن الجموح نے لکڑی کا ایک بت گھر میں رکھا ہوا تھا جس کی وہ عبادت کرتے تھے، ایک رات نوجوان انصار نے چپکے سے ان کا بت اٹھا کر باہر کوڑا کرکٹ میں پھینک دیا، صبح دیکھا تو بت نہیں، چنانچہ اسے تلاش کیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ کوڑا کرکٹ میں گندگی میں پڑا ہے۔ پھینکنے والوں کو برا بھلا کہا، بت اٹھایا، اسے دھویا، صاف کیا اور خوشبو لگا کر دوبارہ اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ رات کو جب عمرو سو گئے تو نوجوانوں نے دوبارہ ایسا کیا، عمرو نے صبح دوبارہ ڈھونڈا، کوڑے کرکٹ میں گھر پڑا دیکھا، اٹھایا، دھویا اور خوشبو لگا کر رکھ دیا، رات کو تلوار اس کے گلے میں لٹکا دی اور اسے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مجھے پتہ نہیں کون تیرے ساتھ ایسا کرتا ہے؟ تمہارے پاس یہ تلوار ہے اگر کوئی تمہارے ساتھ اسی طرح کی حرکت کرے تو تلوار سے اپنا دفاع کرنا۔ عمرو رات کو سو گئے تو نوجوانوں نے اس کے گلے سے تلوار اتار لی، اسے اٹھایا اور ایک مردہ کتے کے ساتھ ایک ہی رسی میں باندھ کر گندگی سے بھرے ایک کنویں میں پھینک دیا، عمرو صبح اٹھے تو اسے اس کی جگہ نہ پایا تو اس کی تلاش میں نکلے، تلاش کرتے ہوئے دیکھا کہ وہ کنویں میں مردہ کتے کے

ساتھ بندھا ہوا پڑا ہے۔ جب انہوں نے یہ دیکھا تو ان کی آنکھیں کھلیں اور کسی مسلمان نے ان سے گفتگو کی تو وہ اللہ کی رحمت سے مسلمان ہو گئے۔ مسلمان ہونے کے بعد اس واقعے سے متعلق انہوں نے کچھ اشعار کہے جن میں سے پہلا شعر یہ ہے:

واللّٰہ لو کنت الھاً لم تکن

انت و کلب وسط بئر فی قرن

(السیرۃ لابن ھشام ج ۲ ص ۷۵)

''اللہ کی قسم! اگر تو معبود حقیقی ہوتا تو اس طرح کتے کے ساتھ ایک رسی میں بندھا ہوا کنویں میں نہ پڑا ہوتا۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ چونکہ سن رسیدہ اور بزرگ حضرات کا ذہن پختہ ہو چکا ہوتا ہے، اس لیے انہیں ایک نئی فکر اور نیا نظریہ قبول کرنے پر آمادہ کرنا ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ضرور ہوتا ہے، نوجوان دعوت دیں تو ان کا کہنا ہوتا ہے کہ ''نوجوان ہیں، جذبات میں آکر اس طرح نا قابل عمل باتیں کر جاتے ہیں۔'' ان کی اس طرح کی باتوں کا جواب باتیں اور لمبی چوڑی تقریریں کرنے سے نہیں دیا جا سکتا بلکہ کوئی ایسی عملی چیز اور مثال ان کے سامنے رکھی جائے جس سے عمرو بن الجموح کی طرح ان کی بھی آنکھوں پر چڑھی پٹی اتر جائے اور وہ حق کا مشاہدہ کر لیں۔

بار بار تشکیل

نصرت کی بیعت ہو جانے کے بعد آپ نے حضرت مصعب بن عمیر کو دوبارہ مدینہ روانہ فرما دیا۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بذات خود ہجرت کرنے سے قبل انہیں دوبارہ مدینہ بھیج دیا چنانچہ انہوں نے بھی (یہاں پہنچ کر) لوگوں کو قرآن کی تعلیم دینا اور انہیں اسلام کی دعوت دینا شروع کر دی تو اسلام مدینہ میں پھیل گیا۔'' (بذل القوۃ ص ۳۸)

اس سے یہ معلوم ہو کہ ایک علاقے کی طرف داعی کی بار بار تشکیل بھی کی جا سکتی ہے خصوصاً جب وہ اس علاقے میں ایک حد تک دعوت کو بہتر طور پر چلا کر اسے کامیاب کر چکا ہو تو اس کی دوبارہ تشکیل زیادہ موزوں ہے اور مصلحت وحکمت کا تقاضا بھی یہی ہے، کیونکہ وہ وہاں کام کر کے کئی تجربات سے گزر چکا ہوتا ہے، وہ وہاں کے حالات، لوگوں کی ذہنی سطح، وہاں کی روایات اور تہذیب وثقافت کو سمجھ چکا ہوتا ہے، اس لیے اس کی تشکیل زیادہ مفید رہتی ہے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ مصعب بن عمیر کے علاوہ دوسرے حضرات کو بھی بطورِ معلم بھیجا گیا۔امام بخاریؒ حضرت براؓ بن عازب سے روایت کرتے ہیں۔

اول مَنْ قدم لینا مصعب بن عمیر وابن ام مکتوم وکانوا یقرؤن الناس(صحیح البخاری کتاب المناقب باب مقدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ الی المدینۃ)

''ہمارے ہاں سب سے پہلے مصعب بن عمیر اور ابن ام مکتوم آئے۔وہ لوگوں کو قرآن پڑھاتے تھے۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ بیرونی دعوت کے لئے ایک سے زائد داعی یا بالفاظ دیگر ایک جماعت بھیجی جا سکتی ہے جو وہاں اجتماعی طور پر اور ایک ہی نظم کے مطابق کام کریں۔

ہجرت کی اہمیت اور ہجری تاریخ

حضرت عمرؓ نے صحابہ کرامؓ سے اسلامی تاریخ کی ابتداء سے متعلق مشورہ کیا کہ اسے کب سے شروع کیا جائے تو مختلف آراء سامنے آئیں ،تاہم اتفاق اس بات پر ہوا کہ ہجرت سے شروع کی جائے۔علامہ سہیلیؒ اسلامی تاریخ کی ہجرت سے ابتدا کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فاتفق رأیھم ان یکون التاریخ من عام الھجرۃ لانہ الوقت الذی عز فیہ الاسلام والذی امر بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وأسس المساجد وعبداللہ آمنا کما یحب.(الروض الانف ج ۲،ص ۱ ۱)

''ان کی متفقہ رائے یہ تھی کہ تاریخ ہجرت والے سال سے شروع کرنی چاہئے ،اس لئے کہ یہی وہ وقت تھا جس میں اسلام ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور جو حکم دیا اس کو شان وشوکت ملی، مساجد کی بنیادیں رکھیں اور حالتِ امن میں اللہ کی عبادت کی جیسا کہ چاہتے تھے۔''

ہجری تاریخ کی وجہ

ابن عباس سے روایت ہے کہ جب عمرؓ نے تاریخ طے کرنے کا عزم کیا تو صحابہ کو جمع کر کے ان سے مشورہ لیا تو سعد بن ابی وقاصؓ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تاریخ شروع کیجئے، طلحہؓ نے کہا آپ کی بعثت سے ابتدا کیجئے اور علیؓ نے مشورہ دیا کہ:

ارخ لھجرتہ فانما فرقت بین الحق و الباطل.(عمدۃ القاری جز ۱۷، ۲۶)

''آپ کی ہجرت سے اس کی ابتداء کیجئے، کیونکہ اس نے حق اور باطل کے درمیان تفریق کی تھی۔''

مختلف اقوام نے اپنے اپنے لیے مختلف تاریخیں مقرر کر رکھی ہیں اور ہر قوم نے اپنی تاریخ کی ابتدا کسی نہ کسی تاریخی واقعے سے کی ہے۔اسلامی تاریخ کی ابتدا بھی آخر کسی تاریخی واقعے سے ہی کی جانی تھی،حضرت سعد بن وقاصؓ اور حضرت طلحہ کا مشورہ بھی اپنی جگہ درست تھا،لیکن حضرت علی بن ابی طالبؓ کی تجویز پسند کی گئی اور اسے زیادہ اہمیت دیتے ہوئے اسلامی تاریخ کی ابتدا ہجرت کے واقعے سے کی گئی اور اس کی وجہ بھی سیدنا علیؓ نے بیان فرمادی کہ دراصل اسی واقعے کی بدولت حق اور باطل کے درمیان تفریق واضح ہوئی اسلام کی کامیابیوں اور فتح ونصرت کا آغاز اسی سے ہوا۔

دراصل تیرہ سالہ انتھک جدوجہد کے باوجود مکہ اسلام اور مسلمانوں کا مضبوط ٹھکانہ اور گڑھ نہ بن سکا تھا،اسلام کے احکام کی روشنی میں معاشرے کی تشکیل اور نظامِ حیات کے نفاذ کا تو یہاں فی الحال تصور بھی نہ کیا جاسکتا تھا۔مدینہ میں اسلامی معاشرے کی تشکیل ہوئی تو ہجرت ونصرت کی بدولت،مدینہ کے تمام قبائل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم اور سردار تسلیم کیا تھا تو اسی کی بدولت،غزوۂ بدر میں فتح حاصل ہوئی،پھر بالآخر مکہ فتح ہوا تو اسی کی بدولت۔الغرض ہجرت ونصرت نہ ہوتی تو بظاہر ان امور کا وقوع ممکن نہ تھا۔چنانچہ اسی وجہ سے اسلامی تاریخ کی ابتداء اسی تاریخی واقعے سے کی گئی اور آئندہ آنے والے مسلمانوں کو سبق دیا گیا کہ یادرکھو!جب تک ہجرت ونصرت،پھر جہاد کا راستہ نہ اپنایا جائے تب تک غلبۂ دین کی جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کرنا ممکن نہیں ہے۔

ہجرت وجہاد

بیعتِ عقبہ ثانیہ میں یہ بھی طے پایا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس مدینہ تشریف لے جائیں گے،چنانچہ آپ نے صحابہ کرامؓ کو ہجرت کی اجازت دیدی۔ابن قتیبہ لکھتے ہیں:

ثم امره الله تعالیٰ بالهجرة وافترض عليه الجهاد فامر اصحابه بالهجره.(المعارف لابن قتيبه ص ١٥١)

''اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہجرت کا حکم دیا اور آپ پر جہاد فرض کر دیا تو آپ نے صحابہ کو ہجرت کا حکم دیا۔''

صحابہ کرامؓ یکے بعد دیگرے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے لگے۔امام بخاریؒ ابن اسحاق سے روایت ہے:

''سب سے پہلے مصعب بن عمیر اور ابن ام مکتوم آئے،یہ حضرات لوگوں کو قرآن پڑھایا کرتے

تھے، پھر بلال، سعد اور عمار بن یاسر آئے، پھر عمرؓ بیس صحابہ کے ساتھ آئے۔''

(صحیح البخاری باب ہجرۃ النبی ﷺ واصحابہ)

غلبۂ دین کی جدوجہد کو ترجیح

عمر بن الخطابؓ نے ہجرت کی تو ان کے ساتھ عیاش بن ابی ربیعہ نے بھی مدینہ ہجرت کی مدینہ پہنچے تو ابوجہل بن ہشام اور حارث بن ہشام جو ان کے چچازاد تھے، مدینہ پہنچے اور ان سے کہا کہ تمہاری ماں نے نذر مانی ہے کہ جب تک وہ تمہیں نہیں دیکھے گی، نہ کنگھا کرے گی اور نہ سایے میں بیٹھے گی۔ عیاش نے یہ سنا تو ان کا دل پسیج آیا، عمر بن الخطاب فرماتے ہیں کہ میں نے اسے کہا ''اے عیاش! اللہ کی قسم! یہ لوگ تمہیں تمہارے دین سے منحرف کرنا چاہتے ہیں، تم ان سے بچو اللہ کی قسم! اگر تمہاری ماں کو جوؤں نے تنگ کیا تو وہ ضرور کنگھا کرے گی اور مکہ کی گرمی نے پریشان کیا تو ضرور سایہ میں بیٹھے گی۔ عیاش نے کہا: میری ماں ضرور قسم کو پورا کرے گی، میرا وہاں مال ہے میں وہی لینا چاہتا ہوں۔ عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے کہا:

و اللہ إنک لتعلم أنی لمن أکثر قریش مالاً، ذلک نصف مالی و لا تذھب معھما. (السیرۃ لابن ھشام ج ۲ ص ۸۹، ۹۰)

''اللہ کی قسم! تمہیں معلوم ہے کہ میں قریش میں کثیر مال کا مالک ہوں، تم میرا آدھا مال لے لو اور ان کے ساتھ واپس نہ جاؤ۔''

حضرت عیاش نے حضرت عمرؓ کا مشورہ اور پیشکش قبول نہ کی اور ان کے ساتھ واپس روانہ ہو گئے، راستے میں ابوجہل اور حارث نے ان کو پکڑ کر باندھ لیا اور اسی حالت میں مکہ میں داخل ہوئے انہیں وہاں قید کر دیا پھر ابوجہل نے اہل مکہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

یا أھل مکة، ھکذا فافعلوا بسفھائکم کما فعلنا بسفیھنا ھذا.

(السیرۃ لابن ھشام ج ۲ ص ۹۰)

''اے اہل مکہ! تم بھی اپنے احمقوں کے ساتھ یہی سلوک کرو جو ہم نے اس بے وقوف کے ساتھ کیا ہے۔''

اس میں یہ سبق ہے کہ داعی کو اگر ایسی صورت درپیش ہو تو وہ دین، عقائد و نظریات اور مقصدِ زندگی یعنی غلبۂ دین کی جدوجہد کو ہر چیز پر ترجیح دے۔

مشکل میں پھنسے ساتھیوں کو رہا کروانا

عیاش بن ابی ربیعہؓ اور ہشام بن العاصؓ دونوں مکہ میں پھنس گئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت فرمائی تو ایک دن فرمایا ''کون ہے جو عیاش بن ابی ربیعہ اور ہشام بن العاص کو رہا کروا کرلائے؟ ولید بن الولید بن المغیرہ نے عرض کیا:

أنا لک یا رسول الله بهما. (السیرة لابن هشام ج ۲ ص ۹۱)

''اے اللہ کے رسول! میں ان (کی رہائی) کیلئے تیار ہوں۔''

چنانچہ ولید بن الولید دونوں کو مکہ سے رہا کروا کرلائے۔ جس سے معلوم ہوا کہ اگر رفقاءِ دعوت کہیں کسی مشکل میں پھنس جائیں مثلاً گرفتار ہو جائیں، مخالفین اغوا کر کے لاپتہ کر دیں وغیرہ، تو انہیں بے یارومددگار نہیں چھوڑنا چاہیے بلکہ رہا کروانے اور چھڑوانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو مخالفین کی طرف سے اس کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہو سکتا ہے، وہ جس کو اور جب چاہیں گے اٹھا کرلے جائیں گے اور انہیں جبر وتشدد کا نشانہ بنائیں گے، پھر اگر اربابِ دعوت انہیں چھڑوانے کے لیے متحرک نہ ہوئے تو ساتھیوں کی حوصلہ شکنی ہوگی جس کا نقصان یہ ہوگا کہ وہ بڑھ چڑھ کر امورِ دعوت میں حصہ لینے سے گریز کرنے لگیں گے۔

سارا مال قربان کردیا

حضرت صہیب رومی مکہ سے ہجرت کر کے جانے لگے تو قریش نے ان کا راستہ روک لیا اور انہیں قتل کر کے ان کا مال لینا چاہا تو انہوں نے قریش کو کہا کہ ''تمہیں معلوم ہے کہ مجھ سے زیادہ صحیح ہدف پر تیراندازی کرنے والا تم میں سے کوئی نہیں ہے۔ اگر تم نے میرے قریب آنے کی کوشش کی تو ایک بھی زندہ نہ بچے گا۔'' قریش نے کہا تم مال ہمیں دے کر جا سکتے ہو۔ انہوں نے کہا:

مالی خلفته بمکة وانا اعطیکم امارةً فأخذونه. (الدرر ص ۸۳)

''میں اپنا مال مکہ میں چھوڑ کر جارہا ہوں، میں تمہیں نشانی بتاتا ہوں تم اسے لے لینا۔''

چنانچہ انہوں نے نشانی بتائی تو قریش نے انہیں جانے کی اجازت دے دی اور بتائی گئی نشانی کے مطابق مال لے لیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَؤُفٌ بِالْعِبَادِ﴾ (۲: ۲۰۷)

''اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں اپنی جان تک بیچ ڈالتے

ہیں۔ اللہ بندوں پر بہت مہربان ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر صحابہ کرامؓ تو ہجرت کر رہے تھے لیکن خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم حکمِ خداوندی کے منتظر تھے کہ اجازت ملے تو ہجرت کی جائے۔ حضرت ابوبکر الصدیق ؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار ہجرت کی اجازت چاہتے تھے لیکن جب حضرت ابوبکر الصدیق ؓ نے مدینہ کی طرف ہجرت کا ارادہ کیا تو انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''رک جائیں، امید ہے کہ مجھے ہجرت کی اجازت دی جائے گی۔'' چنانچہ ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے رک گئے تاکہ ہجرت میں آپ کی صحبت حاصل کر سکیں۔

(صحیح بخاری کتاب المناقب باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ الی المدینۃ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے مخالفین کو خوف

جیسا کہ ماقبل میں بیان کیا جا چکا ہے کہ بیعت عقبہ ثانیہ میں انصار صحابہؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قسم کا تحفظ کرنے اور آپ کی خاطر عرب و عجم سے لڑائی کرنے کا عہد کیا تھا، اس لئے مشرکین مکہ کو یہ خوف لاحق ہو گیا تھا (اور حقیقت بھی یہی تھی) کہ اگر صحابہ کرامؓ مدینہ چلے جاتے ہیں اور آپ بھی ہجرت کر جاتے ہیں تو پھر آپؐ اپنے ساتھیوں (مہاجرین و انصار) سمیت ان کے خلاف پیش قدمی کر کے انہیں مغلوب بنائیں گے اور مکہ پر قابض ہو جائیں گے۔ اسی خوف کے پیش نظر وہ آپ کے خلاف فیصلہ کن اقدام کیلئے مشاورت کرنے لگے، چنانچہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

فحذروا خروج رسول الله صلى الله عليه وسلم اليهم وعرفوا انه قد اجمع لحربهم. (السيرة لابن كثير ج ۲ ۲۲۷)

''مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان (انصار) کی طرف نکلنے سے خوفزدہ ہو گئے اور انہیں یہ بات معلوم ہو گئی کہ آپ ان کے خلاف جنگ (جہاد) کرنے کا عزم کر چکے ہیں۔''

امام ابن القیم الجوزیہ لکھتے ہیں:

''جب مشرکین نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کوچ کر کے قبائلِ اوس و خزرج کی طرف اپنے بیوی بچے اور اموال لے جا چکے ہیں اور انہیں یہ بات بھی معلوم تھی کہ یثرب محفوظ ٹھکانہ ہے اور یہ قوم (اوس و خزرج) اسلحہ رکھنے والے، سخت گیر اور جنگجو ہیں تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کی طرف نکلنے اور ان سے جا ملنے سے خوفزدہ ہو گئے اور ان پر یہ معاملہ گراں

گزرا۔''(زادالمعاد ج۳ص۵۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنفسہٖ ہجرت کی وجہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تین ماہ تک اذنِ خداوندی کا انتظار کرنا پڑا۔آخر کار ربیع الاوّل میں اجازت ملی۔مشرکینِ مکہ کے ظلم وستم کا نشانہ بننے والے صحابہ کرامؓ تو مدینہ سے پہلے دوبار حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھےاور وہاں امن وامان سے رہ رہے تھے،اسی طرح مدینہ ہجرت کر جانے والے صحابہ کرامؓ بھی امن وامان سے رہ رہے تھے بلکہ انصار ان سے مکمل تعاون کر رہے تھے،اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت کی تو آپ کا بذاتِ خود ہجرت کرنے کا سبب کیا تھا؟اس کی وضاحت درج ذیل آیت،اس کی تفسیر اوراس کے بارے میں مروی احادیث سے ہوتی ہے۔ارشادِ ربانی ہے:

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِيْرًا.(الاسراء:۸۰)

''اور کہہ اے رب داخل کر مجھ کو سچا داخل کرنا اور نکال مجھ کو سچا نکالنا اور عطا کر دے مجھ کو اپنے پاس سے حکومت کی مدد۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)

امام ابن کثیر اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے آپ کی رہنمائی کی اور آپ کو الہام کیا کہ آپ ان الفاظ میں اللہ سے دعا کریں کہ آپ جن مشکل حالات میں گھرے ہوئے ہیں،ان میں جلد فراخی اور نکلنے کے اسباب پیدا فرمائیں، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دی،جہاں آپ کے مددگار اور احباب موجود تھے تو یہ شہر آپ کی محفوظ پناہ گاہ اور ٹھکانے میں بدل گیا اور اس کے رہائشی (اوس وخزرج) آپ کے انصار بن گئے۔''(تفسیر ابن کثیر ج۲،ص۲۲۶)

حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں:

المخرج الصدق مكة والمدخل الصدق المدينة والسلطان النصير الانصار.

(الدرر ص۸۰)

''مخرج صدق سے مراد مکہ،مدخل صدق سے مراد مدینہ ہےاور سلطان نصیر سے مراد انصار ہیں''۔

علامہ زرقانی سلطاناً نصیراً کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قوة تنصرني بها علىٰ اعدائك.(شرح الزرقانی ج۲،ص۱۰۰)

''ایک ایسی قوت (عطا کیجئے) جس سے آپ اپنے دشمنوں کے خلاف میری نصرت کریں''

امام ابن کثیر حضرت قتادہ سے اس آیتکی تفسیر میں ان کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علم ان لا طاقة لهٗ بهذا الامر الا بسلطان فسأل سلطاناً نصیراً لکتاب اللہ ولحدو اللہ ولفرائض اللّٰہ ولاقامة دیناللہ فان السلطان رحمة من اللہ جعله بین اظهر عباده لو لاذلک لاغار بعضهم علیٰ بعض وفاکل شدیدهم ضعیفهم.

(تفسیر ابن کثیر تفسیر سورة الاسراء، ایضادلائل النبوة للبیهقی ج ۲، ص ۵۱۷)

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ انہیں اس امر (اشاعت وغلبۂ اسلام) کی سلطان کے بغیر طاقت نہیں ہے چنانچہ آپ نے اللہ سے کتاب اللہ، اس کے حدود وفرائض اور کتاب اللہ (کے احکام) کے قیام کیلئے سلطان کی درخواست کی، اس لئے کہ سلطان اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایسی شان و شوکت ہے جسے اللہ نے اپنے بندوں کے سامنے قائم کردی ہے، اگر یہ نہ ہوتی تو لوگ ایک دوسرے کے خلاف غارت گری کرتے اور طاقتور کمزوروں کو کھا جاتے۔''

امام ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ اس سے مراد کھلی دلیل (حجة بینة) ہے، پھر حضرت قتادہ کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

وهو الارجح لانه لابد مع الحق من قهر لمن عاداه وناوأه.

(تفسیر ابن کثیر تفسیر سورة الاسراء)

''وہی زیادہ راجح قول ہے اس لیے کہ حق کے ساتھ اس کی مخالفت اور اس کا مقابلہ کرنے والوں کے خلاف طاقت وقوت کا ہونا ضروری ہے۔''

اقامت دین کے لیے قوت واقتدار

''سلطان نصیر'' (حکومت کی مدد) کی مندرجہ بالا وضاحت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مکہ میں کتاب اللہ یعنی قرآن کے احکام وحدود وفرائض الٰہیہ اور دین کے قیام کی صورت ابھی تک نہ بن پائی تھی کیونکہ مشرکین مکہ نے بے شمار رکاوٹیں کھڑی کی ہوئی تھیں جن کی موجودگی میں فی الحال مذکورہ امور کا قیام ممکن نہ تھا، اس لئے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے وہ طاقت وقوت، اسباب وسائل اور ایسی جگہ عطا کرنے کی درخواست کی جہاں آپ اور آپ کے اصحاب بلا روک ٹوک اللہ کی کتاب،

اس کے حدود و فرائض، الغرض اسلامی نظام حیات کے احکام اور حکومتِ الٰہیہ کا قیام کر سکیں کیونکہ جب تک کسی شہر اور خطے میں طاقت واقتدار حاصل کر کے اس کا عملی نفاذ نہیں کیا جاتا تب تک اسے مقبول بنایا جا سکتا ہے اور نہ اس کی اشاعت وتوسیع کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ کفریہ طاقتیں ایمان واسلام کے نفاذ اور توسیع میں سدراہ رہتی ہیں، اور وہ لوگ جو اس کی حقانیت وصداقت کا ادراک کر چکے ہوتے ہیں اور اسے قبول کرنا چاہتے ہیں، وہ باطل قوتوں کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے حق قبول کرنے سے محروم رہتے ہیں، اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ کسی ایسی جگہ اور خطے پر قبضہ (کنٹرول) کیا جائے جہاں اس کی عملی شکل قائم کی جائے اور طاقت واقتدار کا استعمال کرتے ہوئے اس دعوت اور نظام کو توسیع دی جائے، چنانچہ طاقت کے ذریعے آگے بڑھا جاتا اور علاقوں کو فتح کر کے اور اپنے قبضے میں لے کر وہاں کی مقتدر طاقتوں کو بے دخل کر کے اس نظام کو نافذ کیا جاتا ہے۔

اس سے ایک تو یہ ہوتا ہے کہ وہاں کے عوام کو اس نظام اور اس کے بنیادی افکار ونظریات کو دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملتا ہے، دوسرا یہ کہ وہ باطل مقتدر طاقتوں کے اثر سے بھی آزاد ہو جاتے ہیں اور یوں دعوت حقہ کو قبول کرنے میں حائل رکاوٹ ختم ہو جاتی ہے چنانچہ وہ خود بخود اسے قبول کر لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے جہاد فرض کیا گیا ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

خلاصہ کلام یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا مقصد مکہ سے دوسرے علاقے میں منتقل ہو کر وہاں صالح معاشرے کی تشکیل اور اسلامی حکومت کا قیام تھا تاکہ وہاں اس کی بنیادیں مضبوط کر کے (بالفاظِ دیگر بیس کیمپ قائم کر کے) دیگر علاقوں کی طرف بڑھا جائے چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور غزوۂ بدر سے لے کر فتح مکہ، پھر غزوۂ تبوک اسی سلسلے کی کڑی تھا۔

کیا نظام خود بخود تبدیل ہوگا؟

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کی دعوت محض کوئی ارتقائی اصلاحی دعوت نہ تھی کہ محض صبر وتحمل اور عفو ودرگذر کے اصول پر عمل پیرا ہوتے ہوئے رفتہ رفتہ کام کو آگے بڑھایا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ جب لوگوں کی اکثریت کی اصلاح ہو جائے گی تو نظام اور حکومت بھی خود بخود تبدیل ہو جائے گا اور اس کی اصلاح ہو جائے گی نہیں بلکہ ایک عرصہ تک محنت کرنے اور اصحاب تیار کرنے کے بعد جب مکہ میں بات بنتی نظر نہیں آئی تو آپ نے مدینہ کا رخ کیا اور وہاں انصار کے تعاون سے اسلامی نظام قائم کر کے اسے دوسرے علاقوں تک توسیع دی، یہاں تک کہ محض آٹھ سال کے بعد اسی

شہر کو فتح کر کے اسلامی نظام نافذ کیا جہاں آپ مسلسل تیرہ سال دعوت دیتے رہے اور آپ کو وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ اس میں یہ سبق ہے کہ اربابِ دعوت وتحریک کو چاہیے کہ وہ سیرۃ نبویہ کے اس نمونے کو سامنے رکھتے ہوئے پہلے کسی ایک علاقے (موجودہ دور میں ایک ملک) پر توجہ مرکوز رکھیں، اس میں خوب محنت کریں، جب تیاری مکمل ہو جائے تو اقدام کرتے ہوئے اسلامی نظام تشکیل دیں، پھر رفتہ رفتہ دیگر علاقوں اور ممالک کی طرف بڑھیں۔

امیر کے قتل کا منصوبہ

ہجرت سے خوفزدہ ہو کر مکہ کے تمام اہل لرائی اور تجربہ کار لوگ دارالندوہ میں جمع ہوئے۔ اس مشاورتی اجلاس کا محرک ابوجہل تھا۔ جب تمام لوگ جمع ہو گئے تو ابلیس شیخ نجدی کی صورت میں آیا اور اجازت حاصل کرنے کے بعد اس مشاورت میں شریک ہو گیا۔ مشورہ شروع ہوا تو مشرکینِ مکہ ایک دوسرے سے کہنے لگے:

''اس آدمی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاملے کو تم دیکھ چکے ہو، اللہ کی قسم! ہمیں اس بات کا خدشہ ہے کہ اغیار نے اس کی جو اتباع کر لی ہے تو یہ (انہیں تیار کر کے) ہمارے اوپر حملہ آور ہو گا، لہٰذا تم اس کے بارے میں کوئی متفقہ رائے قائم کر لو۔''

(السیرۃ لابن ہشام ج ۲ ص ۹۵، ایضاً عیون الاثر ج ا ص ۱۷۸)

جب مشورہ شروع ہوا تو ایک نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ اسے لوہے میں بند کر کے کسی مکان میں ڈال کر دروازہ بند کر دیا جائے، تا آنکہ اسی حالت میں اسے موت آ جائے، اس پر شیخ نجدی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

''خدا کی قسم! یہ رائے درست نہیں، خدا کی قسم! اگر تم انہیں قید کرو گے جیسا کہ تم کہہ رہے ہو تو تم جہاں انہیں بند کرو گے اس کی بات اس کے ساتھیوں تک پہنچ جائے گی، قریب ہے کہ وہ تم پر حملہ آور ہوں اور تمہارے قبضے سے اسے چھڑوا لے جائیں، پھر ان کی تعداد بڑھ جائے یہاں تک کہ وہ تم پر غالب آ جائیں، لہٰذا یہ رائے درست نہیں، کچھ اور سوچو۔''

(السیرۃ لابن ہشام ج ۲ ص ۹۵، ایضاً عیون الاثر ج ا ص ۱۷۸)

پھر مشورہ ہوا تو ایک آدمی نے اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہم انہیں جلا وطن کر دیتے ہیں۔ جب یہ ہمارے علاقے سے نکل جائیں گے تو ہمیں اس بات کی پرواہ نہیں ہو گی کہ وہ کہاں جاتے ہیں

اور کیا کرتے ہیں۔ان کے چلے جانے کے بعد ہمارے حالات حسب سابق معمول پر آ جائیں گے۔
اس رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ نجدی نے کہا:

لا واللہ ماھذا لکم برأی الم تروا احسن حدیثه وحلاوة منطقه وغلبته علیٰ قلوب الرجال لما یاتی به واللہ لوفعلتم ذلک ما امنتم ان یحل علی حي من العرب فیغلب علیهم بذلک من قوله وحدیثه حتیٰ یتابعوہُ علیه ثم یسیر بهم الیکم حتی یطأکم بهم فی بلادکم فیأخذ امرکم من ایدیکم ثم یفعل بکم ما اراد، دبرّوا فیه رایاً غیر هذا.(السیرة لا بن هشام ج ۲،ص ۹۵ ایضاًعیون الاثر ج ا،ص ۱۷۸)

''اللہ کی قسم! یہ کوئی درست رائے نہیں ہے۔کیا تم اس کا حسنِ کلام، زبان کی شیرینی اور جو بات وہ لائے ہیں اس کے ذریعے لوگوں کے دلوں پر اس کے غلبے کو نہیں دیکھتے ہو؟ اللہ کی قسم! اگر تم نے اس طرح کیا تو اس بات سے محفوظ نہیں رہ سکتے کہ وہ عرب کے کسی قبیلے کے پاس چلے جائیں اور اپنی باتوں سے ان پر غالب آ جائیں اور وہ اس کی اتباع کرلیں۔پھر وہ انہیں لے کر تم پر حملہ آور ہو اور تمہارے علاقے میں تمہیں روند ڈالے (اینٹ سے اینٹ بجا دے گا) اور تمہارا اختیار واقتدار تم سے چھین لے، پھر تمہارے ساتھ جو چاہے کرے،لہٰذا تم کوئی دوسری بات سوچو۔''

آخر میں ابوجہل نے اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا میری رائے یہ ہے کہ ہر قبیلہ میں سے ایک عالی النسب اور طاقتور نوجوان لیا جائے پھر یہ اکٹھے ہو کر اس پر ایک ہی وار کر کے اس کا کام تمام کر دیں، اس طرح ہم اس سے نجات پا سکتے ہیں۔جب ہر قبیلے کا نوجوان قتل میں ملوث ہوگا تو بنو عبد مناف تمام قبائل سے جنگ کرنے پر قادر نہ ہوں گے،لہٰذا دیت پر بات آئے گی جو تمام قبائل مل کر باآسانی ادا کر دیں گے۔اس رائے کو شیخ نجدی نے پسند کیا اور کہا:

القول ماقال الرجل هذا الرأی الذی لااری غیره.(السیرة لا بن هشام ج ۲، ص ۹۶)

''(اصل) بات تو یہی ہے جو اس آدمی نے کہی ہے، یہی درست رائے ہے میں بھی اس کے علاوہ کوئی دوسری رائے نہیں رکھتا۔''

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس واقعے کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

وَاِذۡ یَمۡکُرُ بِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِیُثۡبِتُوۡکَ اَوۡ یَقۡتُلُوۡکَ اَوۡ یُخۡرِجُوۡکَ وَیَمۡکُرُوۡنَ وَیَمۡکُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَیۡرُ الۡمٰکِرِیۡنَ (الانفال: ۳۰)

''اور (اے محمد اس وقت کو یاد کرو) جب کافر لوگ تمہارے بارے میں چال چل رہے تھے کہ تم کو قید کریں یا جان سے مار ڈالیں یا وطن سے نکال دیں، (ادھر) تو وہ چال چل رہے تھے اور (ادھر) اللہ چال چل رہا تھا اور اللہ بہتر چال چلنے والا ہے۔''

قتل کی تجویز کیوں؟

اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ ابلیس اور قریش میں سے ابوجہل جیسے لوگ اس بات کا بخوبی ادراک کر چکے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت رکنے والی نہیں آپ کو کسی گھر میں قید کر کے ہلاک ہونے کا انتظار کیا جائے تو آپ کی آواز آپ کے جاں نثاروں تک ضرور پہنچے گی اور وہ ضرور آپ کی رہائی کی کوشش کریں گے اور بالآخر چھڑوا لے جائیں گے، اگر ایسا ہوا تو آپ ان کے ساتھ مل کر اور بھرپور تیاری کر کے مکہ پر حملہ آور ہوں گے۔ دوسری تجویز کہ جلاوطن کر دیا جائے تو یہ تو پہلی سے بھی زیادہ خطرناک بات ہے کیونکہ اس صورت میں آپ جہاں اور جس قبیلے میں بھی جائیں گے وہاں اپنے کلام، عقائد وافکار اور اندازِ بیان سے ان کے دل ودماغ پر چھا جائیں گے، پھر انہیں ساتھ ملا کر مکہ پر زوردار حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے، لہٰذا اس صورت میں بھی اہل مکہ کی خیر نہیں، اس لیے ابوجہل کی تجویز ابلیس کو پسند آئی اور اس نے بھرپور تائید کی کہ اس سے بہتر کوئی تجویز نہیں۔

دراصل انہیں یہ صاف نظر آ رہا تھا (اور بجا طور پر نظر آ رہا تھا) کہ قتل کے سوا ان کا راستہ روکنے کا کوئی ذریعہ نہیں، لہٰذا اس مسئلے کا جڑ سے ہی خاتمہ ضروری ہے۔ یعنی انہیں اس بات پر یقین ہو چکا تھا کہ اگر آپ زندہ رہیں، قید میں ہوں یا جلاوطن کر دیے جائیں، قریش کی خیر نہیں ہوگی اور آپ ضرور مکہ پر حملہ کریں گے، لہٰذا انہیں کسی صورت میں مکہ سے زندہ نکلنے نہ دیا جائے۔

الغرض قریش نے آپ کے قتل کے منصوبے پر اتفاق کر لیا اور اسے عملی جامہ پہنانے کی تیاری بھی کر لی۔ ادھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو اس منصوبے سے آگاہ کر دیا، آپ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ وہ آپ کی چادر اوڑھ کر آپ کے بستر پر سو جائیں، قریشی نوجوانوں کا دستہ منصوبے کے مطابق آپ کے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا اور حملے کے لیے پوری طرح کمربستہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توکل علی اللہ کرتے ہوئے باہر نکلنے کا عزم کیا، بحکمِ خداوندی مٹی ہاتھ میں لی اور گھر سے باہر موجود مشرکین کے سروں پر پھینکتے ہوئے یہ آیات تلاوت فرماتے جاتے تھے:

﴿یٰسٓ وَالْقُرْآنِ الْحَکِیْمِ اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ﴾ (یسین: ۱، ۲)

''یسین، قسم ہے قرآن کی جو حکمت سے بھرا ہوا ہے (اے محمد) بیشک تم پیغمبروں میں سے ہو۔''

درج ذیل آیت تک آپ نے پڑھا۔

﴿فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ﴾ (یسین)

''پھر ان پر پردہ ڈال دیا تو وہ دیکھ نہیں سکتے۔''

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات کی تلاوت سے فارغ ہوئے تو اس وقت ''کوئی آدمی ایسا نہ تھا جس کے سر پر مٹی نہ ہو۔'' (ابن ہشام ج ۲، ص ۹۶)

اس کے بعد آپ اپنے مطلوبہ ٹھکانے پر تشریف لے گئے۔ مشرکین کو کچھ پتہ نہ چلا، یہ آپ کا انتظار کرتے رہے، ایک آدمی آیا اور اس نے ان سے کہا:

''خدا نے تمہیں رسوا کر دیا ہے۔ خدا کی قسم! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو تمہارے سامنے گذرے، تم میں سے ہر ایک پر مٹی پھینکی اور اپنے کام کو چلے گئے۔'' (ایضاً ج ۲ ص ۹۷)

تب انہوں نے اپنے سروں سے مٹی جھاڑی اور جھانک کر دیکھا تو انہیں ایک آدمی سویا ہوا نظر آیا، انہیں یقین ہو گیا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ صبح ہوئی تو حضرت علیؓ بستر سے اٹھے تو انہیں بڑی شرمندگی ہوئی چنانچہ ناکام و نامراد لوٹ گئے۔

حساس معاملات کو خفیہ رکھنے کی ضرورت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے فیصلے کو خفیہ رکھا اور چند انتہائی معتمد حضرات کے علاوہ کسی کو اس کا علم نہیں تھا۔ ابن اسحاق روایت کرتے ہیں:

''مجھے جو روایت پہنچی ہے اس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے (مکہ سے) نکلنے کے بارے میں علیؓ، ابوبکر صدیق اور ابوبکر کے اہل خانہ کے علاوہ کوئی نہ جانتا تھا۔''

(السیرۃ لابن ہشام، ج ۲، ص ۹۸)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اہم مواقع پر اہم فیصلوں اور اقدامات کو مخفی رکھا جاتا ہے تاکہ دشمن کی مخالفانہ کارروائیوں سے محفوظ رہا جا سکے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر الصدیق کو بتلایا تھا کہ عنقریب مجھے بھی اجازت ملنے والی ہے جس میں تم بھی رفیق ہو گے تو اس کے بعد سے حضرت ابوبکر الصدیق ؓ نے اس سفر کیلئے دو اونٹنیاں پالنا شروع کر دی تھیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کی اجازت ملی تو آپ ابوبکر

کے پاس تشریف لائے تو ابوبکر سے فرمایا:

''آپ کے پاس جولوگ موجود ہیں انہیں باہر بھیج دیجئے (خفیہ بات کرنی ہے) ابوبکرؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ پر میرا باپ فدا ہو، یہ آپ کے اہل خانہ ہی ہیں (کوئی دوسرا یہاں نہیں ہے)۔'' (صحیح البخاری کتاب المناقب باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

اس سے اس معاملے کی حساسیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ صرف ابوبکر کو ہی بتانا چاہتے تھے تاکہ راز فاش نہ ہو، لیکن چونکہ وہاں ان کی صرف دوصاحبزادیاں (حضرت اسماء اور عائشہ موجود تھیں) اس لیے ابوبکر نے اِن کی موجودگی میں بات بتانے میں حرج محسوس نہیں کیا اور آپ نے بھی ان کی موجودگی میں بتادیا، جس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی حساس معاملہ ہوتو داعی کو چاہیے کہ وہ اسے مخفی رکھے اور محض اپنے قریبی اور بااعتماد ساتھیوں کو ہی بتائے۔ یہاں تک کہ اہل خانہ سے بھی مخفی رکھنے کی ضرورت محسوس ہوتو ایسا ہی کیا جائے اور اگر اہل خانہ کی موجودگی میں داعیوں کے مابین بات چیت میں کسی ضرر کا اندیشہ نہ ہوتو بات کرلی جائے۔

ہجرت میں جانی و مالی قربانی

ابوبکر نے عرض کیا:

''یارسول اللہ! آپ پر میرا باپ فدا ہو، آپ میری ان دواونٹنیوں میں سے ایک لے لیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیمت کے ساتھ۔'' (صحیح البخاری کتاب المناقب باب ہجرۃ النبی ﷺ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکرؓ کی پیشکش پر اونٹنی قیمتاً لینا پسند کی، کتبِ سیرت میں اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے:

انما فعل ذلک لتکون هجرته الی الله بنفسه وماله رغبة منه علیه السلام فی استکماله فضل الهجرة الی الله تعالیٰ و ان تکون علیٰ اتم الاحوال.

(المواهب مع شرح الزرقانی ج ۲، ص ۱۰۶، ایضاالروض الانف ج ۲، ص ۳)

''آپ نے یہ اس لئے کیا تاکہ آپ اپنی جان اور مال کے ذریعے ہجرت کریں، آپ کو اس بات کی رغبت تھی کہ آپ ہجرت الی اللہ کی فضیلت کامل طور پر حاصل کریں اور وہ کامل ترین حالت پر ہو۔''

سفر خرچ

ابن ہشام نقل کرتے ہیں کہ ''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر (مکہ سے) نکلے تو ابوبکر

نے اپنا سارا مال اٹھالیا، ان کے ساتھ پانچ یا چھ ہزار درہم تھے جنہیں وہ ساتھ لے کر چلے۔''

(السیرۃ لابن ہشام ج ۲،ص ۱۰۱)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ:

(الف) اہم مواقع پر داعی کو اپنی پوری جمع پونجی خرچ کرنے سے بھی دریغ نہ کرنا چاہئے۔

(ب) مرکزی قیادت جہاں دیگر امور میں ماتحتوں کیلئے نمونہ ہو، وہاں انفاق فی سبیل اللہ میں بھی اسے نمونہ ہونا چاہئے۔

ہجرت کے وقت رب کے حضور التجا

جب آپ مکہ سے مدینہ کیلئے روانہ ہوئے تو اللہ تبارک وتعالیٰ سے مستقبل کے لئے یہ دعا مانگی:

الحمدللہ الذی خلقنی ولم اک شیئا. اللھم اعنی علی ھول الدنیا و عوائق الدھر ومصائب اللیالی و الایام. اللھم اصحبنی فی سفری واخلفنی فی اھلی و بارک لی فیما رزقتنی وعلی صالح خلقی فقومني و الیک رب فجبنی والی الناس فلا تکلنی. انت رب المستضعیفن و انت ربی.(بذل القوۃ ص ۹۷)

''تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے پیدا کیا حالانکہ میں کچھ نہ تھا، اے اللہ! تو میری دنیا کی ہولناکی، زمانے کی رکاوٹوں اور دن رات کے مصائب میں مدد فرما۔ اے اللہ! سفر میں آپ میرے ساتھ ہوں، میرے اہل خانہ میں میرے قائم مقام ہوں، جو مجھے آپ نے عطا کیا ہے اس میں برکت عطا کیجئے اور اچھے اخلاق پر مجھے پختہ کر دیجئے، اے رب اپنی طرف ہی مجھے کھینچ لیجئے اور مجھے لوگوں کے حوالے مت کیجئے، آپ ہی کمزوروں کے رب ہیں اور میرے رب ہیں۔''

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ انقلابی دعوت اور تحریک کی ترقی و کامیابی اللہ رب العزت کی نصرت اور مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے، اس لیے داعی کو چاہیے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے اور ہر مشکل گھڑی میں اسی سے مدد مانگے، اسی طرح ہر اہم موقع پر بھی اسی کے سامنے اپنی حالت رکھے، اسی کے سامنے التجائیں اور آہ وزاریاں کرے، الغرض کسی بھی جگہ، کسی بھی موقع اور کسی بھی لمحہ تعلق مع اللہ ٹوٹنے نہ پائے کیونکہ تقویٰ، للّٰہیت اور تعلق مع اللہ ہی وہ ہتھیار ہیں جن کے ذریعہ یہ میدان سر کیا جا سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکل کر غارِ ثور کی طرف جا رہے تھے تو اپنی انگلیوں کے بل پر چل رہے تھے۔ اور ابوبکرؓ سے بھی فرما رہے تھے کہ ''تم (میرے پیچھے آتے ہوئے) اپنے پاؤں میرے

پاؤں پر رکھو، اس لئے کہ ریت ملتی نہیں (اس پر پاؤں کے نشانات باقی نہیں رہتے اور ان کا کھوج لگانا مشکل ہوتا ہے)۔ (شرح الزرقانی ج ۲ ص ۱۱۱)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اس طرح کے مواقع پر جہاں تک ممکن ہو، احتیاط اور راز داری سے کام لیا جائے تا کہ دشمنوں کو کارروائی کے لئے کم سے کم مواقع ملیں اور وہ بآسانی داعیانِ حق تک نہ پہنچ سکیں۔

خوف کی حالت میں داعی کا طرزِ عمل

اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکینِ مکہ کی قتل کی سازش سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن خوف اور سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی، چنانچہ جب آپ اور ابوبکر غار ثور کی طرف جا رہے تھے تو ابوبکر کی حالت یہ تھی:

فجعل يمشي مرة أمامه، ومرة خلفه، ومرة عن يمينه، ومرة عن يساره،

''وہ کبھی آپ کے آگے چلتے، کبھی پیچھے، کبھی دائیں اور کبھی بائیں چلتے''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا تو فرمایا: ''اے ابوبکر یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' انہوں نے جواب دیا:

''اے اللہ کے رسول! مجھے (مشرکین کی طرف سے) گھات لگائے جانے کا خیال آتا ہے تو میں آپ کے (تحفظ اور دفاع کے لئے) آگے ہو جاتا ہوں، تعاقب کرنے والوں کا خیال آتا ہے تو آپ کے پیچھے ہو جاتا ہوں، اسی طرح کبھی دائیں اور بائیں ہو جاتا ہوں، مجھے آپ کے بارے میں خطرہ لگ رہا ہے۔'' (دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۲، ص ۴۷۷)

حضرت صدیق اکبرؓ کے اس طرزِ عمل سے واضح ہوتا ہے کہ:

(۱) انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی محبت وعقیدت تھی۔

(۲) وہ آپ کے لیے اپنی جان بھی قربان کرنے کے لئے تیار تھے اور اپنے آپ کو آپ کے سامنے ڈھال بنایا ہوا تھا کہ اگر دشمن کی طرف سے حملہ ہو تو اس کا نشانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے وہ بنیں اور آپ کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

(۳) وہ دشمن کے حملے کے قوی امکان اور خوف وسراسیگی کی حالت میں بغیر کسی گھبراہٹ کے چوکنا اور چاق وچوبند تھے اور انتہائی جرأت وشجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر قسم کے خطرے سے نمٹنے کے لئے تیار تھے۔

داعی کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر بھی یہی خوبیاں پیدا کرے اور امیر دعوت کے ساتھ محبت وعقیدت کا تعلق رکھے، اس کی حفاظت کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو، نیز جب ارباب دعوت خصوصاً امیر دعوت کی جان کو خطرہ لاحق ہو تو چستی و چالاکی اور جرأت وشجاعت کا مظاہرہ کرے۔

امیر دعوت کے ساتھ محبت وعقیدت کی لاثانی مثال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس رات اپنی انگلیوں کے بل چلتے رہے تو آپ کے پاؤں مبارک زخمی ہو گئے۔ جب ابوبکرؓ نے آپ کی یہ حالت دیکھی تو آپ کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا اور آپ کو اٹھائے ہوئے غار کے منہ تک لے آئے، پھر اتارا۔ غار کے دہانے تک پہنچنے کے بعد ابوبکرؓ نے آپ سے عرض کیا:

والذی بعثک بالحق لاتدخله حتی أدخله، فإن كان فيه شيء نزل بي قبلک.

(مواهب اللدنيه ج ٢ ص ١١٨)

''قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، جب تک میں اس میں داخل نہیں ہوتا آپ داخل نہ ہوں تاکہ اگر اس میں (کوئی موذی) چیز ہو تو آپ سے پہلے مجھے نقصان پہنچائے۔''

آپ باہر رک گئے اور ابوبکرؓ غار کے اندر چلے گئے، غار میں کچھ سوراخ تھے جن میں سانپ بچھو وغیرہ رہتے تھے، ایک سوراخ بند کرنا رہ گیا تو ابوبکر نے اس پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ آپ غار میں تشریف لے جا کر لیٹ گئے، سانپ نے ابوبکر کے پاؤں کو کاٹنا شروع کر دیا۔ شدتِ درد سے ان کے آنسو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رخسار مبارک پر پڑے تو آپ کی آنکھ کھل گئی، آپ نے ان کے پاؤں پر لعاب مبارک لگایا تو درد ختم ہو گیا۔

امیر سے اس قدر عقیدت ومحبت اور ایثار وقربانی کی مثال نہ پہلے ملتی ہے اور نہ اس کے بعد، یہی وجہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کے بعد امتوں میں سب سے افضل ترین ہستی کے منصب پر فائز کیا۔ دراصل ان کا یہ مقام ومرتبہ ان کی لاثانی اور لازوال قربانیوں کی بدولت ہے، جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ جو شخص جس قدر اللہ کے دین کے لیے قربانیاں دیتا اور مشکلات برداشت کرتا ہے اسی قدر اس کا مقام ومرتبہ بھی بلند ہوتا ہے۔

اللہ ہمارا حامی وناصر ہے

مشرکینِ مکہ کھوج لگاتے ہوئے غار کے بالکل قریب پہنچ گئے تو ابوبکرؓ نے انہیں دیکھ لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا تو آپ نے اس حالت میں ابوبکرؓ سے فرمایا:

يا أبا بكر! لا تحزن، إن الله معنا(دلائل النبوة للبيهقي ج ۲،ص ۴۷۷)

''اے ابوبکر! غم نہ کرو، بلاشبہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

ابن عباس سے روایت ہے،فرماتے ہیں:

فانزل الله سكينته عليه قال على ابى بكر لان النبى صلى الله عليه وسلم لم تزل السكينة معهٗ (دلائل النبوة للبيهقى ج ۲، ص ۴۸۲)

''اللہ تعالیٰ نے اپنا سکینہ ان پر نازل کیا، یعنی ابوبکر پر، اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تو ہر وقت سکینہ شاملِ حال رہتا تھا۔''

امیرِ دعوت کی حیثیت واہمیت

جب ابوبکرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ کو تلاش کرنے والے مشرکین کو غارِ ثور کے قریب آتے ہوئے دیکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان کی پریشانی اور فکر بڑھ گئی۔ آپ سے عرض کیا:

ان قتلت فانما انا رجلٌ واحدٌ وان قتلت انت هلكت الامة (ايضا)

''اگر مجھے قتل کر دیا گیا تو میں ایک ہی آدمی ہوں (اس سے کوئی زیادہ اجتماعی نقصان نہ ہوگا) اور اگر خدانخواستہ آپ قتل کر دیے گئے تو پوری امت ہلاک ہو جائے گی۔''

دراصل امیرِ دعوت ہی دعوت وتحریک کی روحِ رواں ہوتا ہے خصوصاً اگر وہ داعیٔ اول (بانی تحریک) بھی ہو۔ وہ پوری دعوت اور تحریک کو حکمت ودانش کے ساتھ آگے بڑھا رہا ہوتا ہے، وہ دعوت وتحریک کے تمام مراحل اور آنے والے نشیب وفراز سے بخوبی واقف ہوتا ہے، اسے یہ اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ دعوت اور اربابِ دعوت کے لیے کب اور کون سے چیز بہتر ہے، کون سے وقت اور کس جگہ کیا ترتیب اور نظم ہونا چاہیے اور اس پر کس طرح عمل درآمد کیا جائے، وہ جہاں دعوت وتحریک کی ترقی وکامیابی کے امکانات ومواقع پر نظر رکھتا ہے وہاں پیش آنے والی رکاوٹوں اور مسائل سے بھی بخوبی آگاہ ہوتا ہے۔ مواقع اور رکاوٹوں کو سامنے رکھتے ہوئے وہ ترتیب بناتا ہے، وہ ارکان اور اپنے ماتحتوں کی خوبیوں اور صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کی خامیوں اور کمزوریوں کا بھی ادراک رکھتا ہے اور انہیں کے پیشِ نظر ان سے کام لیتا اور انہیں ذمہ داریاں سونپتا ہے۔ ان امور کی وجہ سے امیرِ دعوت خصوصاً بانی کی موجودگی اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت، رحمت اور انمول اثاثہ ہوتا ہے، بالخصوص جب دعوت وتحریک

کسی اہم مرحلے میں داخل ہو رہی ہو تو اس کی موجودگی کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے، ایسے میں اگر مخالفین اسے راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو دعوت وتحریک کو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچنے کا قوی امکان ہوتا ہے اور بعض اوقات تو تحریک درہم برہم ہو جاتی ہے، اس کے ارکان میں انتشار وافتراق پیدا ہو جاتا ہے اور منافقین کئی کئی نئے نظریات گھڑ لیتے اور ان کی بنیاد پر الگ الگ گروپ بنا لیتے ہیں۔

حضرت صدیق اکبر کے مذکورہ بالا ارشاد میں دراصل انہی امور کی طرف اشارہ ہے کہ ابوبکر کے قتل سے تو ایک فرد مارا جائے گا لیکن (نعوذ باللہ) خاتم الانبیاء والرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل سے تو تا قیامت آنے والی پوری امت ہلاکت کے گڑھے میں جا گرے گی۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ (التوبة: ۴۰)

''غم نہ کرو! اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

امیر کا غم

یہ انتہائی خوف و ہراس کا عالم تھا، مشرکینِ مکہ آپ اور ابوبکر کو قتل کرنے کیلئے تلاش کرتے کرتے غار کے قریب پہنچ چکے تھے۔ لیکن ابوبکر نے خوف محسوس نہ کیا بلکہ آقا کے غم میں گھلے جا رہے تھے، علامہ سہیلی لکھتے ہیں:

''دیکھئے کہ آپ نے لَا تَخَفْ (خوف نہ کر) نہیں بلکہ لَاتَحْزَنْ (غم نہ کر) فرمایا اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کی سلامتی کے غم نے انہیں اپنی جان کے خوف سے بے پرواہ کر دیا تھا، نیز اس لئے بھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچنے والی تکلیف اور غار کی مشقت، اہلِ خانہ سے جدائی اور مسافرت کی وحشت دیکھ چکے تھے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بہت زیادہ نرم دل اور شفقت کا معاملہ کرنے والے تھے، چنانچہ اسی وجہ سے غمناک ہوئے۔'' (الروض الانف)

روپوشی وہجرت کے لیے منصوبہ بندی

حضرت ابوبکر الصدیق ؓ نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ اور منظم انداز میں غار ثور میں قیام کا انتظام کیا۔ اپنے غلام عامر بن فہیرہ کے ذمہ لگایا کہ وہ دن کو بکریاں چرا کر شام کو غار کے قریب لائیں گے اور دودھ دوھ کر دیں گے۔ اپنی دختر اسماءؓ کے ذمے لگایا کہ کھانا تیار کر کے لایا کریں، چنانچہ وہ کھانا لاتی تھیں اور اپنے فرزند عبداللہ کے ذمہ مخبری کا کام لگایا۔ ابن ہشام لکھتے ہیں:

امر ابوبکر ابنہ عبداللہ بن ابی بکر ان یستمع لھما مایقول الناس فیھما انھارہ ثم یأتیھما اذا امسیٰ بما یکون فی ذلک الیوم من الخبر. (السیرۃ لا بن ھشام ج ۲، ص ۹۹)

''ابوبکر نے اپنے بیٹے عبداللہ بن ابی بکر کو حکم دیا کہ لوگ دن میں ان دو حضرات کے بارے میں جو باتیں (مشورے) کریں وہ انہیں بغور سنیں اور شام کے وقت ان کے پاس آ کر انہیں بتائیں۔''

ہر ایک اپنا کام پوری ذمہ داری سے انجام دے رہا تھا چنانچہ عبداللہ بن ابی بکر بھی مخبری کر رہے تھے۔ ابن ہشام لکھتے ہیں کہ ''عبداللہ بن ابی بکر دن کو قریش کے ساتھ رہتے، ان کی باتیں اور مشورے اور وہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ کے بارے میں کہتے، انہیں سنتے پھر شام کو آ کر انہیں بتاتے۔'' (السیرۃ لابن ہشام ج ۲، ص ۹۹)

منصوبہ بندی کی اہمیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے روپوشی و ہجرت کے بارے میں کی جانے والی بہتر منصوبہ بندی سے منصوبہ بندی کی اہمیت و ضرورت واضح ہوتی ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ کوئی بھی کام منصوبہ بندی کے بغیر بہتر طور پر انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اگر وسائل و ذرائع کم ہوں لیکن مطلوبہ ہدف حاصل کرنے کے لیے اچھی منصوبہ بندی کی گئی ہو تو کافی بہتر نتائج حاصل کیے جا سکتے اور مطلوبہ ہدف تک پہنچا جا سکتا ہے، اس کے برعکس اگر وسائل و ذرائع بے تحاشا ہوں لیکن مطلوبہ ہدف تک پہنچنے کے لیے منصوبہ بندی نہ کی گئی ہو تو اس کے منفی نتائج سامنے آتے ہیں اور مطلوبہ ہدف تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے، اس لیے اربابِ دعوت کو چاہیے کہ وہ سیرت کے اس نمونے کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں اور دعوتی امور کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ انجام دیں اور بے ترتیبی اور بدنظمی سے گریز کریں کیونکہ اس طرح نہ صرف وسائل و ذرائع اور داعی کی صلاحیتیں ضائع ہوتی ہیں بلکہ منزل بھی دور ہوتی جاتی ہے۔

قتل یا زندہ گرفتاری کیلئے انعام کا اعلان

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تلاشِ بسیار کے باوجود مشرکین مکہ کے ہاتھ نہ آئے اور نہ کوئی سراغ ملا، ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غارِ ثور سے نکل کر مدینہ کی طرف راہی ہوئے تو قریش نے اجتماع کیا، چنانچہ علامہ حلبیؒ لکھتے ہیں:

''جب قریش مایوس ہو گئے تو انہوں نے ساحلی علاقے کے لوگوں کے پاس اپنے آدمیوں کے ذریعے پیغام بھجوایا کہ جو آدمی ان میں سے کسی کو زندہ گرفتار یا قتل کرے گا، اسے سو اونٹ انعام میں ملیں

گے، کہا جاتا ہے کہ ابوجہل نے مکہ شہر کے بالائی اور نشیبی دونوں حصوں میں منادی کروائی کہ جو آدمی بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گرفتار کر کے لائے گا یا ان کے بارے میں معلومات دے گا، اسے سو اونٹنیاں انعام میں دی جائیں گی۔'' (السیرۃ الحلبیۃ ج ا ص ۴۳۱)

امیر و مرکزی قیادت کا ارکان کے ساتھ برتاؤ

مدینہ کے راستہ میں عاتکہ بنت خالد خزاعیہ نامی ایک عورت جو''ام معبد'' کی کنیت سے مشہور تھی، کا گھر آتا ہے۔ یہ خاتون مسافروں کی خبر گیری اور خدمت و تواضع میں مشہور تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کو یقین تھا کہ وہاں کھانے کا کچھ انتظام ہو جائے گا۔ لیکن اتفاق سے وہاں پہنچ کر کوئی چیز نہ مل سکی۔ خیمہ کی ایک طرف دبلی سی بکری بندھی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام معبد سے فرمایا کہ اجازت دو تو اس بکری کا دودھ دوہ لیں۔ ام معبد نے کہا کہ اگر یہ دودھ دیتی تو میں نے اب تک خود ہی آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کر دیا ہوتا۔ آپ نے فرمایا'' جیسی بھی ہو تم دوہنے کی اجازت دو۔'' اس نے کہا میری طرف سے اجازت ہے مگر یہ دودھ نہیں دے گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ پڑھ کر تھنوں پر ہاتھ لگایا تو تھن فوراً دودھ سے بھر گئے۔

آپ نے دودھ دوہنا شروع کیا۔ ایک بڑا مٹکا دودھ سے بھر گیا۔ پہلے آپ نے ام معبد کو پلایا۔ اس کے بعد وہاں موجود تمام مسافروں کو پلایا۔ جب سب سیر ہو چکے تو آپ نے اور آپ کے تینوں ساتھیوں نے پیا۔

ثم شرب صلى الله عليه وسلم فكان آخرهم شرباً وقال ساقي القوم آخرهم شرباً. (السيرة الحلبية ج ١، ص ٤٣٩)

''(رفقا کو پلانے کے بعد) پھر آپ نے پیا، آپ سب سے آخر میں پینے والے تھے آپ نے فرمایا'' پلانے والا خود آخر میں پیتا ہے۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو دوسروں پر ترجیح نہ دیتے تھے بلکہ ان کا اکرام و اعزاز کرتے، ان کے ساتھ گھل مل کر رہتے اور مروج اخلاقی اصولوں کو ملحوظ رکھتے تھے۔ لہٰذا داعی خصوصاً امیر دعوت اور مرکزی قیادت کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو بزعم خود رفیع الشان منصب پر''فائز'' نہ کریں بلکہ پورے نظم میں بھائی چارگی اور مساوات و برابری کی فضا ہو، امیر دعوت اور مرکزی قیادت ارکانِ دعوت کو حقیر، گھٹیا، کم درجے کے لوگ نہ سمجھیں بلکہ وہ انہیں اپنے برابر بلکہ

اپنے سے بہتر خیال کریں۔اسی طرح وہ ارکان کے ساتھ ایسا طرزِعمل اختیار نہ کریں جس سے وہ اپنے آپ کو حقیر، گھٹیا یا کم رتبے کا سمجھنے لگیں اور امیر دعوت اور مرکزی قیادت کو اعلیٰ درجے (وی آئی پی) اور آسمانی مخلوق سمجھنے لگیں۔ وہ ان سے ایسا برتاؤ اور سلوک کریں کہ انہیں یہ یقین ہو کہ ہمیں اپنے برابر سمجھا جاتا ہے اور ہمیں اہمیت دی جاتی ہے۔امیر اور ارکان کے درمیان اسی طرح کے تعلقات کی وجہ سے محبت والفت اور عقیدت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

انعام کالالچ

ابوجہل کی طرف سے انعام کے اعلان کے بعد سراقہ ؓ انعام کے لالچ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیچھا کرنے کیلئے چل پڑے۔امام بیہقی حضرت براء سے روایت کرتے ہیں کہ ابوبکر الصدیق نے یہ واقعہ خود بیان کرتے ہوئے فرمایا ''جب وہ ہمارے قریب ہوا اور ہمارے اور اس کے درمیان دو یا تین نیزوں کے برابر فاصلہ رہ گیا تو میں نے عرض کیا یارسول اللہ! ہمارا تعاقب کرنے والا ہم تک پہنچ گیا ہے، یہ کہہ کر میں رونے لگا۔''

قائد کی جان کی فکر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ''اے ابوبکر! تمہیں کس چیز نے رلایا ہے''میں نے عرض کیا:
''اللہ کی قسم! میں اپنی جان کی فکر میں نہیں رو رہا بلکہ میں تو آپ کی فکر میں رو رہا ہوں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے بددعا کرتے ہوئے فرمایا ''اے اللہ! تو ہمیں اس کے شر سے جس طرح چاہے محفوظ رکھ۔''
(صحیح ابن حبان کتاب التاریخ فصل فی ہجرتہ وکیفیۃ احوالہ، ایضاً مسند امام احمد مسند ابی بکر الصدیق)

جب سراقہ ؓ آپ کے قریب پہنچے تو گھوڑے سے گر پڑے۔ دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی تو گھوڑا زمین میں دھنس گیا۔ سہ بارہ کوشش کی تو گھوڑا پہلے سے زیادہ زمین میں دھنس گیا۔ جب ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو رک گئے۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ:

وقع فی نفسی حین لقیت ما لقیت من الحبس عنهم ان سیظهر امر رسول الله صلی الله علیه وسلم.

(صحیح البخاری کتاب المناقب باب هجرة النبی صلی الله علیه وسلم)

''جب مجھے (غیبی طور پر) ان کے قریب پہنچنے سے روک دیا گیا تو میرے دل میں اس بات کا

یقین پیدا ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امر (دعوت) عنقریب غالب آئے گا۔''

میں نے انہیں بتایا کہ آپ کی قوم نے آپ (کو قتل کرنے کے بدلے میں بطور انعام) دیت (کے برابر رقم) مقرر کی ہے اور انہیں بتلایا کہ قریش ان کے بارے میں کیا کرنا چاہتے ہیں، میں نے انہیں زادِ راہ اور دیگر سامان کی پیشکش کی تو انہوں نے مجھ سے کچھ لیا اور نہ کوئی سوال کیا، البتہ کہا کہ تم ہماری بات کو راز رکھو، میں نے ان سے درخواست کی کہ میرے لئے امان کی تحریر لکھ دیجئے، آپ نے عامر بن فہیرہ کو حکم دیا تو انہوں نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر رقعہ لکھ دیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہو گئے۔

مندرجہ بالا روایت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی دعوت کے غلبے کا کامل یقین تھا اور آپ اپنے صحابہ کو بھی اس کی خوشخبری دے کر تسلی دیا کرتے تھے، وہاں کفار کو بھی یہ یقین ہو چکا تھا کہ اس دعوت ونظریے میں اتنی طاقت وتاثیر ہے کہ عنقریب یہ نظریہ تمام فرسودہ و باطل نظریات اور نظامہائے حیات پر غالب آ کر رہے گا اور اس کو کوئی طاقت غالب آنے سے روک نہیں سکے گی۔ یہاں تک کہ سراقہؓ کو اس قدر یقین تھا کہ وہ مستقبل کے پیش نظر آپ سے امان کی تحریر لکھوا رہے ہیں۔

مکہ میں اصولِ دعوت

مکہ کے تیرہ سال دعوتی دور میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے دعوت کو آگے بڑھانے اور اسے مضبوط کرنے کے لئے جو بنیادی اصول عطا فرمائے ان میں سے ایک اہم اصول ''مخالفین کے ظلم وستم اور جبر وتشدد پر صبر کرنا، عفو درگذر کا معاملہ کرنا اور تصادم سے بچنا ہے۔''

اس اصول کی وضاحت کے لئے ذیل میں کچھ آیات پیش کی جاتی ہے۔

(۱) اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ.

(النساء: ۷۷)

''کیا تو نے نہ دیکھا ان لوگوں کو جن کو حکم ہوا تھا کہ اپنے ہاتھ تھامے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوۃ دیتے رہو۔''

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ ''كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ'' (اپنے ہاتھ تھامے رکھو) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یعنی جنگ مکنید۔ (فتح الرحمٰن)

''مطلب یہ ہے کہ جنگ نہ کرو۔''

امام ابن کثیر مذکورہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اسلام کے ابتدائی زمانے میں مکہ میں مسلمانوں کو نماز، زکوٰۃ (اگر چہ نصاب نہ تھا)، فقراء کی مدد کا حکم دیا گیا تھا۔ وہ مشرکین سے درگزر کرنے، معاف کرنے اور ایک مدت تک صبر کرنے پر مامور تھے، وہ چاہتے تھے کہ انہیں قتال کی اجازت دی جائے تا کہ دشمنوں سے بچیں، حالانکہ اس وقت کے حالات اس کے لئے سازگار نہ تھے، جس کے کئی اسباب تھے، جن میں سے ایک یہ تھا کہ ان کی تعداد ان کے دشمنوں کی تعداد کی بنسبت کم تھی، دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے شہر (مکہ) میں جو شہر حرام اور کائنات کی سب سے زیادہ شان وعظمت والی جگہ ہے، اس میں ابتدائی (اقدامی) طور پر قتال کا حکم نہ تھا، اس لئے جہاد کا حکم مدینہ میں ہی دیا گیا کیونکہ وہ ان کا ٹھکانہ، دفاع کی جگہ بن چکا تھا اور نصرت و مدد کرنے والے بھی تھے۔'' (تفسیر ابن کثیر ج ا، ص ۵۲۵)

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''مکہ میں ہجرت کرنے سے پہلے کافر مسلمانوں کو بہت ستاتے تھے اور ان پر ظلم کرتے تھے۔ مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کرتے اور رخصت مانگتے کہ ہم کفار سے مقاتلہ کریں اور ان سے ظلم کا بدلہ لیں۔ آپ مسلمانوں کو لڑائی سے روکتے کہ مجھ کو مقاتلہ کا حکم نہیں ہوا بلکہ صبر اور درگذر کرنے کا حکم ہے اور فرماتے کہ نماز اور زکوۃ کا جو حکم تم کو ہو چکا ہے اس کو برابر کیے جاؤ کیونکہ جب تک آدمی اطاعت خداوندی میں اپنے نفس پر جہاد کرنے کا اور تکالیف جسمانی کا خوگر نہ ہو اور اپنے مال خرچ کرنے کا عادی نہ ہو تو اس کو جہاد کرنا اور اپنی جان کا دینا بہت دشوار ہے، اس بات کو مسلمانوں نے قبول کر لیا تھا۔'' (موضح فرقان، تفسیر سورۃ النساء)

حضرت شیخ الہندؒ کی مذکورہ تفسیر سے یہ امر واضح ہو گیا کہ مکہ میں صبر اور عفو درگذر کا حکم دیا گیا اور قتال کی اجازت اس لئے نہ دی گئی کہ مکہ میں صحابہ کرامؓ کی تعلیم وتربیت کا سلسلہ جاری تھا، انہیں جہاد بالنفس اور انفاق فی سبیل اللہ کا خوگر بنایا جا رہا تھا گویا قتال کے لیے ان کے اندر استعداد پیدا کی جا رہی تھی۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اقدام سے پہلے اس کے لیے ظاہری اور باطنی طور پر تیاری ضروری ہے۔

امام ابوالحسن علی بن احمد الواحدی النیشاپوریؒ لکھتے ہیں:

(۲) ''وَاصْبِرْ عَلٰی مَایَقُوْلُوْنَ ''لک من التکذیب والاذی.

(الوسیط فی تفسیر القرآن المجید ج ۴ ص ۳۷۵)

''یعنی وہ آپ کو جو جھٹلاتے اور ایذائیں پہنچاتے ہیں، اس پر صبر کیجئے۔''

(۳) لَتُبْلَوُنَّ فِیْ اَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا اَذًی کَثِیْرًا وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ.

(آل عمران ۱۸۶)

''(اے اہلِ ایمان) تمہارے اموال میں خسارے اور نقصان کے ذریعے تمہارا امتحان لیا جائے گا اور اہلِ کتاب سے اور ان لوگوں سے جو مشرک ہیں بہت سی ایذاء کی باتیں سنو گے تو اگر صبر اور تقویٰ اختیار کرو گے تو یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔''

امام واحدی نیشاپوری اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ای لتخبرن فی اموالکم بالخسران والنقصان حتی یتبین الجازع من الصابر والمخلص من المنافق وانفسکم بالامراض والخطاب للمهاجرین اخذالمشرکون اموالهم بمکة وباعواارباعهم وعذبوهم. (الوسیط فی تفسیر القرآن المجید ج ۱ ص ۵۳۰)

''اموال میں خسارے اور نقصان کے ذریعے تمہارا امتحان لیا جائے گا تاکہ جزع وفزع اور صبر کرنے والے اور مخلص کی منافق سے تفریق ہو جائے، خود تمہیں امراض کے ذریعے آزمایا جائے گا۔ اس آیت میں مہاجرین کو مخاطب کیا گیا ہے کہ مشرکین نے مکہ میں ان کے اموال لے لئے تھے، ان کے گھر بیچ دیے تھے اور انہیں سزائیں دی تھیں۔''

(۴) وَدَّ کَثِیْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ لَوْ یَرُدُّوْنَکُمْ مِنْ بَعْدِ مَاتَبَیَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ. (البقرة ۱۰۹)

''بہت سے اہل کتاب کا دل چاہتا ہے کہ کسی طرح تم کو پھیر کر مسلمان ہونے کے بعد کافر بنا دیں اپنے دلی حسد کے بسبب، بعد اس کے کہ ظاہر ہو چکا حق ان پر حق، سو تم درگذر کرو اور خیال میں نہ لاؤ جب کہ تک اللہ اپنا حکم بھیجے، بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

خلاصہ کلام یہ کہ مکہ میں حالات سازگار نہ ہونے کی بنا پر قتال کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ عفو درگذر اور پہلوتہی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا، چنانچہ صحابہ کرامؓ نے انتہائی مشکلات اور مصائب وآلام اٹھانے کے باوجود اس اصول پر عمل درآمد کیا اور یوں ثابت قدمی اور نظم وضبط کا کامیاب مظاہرہ کر کے عظیم

اجر و ثواب کے مستحق ٹھہرے۔

مدینہ میں تشریف آوری

مدینہ میں موجود مسلمانوں (مہاجرین و انصار) کو یہ اطلاع پہنچ چکی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ کیلئے روانہ ہو چکے ہیں، چنانچہ وہ اپنے محبوب قائد حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے استقبال کیلئے صبح کے وقت شہر سے باہر نکل کر انتظار کیا کرتے تھے۔ جب گرمی بڑھ جاتی اور آپ صلی علیہ وسلم تشریف نہ لاتے تو دوپہر کے وقت گھروں کو لوٹ جاتے۔ ایک دن انتظار کے بعد گھروں کو واپس چلے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نمودار ہوئے۔ آپ کے دیدار کے مشتاق فوراً آپ کو لینے کیلئے آ گئے۔

امیر و مرکزی قیادت کی تواضع و سادگی

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر مدینہ پہنچے تو کھجور کے سائے میں تشریف فرما ہوئے۔ انصار صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے اکثر نے آپ کو پہلے سے دیکھا ہوا نہیں تھا، اس لئے پہچان نہ سکے۔ جب آپ سے سایہ ختم ہو گیا تو ''ابوبکر نے کھڑے ہو کر اپنی چادر کے ذریعے آپ پر سایہ کیا تو اس وقت ہم نے آپ کو پہچانا۔''

(صحیح البخاری کتاب المناقب باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایضاً السیرۃ لابن ہشام ج ۲، ص ۱۰۵)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کے باوجود آپ نے بظاہر کوئی ایسی ہیئت اور کیفیت اختیار نہیں کی ہوئی تھی جس سے دور سے ہی اجنبی بھی آپ کے بارے میں فوراً سمجھ جاتا کہ کوئی بڑی شخصیت اور بڑے منصب و مرتبے کے آدمی ہیں بلکہ نبوی وجاہت کے باوجود آپ نے عمومی ہیئت و کیفیت اختیار کر رکھی تھی، لہٰذا ارباب دعوت خصوصاً مرکزی قیادت کو چاہیے کہ وہ ظاہری نمود و نمائش اور کروفر سے اجتناب کریں، سنت پر عمل کرتے ہوئے سادگی اور تواضع کو اپنا شعار بنائیں اور اپنے ساتھیوں کو بھی اسی چیز کا خوگر بنائیں۔

ظاہری نمود و نمائش کا نقصان

ظاہری نمود و نمائش اور شان و شوکت کے نقصانات میں سے جماعتی اور تنظیمی حوالے سے ایک بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ جب ارکانِ تحریک اپنے امیر اور مرکزی قیادت کو نمود و نمائش اور کروفر کی حالت و کیفیت میں دیکھتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ان کی جو عزت و اکرام کیا جا رہا ہوتا ہے، مختلف جگہوں پر آمد کے موقع پر جشنِ استقبال منایا جا رہا ہوتا ہے اور ہر طرف سے ''ہٹو بچو'' کی آوازیں لگ رہی ہوتی

ہیں تو ان کے دل میں بھی اس شان وشوکت اور کروفر کے حصول کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور چونکہ وہ اس منصب پر فائز ہوئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی اس لیے حبِ جاہ کا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔

جب اس کے اندر یہ مرض پیدا ہو گیا تو اب اس کی حرکت وجدوجہد اور بھاگ دوڑ کا مقصد رفتہ رفتہ اس منصب تک پہنچنا ہوتا ہے، چنانچہ مسابقت ومقابلے کی فضا بن جاتی ہے اور اس منصب تک پہنچنے والوں میں دوڑ اور رسہ کشی شروع ہو جاتی ہے، جس سے تصادم وٹکراؤ اور حسد وبغض سمیت دیگر کئی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ پھر وہ وقت بھی آتا ہے جب عہدوں اور مناصب کے لیے جمہوری اصولوں کے مطابق ''انتخابات'' ہوتے ہیں اور اکثریت کی بنیاد پر صدارت اور امارت کے مناصب سونپے جاتے ہیں، بالآخر جمہوریت اپنی تمام انواع واقسام اور جملہ خرابیوں کے ساتھ اس جماعت کے مرکز اور مرکزی قیادت سے لے کر نچلی سطح تک کی تنظیم اور ارکان میں سرایت کر جاتی ہے اور دنیا ''جوتوں میں دال بٹنے کا'' بار بار نظارہ کرتی ہے۔ مقصد فراموش کر دیا جاتا ہے اور ہر رکن کی منزل بڑے سے بڑے عہدے اور منصب کا حصول بن جاتی ہے۔

تعمیر مرکز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ عرروز مقامِ قباء مقیم رہے۔ اس دوران آپ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مرکزِ تعلیم وتربیت قائم کیا یعنی قباء میں مسجد تعمیر کروائی جو کہ اسلام کی پہلی باقاعدہ مسجد تھی۔

(السیرۃ لابن کثیر ج ۲، ص ۲۹۳)

حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھویؒ لکھتے ہیں:

عمل فیها هو بنفسه و اصحابه (بذل القوة ص ۱۰۱)

''آپ نے بذاتِ خود اور آپ کے اصحاب نے اُس (کی تعمیر) میں حصہ لیا۔''

شموس بنت النعمان رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور مسجد قباء کی بنیاد رکھنا چاہی اور اس کیلئے پتھر اٹھایا تو ایک صحابی نے عرض کیا:

یارسول الله بابی انت و امی تعطینی اکفک. (السیرة الحلبیة ج ۲، ص ۷۴)

''یارسول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں، مجھے عطا کیجئے میں آپ کی طرف سے اٹھاتا ہوں۔''

ایک دوسری روایت اس طرح ہے کہ صحابی نے عرض کیا: اے رسول اللہ! مجھے عطا کیجئے، آپ نے فرمایا:

اذهب فخذ غیرها فلستَ بافقرَ الی الله منی. (وفاء الوفا ج ۱ ص ۳۳۳)

''جاؤ دوسری اینٹ اٹھاؤ، تم مجھ سے زیادہ اللہ کے ہاں قربت حاصل کرنے کے محتاج نہیں ہو۔''

مرکزی قیادت

ابن ابی خیثمہ روایت کرتے ہیں:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حین اسسہ کان ھو اول من وضع حجراً فی قبلتہ ثم جاء ابوبکر بحجر فوضعہ ثم جاء عمر بحجر فوضعہٗ الی حجر ابی بکر ثم اخذ الناس فی البنیان. (الروض الانف ج ۲، ص ۱۱)

''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بنیاد رکھی تو سب سے پہلے آپ نے قبلہ کی سمت میں ایک پتھر نصب کیا، پھر ابوبکر نے ایک پتھر لا کر اس کے ساتھ رکھا، پھر عمر ایک پتھر لائے اور ابوبکر کے رکھے ہوئے پتھر کے ساتھ نصب کیا۔ اس کے بعد باقی لوگوں نے اس کی تعمیر شروع کی۔''

امام بخاری حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں:

کنا نخیّر بین الناس فی زمانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فنخیّر ابابکر ثم عمربن الخطاب ثم عثمانَ بن عفان.

(صحیح البخاری کتاب المناقب باب فضل ابی بکر الخ)

''ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لوگوں کے درجات وفضیلت کا تذکرہ کرتے تو سب سے پہلے درجے میں ابوبکر کو بہتر سمجھتے، ان کے بعد عمر کو اور ان کے بعد عثمان بن عفان کو۔''

مدینہ میں پہلا جمعہ اور پہلا خطاب

قباء میں کچھ روز قیام کر کے جمعہ کے روز آپ شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ بنی سالم بن عوف کے محلے میں پہنچے تو جمعہ کا وقت آ گیا آپ نے بطنِ وادی میں جمعہ پڑھایا۔ مدینہ پہنچنے کے بعد آپ نے صحابہ کرام ؓ کو پہلا خطاب ارشاد فرمایا۔ جمعہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگے روانہ ہوئے۔ جب آپ مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ کو آپ کی آمد سے جو خوشی اور مسرت ہوئی اس کا اندازہ حضرت عائشہؓ کی درج ذیل روایت سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو عورتیں، بچے اور لڑکیاں خوشی سے یہ اشعار پڑھ رہی تھیں:

طلع البدر علینا   من ثنیات الوداع

جنوبی جانب کے پہاڑوں سے ہم پر چودھویں کا چاند طلوع ہوا ہے۔

وجب الشکر علینا　　　ما دعا للہ داعی

ہم پر خدا کا شکر واجب ہے، جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں۔

ایھا المبعوث فینا　　　جئت بالامر المطاع

(الحلبیۃ ج ۲ ص ۲۳۵)

''اے ہم میں مبعوث ہونے والے! آپ ایسے حکم کے ساتھ آئے ہیں جس کی اتباع فرض ہے''۔

حضرت عبداللہ بن سلامؓ فرماتے ہیں کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے مدینہ روشن ہوگیا اور ان کے آنے سے دلی سرور حاصل ہوا۔'' (عیون الاثر ج ا، ص ۱۹۳)

حضرت انسؓ سے روایت ہے:

''جس دن آپ مدینہ میں داخل ہوئے میں اس کا عینی شاہد ہوں، میں نے اس سے زیادہ حسین اور روشن دن نہیں دیکھا، جس دن آپ کی وفات ہوئی میں نے اس کا بھی مشاہدہ کیا، اس دن سے زیادہ برا اور تاریک دن میں نے نہیں دیکھا۔''

(مصنف ابن ابی شیبہ کتاب المغازی باب ما قالوا فی مہاجر النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

بیعت عقبہ ثانیہ میں تحفظ و نصرت کا وعدہ ہو چکا تھا۔ اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء اپنا محبوب شہر مکہ چھوڑ کر آئے اور غلبۂ دین کیلئے جان و مال اور بیوی بچوں کی قربانی کا بے مثال نمونہ پیش کیا۔ چنانچہ ہر قبیلے اور محلے والے انصار کی خواہش تھی کہ آپ ان کے ہاں قیام پذیر ہوں۔

وفی روایۃ فتنازع القوم ایھم ینزل علیہ ای کل یحرص علی ان تکون دارہ لہٗ منزلاً ای مقاماً. (السیرۃ الحلبیۃ ج ا، ص ۳۵۴)

''ایک روایت میں آیا ہے کہ لوگوں میں اس بات پر تنازع ہوا کہ آپ کس کے ہاں قیام فرمائیں، ہر ایک اس بات کا حریص تھا کہ اسی کا گھر آپ کی قیام گاہ بنے۔''

آپ کی اونٹنی چل رہی تھی تو انصار کے جس محلے سے گزر ہوتا، آپ سے عرض کیا جاتا:

یا رسول اللہ اقم عندنا فی العدد و العدّۃ و المنعۃ

(عیون الاثر ج ا، ص ۱۹۴ ایضاًالسیرۃ لا بن ھشام ج ۲، ص ۱۰۷)

''یارسول اللہ! آپ ہمارے یہاں افراد کی زیادہ تعداد، سامان حرب اور تحفظ میں رہیں۔''

آپ ان کے جواب میں فرماتے ''اونٹنی کا راستہ چھوڑ دو، یہ مامور من اللہ ہے (جہاں قیام کا حکم

ہوگا وہیں ٹھہرے گی)۔''

وہ اونٹنی کا راستہ چھوڑ دیتے تو وہ چل پڑتی۔ جب بنی مالک بن النجار کے محلے قریب پہنچی تو بنی النجار کی بچیوں اور باندیوں نے یہ اشعار پڑھتے ہوئے آپ کا استقبال کیا:

نحن جوار من بنی النجار　　　　یاحبّذا محمدمن جار

(السیرة لابن کثیر ج ۲ ص ۲۷۴)

''ہم بنی نجار کی لڑکیاں ہیں اے خوشا بخت کہ محمد آج ہمارے پڑوسی ہیں۔''

جو جگہ اب مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل ہے وہاں اونٹنی بیٹھ گئی۔ آپ نے حضرت ابوایوبؓ کو ہی شرفِ میزبانی بخشا۔ (السیرۃ لابن ہشام ج ۲ ص ۱۰۷، ۱۰۸)

ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر نصرت

علامہ حلبی لکھتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قباء سے شہر مدینہ کی طرف تشریف لے آئے ، پھر اکثر مہاجرین بھی قباء سے شہر چلے آئے تو انصار میں اس بات میں مقابلہ ہوا کہ وہ ان کے ہاں قیام پذیر ہوں، ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ اسکے ہاں قیام کریں، یہاں تک کہ:

مانزل احد من المهاجرين على احد من الانصار الاّ بقرعة بينهم فكان المهاجرون فى دور الانصار واموالهم.(السيرة الحلبية ج ا ، ص ۴۵۵)

''ان میں قرعہ اندازی ہوئی، مہاجرین میں سے ہر ایک آدمی قرعہ اندازی کے ذریعے ہی کسی انصار کے ہاں قیام پذیر ہوا چنانچہ مہاجرین انصار کے گھروں اور اموال میں شریک ہو گئے۔''

عالمی مرکز کا قیام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ روز مسجد کے بغیر نماز ادا فرماتے رہے پھر مسجدِ نبوی تعمیر کی گئی جسے اسلام کے عالمی مرکزِ تعلیم وتربیت کی حیثیت حاصل تھی۔

اسلام میں مسجد کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تمام دینی اور دنیاوی امور یعنی اسلامی نظام کا مرکز مسجد ہی تھی ، اس کے اندر نماز باجماعت ادا کی جاتی تھی ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو وعظ وارشاد فرمایا کرتے تھے ، مسجد سے متصل ''صفہ'' میں باقاعدہ تعلیم وتربیت اور درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہتا تھا (جیسا کہ آگے آرہا ہے) زکوٰۃ وصدقات کی تقسیم یہیں ہوتی تھی ، خصومات اور تنازعات کے فیصلے یہی ہوتے تھے اور مجرموں کو سزا بھی یہی دی

جاتی تھی، کسی شخص کو سماجی یا معاشی مسئلہ درپیش ہوتا تو آپ کے پاس یہیں حاضر ہو کر عرض کرتا اور آپ اس کا مسئلہ حل فرماتے تھے، باہر سے آنے والے وفود بھی مسجد میں ہی آ کر آپ سے ملاقات کرتے، یہیں بیٹھ کر آپ قبائل کے سرداروں، اپنے متعین کردہ امراء اور عمال اور بادشاہوں کو خطوط روانہ فرماتے تھے، یہیں صحابہ کرام عسکری تربیت کے لئے مشقیں کرتے تھے، آپ جہاد کے لئے لشکر یہیں سے روانہ فرماتے اور واپس آنے والوں کا استقبال اور ان سے ملاقات کر کے کارگزاری بھی یہیں سنا کرتے تھے، مال غنیمت، جزیہ اور خراج بھی یہی تقسیم کیا جاتا تھا۔

الغرض مسجدِ نبوی عبادت خانہ بھی تھی، خانقاہ اور جامعہ بھی تھی، عدالت بھی تھی اور سفارت خانہ بھی، مرکز فلاح و بہبود اور وزارت خزانہ بھی تھی اور چھاؤنی بھی، گویا اجتماعی نظام سے متعلق تمام شعبے اور محکمے یہاں قائم تھے اور یہ گویا ''دارالخلافہ'' تھا۔ اگرچہ بعد کے ادوار میں شعبہ جات میں وسعت کی وجہ سے الگ الگ شعبے اور محکمے قائم کئے گئے لیکن اس کی مرکزی حیثیت پھر بھی بحال رہی، لیکن افسوس! آج مسجد کو عبادت خانہ یا جائے نماز کی حیثیت دے دی گئی ہے اور اس کے کردار کو محض نماز پڑھنے تک محدود کر دیا گیا ہے اور اس کا ''مسجد نبوی'' والا تصور ختم ہو کر رہ گیا ہے حتی کہ وہ حضرات جو علوم اسلامیہ کے حامل ہونے کی بنا ر وراثت نبوی کے حامل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ خود بھی مسجد کو نماز تک محدود رکھنا چاہتے ہیں یا چاہتے تو نہیں لیکن عملی طور پر اس کے کردار کو وسعت نہیں دے رہے۔

دعوتی سرگرمیوں کے مراکز

مذکورہ وجوہ کی بنا پر ارباب دعوت کو چاہئے کہ وہ اپنی دعوت اور دعوتی سرگرمیوں کا مرکز مساجد و مدارس کو ہی بنائیں۔ مساجد و مدارس سے ہٹ کر دیگر مقامات (مثلاً دفاتر) کو مرکز بنانے کی فکر اور روش کی پیروی ہرگز نہ کریں۔ وہ ماضی قریب کے حوالے سے بھی مساجد سے جڑنے اور انہیں مراکز بنانے کے فوائد اور ثمرات اور ان سے ہٹنے کے نقصانات اپنے سامنے رکھیں۔

اجتماعی کاموں میں امیر کی بنفس نفیس شرکت

مسجدِ نبوی کی تعمیر شروع ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بذات خود اس میں حصہ لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو کام کی ترغیب دینے کیلئے خود کام کیا، علامہ سمہودی لکھتے ہیں:

وفعل ذلک احتساباً وترغیباً فی الخیر لیعمل الناس کلھم ولایرغب احد بنفسه عن نفس رسول الله صلى الله عليه وسلم. (وفاء الوفاء ج ۱ ص ۳۲۹)

''آپ نے اللہ کی رضا اور اجرو آخرت کے حصول کی نیت کرتے ہوئے اور نیک کام کی ترغیب دینے کی غرض سے ایسا کیا تا کہ تمام لوگ کام کریں اور کوئی بھی آپ کی وجہ سے اس سے اعتراض نہ کرے۔''

حضرت حسن سے روایت ہے:

لما بنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المسجد اعانہ علیہ اصحابہ وھو معھم یتناول اللبن حتی اغبرّ صدرہ. (دلائل النبوۃ للبیھقی ج ۲، ص ۵۴۲)

''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کی تعمیر کروائی تو آپ نے صحابہ کرامؓ کی اعانت کی اور ان کے ساتھ اینٹیں اٹھاتے رہے۔جس سے آپ کا سینہ مبارک بھی غبار آلود ہو گیا۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر چہ امیر دعوت ہر کام میں عملی طور پر شرکت نہیں کر سکتا لیکن اس کے باوجود جہاں تک ممکن ہوا سے ارکانِ دعوت کے شانہ بشانہ اجتماعی کاموں میں شرکت کرنی چاہئے اور اپنی بڑائی اور عظمت و بزرگی کا ذرا بھی دھیان نہ لانا چاہئے۔امیر دعوت کی عملی شرکت کی وجہ سے ارکانِ دعوت پر خوشگوار اثرات پڑتے ہیں،ان میں ایثار وقربانی کا جذبہ بڑھتا ہے اور وہ خلوص اور رضا ورغبت کے ساتھ ذمہ داری انجام دیتے ہیں۔اس کے برعکس ان میں سستی وکاہلی پیدا ہوتی ہے اور وہ کام سے جی چرانے لگتے ہیں۔نیز یہ تربیت کے لئے بھی انتہائی ضروری ہے، کیونکہ اس طرح جہاں ارکان میں جذبہ وایثار پیدا ہوتا ہے اور تواضع وانکساری آتی ہے وہاں خود امیر دعوت کے تزکیۂ نفس اور جذبہ ایثار میں اضافے کے لئے بھی ضروری ہے۔

آپ کے اس طرزِ عمل کا صحابہ کرامؓ پر کیا اثر پڑا اس کا اندازہ درج ذیل اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے۔
مہاجرین اور انصار نے اس میں کام کیا اور آپ کی پیروی کی،(کام کرتے ہوئے)ایک مسلمان یہ کہتا جاتا تھا۔

لئن قعدنا والنبی یعمل
لذاک منا العمل المضلّل

''نبی کام کرے اور ہم بیٹھے رہیں تو ہمارا یہ عمل تو گمراہی ہوگا۔''

مسلمان مسجد نبوی کی تعمیر کرتے ہوئے یہ کہتے جاتے تھے:

لا عیش الا عیش الآخرۃ
اللھم ارحم الانصار والمھاجرۃ

(ابن ھشام ج ۲، ص ۱۰۸)

''اصل زندگی تو آخرت کی ہے، اے اللہ تو انصار اور مہاجرین پر اپنا رحم فرما۔''

مرکز کی عمارت

امام بخاریؒ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں:

ان المسجد کان علیٰ عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم مبنیاباللّبن وسقفه الجریدوعمده خشب النخل.(صحیح البخاری کتاب الصلوة باب بنیان المسجدایضاً صحیح ابن خزیمه ابو اب فضائل المساجد باب صفة بناء مسجد النبی صلی الله علیه وسلم .)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسجد (نبوی) کی دیواریں کچی اینٹ کی، چھت کھجور کی ٹہنیوں کی، اور ستون کھجور کے تنوں کے تھے۔''

اس میں اربابِ دعوت کے لئے یہ سبق ہے کہ مراکز کی عمارتیں سادہ ہوں، البتہ ان میں ضروریات کی تمام چیزیں موجود ہوں، نیز ان کی تعمیر میں ظاہری بناوٹ وسجاوٹ سے زیادہ لوگوں کی راحت وآسانی کوملحوظ رکھا جائے۔

مرکز کی تعمیر وترقی میں اِنفاق

علامہ حلبی روایت کرتے ہیں کہ مسجد میں رات کے وقت کھجور کی ٹہنی جلائی جاتی تھی، جب تمیم داری مدینہ آئے تو ان کے پاس چراغ، رسیاں اور تیل تھا تو انہوں نے یہ چراغ مسجد کے ستونوں کے ساتھ لٹکا دیے اور انہیں جلایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تو نے ہماری مسجد روشن کردی ہے، اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر اپنا نور نازل کرے، اللہ کی قسم! اگر میری بیٹی ہوتی تو میں تیرے نکاح میں دے دیتا۔'' (السیرۃ الحلبیۃ ص ۱۷۴)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ ارکانِ دعوت میں سے مخیّر حضرات کو چاہیے کہ وہ مراکزِ دعوت کی تعمیر وترقی اوران میں سہولیات کی فراہمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ اس سے ارکانِ دعوت کو راحت وسکون ملے گا اور انفاق فی سبیل اللہ کرنے والوں کو آخرت میں عظیم اجر سے نوازا جائے گا۔

صُفّہ، دارالعلم والتربیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کی تعمیر کے ساتھ اس سے متصل ایک چبوترہ بھی تعمیر کروایا جس میں تعلیم وتربیت کا سلسلہ شروع کردیا گیا۔ علامہ حلبی لکھتے ہیں:

لما بنی المسجد جعل فی المسجد محلاً مظللاً یأوی الیه المساکین یسمیّ الصفة و کان اهلُهٗ یسمون اهل الصفة و کان صلی الله علیه وسلم فی وقت العشاء یفرقهم علیٰ اصحابه ویتعشی معهٗ منهم طائفة.(السیرة الحلبیة ج ۱/ص ۴۷۱)

''جب مسجد تعمیر کی گئی تو اس میں ایک سایہ دار چھپر بنایا گیا، مساکین اس میں رہنے لگے، اسے صفہ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور اس میں رہنے والوں کو ''اہل صفہ'' کہا جاتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت انہیں اپنے اصحاب میں کھانا کھلانے کے لئے تقسیم کر دیتے تھے اور ایک گروہ آپ کے ساتھ رات کا کھانا کھاتا تھا۔''

اصحابِ صفہ

علامہ حلبی لکھتے ہیں کہ ظاہر سیاق سے تو یہی معلوم ہوتا ہے یہ جگہ مسجد نبوی کی تعمیر کے زمانے میں ہی بنائی گئی تھی اور مساکین اسی وقت سے وہاں ٹھہرنے لگے تھے، البتہ بیہقی نے عثمان بن الیمان سے روایت کیا ہے کہ:

''جب مدینہ میں مہاجرین کی کثرت ہوگئی اور ان کے پاس مال و متاع اور (رہائش کے لئے) ٹھکانہ نہ تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مسجد میں ٹھہرایا، انہیں اصحاب صفہ کا نام دیا، آپ ان کے پاس بیٹھتے اور انس و محبت کی باتیں کرتے یعنی نماز پڑھ کر ان کے پاس آتے اور ان سے فرماتے ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جو اجر تیار کر رکھا ہے اگر تمہیں معلوم ہو جائے تو تم چاہو گے کہ ہمارا فقر اور احتیاج اس سے زیادہ ہو (تاکہ اجر زیادہ ملے)۔''(السیرۃ الحلبیۃ ج۱ ص۴۷۱)

شریعت، طریقت اور فلاح و بہبود

اصحابِ صفہ کیا کرتے تھے اور ان کی تعداد کتنی ہوتی تھی اس کا اندازہ حضرت انس بن مالکؓ کی اس روایت سے ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ قبیلہ رعل وذکوان وعصیہ و بنی لحیان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد طلب کی تو:

فامدّهم بسبعین من الانصار کنّا نسمیهم القراء فی زمانهم کانو یحتطبون بالنهار ویصلون باللیل.(صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوة الرجیع)

''آپ نے ستر انصار صحابہ کے ساتھ ان کی مدد کی جنہیں ہم قراء کہا کرتے تھے، یہ دن کو لکڑیاں اکٹھی کرتے اور رات کو نماز میں مشغول رہتے تھے۔''

نجد سے عامر بن مالک بن جعفر ابو البراٗ ملاعب الاسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے اسے اسلام کی دعوت دی تو اس نے یہ دعوت تو قبول نہ کی لیکن کہنے لگا کہ آپ نے جو بات پیش کی ہے بہت اچھی ہے۔ اگر آپ میری قوم کی طرف اپنے کچھ آدمی (داعی) حضرات بھیجیں تو مجھے امید ہے کہ وہ اس دعوت کو قبول کر لیں گے۔ آپ نے جن حضرات کو اس کے ساتھ بھیجا۔ ان کے متعلق واقدی لکھتے ہیں:

وکان من الانصار سبعون رجلاً شببة یسمّون القرأ کانوا اذا امسوا اتوا ناحیة من المسجد فتدا رسوا وصلوا حتی اذا کان وجاہ الصبح استعذبوا من الماء واختطبو من الحطب فجاؤا به الیٰ حجر رسول الله صلی الله علیه وسلم وکان اهلهم یظنون انهم فی المسجد وکان اهل المسجد یظنون انهم فی اهلهم

(کتاب المغازی للواقدی ج ۱، ۳۴۷)

''انصار میں سے ستر نوجوان ایسے تھے جنہیں قراء کہا جاتا تھا، جب شام ہوتی تو مسجد کے ایک کونے میں آ کر بیٹھ جاتے، پڑھتے پڑھاتے، نماز پڑھتے، صبح کا وقت قریب ہوتا تو میٹھا پانی بھر کر لاتے اور لکڑیاں چن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجروں کے پاس لا کر رکھ دیتے۔ ان (اصحابِ صفہ) کے اہل خانہ سمجھتے کہ وہ مسجد میں ہیں اور اہل مسجد کا خیال ہوتا کہ گھر میں ہیں۔''

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت اور واقدی کے مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوا کہ اصحاب صفہ اور قراٗ، تین کام کرتے تھے:

(الف) درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے، جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ مسجد نبوی میں تعلیم و تعلم کا باقاعدہ سلسلہ قائم تھا۔

(ب) نوافل میں مشغول رہتے تھے، یعنی علم کے ساتھ تعلق مع اللہ میں مضبوطی اور للّٰہیت میں پختگی کے حصول میں بھی کوشاں رہتے تھے۔

(ج) صبح ہونے سے قبل پانی بھر کر لاتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانوں کے لئے لکڑیاں چن کر لاتے تھے، یعنی وہ خیر اور فلاح کے کاموں میں بھی شریک ہوتے تھے۔

پہلے کام کو شریعت، دوسرے کو طریقت اور تیسرے کو معاشرت یا فلاح و بہبود کہا جا سکتا ہے، لہٰذا داعی کو چاہیے کہ وہ ان تینوں امور میں پیش پیش رہے۔ اسلامی علوم خصوصاً قرآن و سنت کا زیادہ

سے زیادہ فہم حاصل کرنے کی کوشش کرے، اس کے ساتھ تزکیۂ نفس، تقویٰ، للّٰہیت اور تعلق مع اللہ جیسی صفات پیدا کرنے کی سعی کرے، تزکیۂ نفس اور روحانیت کے لئے قرآن وسنت کے بیان کردہ طریقوں کو اختیار کرے اور کسی صاحبِ نسبت اللہ والے کی صحبت بھی حاصل کرے، داعی ہمیشہ یاد رکھے کہ ہمارے اسلاف اور اکابر شریعت وطریقت، تصوف و جہاد اور سیف وقلم کے جامع تھے، لہٰذا ان کی پیروی اور جانشینی کا حق ان کے اس نقشِ قدم پر عمل پیرا ہونے سے ہی ادا ہوسکتا ہے۔

علم و جہاد بیک وقت

علامہ عینی مذکورہ حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

''حلیہ (کتاب) میں مذکور ہے کہ ان کی تعداد سو کے قریب تھی۔ ابونعیم فرماتے ہیں کہ اہل صفہ کی تعداد اختلاف احوال کی وجہ سے مختلف رہتی تھی، کبھی سب جمع ہو جاتے تو کثیر تعداد بن جاتی، بسا اوقات جہاد یا سفر میں جاتے یا غنی ہونے کی وجہ سے ان کی تعداد کم ہو جاتی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ستر سے زائد ہوتے تھے۔'' (عمدۃ القاری جز ۲۳، ص ۶۰)

ماقبل میں واقدی کے حوالے سے لکھا جا چکا ہے کہ اصحابِ صفہ رات کو تعلیم وتعلم میں مشغول رہتے تھے، جبکہ اس روایت کے مطابق انہیں جہاد کے لئے بھی بھیجا جاتا تھا، یعنی مسجد نبوی میں موجود ہوتے تو درس وتدریس میں مشغول ہوتے، جب جہاد کے لئے لشکر روانہ کرنے کی ضرورت پیش آئی تو انہیں جہاد کے لیے بھیج دیا جاتا تھا۔ گویا وہ علم و جہاد کے جامع تھے، جس وقت میں جو چیز ضروری ہوتی، اسے روبہ عمل لاتے اور ایک چیز کو دوسری چیز پر ترجیح نہ دیتے تھے۔

امیرِ دعوت کی رہائش گاہیں، سادگی کا نمونہ

مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خانہ کے لئے حجرے بھی تعمیر کیے گئے۔ سرورِ کائنات کی ذاتی رہائش کے لئے بنائے جانے والے حجرے کیسے تھے، اس کا اندازہ درج ذیل روایت سے بخوبی ہوتا ہے۔ علامہ حلبی لکھتے ہیں:

وبنى لرسول الله صلى الله عليه وسلم حول مسجده الشريف حجراً لتكون مساكن لهٗ ولاهله وكانت مساكن قصيرة البناء قريبة الفناء.

(السيرة لابن كثير ج ۲، ص ۳۱۳)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل خانہ کی رہائش کے لئے مسجد نبوی کے گرد حجرے تعمیر

کئے گئے، یہ رہائش گاہیں کم اونچائی والی اور جلد ختم ہونے والی تھیں۔''

علامہ سہیلی ازواج مطہرات کے حجروں سے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ نو تھے، بعض تو تنوں کے تھے جنہیں گارے سے لیپ دیا گیا تھا اور ان کی چھتیں کھجور کی ٹہنیوں کی تھیں، بعض اوپر نیچے رکھے ہوئے پتھروں کے بنے ہوئے تھے، ان کی چھتیں بھی کھجور کی ٹہنیوں کی تھیں۔'' (الروض الانف ج ۲ ص ۱۳)

سرور کائنات اور امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہلِ خانہ کے لئے بنائے گئے گھر کوئی عالی شان اور بلند و بالا محلات نہ تھے بلکہ وہ سادگی اور فقر کا اعلیٰ نمونہ تھے، ان کی اونچائی قدآدم کے برابر تھی اور اس قدر سادہ تھے کہ صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ وہ کوئی دیرپا اور مضبوط عمارتیں نہ تھیں بلکہ جلد ختم ہونے والے حجرے تھے۔ امّ المؤمنین سیدہ ام سلمہؓ کے حجرے کے علاوہ باقی تمام ازواج مطہرات کے حجرے کچی اینٹوں کے بنے ہوئے تھے اور ان کی چھتیں کھجور کی ٹہنیوں کی تھیں۔ جس وقت ام المؤمنین سیدہ ام سلمہ کا حجرہ پکا بنایا گیا خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ دومۃ الجندل میں تھے۔ وہاں سے واپس تشریف لائے تو سب سے پہلے سیدہ امّ سلمہؓ کے ہاں تشریف لائے۔ پختہ بنا ہوا حجرہ دیکھا تو فرمایا ''یہ کیسی عمارت ہے؟ یعنی اس طرح پختہ کس مقصد کے پیش نظر بنائی گئی ہے۔ سیدہ امّ سلمہ نے عرض کیا ''میری مقصود یہ ہے کہ لوگوں کی نظروں سے محفوظ ہو جائیں۔'' یعنی ان کا مقصود یہ تھا کہ اطمینان بخش پردہ ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان شر ما ذهب فيه مال المرٔ المسلم البنيان.

(الطبقات الكبرىٰ ج ا ص ۴۹۹، ۵۰۰، ايضاً الوفاء ج ا ص ۲۵۸)

''سب سے برا مصرف جس میں مسلمان کا مال خرچ ہو وہ (بلا ضرورت) تعمیر ہے۔''

ابن سعد روایت کرتے ہیں کہ جب ولید ابن عبدالملک کے دور میں حجرات منہدم کر کے مسجد نبوی میں شامل کئے گئے تو حضرت سعید بن المسیبؒ نے فرمایا:

والله لوددت انهم تركوها على حالها ينشاء ناشىء من اهل المدينة ويقدم القادم من الافق فيرى ما اكتفى به رسول الله صلى الله عليه وسلم فى حياته فيكون ذلک مما يزهد الناس فى التكاثر والتفاخر.

(الطبقات الكبرىٰ ج ا ص ۴۹۹، ۵۰۰، ايضاً الوفاء ج ا ص ۲۵۹)

''اللہ کی قسم! میری خواہش تھی کہ یہ لوگ ان (حجروں) کو ان کی حالت پر چھوڑ دیتے تو مدینہ کی آنے والی نسلیں اور باہر سے آنے والے لوگ انہیں دیکھتے تو انہیں اندازہ ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی چیز پر اکتفا کیا، یہ چیز لوگوں کو تعمیرات میں ایک دوسرے سے بڑھنے اور فخر کرنے سے روکتی۔''

اسی طرح ابوامامہ نے فرمایا:

''کاش! انہیں اسی طرح چھوڑ دیا جاتا تو لوگوں میں تعمیرات میں (بڑھ چڑھ کر حصہ لینے) میں کمی آتی اور وہ دیکھ لیتے کہ دنیا کے خزانوں کے مالک ہونے کے باوجود اللہ نے اپنے نبی کے لیے کیا چیز پسند فرمائی ہے۔'' (الطبقات الکبریٰ ج ۱ ص ۵۰۰)

امیر کے گھریلو اخراجات کا بندوبست

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابوایوب انصاری کے گھر سکونت پذیر ہوئے تو آپ کے پاس سعد بن عبادہ اور اسعد بن زرارۃ کی طرف سے ہر رات کھانے کا تھال آتا تھا۔

''اس کے بعد سعد بن عبادہ کی طرف سے یہ تھال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ازواج مطہرات کے گھروں میں بھی آتا رہتا تھا یعنی آپ اپنی ازواج کے ساتھ جہاں کہیں بھی ہوتے یہ تھال آتا تھا جس میں ثرید ہوتا تھا۔ یعنی اس میں گوشت اور روٹی، دودھ یا گھی یا شہد یا خل یا زیتون کے ساتھ ملا ہوتا ہے۔'' (السیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۴۷۹)

ابوایوب کے گھر میں قیام کے دوران ان دو حضرات کے علاوہ دیگر حضرات کی طرف سے بھی کھانا آتا تھا۔ علامہ حلبی لکھتے ہیں:

وما كان من ليلة الاوعلى باب رسول الله صلى الله عليه وسلم الثلاثة والاربعة يحملون الطعام يتناوبون حتى تحول رسول الله صلى الله عليه وسلم من منزل أبى أيوب. (السيرة الحلبية ج ۱، ص ۴۷۹، ۴۸۰)

''ہر رات تین چار آدمی باری باری کھانا اٹھائے آپ کے دروازے پر کھڑے ہوتے تھے یہاں تک کہ آپ ابوایوب کے مکان سے منتقل ہو گئے۔''

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ابوایوب کے گھر میں قیام کے دوران جو کہ نو ماہ پر مشتمل تھا، بنونجار کے آدمی باری باری آپ کے پاس کھانا لاتے تھے۔ (ایضا)

علامہ سمہودی روایت کرتے ہیں کہ انصار مرد اور عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہدایا بھیجتے تھے، حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیمؓ کے پاس کچھ نہ تھا تو انہیں اس پر افسوس ہوتا تھا، چنانچہ وہ اپنے فرزند انس بن مالک کو آپ کے پاس لائیں اور عرض کیا:

یخدمک انس یارسول اللہ ؟ قال نعم ۔ (وفاء الوفا ج ۱ ص ۲۷۱)

''یارسول اللہ! انس آپ کی خدمت کیا کرے گا، آپ نے قبول کرتے ہوئے فرمایا ہاں (ٹھیک ہے)۔''

امیر کے گھریلو اخراجات کا معیار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اور آپ کے اہل خانہ (ازواج مطہرات) کے گھریلو اخراجات کا معیارِ معیشت کیا تھا۔ اس کا اندازہ درج ذیل روایت لگایا جاسکتا ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں:

ماشبع آل محمدصلی اللہ علیہ وسلم منذقدم المدینۃ من طعام بُرّ ثلٰث لیالٍ تباعاً حتی قبض. (صحیح البخاری کتاب الرقاق باب کیف کان عیش النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ)

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خانہ آپ کی مدینہ تشریف آوری سے وفات تک تین رات لگا تار گندم کی روٹی پیٹ بھر کر نہیں کھاسکے۔''

اسی طرح حضرت عائشہ نے ایک دفعہ حضرت عروۃ بن زبیر سے فرمایا:

ابن اختی ان کنّا لننظر الی الھلال ثلثۃ اھلّۃ فی شعرین وماا وقدت فی ابیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نارٌ. (ایضاً)

''اے بھانجے! ہم دو مہینے گذرنے کے بعد تیسرے مہینے کا چاند طلوع ہوتا دیکھ لیتے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں (کھانا پکانے کے لئے) آگ نہ جلتی تھی۔''

عروہ نے پوچھا ''پھر آپ لوگ کیا کھاتے تھے؟'' عائشہؓ نے بتایا کہ ''کھجور اور پانی پر گزارا کرتے تھے، البتہ ہمارے پڑوس میں انصار رہتے تھے جو آپ کے لئے دودھ بھیج دیا کرتے تھے جو ہم پیتے تھے۔''

بقدرِ ضرورت رزق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فقر اختیاری تھا، چنانچہ حضرت ابوہریرۃؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی:

اللّٰھم ارزق آل محمد قوتاً. (ایضاً)

''اے اللہ! آلِ محمد کو بقدرِ ضرورت رزق عطا فرمائیے۔''

یعنی اس قدر روزی عطا فرمائیے جس سے ضرورت پوری ہو جائے، جسم و جان کا رشتہ باقی رہے اور اللہ کے احکام بجالانے پر قدرت حاصل ہو۔

یہ تو آپ، کے اور آپ کے اہل خانہ کے کھانے پینے کی حالت تھی، اب ذرا آپ کی خواب گاہ (آرام کرنے کی جگہ) کا حال ملاحظہ ہو، حضرت عائشہ فرمائی ہیں:

کان فراش رسول الله صلی الله علیه وسلم من ادم وحشوة من لیف. (ایضاً)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر چمڑے کا تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوتی تھی۔''

علامہ سہیلی لکھتے ہیں:

کان سریره خشبات مشدودة باللیف. (الروض الانف ج ۲ ص ۱۴)

''آپ کی چارپائی لکڑی کی تھی اور بان کھجور کے پتوں کا تھا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا فقر اس وجہ سے نہ تھا کہ ان کے پاس مال ومتاع نہ تھا بلکہ اس وجہ تھا کہ جو آتا تھا اسے بقدرِ ضرورت خرچ کرکے باقی ماندہ دوسرے لوگوں پر صدقہ کردیا کرتے تھے، بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ خود محتاج ہونے کے باوجود سائل کو خالی نہ لوٹاتے تھے اور خود فاقے برداشت کرکے دوسرے کی حاجت پوری کردیتے تھے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر:)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ احوال میں یہ سبق ہے کہ داعی سادہ زندگی اپنائے، گھر اور گھر سے باہر کے اضافی اور ضرورت سے زائد اخراجات سے گریز کرے اور انفاق فی سبیل اللہ اور دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کا معمول بنائے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ یہ دنیا فانی ہے، فانی چیزوں کو جمع کرنا مسلمان کی شان نہیں ہے اور نہ یہ زندگی کا مقصد ہے۔ دوسری بات یہ کہ ضرورت سے زائد اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ملازمت وتجارت وغیرہ کرنا ہوگی یعنی بھاگ دوڑ زیادہ کرنا پڑے گی، جس کی وجہ سے داعی دعوت کو مطلوبہ وقت نہ دے سکے گا اور یوں وہ رفتہ رفتہ دعوت سے دور ہوتا جائے گا اور خطرہ ہے کہ کہیں بالکل اس سے کٹ کر نہ رہ جائے۔

مواخاۃ

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ مدینہ میں مہاجرین و انصار کے درمیان مواخاۃ سے پہلے مکہ میں بھی مہاجرین کے درمیان مواخاۃ ہو چکی تھی۔ مدینہ میں مواخاۃ کے وہی مقاصد تھے جو مکہ میں ہونے والی مواخاۃ کے تھے۔ مہاجرین صحابہ کرامؓ نے مکہ سے ہجرت کر کے عظیم الشان جانی و مالی قربانی دی تھی۔ مدینہ آئے تو ان کے پاس نہ تو خرچ کے لیے زیادہ رقم تھی اور نہ رہائش کیلئے مکان تھے۔ انصار صحابہؓ نے کھلے دل کے ساتھ ان کا ہر قسم کا تعاون کیا، جس کی وجہ سے مہاجرین کو زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ مہاجرین کو اپنے اپنے ہاں رہائش دینے کے معاملے میں انصار میں ایک دوسرے سے پہل کرنے میں اس قدر جوش و خروش تھا کہ باقاعدہ قرعہ اندازی کرنا پڑی۔ حضرت ام العلاء بنت الحارث بیعت عقبہ ثانیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرنے والی تھیں۔ امام بخاری ان سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتی ہیں:

''جب انصار نے مہاجرین کو رہائش دینے کے معاملے پر قرعہ اندازی کی گئی تو عثمان بن مظعونؓ ان کے حصے میں آئے۔'' (صحیح البخاری کتاب المناقب باب مقدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ الی المدینہ)

مہاجرین دوسروں کے تعاون و امداد کو پسند نہ کرتے تھے بلکہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتے تھے، اس لئے مستقل انتظام کی ضرورت تھی۔ نیز یہ کہ تمام صحابہ (مہاجرین و انصار) ارکانِ دعوت تھے تو ان میں تنظیم و وحدت پیدا کرنا بھی ناگزیر تھا چنانچہ مسجد نبوی کی تعمیر سے فراغت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اہم کام کو انجام فرمایا

مواخاۃ پر عمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے درمیان جو اخوۃ قائم کی، انہوں نے اس کو دل و جان سے قبول کیا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن الربیع انصاری کے درمیان مواخات قائم کی تو سعد نے انہیں پیشکش کرتے ہوئے کہا:

انّی اکثر الانصار مالاً فاقسم مالی نصفین ولی امرأتان فانظر اعجبھما الیک فسمھا لی اطلقھا فاذا انقضت عدّتھا فتزوجھا قال بارک اللہ لک فی اھلک و مالک این سوقکم.

(صحیح البخاری کتاب المناقب باب اخاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم بین المهاجرین و انصار)

''میں انصار میں سے سب سے زیادہ مال ودولت کا مالک ہوں۔میرے مال میں سے نصف تقسیم کرلیں۔میری دو بیویاں ہیں۔ان میں سے جوآپ کو پسند آئے مجھے بتلایئے میں اسے طلاق دے دوں گا،جب اس کی عدت پوری ہوجائے تو آپ اس سے نکاح کرلیں۔عبدالرحمٰن نے جواب دیا اللہ تعالیٰ آپ کے اہل وعیال اور مال میں برکت عطا فرمائے،تمہارا بازار کہاں ہے (آپ مجھے بازار کا راستہ بتادیں)۔''

آدھے مال کی پیشکش تو شاید زیادہ حیران کن نہ ہولیکن دین کی خاطر اپنی بیوی کی پیشکش کی مثال انسانی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔اس طرح کی پیشکش صرف وہی آدمی کرسکتا ہے جواللہ اوراس کے رسول کے احکام پر اپنا سب کچھ لٹانے پر تیار ہو،اپنے دین کی عزت وتوقیر اس کے دل میں ہو اورانفاق فی سبیل اللہ اورنصرت واکرام کی فضیلت اوراس کے بدلے میں آخرت میں ملنے والے عظیم الشان اجروثواب پر اسے یقین کامل ہو۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر رفقاء دعوت ایک دوسرے سے تعاون کریں تومحتاج حضرات کوقبول کرنا چاہیے،اس میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے جوصلاحیت،علم،فن اورہنر عطا کیا ہے،اس کواستعمال کرتے ہوئے اپنے پاؤں پرکھڑے ہونے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ مخیّر حضرات پر بوجھ نہ پڑے اورارکانِ دعوت کی ذات پرخرچ ہونے والی رقم زیادہ سے زیادہ دعوتی امور میں خرچ ہو،اس سے جہاں ارکانِ دعوت کی مالی مشکلات میں کمی آئے گی وہاں دعوت میں بھی تیزی اورقوت آتی جائے گی،اگرمحتاج داعی نے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش نہ کی اورمخیّر حضرات پرتکیہ کیے رکھا تواس سے جہاں مخیّر حضرات پر مستقل بوجھ پڑے گا وہاں دعوتی امور میں بھی خلل واقع ہوگا کیونکہ ان کے اپنے پاؤں پرکھڑے نہ ہونے کی وجہ سے دعوتی امور میں صرف کیا جانے والا مال ان کی ضروریات میں صرف ہوجائے گا۔اس لیے اپنے پاؤں پرکھڑا ہونے کے لیے بھرپورکوشش کرنی چاہیے،جیسا کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے بازار میں جاکرتجارت شروع کردی چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں ان کی مالی حالت بھی مستحکم ہوگئی اورانہوں نے ایک انصاری عورت سے شادی بھی کرلی۔(ایضاً)

امام بخاری حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ مواخاۃ کے بعد انصار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

اقسم بيننا وبينهم النخل قال لا قال تكفونا المؤنة ويشر كونافى الامر قالوا سمعنا واطعنا. (صحيح البخارى كتاب المناقب باب اخاء النبى صلى الله عليه وسلم)

''آپ ہمارے اوران (مہاجرین) کے درمیان ہمارے کھجور کے باغات تقسیم فرمادیں، آپ نے فرمایا''نہیں'' انصار نے عرض کیا تب آپ لوگ (مہاجرین) ہمارے کام کردیا کریں اور ہم پھل میں آپ کو شریک رکھیں گے انہوں نے کہا ٹھیک ہے، ہم نے بات سنی اور مانی۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ مخیّر حضرات اپنے ساتھیوں پر خرچ کریں اوران کی مالی ومعاشی ضروریات کا خیال کریں اورانہیں پورا کریں۔اس سے بہتر صورت یہ ہے کہ ضرورت مندوں کواس قدر مال دیا جائے کہ وہ اس سے تجارت وغیرہ شروع کرکے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکیں۔اس طرح وہ مستقل احتیاج سے بچ جائیں گے، اپنے پاؤں پر کھڑے ہوجائیں گے اور یوں دعوتی امور کو بہتر طور پرانجام دے سکیں گے۔وہ حضرات جن سے تعاون کیا گیا ہے انہیں بھی ان کی قربانیوں کا اعتراف اورقدر کرنی چاہیے،ان کے لئے اللہ رب العزت سے خیروبرکت اورزیادہ سے اجر وثواب کی دعا کرنی چاہیے۔نیز یہ کہ مخیّر حضرات تعاون کرکے ان پراحسان جتلائیں اورنہ ان سے کسی دنیاوی مفاد کالالچ اورامید کریں۔محض اللہ تعالیٰ کی رضاوخوشنودی کے حصول کے لئے خرچ کریں اوراسی سے اس کے صلہ اورجزا کی امید رکھیں۔

داعی کادعوتی امور میں ایک دوسرے سے سبقت کرنا

عبداللہ بن کعب بن مالک سے روایت ہے،فرماتے ہیں:

''اللہ تبارک وتعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جوفضل فرمایا اورنصرت کی تھی،اسی میں سے ایک یہ امر بھی تھا کہ انصار کے دونوں قبیلے اوس وخزرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں ایک دوسرے سے اس طرح مقابلہ کرتے تھے جیسے دوسانڈ کرتے ہیں۔اگراوس ایسا کوئی کام کرتے جس میں آپ کوکوئی سہولت وراحت ملتی تو خزرج والے کہتے اللہ کی قسم!تم اس کام کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں اوراسلام میں ہم سے فضیلت نہ لے جاؤ گے، پھر وہ اس جیسا کوئی کام کرکے ہی رہتے تھے،اسی طرح خزرج کوئی کام کرتے تواوس بھی اس طرح کہتے (اورکرتے تھے)۔''

(السیرۃ لابن ہشام ج ۳،ص ۱۷۳)

اس میں یہ سبق ہے کہ ارکانِ دعوت کو چاہیے کہ امورِ دعوت کی انجام دہی میں بڑھ چڑھ کر حصہ

لیں، ہر ایک آگے بڑھنے اور پیش پیش رہنے کی کوشش کرے، ایثار وقربانی کا اس قدر جذبہ اور تڑپ ہو کہ مقابلے کی فضا بن جائے۔ جیسا کہ اوس وخزرج کے درمیان مقابلے کی فضا تھی۔ ارشاد ربانی ہے:

وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ. (المطففین: ٢٦)

''(نعمتوں کے) شائقین کو چاہیے کہ اسی سے رغبت کریں۔''

یوم بعاث اور حکمتِ الٰہیہ

اوس وخزرج ایک دوسرے کے حریف تھے اور یہود ان کو ہمیشہ باہم لڑانے کی سازشیں کرتے اور جنگ کی آگ بھڑکاتے رہتے تھے، چنانچہ ان کے درمیان کئی خونریز جنگیں ہوئیں۔ آخری جنگ ''بعاث'' تھی جو ہجرت سے پانچ سال قبل ہوئی، جس میں دونوں قبیلوں کے بڑے بڑے جنگجو اور سردار مارے گئے تھے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی جو حکمت تھی، اس سے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''اللہ عزوجل نے یوم بعاث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کی مدد ونصرت) اور انصار کے اسلام میں داخل ہونے کے لئے پیش خیمہ بنا دیا تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو ان کی جمعیت ختم ہو چکی تھی اور ان کے بڑے بڑے سردار قتل ہو چکے تھے۔''

(صحیح البخاری کتاب المناقب باب مقدم النبی ﷺ)

علامہ بدرالدین عینی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

یعنی لو کان صنادیدھم احیاء لما انقادوا لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حباً للریاسۃ. (عمدۃ القاری جزء ١٧، ص ٦٤)

''یعنی اگر ان کے بڑے بڑے سردار زندہ ہوتے تو وہ ریاست اور اقتدار وحکومت کی محبت کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع نہ کرتے۔''

سرداری اور حکومت میں اللہ تعالیٰ نے ایسی کشش، جاذبیت اور لذت رکھی ہے کہ جو اس کا مزہ چکھ لے، وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتا اور ہمیشہ ہی حکومت کرنے کا خواہاں ہوتا ہے، اس لئے وہ اس کے تحفظ اور اسے زیادہ سے زیادہ طول دینے کے لئے کئی اقدامات اٹھاتا اور زیادہ سے زیادہ طاقت وقوت حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتا ہے، جس کے لئے اخلاقی قدروں کی دھجیاں اڑا دیتا ہے، مسلمہ اصولوں کو جوتے کی نوک پر رکھتا ہے اور بے دریغ طاقت استعمال کرتے ہوئے ہر اس فرد، گروہ

اور جماعت کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے جسے وہ اپنے اقتدار کے لئے خطرہ سمجھتا ہے، تب وہ اندھا، بہرا اور بصیرت سے محروم ہو جاتا ہے اور حق اسے نہ دکھائی دیتا ہے، نہ سنائی دیتا ہے اور نہ وہ اس پر غور و فکر کر سکتا ہے، اس لیے اس سے محروم رہتا ہے اور یوں ابدی شقاوت اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے ماتحتوں اور زیر اثر افراد، گروہوں، اور جماعتوں کو بھی حق قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور یوں وہ بھی محروم رہتے ہیں۔

جب بادشاہ، حاکم اور بڑے بڑے سردار ہی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیں جیسا کہ مکہ، طائف اور دیگر قبائل کے سردار انکار کر چکے تھے تو قبائلی روایات کے مطابق ان کے ماتحت بھی ان کی پیروی کرتے ہوئے قبول حق کی طرف مائل نہ ہوتے۔ لہٰذا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کے وقت اوس وخزرج کے بڑے بڑے سردار موجود ہوتے تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ دیگر قبائل کی طرح وہ بھی انکار کر دیتے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے جنگ بعاث کی بدولت اس کا سدباب کر دیا۔

میثاق مدینہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد (نبوی) کی تعمیر اور صحابہ کرامؓ کے درمیان مواخاۃ قائم کرنے کے بعد مسلمانوں اور مدینہ کے مختلف قبائل کے درمیان امن کے معاہدے کے لئے ایک تحریر تیار فرمائی جس میں یہود سے امن وامان کا معاہدہ تھا اور ان کے اپنے دین و مذہب پر رہنے اور مال و جائداد کی حفاظت و بقا کا ذمہ لیا گیا تھا اور ان کے حقوق اور ذمہ داریوں دونوں کی نشان دہی کی گئی تھی۔ ابن اسحاق روایت کرتے ہیں:

بسم الله الرحمن الرحيم هذا كتاب من محمد النبي صلى الله عليه وسلم، بين المؤمنين والمسلمين من قريش ويثرب، ومن تبعهم فلحق بهم وجاهد معهم إنهم أمة واحدة من دون الناس. (السيرة لابن هشام ج ٢، ص ١١٢، ١١٣)

''یہ تمام معاہد گروہ (یعنی مسلمانان مدینہ اور جو لوگ آ کر ان سے ملحق ہوئے ہیں اور مہاجرین جو قریش میں سے ہیں اور یہود کے مختلف قبائل) دوسرے غیر معاہد غیر مسلموں کے مقابلہ میں ایک قوم شمار ہوں گے۔''

اس معاہدے کی سب سے اہم دفعہ یہ تھی:

وإنه ما كان بين أهل هذه الصحيفة من حدث أو اشتجار يخاف فساده فإن مرده إلى الله عزوجل وإلى محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم (ایضاً ص ۱۱۴)

''اس معاہدہ کے شرکاء میں جو قضیہ اور نزاع واختلاف رونما ہوگا وہ خدا اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے پیش کیا جائے گا۔''

قبائلِ یہود نے خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور قبول اسلام سے گریز کیا، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو بھی میثاقِ مدینہ میں شامل کر کے ان سے عہد و معاہدہ کیا تا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فتنہ وفساد نہ پھیلا سکیں مگر تینوں قبیلوں نے یکے بعد دیگرے اس معاہدے کی خلاف ورزی کی اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں پورا پورا حصہ لیا، اسلام کی اشاعت و وسعت کو روکنے اور مسلمانوں کو زیر کرنے کے منصوبے بنائے اور مشرکین مکہ اور دیگر قبائل کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے، لیکن ان کی تمام سازشیں اور منصوبے ناکام ہو گئے اور انہیں اپنے کئے کی سزا بھگتنا پڑی جیسا کہ غزوات کے بیان میں آئے گا۔

میثاقِ مدینہ میں یہود سے ہونے والے معاہدہ کی دفعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاہدہ مسلمانوں اور یہود کے درمیان اس طرح ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس معاہدے میں شریک فریقوں کے مسلّمہ ثالث اور منصف ہیں اور جب فریقین میں کوئی اختلاف اور تنازع پیش آئے گا تو انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور جو آپ فیصلہ فرمائیں گے اس پر عمل کرنا ہوگا۔

اسلامی حکومت کی اساس

اس معاہدے کی بظاہر نوعیت ایسی ہے جیسے ایک اسلامی حکومت اور غیر مسلم ذمیوں کے درمیان معاہدہ ہوتا ہے مگر اُس جیسا ہرگز نہیں، اس لئے کہ اسلام قبول کرنے والے انصار کے علاوہ یہود سمیت یثرب کے تمام قبائل آزاد و خودمختار تھے، وہ نہ تو آپ کے محکوم بنے تھے اور نہ انہوں نے آپ کو ایک حاکم کے طور پر قبول کیا تھا، البتہ یہ ضرور تھا کہ آپ تمام قبائل کے متفقہ اور مسلّمہ سردار اور منصف بن گئے تھے اور تنازعات میں آپ کو حکم بنانے کے پابند ہو گئے تھے، مکہ میں آپ اور آپ کے اصحاب جن حالات کا سامنا کر چکے تھے اور جو مصائب و مسائل انہیں درپیش رہے تھے، ان کے پیش نظر یہ معاہدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ کی بہت بڑی کامیابی تھی کیونکہ مکہ میں مشرکین آپ کی جان کے درپے تھے اور یہاں آپ کو تمام قبائل اپنا سردار تسلیم کر رہے ہیں، لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ ہجرت

کے بعد اس معاہدے کے ذریعے اسلام کے اقتدار و اختیار کی بنیاد رکھی گئی جس میں بتدریج ترقی ہوتی گئی، جب پورا جزیرۂ عرب فتح ہو چکا تھا اور قبائل عرب مدینہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر رہے اور آپ کی سیادت و حکومت کو تسلیم کر رہے تھے۔ اس وقت پورے جزیرۂ عرب پر آپ کی ہی حکمرانی تھی اور کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو آپ کے مدمقابل ہو۔

حریف طبقے کی بڑی بڑی شخصیات کی دعوت میں شمولیت

جب انصار اسلام قبول کرنے کے بعد مدینہ واپس آئے تو انہوں نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ کو بتلایا کہ تم جس نبی آخر الزمان کی بعثت کا تذکرہ کرتے رہتے ہو وہ مکہ کے اندر مبعوث ہو چکے ہیں اور ہم نے ان کی پیروی اختیار کر لی ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو حضرت عبداللہ بن سلامؓ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہوئے۔ میمون بن یامینؓ بھی یہود کے سردار تھے۔ یہ بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہوئے۔ اسی طرح صرمۃ بن ابی انس انصاریؓ طلوعِ اسلام سے پہلے ابتداء ہی سے توحید کے قائل تھے اور کفر و شرک سے متنفر اور بیزار تھے، اپنے زمانہ کے بڑے شاعر تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔ (السیرۃ لابن ہشام ج ۲ ص ۱۲۲۸۲۱)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ بعض اللہ کے مخلص بندے عمر رسیدہ، تجربہ کار اور جہاندیدہ ہونے کے باوجود مبنی برحق دعوت کو برضا و رغبت قبول کر لیتے ہیں۔

حریف طبقے کی عداوت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو یہودیوں نے آپ کی نبوت و رسالت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا بلکہ عداوت و دشمنی کا طرزِ عمل اختیار کیا اور آخر وقت تک اس پر قائم رہے۔ اس کے علاوہ اوس و خزرج کے کچھ لوگ بھی مسلمان نہ ہوئے لیکن جب اسلام کی ترقی دیکھی تو بظاہر مسلمان ہو گئے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ بدفطرت لوگ حق واضح ہونے کے باوجود اسے قبول نہیں کرتے اور اپنے فاسد عقائد اور باطل افکار و نظریات پر قائم رہتے ہیں لیکن انقلابی دعوت و تحریک کو زور پکڑتا دیکھتے ہیں تو بظاہر اس کے حامی بن کر اس میں شریک ہو جاتے ہیں تاکہ اپنے مفادات کا تحفظ کر سکیں۔ ان کے منافقانہ کردار کی وجہ سے دعوت کو کئی خطرات لاحق ہو جاتے ہیں، اس لئے اربابِ تحریک

کو چاہیے کہ وہ ایسے لوگوں سے چوکنا اور ہوشیار رہیں اور ان کی حرکات وسکنات پر کڑی نظر رکھیں۔

ارکان میں افتراق وانتشار اور پھوٹ ڈالنے کی سازش

شاس بن قیس (یہودی) جسے مسلمانوں سے شدید بغض اور حسد تھا ایک دفعہ قبیلہ اوس وخزرج سے تعلق رکھنے والے صحابہ کرامؓ کی مجلس کے پاس سے گزرا تو وہ صحابہ کرام کے درمیان الفت ومحبت، ان کی اجتماعیت اور زمانۂ جاہلیت کی عداوت کے بعد اسلام کی برکت سے ان میں ہونے والی مصالحت دیکھ کر غضبناک ہو گیا اور کہا:

قد اجتمع ملأ بنی قیلة بهذه البلاد لا والله مالنا معهم اذا اجتمع ملؤهم بها من قرار.

''بنو قیلہ اس شہر میں مجتمع ہوں گے تو بخدا ہمارا تو کوئی ٹھکانہ نہ رہے گا۔''

اس نے ایک نوجوان یہودی سے کہا ''تم ان کے پاس جا کر بیٹھو، پھر یوم بعاث کا تذکرہ چھیڑ دو اور اس حوالے وہ اشعار جو وہ پڑھتے تھے ان میں سے کچھ ان کے سامنے پڑھ دو۔''

اس نے جا کر ایسا ہی کیا۔ چند سال قبل دونوں قبیلوں کے درمیان ہونے والی جنگ کے بارے میں دونوں قبیلوں کے تفاخر پر مبنی کہے جانے والے اشعار پڑھنا شروع کر دیے، پرانی دشمنی اور تعصب کی آگ بھڑک اٹھی اور دونوں قبیلوں کے افراد کے درمیان جھگڑا شروع ہو گیا یہاں تک کہ تلواریں میانوں سے نکل چکی تھیں اور نوبت لڑائی تک پہنچنے والی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس فتنے کی اطلاع ملی تو آپ فوراً تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا:

یامعشر المسلمین! الله الله ابدعوی الجاهلیة وانابین اظهرکم بعدان هداکم الله للاسلام واکرمکم به وقطع به علکم امر الجاهلیة واستنقذکم به من الکفر والف به بین قلوبکم؟(السیرة لابن هشام ج۲ ص ۱۵۹)

''اے مسلمانو! اللہ سے ڈرو! یہ تم کیا جاہلیت کی باتیں کر رہے ہو حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اسلام قبول کرنے کی ہدایت دی، تمہیں عزت بخشی، جاہلیت کا خاتمہ کیا تمہیں کفر سے بچایا اور تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت پیدا کر دی۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ جب مخالفین دعوت وتحریک کو زور پکڑتا دیکھتے ہیں تو ان کے حسد، بغض اور عداوت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس جماعت میں شامل مختلف طبقوں، قبیلوں، زبانوں اور علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد اور گروہوں میں طبقاتی، قبائلی، لسانی

اورعلاقائی تعصب پیدا کر کے انہیں باہم لڑایا جائے تاکہ جماعت میں افتراق پیدا ہو، دعوت کی اجتماعیت درہم برہم ہوجائے اورارکان منتشر ہوجائیں، چنانچہ اس کے لئے مختلف حربے آزمائے جاتے ہیں اوراپنے ''آدمی'' داخل کر کے مذکورہ مذموم مقاصد حاصل کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔موجودہ دور میں خفیہ ریاستی ادارے اورحکومتیں یہ کام بڑی مہارت سے انجام دے رہی ہیں۔وہ جماعتی اور تنظیمی جوڑتوڑ میں مہارت تامہ حاصل کرچکی ہیں اورایسے ایسے گل کھلاتی ہیں کہ نہ صرف عوام اور جماعت کے ارکان بلکہ مرکزی قیادت بھی دنگ رہ جاتی ہے اورانہیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ وارکہاں سے کیا گیا ہے؟اس کی منصوبہ بندی کب کی گئی تھی اورکب سے اس پرعمل درآمد کیا جارہا تھا؟مذکورہ امور کے پیش نظر اربابِ دعوت خصوصاً مرکزی قیادت کودشمنانِ دعوت کی اس قسم کی سازشوں اورمنصوبوں پرکڑی نظر رکھنا ہوگی۔

امیرتحریک پراپنی بڑائی کا الزام

جب داعی دعوتِ حقہ لے کراٹھتا ہےاورلوگوں کواس کی دعوت دیتا ہےتو مخالفین اوراس دعوت کے ساتھ بغض وعناد کا اظہار کرنے والے افراداس پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ یہ اپنی بڑائی وعظمت اوراپنااقتداروحکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔جب مدینہ کے یہوداورنجران کے نصاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہوئے اورآپ نے انہیں اسلام کی دعوت دی توابورافع القرظی نے آپ سے کہا:

اترید منا یا محمد ان نعبدک کما تعبداالنصاریٰ عیسیٰ بن مریم؟

''اے محمد(صلی اللہ علیہ وسلم)!کیا آپ ہم سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی اسی طرح عبادت کریں جیسے نصاریٰ عیسیٰ بن مریم کی عبادت کرتے ہیں؟''

اسی طرح ایک آدمی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کومخاطب کرتے ہوئے کہا:

اوذلک ترید منا یا محمد والیه تدعونا؟

''اے محمد(صلی اللہ علیہ وسلم)!کیا آپ ہم سے یہی چاہتے ہیں اورہمیں اسی چیز کی دعوت دیتے ہیں؟''

آپ نے اس کے جواب میں ارشادفرمایا:

معاذ اللہ ان اعبدغیر اللہ او آمر بعبادۃ غیرہ فما بذلک بعثنی اللہ ولا أمرنی او کما قال

''میں اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں اس سے کہ میں غیر اللہ کی عبادت کروں یا غیر اللہ کی عبادت کا حکم دوں،اللہ تعالیٰ نے مجھے اس لئے مبعوث نہیں کیااورنہ مجھے اس کا حکم دیا ہے۔''

ان دونوں(یہودیوں)کی اس بات پراللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ. (آل عمران: ۷۹)

''کسی آدمی کے لئے یہ جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے کتاب، حکم اور نبوت دیں تو وہ لوگوں سے کہے کہ ''تم میرے بندے بن جاؤ'' بلکہ وہ کہتا ہے کہ تم اللہ والے بن جاؤ جیسے کہ تم سکھلاتے تھے کتاب اور جیسے کہ تم اسے خود بھی پڑھتے تھے۔''

داعیٔ حق خصوصاً انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام جنہیں اللہ تعالیٰ توحید کے پرچار، شرک کے خاتمے اور انسانیت کو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ توحید پر مبنی نظام کے مطابق زندگی گزارنے کا پابند بنانے کے لئے مبعوث کرتے ہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی بڑائی وعظمت کا پرچار شروع کردیں اور انسانیت کو رب العالمین کی تحمید وتقدیس بیان کرنے اور اس کی عبادت کرنے کی طرف بلانے کی بجائے انہیں اپنی پرستش کی دعوت دیں اور نہ یہ ان کا مقام ومرتبہ، منصب اور مقصود ہے۔

اسی طرح خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے جب بھی کوئی مخلص داعی، دعوتِ حقہ کو لے کر اٹھتا ہے تو معاندین اور مخالفین اس پر یہی الزام تراشی کرتے اور اس کے بارے میں اسی طرح کی باتیں پھیلاتے ہیں حالانکہ اس کا اپنی بڑائی اور اپنی امارت واقتدار قائم کرنا مقصود ومطلوب نہیں ہوتا اور نہ ہونا چاہئے، اس کے پیشِ نظر تو محض اللہ کی رضا کے حصول کیلئے انسانیت کو قرآنی نظام اور حکومتِ الٰہیہ کے قیام کیلئے کھڑا کرنا ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اقتدار وحکومت کی ایسی پیشکش کو ہرگز قبول نہیں کرتا جو ایسی شرائط کے ساتھ مشروط ہو جو اس کے مقصد کے منافی اور بنیادی اصول وضوابط سے ٹکرا رہی ہو چنانچہ وہ اصولوں پر کبھی بھی سمجھوتہ نہیں کرتا۔ اگر اس کا مقصد اپنی امارت اور حکومت قائم کرنا ہوتا تو وہ اپنے ہی بیان کردہ اصولوں کی پرواہ نہ کرتا اور انہیں پسِ پشت ڈالتے ہوئے ایوانِ اقتدار میں داخل ہو جاتا جیسا کہ موجودہ دور میں لبرل اور سیکولر (بے دین) سیاسی جماعتوں کی قیادت کرتی ہے کہ ہر صورت میں اقتدار اور حکومت حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتی ہے چاہے انہیں اپنی ہی طے کردہ اصولوں پر لات کیوں نہ مارنی پڑے، یہ اس لئے کہ ان کا مقصد اقتدار اور حکومت کا حصول ہے اصولوں اور نظریات کی کوئی حیثیت نہیں، وہ تو محض سیڑھی کی حیثیت رکھتے ہیں جنہیں وہ اقتدار تک پہنچنے کے لیے ذریعے کے طور پر استعمال کرتے ہیں، جب وہاں تک پہنچ جاتے ہیں تو اسے پھینک دیتے ہیں۔

امورِ دعوت میں رفقاء سے مشاورت

اذان سے متعلق ابن ہشام لکھتے ہیں:

فلما اطمأن رسول الله صلى الله عليه وسلم بالمدينة واجتمع اليه اخوانه من المهاجرين واجتمع امر الانصار استحكم امر الاسلام (السيرة لا بن هشام ج ۲،ص ۱۱۸)

''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں اطمینان نصیب ہو گیا، مہاجرین جمع ہو گئے، انصار کی اجتماعیت قائم ہو گئی اور اسلام مستحکم ہو گیا۔''

الغرض ایک حد تک استحکام ملنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں صحابہ کرام سے مشورہ کیا، جیسا کہ ابن ہشام لکھتے ہیں:

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کے درمیان لوگوں کو نماز کیلئے اکٹھا کرنے کیلئے ناقوس کے بارے میں مشاورت ہوئی۔ (السیرۃ لابن ہشام ج ۲،ص ۱۱۹)

عمر بن الخطابؓ ناقوس بنوانے کیلئے دو لکڑیاں خریدنا چاہتے تھے کہ انہوں نے ایک خواب دیکھا جس میں انہیں کہا گیا کہ ناقوس نہ بناؤ بلکہ نماز (کے لئے لوگوں کو جمع کرنے کیلئے) اذان دو۔ عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ خواب بتانے کے لئے آئے تو آپ کے پاس وحی آ چکی تھی، عمرؓ نے دیکھا کہ بلال اذان پڑھ رہے ہیں، جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا تو آپ نے فرمایا، اس بارے میں وحی تم سے سبقت کر چکی ہے۔

مدینہ میں دعوت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لانے کے بعد غزوات سے پہلے کیا کرتے رہے، اس کا اندازہ درج ذیل روایت سے لگایا جا سکتا ہے۔ حافظ ابن عبدالبرؒ لکھتے ہیں:

واقام رسول الله صلى الله عليه وسلم داعياً بالمدينة الى الله ومعلما مـاعلمه الله باقى شهر ربيع الاول الشهر الذى قدم فيه المدينة وباقى العام كله الى صفر من سنة اثنتين من الهجرة ثم خرج غازياًفى صفر المؤرخ. (الدّرر ص ۱۰۳)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں قیام پذیر ہونے کے بعد ربیع الاول کے جس مہینے میں مدینہ تشریف لائے تھے لوگوں کو دعوت الی اللہ دیتے اور احکامات الٰہیہ کی تعلیم دیتے رہے، یہ سلسلہ ہجرت کے دوسرے سال صفر کے مہینے تک جاری رہا، پھر صفر میں جہاد فی سبیل اللہ کے لئے نکلے۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ جب تک اقدام کا مرحلہ نہیں آتا تب تک دعوت اور تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رہے۔

باب ششم:

جہاد

مکہ میں جہاد

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ داعی ساری زندگی جہاد کرتا رہتا ہے۔ دعوت وتحریک کے ابتدائی زمانے میں تو وہ جہاد باللسان کرتا ہے البتہ آخری مرحلے میں جہاد بالسیف کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ ابن القیم آیت ''فَلَاتُـطِعِ الْكَافِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ'' (کافروں کی اطاعت نہ کیجیے اور ان سے جہاد نہ کیجیے) کے تحت مکی زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں:

الجهادفیهاهو التبلیغ و جهاد الحجة. (زاد المعاد جزء ۲ ص ۸۲)

''مکہ میں تبلیغ کرنا اور دلیل کے ساتھ بات کرنا جہاد تھا۔''

دعوت وتحریک کے ابتدائی زمانے میں تحریک کے افکار ونظریات کی دعوت دینا اور اس کے نتیجے میں پیش آنے والی مشکلات کو استقامت کے ساتھ برداشت کرنا بھی جہاد ہے۔ دعوت اور جہاد لازم وملزوم ہیں۔ اسی طرح انقلابی داعی بھی ہوتا ہے اور مجاہد بھی۔ دعوت کا آخری درجہ جہاد یعنی قتال بالسیف ہے اور قتال بالسیف کا مقصود اسلام کی دعوت پوری دنیا تک پہنچانا اور اسے غالب کرنا ہوتا ہے۔ انقلابی جب دعوت کے مرحلے میں ہوتا ہے تو وہ بالفعل (عملاً) داعی جبکہ بالقوۃ (صلاحیت اور استعداد کے حوالے سے) مجاہد ہوتا ہے کیونکہ وہ جہاد کی تیاری اور اس کے لیے راہ ہموار کر رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح جب وہ بالفعل (عملاً) جہاد کر رہا ہوتا ہے اس وقت وہ بالفعل داعی بھی ہوتا ہے، کیونکہ وہ اسلام کی طرف بھی دعوت دے رہا ہوتا ہے، لہٰذا دعوت اور جہاد لازم وملزوم ہیں۔ اسی طرح داعی اور مجاہد میں کوئی فرق اور منافاۃ نہیں ہے۔

مکہ میں قتال کی اجازت نہ ملنے کی وجہ

مکہ میں قتال کی اجازت کیوں نہیں دی گئی، علامہ حلبی اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مکہ کے زمانے میں صحابہ کرام مار کھا کر اور زخمی ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو انہیں فرماتے ''صبر اختیار کرو، مجھے (فی الحال) قتال کا حکم نہیں دیا گیا'' یہ اس لئے کہ یہ حضرات اس وقت مکہ میں کمزور اور قلیل تعداد میں تھے۔'' (السیر ۃ الحلبیۃ ج ا ص ۵۱۰)

ابن القیم لکھتے ہیں کہ بعض نے کہا کہ قتال کی اجازت مکی زندگی میں دی گئی۔ وہ اس کو غلط قرار دے کر دلائل دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''یہ کئی وجوہ سے غلط ہے ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مکہ میں قتال کی اجازت نہیں دی کیونکہ انہیں اتنی قوت حاصل نہ تھی جس کے بل پر وہ اہلِ مکہ سے قتال کر سکتے۔''

(زادالمعاد جزء۲ ص۸۲)

مکی زندگی میں قتال کی اجازت نہیں دی گئی اس لیے کہ مسلمانوں کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے فضا سازگار نہ تھی، پھر مناسب وقت پر اجازت دے دی گئی، چنانچہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

وانّما شرع اللہ تعالیٰ الجهاد فی الوقت الالیق به لانهّم لما کانوا بمکة کان المشرکون اکثر عدداً. (تفسیر ابن کثیر تفسیر سورۃ الحج)

''اللہ تعالیٰ نے جہاد کو اس کے مناسب وقت میں مشروع کیا، اس لئے کہ مسلمان جب مکہ میں تھے تو مشرکین کی اکثریت تھی۔''

وَاذْكُرُوْا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ (الانفال: ۲۶)

''اور (اس وقت کو) یاد کرو جب تم زمین (مکہ) قلیل اور کمزور سمجھے جاتے تھے اور ڈرتے رہتے تھے کہ لوگ تمہیں اڑا (نہ) لے جائیں تو اس نے تمہیں جگہ دی اور اپنی مدد سے تمہیں تقویت بخشی۔''

جب مسلمانوں کی تعداد کم تھی ااور نہیں کفار سے لڑنے کے لئے مطلوبہ جنگی طاقت بھی حاصل نہ تھی تو یہ صورت حال اس بات کی متقضی تھی کہ فی الحال قتال کا حکم نہ دیا جائے، جیسا کہ الشیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:

چون مشرکان در مکہ بسیار بودند ونوعی از غلبہ ہم داشتند ومسلمان کم بودند وخالی از ضعفی ہم نہ حکمت پروردگار تعالیٰ وتقدس اقتضا کرد تا خیر تشریع قتال را تا چوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بمدینہ آمد وجمع گشتند صحابہ وقائم شاند بنصرت وی تعالیٰ وگشت مدینہ برائے ایشاں ماوی وملجا ومستقل تشریع کرد جہاد باعداء دین۔ (مدارج النبوۃ ج۲ ص ۱۰۸)

''چونکہ مکہ میں مشرکین زیادہ تھے اورانہیں غلبہ حاصل تھا جبکہ مسلمان بہت کم ،خال خال اورکمزور تھے ،اس لئے اللہ رب العزت کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ قتال کے حکم کو مؤخر رکھا جائے یہاں تک کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے ،صحابہ کرامؓ کی جمعیت قائم ہوگئی ،اللہ تعالیٰ کی نصرت حاصل ہوگئی اوران کے لئے مدینہ ماوٰی وملجا بن گیا تو دشمنانِ دین کے ساتھ قتال کومستقل طور پر شروع کردیا گیا۔''

قتال کی اجازت کب دی گئی؟

چونکہ مکہ میں مسلمان قلیل تعداد میں تھے جو مشرکین مکہ سے قتال کرنے کی طاقت نہ رکھتے تھے ،اس لئے جب مدینہ میں عددی قوت میں اضافہ ہوگیا تو قتال کی اجازت دے دی گئی۔ابن کثیر امام شافعی کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

ولما مضت لرسول اللہ ﷺ مدة من هجرته انعم الله تعالیٰ فيها علیٰ جماعات باتباعه حدثت لهم بهامع عون الله عزوجلّ قوة بالعدد لم يكن قبلها ففرض الله عزوجل عليهم الجهاد بعد ان كان مباحاً لافرضاً (السيرة لا بن كثير ج ٢، ص ٥٨١)

''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کوایک مدت گزرگئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں کچھ گروہوں پر آپ کی اتباع کے ساتھ انعام فرمایا تو آپ کواللہ عزوجل کی مدد کے ساتھ عددی قوت حاصل ہوگئی جواس سے پہلے حاصل نہ تھی ،تب اللہ تعالیٰ نے قتال کے مباح قرار دیے جانے کے بعد ان پر جہاد فرض قرار دیا۔''

علامہ حلبی لکھتے ہیں:

ثم لما استقر امره صلى الله عليه وسلم أى بعد الهجرة وكثرت أتباعه وشاء نهم أن يقدموا محبته على محبة آبائهم وأبنائهم و أزواجهم واصرّ المشركون على الكفر والتكذيب أذن الله تعالى لنبيه ﷺ أى ولأ صحابه فى القتال

(السيرة الحلبية ج ا ،ص ٠ ١ ٥،ايضا زاد المعادجز ٢ص ٨١)

''پھر جب مدینہ میں ہجرت کے بعد آپ کے پاؤں جم گئے اورآپ کی اتباع کرنے والوں کی کثرت ہوگئی جن کی کیفیت یہ تھی کہ وہ آپ کی محبت کواپنے والدین ،اولاد اور بیویوں کی محبت پرترجیح دیتے تھے،مشرکین کفراورتکذیب پرمصر رہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اوران کے اصحاب کوقتال کی

اجازت دے دی۔''

یعنی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو مدینہ میں استحکام حاصل ہو گیا اور اللہ نے انصار کے ذریعے آپ کی مدد کی اور ان کے دلوں میں دشمنی اور کینہ پروری کے بعد آپس میں الفت ومحبت ڈال دی، وہ آپ کے لئے اپنی جانیں لٹانے پر تیار ہو گئے، آپ کی محبت کو آباؤ اجداد، اولاد اور بیویوں کی محبت پر ترجیح دینے لگے یہاں تک کہ آپ انہیں اپنی جانوں سے زیادہ محبوب ہو گئے، مکی زندگی میں اللہ تعالیٰ صبر، عفو و درگزر کرنے کا حکم دیتے رہے لیکن جب طاقت وقوت حاصل ہو گئی اور جہاد کی راہ ہموار ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے اس وقت قتال کی اجازت دے دی۔

حکمِ جہاد کی ترتیب

ابن القیم حکمِ جہاد کی ترتیب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

كان محرماً ثم ماذوناً ثم مامورًا به لمن بدأ لهم بالقتال ثم مأموراً به لجميع المشركين. (زادالمعاد جزء ٢ ص ٨٢)

''پہلے حرام تھا، پھر اس کی صرف اجازت دی گئی، پھر انہیں کفار سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا جو حملہ آور ہوں، پھر تمام مشرکین کے ساتھ (مطلق) قتال کا حکم دیا گیا۔''

دنیا دو حصوں میں تقسیم رہے گی

علامہ حلبی لکھتے ہیں کہ سورۃ براۃ کے نزول کے بعد کفار کی تین اقسام ہو گئیں۔ پہلی قسم میں وہ کفار شامل ہیں جو جنگ کر رہے ہوں۔ ان کا حکم یہ ہے:

هؤلاء المحاربون اذا كانوا ببلادهم يجب قتالهم على الكفاية فى كل عام مرة. (السيرة الحلبية ج ١، ص ١١٥)

''یہ جنگ کرنے والے جب اپنے علاقے تک محدود ہوں تو ان سے سال میں ایک مرتبہ قتال کرنا فرض کفایہ ہے۔''

دوسری قسم جن کفار سے بغیر جزیہ کے امن کا معاہدہ ہوا اور تیسری قسم جن پر جزیہ مقرر کیا گیا ہو، یعنی انہیں ذمی بنالیا گیا۔

مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں اور کفار کے درمیان تعلقات کی نوعیت انہیں تین چیزوں کی بنیاد پر ہوگی۔ ان کے علاوہ کوئی چوتھی چیز نہیں ہے۔ گویا اب دنیا دو حصوں میں تقسیم رہے گی، مسلم اور غیر مسلم

،ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا حصہ نہیں ہے۔ارشادِ ربانی ہے:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ وَّمِنْ كَافِرٌ

اسلامی انقلابی تحریک کو یہ امور پیشِ نظر رکھنا ہوں گے اور انہیں کی بنیاد پر عصرِ حاضر میں مروجہ ملکی اور بین الاقوامی قوانین اور اصولوں کو دیکھنا ہوگا۔اگر یہ قوانین اور اصول اسلامی جہاد کے مذکورہ اصولوں سے ٹکرا رہے ہیں (جیسا کہ واضح طور پر ٹکرا رہے ہیں) تو ان پر غور کرنا ہوگا اور اسلامی سیاستِ خارجہ کے اصولوں کو اپنانا ہوگا جہاد کے اصولوں پر عمل پیرا ہوتے ہوئے دعوت وجہاد کو پوری دنیا میں جاری کرنا ہوگا چاہے ''عالمی برادری'' اس کی مخالفت کرے یا متحدہ محاذ بنا کر اسلامی حکومت سے برسرِ پیکار ہوجائے۔(جیسا کہ ماضی قریب میں افغانستان کی ''امارتِ اسلامیہ'' کے ساتھ برتاؤ کیا گیا)۔

حکمتِ جہاد

اللہ تبارک وتعالیٰ نے کفار سے جہاد کرنے کو کیوں فرض قرار دیا ہے؟ علامہ حلبیؒ آیت ﴿وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ﴾ (اللہ تعالیٰ ان کی نصرت کرنے پر قادر ہے) کی تشریح کرتے ہوئے اس کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں:

أی فكان ذلک القتال عوضا من العذاب الذی عوملت به الأمم السالفة لما كذبت رسلهم.(السیرة الحلبیه ج ۱ ص ۱۰۵)

''یعنی قتال اس عذاب کے بدلے میں ہے جس میں پہلی امتوں کو رسولوں کو جھٹلانے کی وجہ سے مبتلا کیا گیا۔''

ابن العربی لکھتے ہیں:

بیّنا ان الله تعالیٰ سبحانه لما بعث محمداً صلی الله علیه وسلم بالحجة دعا قومه الی الله دعاءً دائماً عشرة اعوام لاقامة حجة الله تعالیٰ سبحانه و وفاء بوعده الذی امتن به بفضله فی قوله ''وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلاً. (الاسراء:۱۵) واستمّر الناس فی الطغیان وما استدلّوا بواضح البرهان وحین اعذر الله بذلک الی الخلق وابواعن الصدق امر رسوله بالقتال لیتخرج الاقرار بالحق منهم بالسیف.(احکام لابن العربی تفسیر سورة الحج آیت:۳۹)

''ہم یہ بات بیان کر چکے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دلیل کے ساتھ

(قرآن) مبعوث کیا تو آپ دس سال تک مسلسل اپنی قوم کو (اعلانیہ) دعوت الی اللہ دیتے رہے تا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حجت قائم ہو جائے اور اس کا یہ وعدہ جس کے ساتھ فضل اور احسان فرمایا ہے وہ پورا ہو، ارشاد خداوندی ہے ''ہم اس وقت تک عذاب نہیں دیتے جب تک رسول نہ بھیجیں'' لوگ سرکشی و گمراہی میں ہی رہے اور واضح دلائل کو قبول نہ کیا، جب اللہ نے مخلوق پر حجت قائم کر دی اور ان کا عذر ختم ہو گیا اور انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا تو اپنے رسول کو قتال کا حکم دیا تا کہ تلوار کے ذریعے ان سے حق کا اقرار کروایا جائے۔''

مذکورہ اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سنتِ الٰہیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کی اصلاح اور ہدایت کے لئے انبیاء اور رسول بھیجتے ہیں۔ وہ ایک عرصے تک لوگوں کو دعوت الی اللہ دیتے رہتے ہیں اور اس بات کی بھر پور کوشش کرتے ہیں بلکہ اپنی جان کھپا دیتے ہیں کہ لوگ صراطِ مستقیم پر آ جائیں چنانچہ بعض سلیم الفطرت لوگ تو دعوت قبول کر لیتے ہیں جبکہ اکثریت قبولِ حق سے انکار کر دیتی ہے، انبیاء کی تکذیب کرتی، انہیں طعن وتشنیع اور استہزاء کا نشانہ بناتی اور ان پر اور ان کے پیروکاروں پر ظلم وستم ڈھاتی ہے حتی کہ انہیں جان سے مارنے سے بھی دریغ نہیں کرتی تو اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ اس قوم کو عذاب دینے کا فیصلہ کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مشرکین مکہ اور دیگر قبائل کو مسلسل دعوت دیتے رہے، اگر چہ ایک جماعت نے آپ کی پیروی کی لیکن اکثریت نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، آپ کو اور آپ کے اصحاب کو جبر وتشدد کا نشانہ بنایا اور انہیں اپنا گھر بار، خاندان، قوم اور علاقہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تو ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم دیا تا کہ وہ لوگ جو اسلام کی اشاعت وتبلیغ اور اس کی مقبولیت میں رکاوٹ بن رہے ہیں انہیں راستے سے ہٹا کر اس کی راہ ہموار کر دی جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ نے جہاد کر کے مشرکین مکہ کو تہ تیغ کیا، پھر دیگر قبائل سے بھی جہاد کر کے اسلام قبول کرنے کی راہ میں رکاوٹ ختم کر دی، یہی وجہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد پورے جزیرۂ عرب سے قبائل کے وفود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے الشیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

''مروی ہے کہ (فتح کے بعد) جب قیدیوں کو گردنوں میں طوق اور پاؤں میں زنجیریں ڈال کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان کا عجیب حال رکھا

ہے کہ انہیں طوق اور زنجیروں کے ذریعے جنت کی طرف کھینچ کر لاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ از خود مسلمان ہونا نہیں چاہتے تا کہ اس طرح جنت میں داخل ہوں، اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں بزورِ قوت باندھ کر اپنی بارگاہ میں لاتا ہے اور انہیں جنت میں داخل کرتا ہے۔ تمام تکالیف شرعیہ (احکام) کا بھی یہی حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو مکلّف کر کے انہیں ان کا مقید (پابند) بنا دیتا ہے اور اس طرح اپنی بارگاہ میں لاتا اور جنت میں داخل کرتا ہے۔'' (مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۱۳۵)

غلبہءدین

چونکہ دنیا کے تمام ادیان اور نظام ہائے حیات پر غلبۂ اسلام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا مقصد ہے اور یہ اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک بھرپور طریقے سے دعوت وجہاد کا فریضہ منظم انداز میں انجام نہ دیا جائے۔ ارشادِ ربانی ہے:

هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (الصف: ۹)

''وہ اللہ ایسا ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تا کہ وہ اس دین کو تمام ادیانِ باطلہ پر غالب رکھے اگرچہ مشرک کتنا ہی برا مانیں۔''

امام اہلسنّت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنویؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''ارشاد فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے مقصود یہ ہے کہ تمام دینوں پر غالب کر دیا جائے۔ پس اس آیت میں اگر سمجھنے کی کوئی چیز ہے تو یہ ہے کہ غالب کر دینے سے کیا مراد ہے؟ غلبہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ دلیل میں غالب کیا جائے یعنی دینِ حق کی حقانیت پر اور دوسرے دینوں کے بطلان پر ایسی دلیل قائم کی جائے جس کا رد نہ ہو سکے۔ دوسرے یہ کہ تیغ وسناں کے ذریعے سے غالب کیا جائے۔ یعنی دینِ برحق کی شوکت وسطوت کے سامنے تمام مذاہب کو سرنگوں کر دیا جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ دونوں قسم کا غلبہ مراد ہے۔'' (تحفہ خلافت ص ۵۲۰)

دعوتِ حقہ کی ایک عرصے تک اشاعت اور دعوت قبول کرنے والے افراد کی تعلیم وتربیت کر کے انہیں مروج باطل نظام کے خلاف اقدام کر کے صالح نظام کے نفاذ کے لیے تیار کرنے کے بعد اس امر کی شدید ضرورت ہوتی ہے کہ مخالف قوتوں سے ٹکرا کر فاسد نظام کے پشت پناہوں سے قوت اور اقتدار چھین لیا جائے، لیکن چونکہ مخالف قوتیں فاسد نظام کے تحفظ کے لیے ہر ممکن ذریعہ استعمال کرتی

ہیں حتیٰ کہ داعیوں اور انقلابیوں کے خلاف طاقت کا استعمال کرتے ہوئے ان کا قتل عام کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتیں اس لیے داعیوں اور انقلابیوں کے لیے یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ وہ مجاہد بن کر ان قوتوں کے خلاف قوت کا استعمال کرتے ہوئے انہیں راستے سے ہٹائیں۔ مکہ میں تیرہ سال اور مدینہ میں ایک سال سے زائد عرصے تک دعوتی سلسلہ جاری رہنے کے بعد اس امر کا وقت آ چکا تھا کہ غلبۂ دین اور اعلاء کلمہ اللہ کے لیے تلوار اٹھائی جائے۔

سرایا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے۔ آپ نے جہاں مدینہ میں ایک نظم قائم فرمایا اور اسے محفوظ کردیا تھا وہاں مضافات مدینہ کو بھی محفوظ اور پرامن رکھنے کی کوششیں شروع کردیں۔ مہاجرین وانصار کے درمیان مواخاۃ اور یہود سے میثاق کے بعد آپ نے چھوٹے چھوٹے لشکر مدینہ کے اطراف کے قبائل میں بھیجے، خصوصاً قریش کے تجارتی راستے کی نگرانی کے لئے کئی لشکر بھیجے مضافات مدینہ لشکر بھیجنے کے کئی مقاصد تھے:

۱۔ قبائل کو دعوتِ اسلام دے کر اپنا حلیف ومعاون بنانا۔

۲۔ مضافات کے قبائل میں اپنی حربی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی جنگی طاقت کا اندازہ کرنا۔

۳۔ ان سے امن کے معاہدے کرنا۔

۴۔ ان سے یہ عہد لینا کہ اگر مشرکین مکہ مدینہ پر حملہ آور ہوئے تو وہ ان کا ساتھ نہ دیں گے۔

جہاد کی تیاری

ابن ہشام ابن اسحاق کے حوالے سے غزوۂ ودان اور سریہ عبیدہ بن الحارث کے ذکر سے بھی پہلے لکھتے ہیں:

ثم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھیأ لحربہ وقام فیما امرہ اللہ بہ من جہاد عدوہ وقتال من امرہٗ اللہ تعالیٰ بہ ممن یلیہ من المشرکین، مشرکی العرب وذلک بعد ان بعثہ اللہ تعالیٰ بثلاث عشرۃ سنۃ. (السیرۃ لابن ہشام: ج ۲، ص ۱۸۶)

''پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ کیلئے تیار ہو گئے اور دشمن سے جہاد کے اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے کیلئے اور مشرکین میں سے جو آپ کے قریب ہیں یعنی مشرکینِ عرب ان سے قتال کے لئے اٹھ

کھڑے ہوئے اور یہ (حکم) بعثت کے بعد تیرھویں سال کا ہے۔"

یعنی مکہ میں تیرہ سال دعوت دینے اور ہجرت کرنے کے بعد اب وقت آگیا تھا کہ دشمنانِ اسلام سے جہاد وقتال کیا جائے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لئے تیار ہو چکے تھے جس کی ابتدا آپ نے قریبی مشرکینِ عرب سے کی۔

جہاد سے لگاؤ

قتال کا حکم نازل ہونے کے بعد صحابہ کرامؓ نے اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد وقتال میں بے پناہ قربانیاں دیں جس کی ماضی میں مثال نہیں ملتی۔ غلبۂ دین کے لئے جہاد وقتال سے ان کا جو تعلق، محبت اور وارفتگی تھی اس کا درج ذیل روایت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک غزوہ سے واپس آئے۔ مسجد میں نوافل پڑھنے کے بعد حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے گئے، انہوں نے آپ کے چہرے اور آنکھوں کو چومتے ہوئے رونا شروع کر دیا۔ آپ نے پوچھا کیوں روتی ہو؟ انہوں نے جواب دیا:

اراک یارسول اللہ قدشحب لونک واخلولقت ثیابک (حیاۃ الصحابہ ج ا ص ۳۴)

"اے اللہ کے رسول! میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ کا رنگ تبدیل ہوگیا اور کپڑے پرانے ہو چکے ہیں۔"

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

ان اباطلحۃ لم یکن یکثر من الصوم فی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بسبب الغزو فلما مات صلی اللہ علیہ وسلم سرد الصوم. (السیرۃ الحلبیۃ ج ا، ص ۴۷۹)

"ابوطلحہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جہاد میں شرکت کی وجہ سے کثرت سے روزے رکھتے تھے، جب آپ وفات پا چکے تو انہوں نے لگاتار روزے رکھنا شروع کر دیے۔"

پہلا غزوہ

ابن ہشام غزوۂ ودان جسے غزوۃ الابواء بھی کہا جاتا ہے کو پہلا غزوہ قرار دیتے ہیں۔

ابن اسحاق کے نزدیک آپ مدینہ ہجرت کے بارھویں مہینے یعنی صفر میں اس کیلئے نکلے اور آپ کا عزم یہ تھا:

یرید قریشا وبنی ضمرۃ بن بکر بن عبد مناف بن کنانۃ. (ایضاً)

"آپ قریش اور بنی ضمرہ بن بکر سے مقابلے کا ارادہ رکھتے تھے۔"

ابن اسحٰق کے نزدیک اس میں جنگ کی نوبت نہیں آئی البتہ قبیلہ بنوضمرہ سے معاہدہ ہوگیا۔

عسکری امور میں بھرپور شرکت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب ۲ھ میں بارہ مہاجرین پر مشتمل ایک دستہ حضرت عبداللہ بن جحش کی امارت میں روانہ فرمایا اور انہیں ایک تحریر لکھ کر دیتے ہوئے یہ ہدایت فرمائی کہ دودن کی مسافت طے کر لینے کے بعد اسے کھول کر پڑھیں اور اس میں درج شدہ ہدایات پر عمل پیرا ہوں۔ جب لشکر دودن کی مسافت طے کر چکا تو امیرِ سریہ عبداللہ بن جحش نے حکمِ نبوی کے مطابق خط کھول کر پڑھا جس میں یہ تحریر تھا:

''جب تم یہ رقعہ پڑھو تو آگے چل پڑو اور مکہ اور طائف کے درمیان مقامِ نخلہ میں پڑاؤ کرو، یہاں قریش کے ایک قافلے کی گھات لگاؤ اور ہمارے لئے ان کی خبریں لاؤ۔'' (السیرۃ لابن ہشام ۲/۱۹۵)

امیرِ سریہ نے یہ خط پڑھا اور صحابہ کرام سے مخاطب ہو کر کہا ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں مقامِ نخلہ پر جا کر پڑاؤ کروں اور وہاں قریش کے ایک قافلے کی گھات لگا کر ان کے پاس ان کی خبریں لے جاؤں، آپ نے مجھے اس سے منع کیا ہے کہ میں تم میں سے کسی کو مجبور کروں۔'' پھر کہا

فمن کان منکم یرید الشھادۃ ویرغب فیھا فلینطلق ومن کرہ ذلک فلیرجع؟ فامّا انا فماض لامر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فمضیٰ ومضیٰ مع اصحابہ لم یتخلف عنہ منھم احدٌ. (السیرۃ لا بن ھشام، ج ۲، ص ۱۹۵، ۱۹۶،)

''تم میں سے جو شہادت کا ارادہ اور اس کا شوق رکھتا ہو وہ چلے اور جسے یہ بات قبول نہ ہو وہ واپس چلا جائے۔ باقی میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو پورا کروں گا۔ یہ کہہ کر وہ چل پڑے اور ان کے ساتھی بھی ساتھ چل پڑے اور ایک بھی پیچھے نہیں رہا۔''

داعی جو قتال شروع ہونے کے بعد مجاہد بن چکا ہوتا ہے، وہ جس طرح دعوت وتبلیغ میں بھرپور جدوجہد کرتا رہا ہے، اسی طرح عسکری امور میں بھی اسے بھرپور طریقے سے شرکت کرنی چاہئے اور پیچھے نہیں رہنا چاہئے۔

تحریکِ انقلاب کا ایک اہم موڑ

انقلابی تحریک میں ایک ایسا اہم موڑ آتا ہے جب اس کے مخالفین اس کے خلاف باقاعدہ لڑائی شروع کرتے ہیں اور اسے جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ایسا مرحلہ ہوتا ہے کہ اگر انقلابی اور مجاہدین شکست کھا جائیں تو آئندہ ایک طویل عرصے تک اس طرح کی تحریک کے امکانات معدوم

ہوتے نظر آتے ہیں اور اگر مخالفین کو شکست ہو جائے تو انہیں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اس دعوت اور تحریک کو دیگر حربوں کی طرح جنگ اور لڑائی کے ذریعے بھی ناکام یا ختم نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا ان کی ہمتیں ٹوٹ جاتی ہیں اور وہ آئندہ اس طرح کے اقدام سے قبل کئی بار اس کے بارے میں سوچتے ہیں، جبکہ دوسری طرف فتح اور کامیابی کے بعد اہل حق کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں اور انہیں اپنی دعوت کی کامیابی کا یقین ہو جاتا ہے۔

غزوۂ بدر ایسا ہی موڑ تھا، اس موقع پر سردارانِ قریش خصوصاً ابو جہل اور اس کے ہمنوا اسلام اور اہلِ اسلام کو میدانِ جنگ میں نیست و نابود کرنے کا عزم لے کر مکہ سے روانہ ہوئے تھے اور اپنے سرداروں کے واپس لوٹ جانے کے مشورے کو بھی مسترد کر دیا تھا، ادھر اہل اسلام کو پہلی بار با قاعدہ میدانِ کارزار میں کفار سے دو دو ہاتھ کرنا پڑ رہے تھے جبکہ جنگی و حربی آلات اور لشکروں کی تعداد میں بہت بڑا فرق تھا بلکہ کوئی نسبت ہی نہ تھی، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتحیاب کر کے اہل کفر کے استیصال کی بنیاد رکھ دی۔ غزوہ بدر سے پہلے جو سرایا بھیجے گئے یا غزوات ہوئے یہ عمومی لڑائی یا جھڑپیں تھیں، با قاعدہ جنگ نہ تھی۔ غزوہ بدر پہلا غزوہ ہے جس میں داعیانِ حق اور اہل باطل (مشرکینِ مکہ) کھلم کھلا آمنے سامنے آئے اور با قاعدہ جنگ ہوئی، جس میں فدائیانِ اسلام کو فتح نصیب ہوئی اور مشرکین مکہ عبرتناک شکست سے دوچار ہوئے۔ ان کی قوت ٹوٹ گئی اور وہ یہ جان گئے کہ دعوتِ توحید کو جنگ اور طاقت سے دبانا آسان نہیں اور نہ ہی اس طرح مسلمانوں کو زیر کیا جا سکتا ہے اور نہ انہیں ان کے دعوے اور عزائم سے باز رکھا جا سکتا ہے۔ وہ سمجھ گئے کہ دین اسلام غالب ہو کر رہے گا۔ غزوۂ بدر کی اہمیت کے بارے میں حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھویؒ لکھتے ہیں:

وھی الواقعۃ العظمیٰ التی اعز اللہ بھا الاسلام وقلع بھا الکفر واھلہ.

(بذل القوۃ ص ۷۴)

''یہ وہ عظیم واقعہ ہے جس کی بدولت اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غالب کیا اور کفر اور اہلِ کفر کا قلع قمع کر دیا۔''

اسی طرح واقدی لکھتے ہیں:

کانت اول غزوۃ اعزّ اللہ فیھا الاسلام واذلّ فیھا اھل الشرک. (کتاب المغازی ۲۱/۱)

''یہ پہلا غزوہ تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غالب کیا اور اہل شرک کو ذلت و رسوائی سے

دوچار کیا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شام سے لوٹنے والے قافلے پر حملے کیلئے تیاری کر چکے تھے۔ابوسفیانؓ قافلہ لے کر حجاز کے قریب پہنچے تو انہیں جاسوسوں کے ذریعے اطلاع ملی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قافلہ پر حملے کیلئے آ رہے ہیں۔''ابوسفیان جب حجاز کے قریب پہنچ گئے تو انہوں نے حالات کے متعلق معلوم کیا تو بتایا گیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے صحابہ کو تمہارے قافلے پر حملہ آور ہونے کیلئے لا رہے ہیں، تب وہ خوفزدہ ہو گئے۔'' (السیرۃ لابن ہشام ج ۲، ص ۱۹۹)

انہوں نے فوراً مکہ قاصد بھیج کر قریش کو اس کی اطلاع دی اور انہیں اپنا قافلہ بچانے کا کہا۔ (مغازی رسول اللہ لعروۃ بن الزبیر ص ۱۳۲)

جب ابوسفیان اپنے قافلے سمیت بچ نکلے تو مکہ اپنا قاصد بھیجا اور انہیں واپس لوٹ جانے کا پیغام دیتے ہوئے کہا کہ'' تمہارا قافلہ بچ نکلا ہے، لہٰذا تم اپنے آپ کو اہل یثرب (مسلمانوں) کے سامنے ذبح ہونے کیلئے مت پیش کرو۔ تمہیں اس (قافلہ) کے علاوہ کوئی ضرورت نہیں۔ تم تو صرف اپنے قافلے اور اموال کے دفاع وتحفظ کیلئے نکلے اور اسے اللہ نے نجات دے دی ہے۔''

(کتاب المغازی للواقدی اول ص ۴۳)

ابوجہل پر قوت وشوکت کا بھوت سوار تھا۔ وہ کسی بہانے مسلمانوں کے ساتھ جنگ کر کے اپنی حربی طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے واپس جانے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ'' ہم بدر تک ضرور جائیں گے (بدر میں ہر سال بازار لگتا تھا)۔ وہاں ہم تین دن ٹھہر کر خوب کھائیں پئیں گے، شراب پئیں گے۔ یہاں آنے والے عرب ہمارے لشکر اور حربی طاقت اور شان وشوکت دیکھیں گے۔ اس طرح ان پر ہماری طاقت کا رعب بیٹھ جائے گا، ہماری طاقت کی پورے عرب میں شہرت ہو جائے گی''۔ یہ کہہ کر وہ لشکر کو لے کر آگے بڑھ گیا۔

صحابہ کرامؓ کا جذبۂ ایثار

کوئی بھی تحریک، ارکان کی قربانی اور ایثار کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی، ارکان کے جذبۂ ایثار اور اپنے مشن کے لئے جان دینے کی تڑپ کی وجہ سے ہی تحریک آگے بڑھتی اور کامیابی کے مراحل طے کرتی جاتی ہے۔ حضرت مخدوم محمد ہاشم لکھتے ہیں کہ'' ہجرت کے دوسرے سال غزوہ بدر سے کچھ پہلے راستے میں جب روحاء سے چل کر صفراء کے قریب پہنچے تو آپ مشرکین کے مکہ سے نکلنے کی اطلاع ملی

جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑائی کے لئے تیار ہو کر آ رہے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قافلے پر حملے کے لئے مہاجرین صحابہ کرامؓ سے مشورہ طلب کیا کہ ''مشرکین کے ساتھ جنگ لڑی جائے یا نہیں؟ (بذل القوۃ ص ۱۲۰)

مہاجرین میں سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے جنگ کرنے کی تائید کی دونوں حضرات کی طرف سے تائید وتصویب کے بعد آپ انصار کی طرف متوجہ ہوئے تو سعد بن معاذ ؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ ہم آپ کے ساتھ ہیں جو حکم دیں گے ہم اس پر عمل پیرا ہونے کیلئے تیار ہیں۔'' پھر انہوں نے یہ تاریخی الفاظ کہے:

والذی نفسی بیدہ لو امرتنا ان نخضینا البحر لاخضناھا ولو امرتنا ان نضرب اکبادھا الیٰ برک الغماد لفعلنا. (صحیح المسلم کتاب الجھاد والسیر باب غزوۃ بدر ایضاً مصنف ابن ابی شیبه کتاب المغازی باب غزوۃ بدر الکبری)

''اگر آپ ہمیں سمندر میں کودنے کو حکم فرمائیں تو ہم کود جائیں گے اور اگر آپ ہمیں برک غماد تک جانے کا حکم دیں تو ہم ضرور حکم کی تعمیل کریں گے۔''

حضرت مخدوم محمد ہاشم نے حضرت سعد بن معاذ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

لقد آمنا بک و صدقناک وشھدنا انّ ماجئت به الحق واعطیناک مواثیقنا علی السمع والطاعة فامض یا رسول اللہ لما اردت فنحن معک. (بذل القوۃ ص ۱۲۰)

''ہم آپ پر ایمان لا چکے، آپ کی تصدیق کر چکے اور اس بات کی گواہی دے چکے ہیں کہ آپ حق بات لائے ہیں۔ ہم آپ سے سمع وطاعت کا عہد و پیمان کر چکے ہیں، لہٰذا اے رسول اللہ! آپ کا جو ارادہ ہو کریں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ جب دعوتِ حق قبول کر کے انقلابی تحریک میں شمولیت اختیار کر لی گئی اور قائد تحریک کے ہاتھ پر بیعت کر کے سمع وطاعت کا عہد و پیمان کر لیا گیا تو تحریک کے ہر مرحلے خصوصاً عسکری امور میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جائے، امیر کی اطاعت وفرمانبرداری کی جائے، ہر موڑ پر اس کا مکمل ساتھ دیا جائے، اس کا پشت پناہ بنا جائے اور کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کیا جائے۔ حتیٰ کہ اگر انہیں سمندر میں کودنے کو حکم بھی ملے تو وہ برضا ورغبت اس کی تعمیل کریں۔ جیسا کہ سعد بن معاذؓ صحابہ کرام کے جذبات کی ترجمانی کر رہے تھے۔

اسی طرح حضرت مقداد نے عرض کیا:

لانقول کما قال قوم موسیٰ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ، ولکنا نقاتل عن یمینک و عن شمالک و بین یدیک و خلفک فرأیت النبی ﷺ اشرق وجه وسرّه.(صحیح بخاری کتاب المغازی باب قول الله (اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ)

''ہم قومِ موسیٰ کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ'' جاؤ تم اور تمہارا رب قتال کرو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں'' بلکہ ہم تو آپ کے دائیں، بائیں، آگے پیچھے رہ کر قتال کریں گے،(راوی کہتے ہیں) میں نے دیکھا کہ آپ کا چہرہ چمک اٹھا اور آپ مسرور ہو گئے۔''

انقلابی تحریک کے ارکانِ کی تحریک کے ساتھ اس قدر لگن، وابستگی اور دل میں غلبۂ دین کی اس قدر تڑپ ہو کہ وہ اس کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہوں وہ امیر تحریک کے حکم جہاد کرنے پر جان لڑانے کے لئے اس کے شانہ بشانہ ہوں، وہ امیرِ تحریک اور مرکزی قیادت کے تحفظ ودفاع کی خاطر ہر ممکن کوشش کریں جیسا کہ حضرت مقداد صحابہ کرامؓ کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرر ہے تھے کہ اے اللہ کے رسول! ہم ہر جگہ آپ کے ساتھ ہیں اور آگے پیچھے، دائیں بائیں الغرض ہر طرف سے لڑیں گے۔

امیر کو صاحبِ رائے مجاہدین کی رائے قبول کرنی چاہئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قریب ایک جگہ پڑاؤ کیا تو خباب بن منذر بن الجموح نے عرض کیا کہ''اے اللہ کے رسول! اس منزل پر ہمارا پڑاؤ اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق ہے جس میں تقدیم وتاخیر (ردوبدل) کا ہمیں کوئی اختیار نہیں یا یہ آپ کی ذاتی رائے، جنگی حکمت عملی اور تدبیر کے تحت ہے؟'' آپ نے جواب دیا:

بل هو الرأی والحرب والمیکدة . (نہیں بلکہ یہ تدبیر اور جنگی حکمت عملی کے تحت ہے)

خباب نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا، یہاں پڑاؤ کرنا درست نہیں، آپ لوگوں کو آگے چلنے کا حکم دیں اور فلاں کنویں کے پاس پڑاؤ کریں، ہم وہاں ایک حوض بنا کر اسے پانی سے بھر لیں گے، جب دشمن سے لڑائی ہوگی تو ہم تو پانی پیتے رہیں گے لیکن وہ نہ پی سکیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا:

لقد اشرت بالرأی.(السیرة لا بن هشام ج ۲، ص ۲۱۰)

''تم نے اچھی رائے دی۔''

علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

فاستحسن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ذلک من رأیہ وفعل مااشار بہ .

(تاریخ الاسلام ج ۱ ص ۲۷)

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رائے کی تحسین کی اور ان کے مشورے پر عمل درآمد کیا۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ جن امور کا تعلق حکمت و مصلحت اور انتظامی امور سے ہو، ان میں تحریک وجہاد میں شامل ماہرین سے رائے طلب کرنی چاہیے اور اگر یہ ماہرین مشورہ طلب کیے بغیر بھی اپنی رائے کا اظہار کریں تو نہ صرف اسے سنا جائے بلکہ فی الواقع معقول ہو تو اس کی تحسین اور حوصلہ افزائی کرنے کے ساتھ اس پر عمل درآمد کرنا چاہیے۔ امیر اور مرکزی قیادت کو ماہرین سے مشورہ کرنے اور ان سے رائے لینے میں کوئی عار نہیں ہونی چاہئے اور نہ اس میں سستی وکاہلی اور لاپروائی کا مظاہرہ کرنا چاہئے، ہاں ان کی رائے پر عمل کرنا ان کی صوابدید پر ہے۔

قریش سے یا سارے عرب سے لڑائی

لڑائی سے پہلے حکیم بن حزام (جو بعد میں مسلمان ہوگئے تھے) عتبہ بن ربیعہ کے پاس آئے اور اسے واپسی پر آمادہ کیا۔ عتبہ اس پر تیار ہوگیا اور قریش سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''قریش کے لوگو! تم لوگ محمدؐ اور ان کے ساتھیوں سے لڑ کر کوئی کارنامہ انجام نہ دو گے۔ خدا کی قسم اگر تم نے انہیں مار لیا تو صرف ایسے ہی چہرے دکھائی دیں گے جنہیں دیکھنا پسند نہ ہوگا، کیونکہ آدمی نے اپنے چچازاد بھائی کو یا خالہ زاد بھائی کو یا اپنے ہی کنبے قبیلے کے کسی آدمی کو قتل کیا ہوگا۔'' پھر تجویز دی:

فارجعوا وخلّوا بین محمد وبین سائر العرب فان اصابوہ فذلک وان کان غیر ذلک الفاکم ولم تعرّضو امنہ ماتریدون. (تاریخ الاسلام ج ۱ ص ۲۹)

''واپس چلے چلو اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور سارے عرب سے کنارہ کش ہو رہو۔ اگر عرب نے انہیں مار لیا تو یہ وہی چیز ہوگی جسے تم چاہتے ہو، اور اگر دوسری صورت پیش آئی (کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم غالب آگئے اور تم مغلوب ہوگئے) تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہیں اس حالت میں پائیں گے کہ تم نے جو سلوک ان سے کرنا چاہا تھا اسے کیا نہ تھا۔''

حکیم بن حزام ابوجہل کے پاس پہنچے اور عتبہ بن ربیعہ کا پیغام پہنچایا تو اس نے رد کرتے ہوئے کہا:

''خدا کی قسم! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر عتبہ کا سینہ سُوج آیا ،نہیں ہرگز نہیں ۔ بخدا! ہم واپس نہ ہوں گے یہاں تک کہ خدا ہمارے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان فیصلہ فرما دے۔ عتبہ نے جو کچھ کہا ہے محض اس لیے کہا ہے کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے ساتھیوں کو اونٹ خور سمجھتا ہے اور خود عتبہ کا بیٹا انہیں کے درمیان ہے، اس لیے وہ تمہیں ان سے ڈراتا ہے۔'' (ابن ھشام ج ۲ ص ۲۱۳)

دعاءِ نصرت

حضرت ابن عباس، حضرت عمر بن خطاب سے روایت کرتے ہیں کہ جب غزوۂ بدر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب اور مشرکین کی تعداد میں تفاوت دیکھا تو قبلہ رخ ہو کر دعا کیلئے متوجہ ہوئے آہ وزاری کرتے ہوئے یہ دعا کی:

اللھم أنجز لی ما وعدتنی، اللھم إن تھلک ھذہ العصابة من أھل الاسلام لا تعبد فی الأرض أبدا.

''اے اللہ آپ نے مجھ سے (نصرت کا) جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کیجئے ،اے اللہ! اگر اہل اسلام کی یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو دنیا میں کبھی بھی تیری عبادت نہ کی جائے گی''۔

حضرت الفاروق فرماتے ہیں کہ'' آپ مسلسل اللہ رب العزت سے مدد طلب کرتے اور دعا کرتے رہے یہاں تک کہ آپ کی چادر (کندھوں سے) گر پڑی۔''ابو بکر نے چادر لے کر آپ کو اُوڑھائی اور عرض کیا:

''اے اللہ کے نبی! آپ کی اپنے رب سے الحاج وزاری کافی ہو چکی ،وہ آپ سے کئے گئے وعدہ کو عنقریب پورا کریں گے۔'' (مصنف ابن ابی شیبہ کتاب المغازی باب غزوۃ بدر الکبری)

ترغیبِ جہاد

چبوترے میں مذکورہ دعا کرنے کے بعد آپ لشکر کی طرف تشریف لائے اور فدائیانِ اسلام سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا:

والذی نفس محمد بیدہ لا یقاتلھم الیوم رجل فیقتل صابراً محتسباً مقبلاً غیر مدبر الّا ادخلہ اللہ الجنة. (السیرۃ لابن ھشام ج ۲ ص ۲۱۶)

''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ آج جو آدمی بھی ان (مشرکینِ مکہ) سے

ثابت قدمی کے ساتھ، اللہ کی رضا کی نیت سے اور پیش قدمی کرتے ہوئے نہ کہ پیٹھ پھیرتے ہوئے قتال کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کریں گے۔''

جوش وخروش

عمیر بن الحام جن کے ہاتھ میں کھجوریں تھیں اور وہ انہیں کھا رہے تھے انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنا تو کہا:

بخ بخ، افما بینی و بین ان ادخل الجنة الّا ان یقتلنی هو لاء.

(السیرة لا بن هشام ج ۲، ص ۲۱۶)

''واہ واہ! میرے اور جنت میں داخل ہونے کے مابین صرف اس بات کا فاصلہ ہے کہ یہ لوگ (مشرکین) مجھے قتل کردیں۔''

امام مسلم روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا تم بخ بخ (خوب خوب) کیوں کہہ رہے ہو اس پر انہوں نے عرض کیا:

''اللہ کی قسم اے اللہ کے رسول! میں یہ اس امید پر کہہ رہا ہوں کہ میں اس (جنت) میں داخل ہونے والوں میں شامل ہو جاؤں۔''

آپ نے فرمایا ''ہاں تم ان میں سے ہو۔'' اس پر انہوں نے کہا کہ اگر میں یہ کھجوریں کھاتا رہا پھر تو زندگی طویل ہو جائے گی۔ یہ کہہ کر انہوں نے کھجوریں پھینکیں اور لڑنا شروع کردیا حتیٰ کہ لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ (صحیح المسلم کتاب الامارة باب ثبوت الجنة للشهید)

کامیابی و ناکامی تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، وہ ہمیشہ اہل حق کی مدد و نصرت کرتے آئے ہیں، وہ اہل حق کو ہی کامیاب اور غالب کرتے ہیں، اس لئے بالآخر فتح اہل حق کی ہی ہوتی ہے۔ اگر کسی موڑ پر بظاہر ناکامی نظر آئے تو اسے عارضی سمجھا جائے اور یہ خیال کیا جائے کہ اس میں بھی اللہ کی حکمت ہوگی، مجاہد اپنے ظاہر و باطن اور اعمال و اخلاق پر نظر ثانی کرے اور کمی اور کوتاہیوں کو دور کرنے کی کوشش کرے، اسی طرح اگر کامیابی اور فتح ہوتی ہے تو یہ یقین ہونا چاہئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے اور اس کے ساتھ تعلق کو مضبوط سے مضبوط تر بنایا جائے کیونکہ یہ عظیم الشان کام اسی ذات کا ہے اور اس کی مدد و نصرت کے بغیر اس میں کامیابی ممکن نہیں اور اس کی مدد و نصرت تب آتی ہے جب اس کے ساتھ تعلق مضبوط ہو۔ غزوہ بدر میں فتح و نصرت ہو چکی تو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خوشی میں جو طرزِ عمل اختیار کیا، اس سے متعلق حضرت مخدوم محمد ہاشمؒ لکھتے ہیں:

وفیھا بعد فراغه عن غزوة بدر لما بشر بحصول الفتح والنصر للمؤمنین حمد اللہ تعالیٰ و صلیٰ رکعتین شکراً للہ تعالیٰ. (بذل القوۃ ص ۱۳۰)

''جب غزوہ بدر سے فراغت کے بعد مسلمانوں کو فتح اور نصرت حاصل ہونے کی خوشخبری دی گئی تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی اور شکرانے کے طور پر دو رکعت نماز پڑھی۔''

جنگی قیدیوں کے ساتھ برتاؤ

جب مشرکین کو شکست ہوگئی اور ان کے ستر آدمی گرفتار ہوگئے تو آپ نے ان کے بارے میں ابوبکر، عمر اور علیؓ سے مشاورت کی، ابوبکر نے عرض کیا:

''اے اللہ کے نبی! میری رائے یہ ہے کہ یہ چچا زاد، خاندان کے لوگ اور اپنے بھائی ہیں، ان سے فدیہ لے لیجئے، اس طرح ہمیں کفار کے خلاف طاقت حاصل ہو جائے گی اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت دے دیں تو (کل کو) یہ ہمارے دست و بازو بنیں۔''

(مصنف ابن ابی شیبہ کتاب المغازی باب غزوۃ بدر الکبری)

آپ نے عمر بن خطابؓ سے پوچھا تو انہوں نے عرض کیا:

واللہ ما أرى الذی رأى أبوبكر، ولكن أرى أن تمكننی من فلان قریبا لعمر فأضرب عنقه، وتمكن علیا من عقیل فضرب عنقه، وتمكن حمزة من أخیه فلان فیضرب عنقه، حتی یعلم اللہ أنه لیس فی قلوبنا هوادة للمشركین، هؤلاء صنادید هم وأئمتهم وقادتهم. (ایضاً)

''واللہ! میں ابوبکر والی رائے نہیں رکھتا بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ آپ فلاں آدمی (جو عمرؓ کا قریبی رشتہ دار تھا) میرے حوالے کیجئے، میں اس کی گردن اڑاتا ہوں، علی کو اس کا بھائی عقیل حوالے کریں وہ اس کی گردن اڑائیں، حمزہ کو اس کا فلاں بھائی حوالے کریں وہ اس کی گردن اڑائیں۔ یہ اس لئے تاکہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے دلوں میں مشرکین کیلئے کوئی نرمی نہیں ہے، یہ لوگ ان (مشرکین) کے سردار، امام اور قائد ہیں (لہٰذا ان کے ساتھ یہی معاملہ کیا جائے)۔''

سیدنا عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کی رائے پر عمل درآمد کیا جن قیدیوں کو فدیہ دینے کی طاقت تھی، ان سے فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات

نازل فرمائی ہیں:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَّكُوْنَ لَهُ أَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ (الانفال: ٦٧)(ایضاً)

''نبی کو شایاں نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی رہیں جب تک (کافروں کو قتل کر کے) زمین میں کثرت سے خون (نہ) بہا دے تم لوگ دنیا کے مال کے طالب ہو اور اللہ آخرت کی بھلائی چاہتا ہے۔''

اپنوں کی جفا، غیروں کی وفا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر بدر میں مارے جانے والے مشرکین مکہ کو بدر کے ایک کنویں میں پھینک دیا گیا، پھر آپ نے انہیں مخاطب ہو کر فرمایا:

''اے اہل قلیب! تم اپنے نبی کے لئے کتنا بُرا کنبہ اور قبیلہ تھے۔ تم نے مجھے جھٹلایا اور لوگوں نے میری تصدیق کی، تم نے مجھے نکال دیا اور لوگوں نے مجھے ٹھکانہ دیا، تم نے مجھ سے جنگ کی اور لوگوں نے میری نصرت کی، پھر فرمایا کیا تم نے اپنے رب کے کئے ہوئے وعدے کو سچا ہوتے ہوئے دیکھ لیا؟'' (السیرۃ لابن ہشام ج ۲، ص ۲۲۵ ایضاً تاریخ الاسلام للذھبی ج ا ص ۳۵)

یہ اپنوں کی جفا اور غیروں کی طرف سے وفا کی روشن دلیل ہے کہ آپ اپنی زبان مبارک سے اس کا ذکر فرما رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر اپنے قریبی رشتے دار، کنبے، قبیلے، قوم اور علاقے کے لوگ نہ دعوت قبول کریں اور نہ نصرت وحمایت کریں تو اس سے گھبرانا نہ چاہئے تسلسل سے جدوجہد جاری رکھنا چاہئے۔ پھر ایسا وقت ضرور آئے گا کہ دوسرے علاقے کے لوگوں میں سے انصار واعوان پیدا ہو جائیں گے اور انہی کی مدد سے مخالفین پر فتح وغلبہ حاصل ہوگا۔

زمانہ جہاد میں بھی تعلیم وتربیت کا سلسلہ

غزوۂ بدر کے بعد عمیر بن وھب اپنے اسیر بیٹے وہب بن عمیر کے انتقام میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے مکہ سے مدینہ پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بذریعہ وحی اس کے سامنے اس کے منصوبے کا انکشاف کیا تو وہ مسلمان ہو گئے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا:

فقهوا اخاكم في دينه واقرؤه القرآن واطلقوا له اسيره.

''اپنے بھائی کو دین سکھاؤ، اسے قرآن پڑھاؤ اور اس کے قیدی کو رہا کرو۔''

انہوں نے آپ سے عرض کیا کہ میں نے حالتِ شرک میں مسلمانوں کو بہت تکالیف پہنچائی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے مکہ جا کر دعوتِ اسلام کی اجازت دیں، شاید اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت دیں ورنہ جس طرح میں مسلمانوں کو ایذاء پہنچاتا تھا، اسی طرح اہل مکہ کو ایذائیں دوں گا چنانچہ وہ مکہ آئے اور دعوت کا سلسلہ شروع کر دیا۔

''جب وہ مکہ آئے تو یہیں رہ پڑے اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا شروع کر دی، جو ان کی مخالفت کرتا وہ اسے سخت ایذا پہنچاتے تھے چنانچہ ان کے ہاتھ پر لوگوں کی کثیر تعداد مسلمان ہوگئی۔'' (السیر ۃ لابن ہشام، ج ۲ ص ۲۴۴)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر قائدِ دعوت اور ارکانِ تحریک لوگوں کی طرف سے تکذیب، استہزاء اور ایذا پہنچانے کی وجہ سے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں منتقل ہو جائیں تو اس کا یہ مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہاں دعوت کا سلسلہ ختم کر دیا جائے۔ نہیں بلکہ اگر عمیر بن وہب جیسے باہمت افراد کو اجازت دی جائے بلکہ داعیوں کی تشکیلیں جاری رہیں تو امید ہے کہ اچھی خاصی تعداد دعوت قبول کر سکتی ہے۔ جیسا کہ عمیر بن وہب کی دعوت سے کئی مشرکین مسلمان ہوگئے۔

ناقضینِ عہد سے جنگ

مدینہ تشریف آوری کے بعد دوسرے یہود کی طرح بنو قینقاع سے بھی امن کا معاہدہ ہوا تھا مگر غزوۂ بدر کے بعد اس امن معاہدے کی سب سے پہلے بنو قینقاع نے خلاف ورزی کی اور اسے توڑ دیا۔ آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور دعوت اسلام دیتے ہوئے فرمایا کہ ''بدر میں قریش کے انجام سے عبرت پکڑو اور مسلمان ہو جاؤ۔ تم جانتے ہو کہ میں نبی اور رسول ہوں''۔ انہوں نے متکبرانہ انداز میں آپ کو دھمکی آمیز جواب دیتے ہوئے کہا:

یا محمد! انک تری انا قومک؟ لا یغرنک انک لقیت قوماً لا علم لهم بالحرب فاصبت منهم فرصة، انا واللہ لئن حار بناک لتعلمن انّا نحن الناس.

(السیرة لا بن هشام ج ۳، ص ۶)

''اے محمد! تم ہمیں اپنی قوم (جیسا) سمجھ رہے ہو؟ تمہیں اس بات سے دھوکہ نہیں لگنا چاہئے کہ تم نے ایک ایسی قوم کا مقابلہ کیا ہے جنہیں جنگ کے بارے میں کوئی زیادہ معلومات (اور تجربہ) نہ تھا تو تم نے انہیں مات دے دی، خدا کی قسم! اگر ہماری تمہارے جنگ ہوئی تو تمہیں اس بات کا یقین آ جائے گا

کہ دراصل ہم ہی جنگجو لوگ ہیں۔''

اس واقعے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے کا انتظام ابولبابہؓ بن عبدالمنذر کو سونپا اور خود، حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کے ہاتھ میں مسلمانوں کا علم دے کر لشکر کے ہمراہ بنوقینقاع کا رُخ کیا۔انہوں نے آپ کو دیکھا تو گڑھیوں میں قلعہ بند ہوگئے۔آپؐ نے ان کا پندرہ روز تک سختی سے محاصرہ کیے رکھا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا چنانچہ انہوں نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی جان و مال، آل اولاد اور عورتوں کے بارے میں جو فیصلہ کریں گے انہیں منظور ہوگا۔اس کے بعد آپؐ کے حکم سے ان سب کو باندھ لیا گیا۔اس موقع عبداللہ بن ابی نے اپنا منافقانہ کردار ادا کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت اصرار والحاح کرتے ہوئے کہا ''اے محمد! میرے معاہدین کے بارے میں احسان کیجئے۔''

بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خاطر ان سب کی جان بخشی کردی۔البتہ انہیں حکم دیا کہ وہ مدینے سے نکل جائیں اور آپؐ کے پڑوس میں نہ رہیں، چنانچہ یہ شام کی طرف چلے گئے۔

خطرناک لوگوں کا قتل

کعب بن اشرف کا تعلق بنونضیر سے تھا۔یہودیوں میں سے یہ وہ شخص تھا جسے اسلام اور اہلِ اسلام سے نہایت سخت عداوت اور دشمنی تھی۔یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیتیں پہنچایا کرتا تھا اور آپ کے خلاف جنگ کی کھلم کھلا دعوت دیتا پھرتا تھا۔اسے جنگ بدر میں مسلمانوں کی فتح اور سردارانِ قریش کے قتل کی خبر ملی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی ہجو اور دشمنانِ اسلام کی مدح سرائی پر اتر آیا اور انہیں مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے لگا۔پھر قریش کے پاس پہنچا اور ان کی غیرت بھڑکانے اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ پر تیار کرنے کے لیے اشعار کہہ کہہ کر ان سردارانِ قریش کا نوحہ و ماتم شروع کردیا، جنہیں میدانِ بدر میں قتل کئے جانے کے بعد کنویں میں پھینک دیا گیا تھا۔

کعب بن اشرف واپس آیا تو مدینہ آکر صحابہ کرامؓ کی عورتوں کے بارے میں واہیات اشعار کہنے شروع کئے اور یوں مسلمانوں کو سخت اذیت پہنچائی۔ان باتوں سے تنگ آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من لکعب بن الاشرف فانه قداذی الله ورسوله

(صحیح البخاری کتاب المغازی باب قتل کعب بن الاشرف)

''کون کعب بن اشرف کا کام تمام کرنے کے لئے تیار ہے کیونکہ اس نے اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دی ہے۔''

محمد بن مسلمہ فوراً تیار ہو گئے اور با قاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ اسے انجام تک پہنچایا۔

(السیرۃ لابن ہشام ج ۳،ص ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳)

یہود کو کعب بن اشرف کے قتل کا علم ہوا تو ان کے ہٹ دھرم اور ضدی دلوں میں رعب کی لہر دوڑ گئی۔ وہ سمجھ گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امن وامان کے خراب کرنے والوں، ہنگامے اور اضطراب بپا کرنے والوں اور عہد و پیمان توڑنے والوں کے خلاف طاقت کے استعمال سے بھی گریز نہ کریں گے۔ چنانچہ محمد بن مسلمہ فرماتے ہیں کہ کعب بن اشرف کو قتل کرنے کے بعد یہود میں خوف وہراس پھیل گیا:

قد خافت یہود لو قعتنا بعدو اللہ فلیس یہودی اِلّا وھو یخاف علیٰ نفسہ. (السیرۃ لابن ھشام ج۳/ص ۱۳)

''اللہ کے دشمن (کعب بن اشرف) کو قتل کرنے کے بعد یہودی خوفزدہ ہو گئے تھے، ہر یہود کو اپنی جان کا خطرہ لاحق رہتا تھا۔''

الشیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کعب بن اشرف کو قتل کروانے کی وجہ بیان کرتے ہیں:

''اس لئے کہ وہ واجب القتل تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا تھا، اس کے ساتھ کسی قسم کا معاہدہ بھی نہ تھا، اسے بہر حال قتل ہی کیا جانا تھا اور اگر جنگ میں مارا گیا ہوتا تو تب یہی بات تھی کیونکہ ''جنگ تو ایک داؤ ہے'' نیز مشرکین کو قتل کرنا، ان کے فساد کو دور کرنا عالم کی اصلاح اور اہل خیر کی بھلائی کے مقصد کے لئے ضروری ہے، اس کی مثال ایسے ہے جیسے درختوں کی درستگی کے لئے ان کی زائد اور بے کار شاخوں کو کاٹا اور چھانٹا جاتا ہے تاکہ وہ پھل دیں۔ اگر یہ کاٹ چھانٹ نہ کی جائے تو درخت پھل نہیں دیتے۔ اس کے علاوہ بجائے خود ایمان اور تصدیق حق نہیں ہے؟ کیا اس میں کوئی شک وشبہ ہو سکتا ہے؟'' (مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۱۵۰)

غزوۂ احد

غزوۂ بدر میں مشرکین مکہ کے ستر بڑے اور اہم آدمی مارے گئے اور اتنی ہی تعداد میں گرفتار ہوئے تھے، جس پر انہیں شدید غم وغصہ تھا۔ وہ اس کا جلد از جلد انتقام لینا چاہتے تھے۔ قافلۂ تجارت جس کی وجہ

سے غزوۂ بدر کا وقوعہ ہوا تھا ابھی تک دارالندوۃ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ لوگوں کو ان کا رأس المال اور نفع نہیں دیا گیا تھا، کیونکہ مقتول کے ورثا نے جمع ہو کر ابوسفیان سے تجارت کا نفع مسلمانوں کے خلاف جنگ کیلئے استعمال کرنے کی رائے دی تا کہ وہ انتقام لے سکیں۔ ابوسفیان اس کیلئے تیار ہو گئے اور باقی لوگ بھی اس سے متفق ہو گئے، چنانچہ قریش اپنے جنگی ساز و سامان کے ساتھ نکلے اور تین ہزار کا لشکر لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ (السیرۃ لابن ہشام ج ۳، ص ۱۷)

آپ کے چچا عباس (جو ابھی تک مکہ میں تھے) نے بذریعہ خط آپ کو اس کی اطلاع دی۔ یہ اطلاع ملنے کے بعد آپؐ نے خباب بن المنذر کو تحقیق حال کے لئے روانہ کیا انہوں نے واپسی پر وہی خبر (رپورٹ) دی جو حضرت عباس نے خط میں لکھی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ رائے تھی کہ مسلمان مدینہ میں ہی رہیں اور ان لوگوں سے کوئی تعرض نہ کریں، اگر وہ خود حملہ کریں تو ان سے قتال کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہر سے باہر نکل کر ان سے مقابلہ پسند نہیں فرما رہے تھے، عبداللہ بن ابیّ کی بھی یہی رائے تھی، لیکن چونکہ بعض مسلمان بدر کی جنگ میں شریک نہیں ہو سکے تھے، اور ان کو اس کی حسرت رہ گئی تھی اس لیے انہوں نے عرض کیا ''یارسول اللہ! آپ باہر نکل کر دشمنوں کا مقابلہ کریں کہیں ان کو یہ محسوس نہ ہو کہ ہم بُزدلی اور کمزوری کی وجہ سے باہر نہیں نکل رہے ہیں۔'' یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب اس قسم کی باتیں کر رہے تھے تو آپ گھر تشریف لے گئے اور زرہ پہن کر باہر تشریف لائے۔ اس وقت ان لوگوں کو جو باہر نکل کر مقابلے کی رائے دے رہے تھے، ندامت ہوئی، چنانچہ انہوں نے عرض کیا ''یارسول اللہ! ہم نے آپ کو آپ کی مرضی کے خلاف اس کام پر آمادہ کیا ہے، جو ہمیں نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اگر آپ چاہیں تو تشریف رکھیں اور یہیں رہ کر مقابلہ فرمائیں۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا ینبغی لنبی اذا اخذ لامۃ الحرب وأذن فی الناس بالخروج الیٰ العدو انْ یرجع حتیٰ یقاتل. (مغازی رسول اللہ لعروۃ بن الزبیر ص ۱۶۸)

''نبی کی یہ شان نہیں کہ جب وہ جنگ کے لئے ہتھیار اٹھا لے اور لوگوں کو دشمن کی طرف کوچ کرنے کا حکم دے دے تو قتال سے پہلے لوٹ آئے۔''

شوقِ شہادت، ذوقِ جنت

عمرو بن الجموح انتہائی لنگڑے تھے۔ ان کے چار بیٹے تھے جو کہ انتہائی بہادر تھے اور آپ صلی اللہ

علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شریک رہتے تھے۔ غزوۂ احد کے موقع پر بیٹوں نے باپ کولڑائی میں جانے سے روکنا چاہا تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یہ مجھے آپ کے ساتھ جہاد میں جانے سے روکنا چاہتے ہیں جبکہ میری حالت یہ ہے:

فو اللہ انّی لارجو ان اطأ بعرجتی ھذہ فی الجنۃ. (السیرۃ لا بن ھشام ج ۳، ص ۴۰)

''اللہ کی قسم! میں چاہتا ہوں کہ میں اس لنگ کے ساتھ جنت میں پھروں۔''

ان سے آپ نے فرمایا کہ ''آپ معذور ہیں آپ پر جہاد لازم نہیں'' اور بیٹوں سے فرمایا کہ ''تمہیں ان کو روکنے کا حق نہیں۔'' چنانچہ وہ شریکِ جہاد ہوئے اور لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔

اسباب کا استعمال توکل کے منافی نہیں

غزوہ احد کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جسم پر دو زرہیں اور سر پر جنگی ٹوپی ''خود'' پہنی ہوئی تھی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے الشیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

از یجا معلوم میشود کہ تمسک باسباب و مباشرت آن منافی توکل نیست کہ سید المتوکلین صلی اللہ علیہ وسلم آنرا کردہ است و در حقیقت توکل ثقہ بتقدیر الٰہی است و مباشرت اسباب کہ آن نیز از جملہ تقدیر است داخل بندگیست و نیز آنحضرت اشجع ناس بود وہر کہ شجاع تر در جنگ دغدغہ تاک تزوکارگزار تر وآلات جنگ را نگاہ دارندہ تر۔ (مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۱۵۹)

''اس سے یہ معلوم ہوا کہ اسباب کو اختیار کرنا اور انہیں استعمال کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے، سید المتوکلین صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہے۔ درحقیقت توکل تقدیر الٰہی پر اعتماد کرنا ہے اور اسباب کا استعمال بھی منجملہ تقدیر ہے اور بندگی میں داخل ہے، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں سے بڑھ کر بہادر تھے اور جو جتنا زیادہ بہادر ہوتا ہے وہ جنگ میں اتنا ہی زیادہ بے پرواہ نہیں ہوتا اور آلات جنگ کی سب سے زیادہ نگہداشت کرنے والا ہوتا ہے۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ مجاہدین کو چاہیے کہ وہ دشمن سے مقابلے کے لیے جس قدر سامانِ حرب تیار اور جمع کر سکتے ہیں جمع کریں، بلکہ اس کے لیے تمام وسائل و ذرائع استعمال کریں۔

اطاعتِ امیر

جنگ سے پہلے صفوں کو ترتیب دیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احد پہاڑ کی طرف پشت کی اور تیر اندازوں کا ایک دستہ پشت کی طرف پہاڑ پر مقرر کر دیا تا کہ پیچھے سے ممکنہ حملے کو روکا جا

سکے۔آپ نے اس دستہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

احموا لنا ظھورنا فانانخاف اَنْ نؤتیٰ من ورائنا۔

(کتاب المغازی للواقدی اول ص ۲۲۵)

''تم پیچھے کی طرف سے نگرانی کرو کیونکہ پیچھے کی طرف سے حملے کا خطرہ ہے۔''

لڑائی شروع ہوئی تو اللہ نے مدد و نصرت فرمائی اور اپنا وعدہ پورا فرمایا، مسلمانوں نے زور وشور اور انتہائی جذبے سے جنگ کی تو مشرکین کو شکست ہونے لگی۔''(مشرکین) کی شکست میں کوئی شک نہ رہا تھا۔''(السیرۃ الابن ہشام ج ۳،ص ۳۰)

تیر انداز دستہ نے دیکھا کہ لشکرِ اسلام کو فتح ہو چکی ہے اور مشرکین شکست کھا کر بھاگ رہے ہیں حتیٰ کہ مالِ غنیمت بھی اکٹھا کیا جا رہا ہے (اگرچہ لڑائی ختم نہ ہوئی تھی) تو ان میں اختلاف ہو گیا کہ اب یہ جگہ چھوڑ دینی چاہئے یا نہیں؟ اس دستے کے امیر عبداللہ بن جبیر نے انہیں منع کیا اور ارشادِ نبوی یاد دلایا لیکن اکثریت نے ان کی بات سنی ان سنی کر دی اور پہاڑی سے میدانِ جنگ میں اُتر پڑے۔

فلمّا ابو صرف وجوھھم فاصیب سبعین قتیلاً۔

(صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ احد)

''جب انہوں نے بات ماننے سے انکار کر دیا تو ان کے چہرے پھیر دیئے گئے چنانچہ ان میں سے ستر افراد شہید ہو گئے۔''

اطاعتِ امیر سے روگردانی کی وجہ سے لشکرِ اسلام کو بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔اگر وہ اپنے امیر کی اطاعت کرتے تو شاید یہ صورتحال پیش نہ آتی اور مسلمانوں کو حاصل ہونے والی فتح بظاہر عارضی شکست میں تبدیل نہ ہوتی۔اس لئے مجاہدین پر یہ لازم ہے کہ وہ بہرصورت امیر کی اطاعت کریں کیونکہ اسی میں دنیوی واخروی کامیابی اور کامرانی ہے۔

دنیا کے فانی مال واسباب پر مجاہدین کی نظر نہ ہونی چاہئے کیونکہ یہ دینی اور دنیوی ہر دو اعتبار سے خسارے کا باعث ہے۔مال ومتاع کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل یہ تھا کہ امام بخاریؒ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کرتے ہیں کہ فتوحات شروع ہونے کے بعد جزیہ اور خراج بھی مسلمانوں کے پاس آنے لگا۔سب سے زیادہ مال بحرین سے آیا، آپ نے اسے مسجد میں ڈالنے کا حکم دیا:

فخرج رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الی الصلوۃ ولم یلتفت الیہ.

(صحیح البخاری کتاب الصلوۃ باب القسمۃ وتعلیق القنو فی المسجد)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے نماز کے لیے تشریف لائے تو اس طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔''

نماز سے فارغ ہونے کے بعد صحابہ کرامؓ میں تقسیم کرنے کے لئے تشریف فرما ہوئے پورے کا پورا تقسیم کر کے اٹھے اور آخری درہم تقسیم کرنے تک تشریف فرما رہے۔

بہر حال دشمن کے شہسواروں نے جگہ خالی دیکھ کر بھرپور حملہ کر دیا۔ لشکر اسلام پر یہ بے خبری میں اور اچانک حملہ تھا۔ ان کے پاؤں اکھڑ گئے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جانبازوں کے ساتھ ڈٹے رہے، کفار بار بار آپ پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ ابن الدیبع الشیبانی لکھتے ہیں:

وکانوا احرص شیء علی قتلہ فعصمہ اللہ منھم وھو صلی اللہ علیہ وسلم ثابت ینادی اصحابہ. (حدائق الانوار ج ۲ ص ۵۲۴)

''وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے پر بے حد حریص تھے لیکن اللہ نے آپ کی ان سے حفاظت فرمائی، جبکہ آپ اپنی جگہ ڈٹے رہے اور اپنے اصحاب کو پکار رہے تھے۔''

چنانچہ آپ خود زخمی ہوئے۔ انس بن مالک سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک ٹوٹ گئے اور آپ کا چہرہ مبارک بھی زخمی ہوا:

فجعل الدّم یسیل علی وجھہ وجعل یمسح الدم وھو یقول کیف یفلح قوم خضبو اوجہ نبیھم وھو یدعوالی ربّھم (السیرۃ لا بن ھشام ج ۳، ص ۳۱)

''خون آپ کے چہرے پر گر رہا تھا، آپ خون صاف کرتے ہوئے یہ فرما رہے تھے'' وہ قوم کیسے فلاح پا سکتی ہے جس نے اپنے نبی کا چہرہ خون آلود کیا ہے حالانکہ وہ انہیں ان کے رب کی طرف بلاتا ہے۔''

دشمن نے افواہ اڑا دی کہ آپ شہید ہو گئے ہیں۔ آپ نے اپنی سپاہ کو میدانِ جنگ کی طرف واپس بلایا تو وہ لوٹ آئے اور انتہائی بے جگری کے ساتھ لڑتے ہوئے جہاں آپ کا دفاع کیا وہاں کفار کے لشکر پر دوبارہ حملے شروع کر دیے۔ جب مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لیا تو ان کو نئی زندگی مل گئی اور وہ ایک بار پھر لڑائی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، چنانچہ آپؐ ان کو لے کر دوبارہ وادی کی طرف بڑھے۔

امیر پر جان قربان

ابن اسحاق روایت کرتے ہیں:

ترس دون رسول الله ﷺ ابو دجانه بنفسه يقع النبل في ظهره وهو منحن عليه حتى كثر فيه النبل.

''ابو دجانہ ڈھال بن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہو گئے، تیر ان کی پشت پر لگتے رہے اور وہ اسی طرح آپ پر جھکے رہے یہاں تک کہ انہیں بہت زیادہ تیر لگ گئے (اور وہ شدید زخمی ہو گئے)۔''

اسی طرح سعد بن ابی وقاص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑے ہو کر تیر اندازی کر رہے تھے، فرماتے ہیں:

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ مجھے تیر اٹھا اٹھا کر دے رہے تھے اور فرماتے جاتے تھے ''تیر مارو! تجھ پر میرے ماں باپ فدا ہوں'' یہاں تک کہ بعض اوقات آپ نے مجھے بغیر پھل والا تیر دیا اور فرمایا اسے مار۔'' (السیرۃ لابن ہشام ج ۳ ص ۳۲)

جب مشرکین نے آپ پر حملہ کیا تو اس وقت تقریباً دس آدمی آپ کے آگے آگے آ گئے اور سب دفاع کرتے ہوئے اور ایک ایک کر کے شہید ہو رہے تھے۔ زیاد بن السکن پانچ انصاریوں کے ساتھ مل کر لڑ رہے تھے زیاد شدید زخمی ہو کر گر پڑے تو آپ نے فرمایا انہیں میرے قریب لے آؤ چنانچہ انہیں اٹھا کر آپ کے سامنے لایا گیا تو آپ نے ان کے سر کو اپنے قدم مبارک پر رکھ لیا، اور اسی حالت میں انہوں نے جان جان آفرین کے سپرد کی۔ ابن ہشام لکھتے ہیں۔

فمات وخده على قدم رسول الله صلى الله عليه وسلم.

(السيرة لابن هشام ج ٣ ص ٣٣)

''انہیں اس حالت میں موت آئی کہ ان کے رخسار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر تھے۔''

اللہ اللہ! تاریخ عشق و محبت کی ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ لوگ اپنے محبوب پر جانیں قربان کرنے کے دعوے تو کرتے ہیں لیکن صحابہ کرام نے اس کی عملی شکل پیش کر کے اس دعوے کو حقیقت میں تبدیل کر دیا۔ محبوب کے قدموں میں جان جان آفرین کے سپرد کر کے زیاد بن السکنؓ

نے رہتی دنیا کو بتادیا کہ محبوب ترین شخصیت اور مقاصد پر اس طرح جان لٹائی جاتی ہے۔

عورتوں کی طرف سے آپ کا دفاع

ابن ہشام لکھتے ہیں کہ غزوۂ احد میں امّ عمارہ نسیبہ بنت کعب المازنیہ نے بھی بذات خود لڑائی میں حصہ لیا۔ وہ خود بیان کرتی ہیں کہ شروع میں تو مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا اور انہیں فتح ہو چکی تھی۔ لیکن جب جنگ کا پانسا پلٹا اور مسلمان بھاگنے لگے تو

''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑی ہو کر بنفس نفیس لڑائی لڑنے لگی، میں تلوار اور نیزے کے ساتھ آپ کا دفاع کر رہی تھی یہاں تک کہ زخمی ہوگئی۔'' (السیرۃ لابن ہشام ج ۳، ص ۳۴)

ام سعد بنت سعد بن ربیع نے امّ عمارہ سے پوچھا کہ آپ کے شانہ پر یہ زخم کس چیز کا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ غزوہ احد میں ابن قمئہ نے زخم لگایا تھا۔ جب مسلمانوں نے ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیا تو وہ چلاتا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھنے لگا:

فاعترضت لهٗ انا ومصعب بن عمير واناس لمن ثبت مع رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم. (السيرة لابن هشام ۳/۳۴)

''میں، مصعب بن عمیر اور جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ڈٹے ہوئے تھے ہم نے مل کر اس کا سامنا کیا۔''

اس نے مجھ پر وار کیا تو میں نے بھی اس پر کئی وار کئے لیکن اس دشمنِ خدا نے دو زرہیں پہنی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے اس پر وار کارگر نہیں ہوا۔

شوہر، بھائی، باپ کا غم نہیں، رسول اللہ کی فکر

سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ ایک عورت کو اس کے شوہر، بھائی اور باپ کی شہادت کی خبر دی گئی تو اس نے پوچھا:

فما فعل رسول الله صلى الله عليه وسلم؟

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس حال میں ہیں؟''

صحابہ کرامؓ نے بتایا کہ وہ بخیر وعافیت ہیں، پھر جب اس نے خود آپ کو دور سے دیکھ لیا تو کہا:

كل مصيبة بعدك جلل تريد صغيرةً. (السيرة لا بن هشام ج ۳، ص ۴۷)

''آپ (کی سلامتی وخیریت) کے بعد تو ہر ایک مصیبت ہیچ ہے۔''

یعنی اپنے شوہر، بھائی اور باپ سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عزیز تھے اور ان کی جان کی سلامتی کی ان سے زیادہ فکر رہتی تھی یہاں تک کہ اگر شوہر، بھائی اور باپ جیسے محبوب ترین اور زندگی کے سہارے بھی ختم ہو گئے لیکن آپ بخیر و عافیت ہیں تو باقی مصائب و غم ان کے لئے زیادہ اہمیت نہ رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ داعیانِ غلبۂ دین اور مجاہدین کو اپنے قائد اور امیر سے اس طرح محبت و عقیدت اور ان کی جان کی سلامتی کی اس قدر فکر ہونی چاہئے کہ وہ ان کے لئے ہر محبوب اور عزیز چیز حتی کہ اپنی جان تک قربان کرنے کیلئے تیار ہوں اور ہر مشکل موڑ میں ان کے ساتھ ثابت قدم رہیں اور کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑیں۔

جہاد کے زمانے میں دعوت

اگرچہ جہاد بھی دعوت کا ہی حصہ ہے اور اس کا سلسلہ جاری تھا، تاہم دعوتِ اسلام کے لئے دیگر علاقوں میں باقاعدہ طور پر داعیوں کی تشکیل کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ غزوۂ احد کے بعد قبیلہ عضل اور قارہ کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

یا رسول اللہ! ان فینا اسلاماً فابعث معنا نفراً من اصحابک یفقھوننا فی الدین ویقرؤننا القرآن ویعلموننا شرائع الاسلام. (السیرۃ لا بن ھشام ج۳، ص ۱۰۰)

''یارسول اللہ! ہمارے ہاں کے لوگ مسلمان ہو چکے ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ اپنے اصحاب میں سے ایسے افراد کو بھیجئے جو ہمیں دین سکھائیں۔ ہمیں قرآن پڑھائیں اور اسلام کے احکام کی تعلیم دیں۔''

آپ نے ان کی درخواست پر چھ صحابہ کرامؓ کی تشکیل کر دی لیکن انہوں نے رجیع کے مقام پر ان سے غداری کی، ان سے تلواریں چھین لیں۔ امیر اور دیگر دو صحابہ نے تو لڑتے ہوئے جان دے دی البتہ تین حضرات کو انہوں نے گرفتار کر لیا اور مکہ لے گئے۔

غزوہ احد کے بعد مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نجد سے ابو براء عامر بن مالک آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اسلام کی دعوت دی تو نہ تو اس نے قبول کی اور نہ انکار کیا البتہ کہا کہ

لو بعثت رجالاً من اصحابک الیٰ اھل نجد فدعوھم الی امرک رجوت ان یستجیبوا لک.

''اگر آپ اپنے اصحاب میں سے کچھ افراد کو اہلِ نجد کی طرف بھیجیں اور وہ انہیں دعوت دیں تو میں امید کرتا ہوں کہ وہ آپ کی دعوت قبول کر لیں گے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے فرمایا'' مجھے اہل نجد کے بارے میں خدشہ ہے۔'' (کہ کہیں وہ غداری نہ کریں)۔(السیرۃ لابن ہشام ج ۳،ص ۱۱۰)

ابو براء نے اپنی ضمانت دی اور ان کی امن وسلامتی کی یقین دہانی کروائی تو آپ نے (ابن اسحاق کے بقول) چالیس صحابہ کرامؓ کو اس کے ہمراہ روانہ کر دیا۔حرام بن ملحانؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط لے کر عامر بن طفیل کے پاس گئے تو اس نے خط پڑھے بغیر قتل کروادیا، پھر بنو سلیم کے تین قبیلوں رعل، ذکوان اور عصیہ کو بلا کر صحابہ کرام پر حملہ کروادیا، چنانچہ تمام صحابہ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے، البتہ کعب بن زید بن نجارؓ شہداء میں سے زخمی حالت میں زندہ نکلے۔

(صحیح البخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الرجیع ورعل وذکوان)

غزوۂ بنی النضیر

حضرت عمرو بن امیہ نے قبیلۂ عامر کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا تھا۔جس کی دیت (خون بہا) کا ایک حصہ معاہدہ کے مطابق بنو نضیر کو ادا کرنا تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی سلسلہ میں ان کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے دیت کی ادائیگی کا مطالبہ کیا تو انہوں نے آپ اور آپ کے رفقاء کو کہا کہ آپ تشریف رکھیں، ہم اس کا انتظام کرتے ہیں۔آپ رفقاء سمیت تشریف فرما ہوئے تو خفیہ طور پر سازش تیار کی کہ ایک آدمی چھت پر چڑھ کر آپ پر پتھر گرائے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی اس کی اطلاع دے دی گئی تو آپ فوراً وہاں سے چل پڑے۔مدینہ آکر ان کو اپنے قاصد محمد بن مسلمہؓ کے ذریعے یہ حکمنامہ بھیجا کہ'' تم مدینہ سے نکل جاؤ اور یہاں سکونت اختیار نہ کرو کیونکہ تم نے دھوکہ وفریب کرنے کی کوشش کی ہے۔'' بنو نضیر جلاوطنی پر آمادہ ہو جاتے مگر ادھر بنی عوف بن خزرج میں سے بعض منافقین جن میں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول وغیرہ تھے ،انہوں نے بنی نضیر کو کہلا بھیجا کہ کہ اگر تم مسلمانوں سے جنگ کرو گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ جنگ میں شریک ہوں گے اور اگر تم یہاں سے اپنا گھر بار چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گے۔بنو نضیر رئیس المنافقین کے وعدہ اور اپنی جنگی مہارت و مضبوط قلعوں کے ناز پر سرکشی پر اتر آئے ،اس بناء پر یہ لوگ قلعہ بند ہوئے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا چھ روز تک محاصرہ جاری رکھا۔جب چھ شب وروز گزر گئے تب آپؐ نے حکم دیا کہ ان کے باغات کاٹ دیئے جائیں اور کھیتوں میں آگ لگادی جائے۔رئیس المنافقین ان کی مدد کو آیا اور نہ کسی دوسرے حلیف قبیلے نے معاونت کی۔مجبوراً ان کو آپ

سے یہ درخواست کرنا پڑی:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے درخواست کی کہ انہیں جلاوطن کر دیا جائے۔ انہیں قتل نہ کیا جائے اور اسلحہ کے علاوہ اونٹ جو سامان اٹھا لے جاسکتے ہوں اٹھا لے جانے کی اجازت دی جائے۔'' (السیرۃ لابن ہشام ج ۳، ص ۱۱۵)

آپ نے ان کی درخواست منظور کر لی اور وہ اسی طرح جلاوطن کر دیئے گئے۔

اسلام کے خلاف کفار کی مشترکہ یلغار

بنونضیر نے خیبر پہنچنے کے بعد ایک بہت بڑی سازش کے تانے بانے بننے شروع کر دیے۔ اپنے تین سرداروں کو مکہ میں قریش کے پاس بھیجا تاکہ وہ ان کے ساتھ مل کر اہل اسلام کے خلاف متحدہ جنگ کا جامع منصوبہ تیار کر سکیں۔ یہ وفد قریش مکہ کے پاس پہنچا اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ لڑنے کی دعوت دی اور کہا کہ ہم تمہارے ساتھ رہیں گے یہاں تک کہ ہم اس کی جڑ اکھاڑ دیں گے۔ قریش تو پہلے سے یہ چاہتے تھے کہ عرب قبائل کو ساتھ ملا کر مسلمانوں کا استیصال کر دیا جائے، لہٰذا وہ فوراً اس کے لئے تیار ہو گئے۔ اسی طرح دیگر حلیف قبائل بنوغطفان، بنواسد، بنوسلیم کو بھی تیار کر کے دس ہزار کا لشکر لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لشکر کے بارے میں سنا تو صحابہ کرام سے مشورہ کیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے سے مدینہ میں رہتے ہوئے خندق کھودنے پر اتفاق رائے ہو گیا۔ مسلمان باوجود تنگدستی اور فاقوں کے جلد سے جلد خندق کھودنے میں مصروف ہو گئے اور انتہائی محنت ومشقت کے ساتھ خندق کھودتے رہے۔ اس دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود بھی خندق کی کھدائی میں شریک رہے۔ امام بخاری حضرت براءؓ سے روایت کرتے ہیں:

كان النبي صلى الله عليه وسلم ينقل التراب يوم الخندق حتى اغمر بطنه اواغبرّ بطنه. (صحيح البخاري كتاب المغازي باب غزوة الخندق)

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ خندق کے موقع (خندق کودتے ہوئے) مٹی اٹھا رہے تھے جس سے آپ کا پیٹ غبار آلود ہو گیا تھا۔''

مجاہدین (صحابہ کرام) کھدائی کا کام کرتے وقت یہ شعر پڑھتے تھے۔

نحن الذين بايعوا محمدا

على الجهاد مابقينا ابداً

''ہم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ پر جب تک زندگی ہے جہاد کرنے کی بیعت کی ہے''۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اس طرح جواب دیتے تھے۔

اللھم انہ لا خیر الاخیر الآخرۃ
فبارک فی الانصار والمھاجرۃ

''اے اللہ! بلاشبہ اصل بھلائی تو آخرت کی ہے، انصار اور مہاجرین کو برکات عطا فرما''
امام بخاریؒ حضرت انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو صبح کے وقت سخت سردی میں انتہائی مشقت اور بھوک و پیاس کے ساتھ خندق کھودتے ہوئے دیکھا اور وہ کام کر رہے تھے تو آپ نے فرمایا:

اللھم لا عیش الا عیش الآخرۃ
فاغفر الانصار والمھاجرۃ

(صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الخندق)
''اے اللہ! اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے، آپ انصار اور مہاجرین کی مغفرت فرمائیے!''
اس سے یہ معلوم ہوا کہ امیر اور مرکزی قیادت کو چاہئے کہ وہ جہاں مشکل مراحل میں مجاہدین کی حوصلہ افزائی کریں وہاں اللہ تعالیٰ سے ان کے لئے مغفرت و رحمت کی دعا بھی کرتے رہیں تا کہ جہاں حقیقتاً ان کو غیبی مدد و نصرت ملے وہاں خود مرکزی قیادت کے بارے میں یہ بات پختہ ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جوڑے رکھنے والی اور ماتحتوں کا خیال رکھنے والی قیادت ہے اور اسے ان کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔

امیر کی اجازت ضروری ہے

خندق کی کھدائی کے دوران منافقین کام سے جی چراتے اور مختلف بہانوں سے کام چھوڑ کر آپ کی اجازت کے بغیر گھروں کو چلے جاتے لیکن صحابہ کرام کا یہ حال تھا:
''مسلمانوں میں سے جب کسی کو کوئی ضرورت پیش آتی جس کے لئے جانا ضروری ہوتا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کرتے اور اس ضرورت کیلئے جانے کی اجازت چاہتے تو آپ انہیں اجازت مرحمت فرماتے۔ جب وہ اپنی ضرورت سے فارغ ہوتے تو جو کام پہلے کر رہے ہوتے تھے نیکی کی رغبت اور اللہ کی رضا کے حصول کی نیت سے لوٹ کر اس میں لگ جاتے۔''
(السیرۃ لابن ہشام ج ۳، ص ۱۳۱)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ مخلص ارکان ہر موڑ پر امیر کی اطاعت کرتے اور اس کی اجازت کے ساتھ ہی اپنے امور انجام دیتے ہیں جبکہ جن افراد کی تحریک و جہاد سے وابستگی کمزور ہوتی ہے۔ وہ نظم میں رہتے ہوئے بھی اصول وضوابط کی پابندی نہیں کرتے اور اطاعتِ امیر میں کوتاہی کرتے ہیں، جس کا آگے چل کر بہت بڑا نقصان بھی ہوتا ہے جیسا کہ غزوۂ احد میں اس طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔

مشرق ومغرب کی فتح کی خوشخبری

ابن اسحاق ؒ حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ خندق کھودتے ہوئے ایک سخت چٹان آ گئی جو ٹوٹ نہیں رہی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کدال میرے ہاتھ سے لے کر اس پر تین دفعہ مارا اور ہر بار مارنے سے روشنی بلند ہوئی۔ حضرت سلمان فرماتے ہیں کہ میرے پوچھنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

امّا الاولیٰ فان اللہ فتح علیّ باب الیمن و امّا الثانیة فان اللہ فتح علی باب الشام و المغرب و اما الثالثة فان اللہ فتح علیّ بھا المشرق

(مغازی رسول اللہ لعروة بن الزبیر ص ۱۸۵ ایضاًابن ھشام ج۳، ص ۱۳۴)

''پہلی مرتبہ جو روشنی بلند ہوئی اللہ تعالیٰ نے یمن کو مجھ پر فتح کیا، دوسری مرتبہ میں اللہ تعالیٰ نے شام اور مغرب کو فتح کیا اور تیسری مرتبہ میں مشرق کو مجھ پر فتح کیا۔''

اس روایت سے معلوم ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ پر واضح کر دیا کہ اسلام مشرق ومغرب یعنی پوری دنیا پر غالب آئے گا اور اب وہ زمانہ زیادہ دور نہیں جب اسلام کا جھنڈا پوری دنیا میں لہرائے گا اور دین حق تمام ادیان پر غالب آ جائے گا، چنانچہ صلح حدیبیہ، پھر فتح مکہ کے ساتھ فتوحات کا سلسلہ آگے بڑھا اور مشرق ومغرب کے علاقے فتح ہونا شروع ہو گئے، یہی وجہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ صحابہ کرام سے فرمایا کرتے تھے:

''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں ابو ہریرہ کی جان ہے، جو شہر بھی تم فتح کر چکے ہو اور جو قیامت تک فتح کرو گے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے پہلے سے اس کی چابیاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کر دی ہیں۔'' (السیرة لابن ہشام ج ۳ ص ۱۳۴)

غلبۂ دین کا سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا

حضرت ابو ہریرہؓ کے مذکورہ ارشاد سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ دین اسلام مشرق ومغرب پر غالب

ہونے کیلئے آیا ہے اور عملاً ایسا ہوا بھی (چنانچہ حضرت عمر اور حضرت عثمان کے دور میں یہ علاقے فتح ہوئے تو بوسیدہ و کافرانہ قیصری و کسروی نظام نیست و نابود کر دیے گئے اور ان کی جگہ نظامِ اسلام نافذ و جاری ہوگیا۔)وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ دین اسلام کے پوری دنیا میں غالب آنے کا سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا،لہٰذا مجاہدین پر لازم ہے کہ وہ غزوہ خندق میں شریک ہونے والے حضرات کی سنت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے غلبۂ دین کیلئے جہاد کریں اور اس کے لئے کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کریں، کیونکہ ماضی کی طرح آج بھی اور حضرت ابو ہریرہؓ کے بقول آئندہ بھی قیامت تک دینِ اسلام تمام ادیانِ باطلہ پر غالب آتا رہے گا اور مجاہدینِ اسلام فتوحات حاصل کرتے رہیں گے،بشرطیکہ وہ اس عظیم الشان مقصد کے لئے پرعزم ہوں جیسا کہ حضرات صحابہ کرامؓ نے عزمِ مصمم کے ساتھ اسلام کو مشرق ومغرب میں غالب کر دیا۔

قریش اور غطفان وغیرہ کے لشکر مدینہ سے باہر پہنچ چکے تو حی بن اخطب بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد کے پاس پہنچا اور کہا کہ میں ان لوگوں کو لے آیا ہوں، وہ جنگ کے لئے لشکروں سمیت پہنچ چکے ہیں اور ان کے عزائم یہ ہیں:

''یہ لوگ مجھ سے یہ وعدہ کر چکے ہیں کہ وہ محمد اور ان کے اصحاب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے تک ڈٹے رہیں گے۔'' (السیرۃ لابن ہشام ج ۳،ص ۱۳۵)

حی بن اخطب کی اس بات سے کفار کے عزائم کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت اور فتوحات کو روکنے اور مسلمانوں کو ختم کرنے کیلئے کس قدر بے چین اور انتقام وغصے سے بھرے ہوئے تھے اور وہ بہر صورت اس شمعِ اسلام کو گل کرنا چاہتے تھے۔جس کے لئے ہر ممکن حربہ آزما رہے تھے اور سر توڑ کوششیں کر رہے تھے۔حی بن اخطب نے بالآخر کعب بن اسد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کئے گئے معاہدے کو توڑنے پر راضی کر لیا اور اپنے ساتھ ملا لیا۔چنانچہ وہ قریظہ کے یہودیوں کے لشکر کے ساتھ مشرکین مکہ کے ساتھ جنگ میں شریک ہوگیا۔اس وقت جنگ کا خطرہ بڑھ گیا جیسا کہ ابن ہشام لکھتے ہیں:

''اس وقت صورت حال میں کشیدگی بڑھ گئی اور سخت خوف وہراس پھیل گیا اور دشمن نے اوپر نیچے ہر طرف سے انہیں گھیر لیا۔'' (السیرۃ لابن ہشام ج ۳،ص ۱۳۶)

اس مشکل وقت میں بعض منافقین (جیسے عبداللہ بن ابی وغیرہ) کہنے لگے:

کان محمد یعدنا ان ناکل کنوز کسری وقیصر واحدنا الیوم لایأمن علی نفسه ان یذهب الی الغائط .(تاریخ الاسلام ج ا ص ۱۹۰ ،(بذل القوۃ ص ۱۶۳))

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سے وعدے کیا کرتے تھے کہ ہم کسریٰ اور قیصر کے خزانے استعمال کریں گے، جبکہ آج ہماری حالت یہ ہے کہ جان کے خطرے کی وجہ سے کسی کو قضاء حاجت کی ہمت نہیں۔''

اس صورت حال کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:

﴿اِذْ جَاۗءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا﴾ (الاحزاب: ۱۱، ۱۲)

''جب چڑھ آئے تم پر اوپر کی طرف سے، اور نیچے کی طرف سے اور جب آنکھیں پھر گئیں اور دل گلوں تک پہنچ گئے۔''

کفار نے ایک مہینہ تک مدینہ کا محاصرہ کیے رکھا، اس کے بعد ''اللہ تعالیٰ نے انہیں ہوا اور ایسے لشکروں کے ساتھ شکست دی جو انہیں نظر نہ آتے تھے۔'' (بذل القوۃ ص ۱۶۴)

قریش، یہود اور دیگر قبائل عرب کی طرف سے دعوتِ اسلام کو روکنے اور اہلِ اسلام کو ختم کرنے یا انہیں دبانے کی یہ آخری اقدامی کوشش کی تھی جو بری طرح ناکام ہوئی، چنانچہ غزوۂ خندق سے واپسی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لن تغزوکم قریش بعد عامکم هذا ولکنکم تغزونهم.

(السیرۃ لا بن هشام ج ۳، ص ۱۶۰)

''اس سال کے بعد قریش حملہ آور ہو کر تم سے جنگ نہ کر سکیں گے بلکہ تم ان پر حملہ آور ہو کر جنگ کرو گے۔''

صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشن گوئی درست ثابت ہوئی، غزوۂ احزاب کے بعد قریش کو مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہ ہوئی جیسا کہ ابن ہشامؒ لکھتے ہیں:

''قریش اس کے بعد حملہ آور نہ ہوئے اور آپ نے ہی ان کے خلاف جنگ کی یہاں تک کہ اللہ نے آپ کو مکہ فتح کرایا۔'' (السیرۃ لا بن ہشام ج ۳، ص ۱۶۰)

غزوہ بنی قریظہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کے بعد دوسرے قبائلِ یہود کی طرح بنو قریظہ سے

بھی امن معاہدہ ہو چکا تھا، لیکن انہوں نے غزوہ احزاب میں شرکت کر کے معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ غزوۂ احزاب سے واپسی کے بعد جبرائیل علیہ السلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بنوقریظہ کا فتنہ ختم کرنے کا خداوندی حکم سنایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا محاصرہ کیا جو ایک ماہ تک جاری رہا۔ آخر کار انہوں نے حضرت سعد بن معاذؓ کو فیصل مان لیا کہ وہ جو فیصلہ دیں گے، ہمیں منظور ہے، چنانچہ حضرت سعد بن معاذؓ نے ان کی کتاب ''تورات'' کے مطابق فیصلہ دیا کہ ''لڑنے والے مرد قتل کیے جائیں، عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا جائے اور ان کے اموال تقسیم کر دیے جائیں۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ سنا تو حضرت سعدؓ سے فرمایا:

قضیت بحکم اللہ . (صحیح البخاری کتاب المغازی باب مرجع النبی ﷺ)

''آپ نے اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔''

اسلحہ کی خریداری

بنوقریظہ کے اموال، عورتوں اور بچوں کی تقسیم کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد بن زید انصاری کو بنوقریظہ کے قیدی دے کر اسلحہ اور دیگر سامانِ جنگ کی خریداری کے لئے نجد بھیجا، ابن ہشامؒ لکھتے ہیں:

فابتاع لھم بھا خیلاً وسلاحاً. (السیرۃ لا بن ھشام ج ۳، ص ۱۵۲)

''وہ ان کے عوض گھوڑے اور اسلحہ خرید کر لائے۔''

جب انقلابی تحریک عسکری مرحلے میں چل رہی ہو تو اسے جنگی ساز و سامان کی شدید ضرورت ہوتی ہے، اس لئے اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ اگر مالِ غنیمت جیسا کوئی مال ہاتھ لگے تو اسے آلاتِ جنگ خریدنے میں صرف کیا جائے تاکہ حربی طاقت کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے۔

دھوکہ، فراڈ، سازش، بدعہدی یہود کی سرشت میں داخل ہے، اس لئے وہ فتنہ و فساد سے باز نہ آتے تھے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے مضافات میں رہنے والے تمام یہودیوں کو جلا وطن کر دیا تاکہ مدینہ ان کے شر و فساد سے محفوظ رہے۔ امام بخاریؒ ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ''بنونضیر اور بنوقریظہ نے لڑائی مول لی تو آپ نے بنونضیر کو جلاوطن کر دیا جبکہ بنوقریظہ پر احسان کرتے ہوئے انہیں برقرار رکھا، پھر انہوں نے بھی لڑائی کی تو ان کے مردوں کو قتل کیا، ان کی عورتیں اور مال و اسباب مسلمانوں مین تقسیم کر دیا مگر بعض لوگوں نے آپ کے پاس آ کر مل گئے تو آپ نے انہیں دیا تو وہ مسلمان ہو گئے، مدینہ کے تمام یہود کو جلاوطن کر دیا جن میں بنوقینقاع (جو عبداللہ بن سلام

کا قبیلہ تھا) بنو حارثہ شامل تھے۔'' (صحیح بخاری کتاب المغازی باب حدیث بنی النضیر)

اس سے معلوم ہوا کہ اگر یہود جیسے بدفطرت اور شرارتی اور فسادی لوگ تحریک و جہاد کے راستے میں مسلسل رکاوٹ ڈال رہے ہوں اور مجاہدین ان کے خلاف کاروائی کرنے کی طاقت رکھتے ہیں تو انہیں موقع کی مناسبت سے عبرتناک سزا دی جاسکتی ہے۔

مجاہدین میں تصادم کی سازش

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ شعبان ۶ ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع پہنچی کہ بنوالمصطلق مسلمانوں سے جنگ کیلئے تیاری کر کے مدینہ کی طرف آرہے ہیں، جن کی قیادت حارث بن ابی ضرار کررہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لشکر لے کر مقامِ مریسیع تک پہنچ گئے۔ یہاں دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا۔ لڑائی شروع ہوئی کچھ دیر فریقین میں تیروں کا تبادلہ ہوا، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے صحابہ کرامؓ نے یکبارگی حملہ کردیا۔ مشرکین نے شکست کھائی، کچھ مارے گئے، عورتوں اور بچوں کو قید کرلیا گیا، مویشی اور بکریاں بھی ہاتھ آئیں اور مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ اسی موقع پر حضرت عمرؓ کا ایک اجیر جو بنی غفار کے قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا اور جُہینہ کا ایک شخص جو خزرج کا حلیف تھا آپس میں لڑنے لگے تو جہینی نے آواز لگائی اے انصاریو! اجیر نے صدا لگائی: اے مہاجرو! عبداللہ بن ابی بن سلول یہ سن کر بہت غصہ ہوا وہ اس وقت اپنے آدمیوں میں بیٹھا ہوا تھا اس نے کہا کہ'' اچھا ان مہاجرین کے حوصلے یہاں تک پہونچے؟ انہوں نے ہمارے علاقہ میں آکر ہم سے رستہ کشی کی اور اپنی تعداد بڑھانے کی کوشش کی، واللہ یہ معاملہ ویسا ہی ہے جیسا اس مثال میں بیان کیا گیا ہے'' اپنے کتے کو خوب کھلا پلا کے موٹا کرو تو تم ہی کو کھائے گا۔'' خدا کی قسم! جب ہم مدینہ واپس جائیں گے تو وہاں کے باعزت اور سر برآوردہ وہاں کے ذلیل کو نکال باہر کرے گا۔'' (السیرۃ لابن ہشام ج ۳ ص ۱۸۵)

پھر اپنے آدمیوں کی طرف متوجہ ہو کر اس نے کہا:

هـذا مـافعلتم بأنفسكم أحللتموهم بلادكم وقاسمتوهم أموالكم أما والله لو أمسكتم عنهم مابأيديكم لتحولوا إلى غير داركم. (السيرة لابن هشام ج۳، ص ۱۸۵)

''یہ سب کچھ تم نے اپنے ہاتھوں کیا ہے۔ تم نے اپنے وطن میں ان کو جگہ دی، اپنا مال اپنے اور ان کے درمیان تقسیم کیا، خدا کی قسم! اگر تم اپنے ہاتھ کو ذرا روک لیتے اور اس قدر فراخ دلی سے کام نہ لیتے تو وہ یقیناً دوسرا گھر دیکھتے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مجاہدین کو عبداللہ بن ابی کی اس بات کا علم ہو گیا تھا۔ لشکرِ اسلام مدینہ روانہ ہو گیا۔ عبداللہ بن ابی کے فرزند عبداللہ لشکر سے پہلے مدینہ پہنچ گئے اور راستہ میں اپنے باپ کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے، انہوں نے عبداللہ بن ابی کو دیکھا تو اپنا اونٹ بٹھا لیا اور کہا کہ میں تمہیں اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا، جب تک کہ اپنی زبان سے تم نہ کہہ دو کہ میں ذلیل ہوں اور صاحب عزت محمد ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ اس درمیان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُدھر گذر ہوا آپؐ نے یہ سن کر فرمایا عبداللہ جانے دو! جب تک وہ ہمارے درمیان ہیں ہم ان کے ساتھ اچھا ہی سلوک کریں گے۔ ابن اسحاق روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عبداللہ بن ابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ آپ میرے والد عبداللہ بن ابی کو قتل کروانا چاہتے ہیں:

''اگر آپ نے ضرور ایسا کرنا ہے تو مجھے حکم دیجیے میں اس کا سر قلم کر کے آپ کی خدمت میں پیش کروں۔'' (السیرۃ لابن ہشام ج ۳، ص ۱۸۷)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''نہیں بلکہ جب تک وہ ہمارے درمیان میں ہیں ہم ان کے ساتھ اچھا ہی سلوک کریں گے۔''

صلح حدیبیہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے ابتدائی تیرہ سال مکہ میں گزارے تھے۔ حبشہ کی طرف آپ کے رفقاء نے دو مرتبہ ہجرت کی تھی مگر آپ خود مکہ میں ہی موجود رہے۔ انصار کے قبولِ اسلام اور آپ کے ہاتھ پر مدد و نصرت کی بیعت کے بعد ہی آپ مدینہ تشریف لائے تھے۔ مکہ ہر لحاظ سے خصوصاً مذہبی طور پر جزیرۂ عرب کا مرکز و مرجع تھا۔ اس لئے اس کو فتح کیے بغیر پورے جزیرۂ عرب اور پھر پوری دنیا میں اسلام کا پھریرا لہرانا ممکن نہ تھا۔ آپ کئی بار اس کی فتح کی پیشین گوئی اور خوشخبری دے چکے تھے۔ آپ نے عمرہ کی ادائیگی سے متعلق خواب دیکھا تو اپنے اصحاب کو ساتھ لے کر عمرہ کی ادائیگی کیلئے مکہ روانہ ہو گئے۔ قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص قریش کی جاسوسی کیلئے آگے بھیج دیا گیا۔ قافلہ غسفان کیقریب پہنچا تو اس نے آ کر بتایا کہ قریش آپ کی روانگی کی اطلاع پا کر تمام قبائل کو متحد کر کے آپ کے خلاف جنگ کیلئے تیاری کر رہے ہیں۔ (صحیح البخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الحدیبیۃ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمنے قافلے سمیت حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ کیا جو مکہ سے صرف ایک منزل

کے فاصلہ پر ہے۔قبیلہ بنوخزاعہ جو آپ کا حلیف تھا، کا سردار بدیل بن ورقاء آپ کے پاس آیا اور کہا کہ قریش آپ کے خلاف جنگ کیلئے تیار ہو چکے ہیں۔ وہ حلف اٹھا چکے ہیں کہ آپ کو بیت اللہ میں داخل نہ ہونے دیں گے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی جرأت مندانہ مؤقف اختیار کرتے ہوئے فرمایا:

''ہم کسی سے جنگ لڑنے کے ارادے سے نہیں آئے۔ہم تو صرف عمرہ کرنے کے لئے آئے ہیں۔قومِ قریش کو جنگ نے نقصان پہنچایا اور انہیں انتہائی کمزور کر دیا ہے۔اگر یہ چاہیں تو میں ان سے ایک محدود مدت تک معاہدہ کرسکتا ہوں، وہ ہمارے اور لوگوں (قبائل عرب) کے درمیان حائل نہ ہوں۔اگر میرا امر لوگوں پر غالب آ گیا تو انہیں (قریش کو) اختیار ہوگا کہ دیگر لوگوں کی طرح داخل اسلام ہو جائیں یا اس مدت تک راحت سے رہیں۔اگر انہوں نے یہ بات قبول کرنے سے انکار کر دیا تو اللہ کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے میں تو اپنے اس امر (اسلام) پر ان سے جنگ کرتا رہوں گا یہاں تک کہ یا تو میری جان چلی جائے اور یا اللہ تعالیٰ اس امر کو نافذ کر دیں۔''

(صحیح البخاری کتاب الشروط باب فی الجہاد، ایضا کتاب المغازی للواقدی ج ۲ ص ۵۹۳)

الشیخ محمد یوسف الکاندھلویؒ یہ الفاظ نقل کرتے ہیں:

یاویح قریش!لقد اکلتهم الحرب لوخلوا بینی وبین سائر العرب.

(حیاة الصحابه ج ۱ ص ۳۱، ۳۲)

''قریش پر افسوس ہے! انہیں جنگ کھا چکی ہے۔کاش! یہ میرے اور تمام عرب (قبائل) کے درمیان حائل نہ ہوں۔''

ابن ابی شیبہ نے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

فانی لاقاتلن علی هذاالامر الاحمر والاسود حتی یظهرنی الله اوتنفرد سالفتی. (مصنف ابن ابی شیبه کتاب المغازی باب غزوة الحدیبیة)

''میں اس امر (اسلام) کی خاطر عرب وعجم سے قتال کرتا رہوں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ مجھے غالب کر دیں یا میری جان چلی جائے۔''

پختہ کار سفیر

آپ نے حضرت عثمان بن عفان کو اپنا سفیر بنا کر قریش کی طرف بھیجا۔سیدنا عثمان بن عفانؓ نے قریش کے سرداروں تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچایا تو انہوں نے کہا کہ اگر تم بیت اللہ کا طواف

کرنا چاہتے ہوتو کر سکتے ہو، اس پر انہوں نے کہا:

''جب تک اللہ کے رسول طواف نہیں کرتے تب تک میں نہ کروں گا۔''

(السیرۃ لابن ہشام ج ۳، ص ۲۰۴)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ سفیرِ رسول حضرت عثمانؓ کس قدر پختہ کار تھے کہ انہوں نے محض اپنی ذات کیلئے قریش کی پیشکش کو ٹھکرا دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر طواف کرنے سے انکار کر دیا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ قاصد اور سفیر کو سفارت کے اصول وآداب کی مکمل پابندی کرنی چاہئے، خصوصاً جب وہ ایک تحریک کا رکن اور مجاہد ہو تو اسے ہر حال میں اپنے امیر کی اطاعت کرنی چاہئے، چاہے فریق مخالف جس قدر بھی پیشکشیں کرتے رہیں۔

بدیل بن ورقاء نے قریش کو یہ احوال سنائے تو انہوں نے عروہ بن مسعود کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ عروہ بن مسعود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سامنے بیٹھ کر کہا ''اے محمدؐ! آپ نے مختلف اقسام کے لوگوں کو جمع کر لیا ہے۔ اور پھر آپ اپنے قبیلے کی طرف آئے ہیں تا کہ اُسے شکست دیں۔ قریش نے بڑی بڑی تیاریاں کی ہیں اور درندوں کی کھالیں پہنی ہیں اور عہد کیا ہے کہ آپ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ اور واللہ وہ آپ سے بہت نزدیک ہیں۔ کل آپ کے مقابل آجائیں گے اور آپ کو بھگا دیں گے۔'' حضرت ابوبکر صدیقؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسِ پُشت بیٹھے تھے۔ انہوں نے بتوں کو بُرا بھلا کہتے ہوئے فرمایا کیا ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے؟

عروہ بن مسعود سے بات چیت کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی جواب دیا جو بدیل بن ورقاء کو دیا تھا۔ عروہ بن مسعود نے مکہ جا کر قریش سے کہا:

ای قوم واللّٰہ ! لقدوفدت علی الملوک ووفدت علیٰ قیصرو کسریٰ والنجاشی واللّٰہ ان رائیت ملکاً قط یعظمہ اصحابہ مایعظم اصحاب محمدمحمداًواللہ ان تنخم نخامۃً الا وقعت فی کف رجل منھم فدلک بھاوجھہ وجلدہ واذاامرھم ابتدروا امرہ واذاتوضأ کادوایقتتلون علی وضوئہ واذاتکلم خفضوا اصواتھم عندہ ومایحدون الیہ الفطر تعظیماً لہٗ.

(صحیح البخاری کتاب الشروط باب فی الجھاد)

''اے میری قوم اللہ کی قسم! میں مختلف بادشاہوں قیصر، کسریٰ اور نجاشی کے دربار میں جاتا رہا

ہوں، اللہ کی قسم! جس طرح محمد کے رفقاء اس کی تعظیم کرتے ہیں اس سے زیادہ کسی بادشاہ کی تعظیم ہوتے ہوئے میں نے نہیں دیکھی، انہیں جب بھی بلغم اور تھوک آتا ہے تو وہ کسی آدمی کے ہاتھ پر ہی گرتا ہے جسے وہ آدمی اپنے جسم پر مل لیتا ہے، وہ کسی کام کا اشارہ بھی کرتے ہیں تو اس پر عمل درآمد ہوتا ہے۔ وضو کرتے ہیں تو وضو کا پانی لینے والوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے اور ہر آدمی وضو کا بچا ہوا پانی لینا چاہتا ہے وہ اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں اور نہ اس کے سامنے آواز اونچی کرتے ہیں۔''

معاہدہ

عروہ بن مسعود کے بعد قریش نے سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا۔ اس نے آپ کے ساتھ شرائطِ صلح پر طویل گفتگو کی۔ آخر کار چند شرائط پر اتفاق کے بعد یہ معاہدہ طے پایا کہ ''فریقین دس سال تک جنگ نہ کریں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ اس سال واپس چلے جائیں گے اور عمرہ آئندہ سال غیر مسلح ہو کر کریں گے اور مکہ میں صرف تین دن قیام کریں گے۔ اہلِ مکہ میں سے کوئی شخص اگر مسلمان ہو کر مدینہ چلا جائے گا تو اسے واپس کیا جائے گا اور اگر کوئی مسلمان مرتد ہو کر مدینہ سے مکہ آیا تو اہل مکہ پر اسے واپس کرنا لازم نہ ہوگا۔''

صلح ہو رہی تھی، شرائط طے پا رہی تھیں کہ اس دوران ابو جندل بن سہیلؓ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے مکہ سے بھاگ کر یہاں آ پہنچے۔ آپ نے سہیل بن عمرو کی ضد اور اصرار پر انہیں حسبِ شرائط واپس کر دیا۔ ابو جندل نے مسلمانوں سے فریاد کی اور اپنے ساتھ ہونے والے جبر و تشدد کے بارے میں بتایا تو آپ نے اسے فرمایا:

یا ابا جندل! اصبر واحتسب فان الله جاعل لک ولمن معک من المستضعفین فرجاً ومخرجاً انا قد عقدنا بیننا و بین القوم صلحاً واعطینا هم علی ذلک واعطونا عهد الله وانا لا نغدر بهم. (السیرة لا بن هشام ج۳، ص ۲۰۷)

''اے ابو جندل! صبر کرو، اللہ کی رضا کی نیت کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سمیت کمزور لوگوں کیلئے کشادگی اور راستہ پیدا کریں گے، ہمارے اور اس قوم (مشرکینِ مکہ) کے درمیان صلح ہو چکی ہے اور عہد و پیمان ہو چکا ہے، اس لئے ہم اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ:

(الف) اگر ایسا موقع آ جائے جیسا کہ صلح حدیبیہ میں ابو جندل کے ساتھ پیش آیا تھا تو ارکانِ

تحریک کو چاہئے کہ وہ صبر وتحمل کا مظاہرہ کریں اور اجتماعی اور جماعتی مفاد کیلئے مزید ایثار کا مظاہرہ کریں۔

(ب) ارکان کو اس بات کا یقین ہونا چاہئے کہ مشکل حالات جلد ختم ہونے والے ہیں، یہ آزمائش کا زمانہ عارضی ہے۔ بہت جلد تاریکی ختم ہونے والی اور روشن دن طلوع ہونے والا ہے۔

(ج) تحریک کے مشکل حالات میں یہ نہ ہو کہ ارکان ان حالات میں اپنے بنیادی عقائد و نظریات بھلا بیٹھے اور اصول وشرائط کو پس پشت ڈال دے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابی ابوجندلؓ کی وجہ سے معاہدے کو نہیں توڑا اور مکمل پاسداری کی۔

مذکورہ معاہدۂ صلح بظاہر مغلوبانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض جلیل القدر صحابہ کرامؓ کو اس پر تشویش تھی۔ خصوصاً آخری شرط سے متعلق انہیں تردد تھا اس لیے آپ نے فرمایا:

انه من ذهب منا فابعده الله ومن جاء نامنهم سيجعل الله له فرجا ومخرجاً

(صحيح المسلم كتاب الجهاد والسير باب صلح الحديبيه)

''جو ہمیں چھوڑ کر ان کی طرف بھاگا اسے اللہ تعالیٰ دور کردیں گے اور ان میں سے جو ہمارے پاس آئے گا (اور ہم اسے واپس کردیں گے) تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے آسانی اور راستہ پیدا کریں گے۔''

درحقیقت صلح حدیبیہ آئندہ کی کامیابیوں کی ابتداء و دیباچہ تھی، کیونکہ یہ پہلا موقع تھا جب قریش نے جنگ کا راستہ چھوڑ کر صلح پر آمادگی ظاہر کی اور آپ کی حیثیت وطاقت کو تسلیم کیا، ورنہ اس سے پہلے وہ آپ اور آپ کے اصحاب کو کوئی اہمیت دیتے اور نہ ان کی کوئی حیثیت تسلیم کرتے تھے بلکہ ان کی بھرپور کوشش رہی کہ اسلام اور داعیانِ اسلام کو ختم کردیا جائے، جس کیلئے انہوں نے مکی زندگی کے دوران اور مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد غزوۂ بدر، احد اور خندق کی صورت میں عملاً ایسا کرنے کی ناکام سعی کی، اس لئے ان کا آپ کو ایک فریق مان کر صلح کا معاہدہ کرنے اور دس سال تک کوئی جنگ نہ کرنے اور امن وامان سے رہنے کے عہد کرنے میں ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جانثار صحابہؓ کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ اس صلح کا ایک بڑا ثمرہ وہ جنگ بندی اور امن کی فضا تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں کو اطمینان کی سانس لینے اور کسی قدر آرام کرنے، نیز اس پُرامن وقفہ میں یکسوئی کے ساتھ اس دعوت اسلام کا فریضہ ادا کرنے کا بہترین موقع مل گیا۔

اس صلح کے بعد مسلمانوں اور مشرکوں کو جواب تک باہم دست وگریبان تھے ایک دوسرے سے

ملنے جلنے اورایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع بھی ملااوراس کی وجہ سے اسلام کے وہ محاسن اورخوبیاں مشرکین کے سامنے آئیں جواب تک اس قدر واضح طور پر نہ آسکی تھیں اوریوں اسلام کی تعلیمات کی اشاعت عام ہونے لگی، چنانچہ اس صلح پرایک سال بھی نہ گذرا تھااور مکہ بھی ابھی فتح ہونا باقی تھا کہ عربوں کی ایک بڑی تعداد داخلِ اسلام ہوگئی۔ابن شہاب زُہری فرماتے ہیں:

فمافتح فی الاسلام فتح قبله کان اعظم منه .(السیرة لابن هشام ج۳ص ۲۱۰)

''اسلام اس سے پہلے اتنی بڑی کوئی فتح حاصل نہیں ہوئی۔''

جب فریقین (قریش اور مسلمان) میں صلح ہوئی جنگ بندی کا اعلان ہوااورلوگ بلاخوف وخطر ایک دوسرے سے ملنے لگے اوران کے ساتھ رہنے اور بات چیت کرنے کا موقع ملا جس سمجھ دار آدمی سے اسلام کے بارے میں گفتگو کی گئی وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوگیا۔تنہاان دونوں برسوں میں اتنے آدمی داخلِ اسلام ہوئے جتنے اب تک ہوئے تھے بلکہ شایداس سے بھی زیادہ۔''

ابن ہشام لکھتے ہیں''زُہری کے قول کی مزید دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حدیبیہ میں (بروایت جابر بن عبداللہ) چودہ سوآدمی تھے۔اس کے دوسال بعد فتح مکہ کے موقع پرآپ کے ساتھ دس ہزار صحابہ کی جمعیت تھی۔''(ایضاً ص۲۱۱)

امام نووی صلح حدیبیہ سے متعلق لکھتے ہیں:

''اس صلح کے نتیجے میں ظاہر ہونے والے ثمرات اورواضح فوائد میں سے یہ ہے کہ بالآخر مکہ فتح ہوا،اہل مکہ مسلمان ہوگئے اورگروہوں کی صورت میں دین اسلام میں داخل ہوئے۔''

(شرح النووی لصحیح المسلم کتاب الجہادوالسیر باب صلح الحدیبیۃ)

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اسے فتح مبین قرار دیااورحدیبیہ سے واپسی پرسورۃ الفتح نازل ہوئی،جس میں اس''فتح مبین'' کی خوشخبری دی گئی۔

﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحاً مُّبِیْناً﴾(الفتح: ۱)

''(اے محمد) ہم نے تم کو فتح دی۔فتح بھی صریح وصاف۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو بلاکر یہ سورت سنائی تو حضرت عمر نے عرض کیا:

یارسول الله اوفتح هو قال نعم فطابت نفسه ورجع.

(صحیح المسلم کتاب الجهاد والسیر باب صلح الحدیبیة)

اے اللہ کے رسول! کیا یہی فتح ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، تب ان کا دل مطمئن ہو گیا اور انہوں نے اپنی بات (تشویش) سے رجوع کرلیا۔''

صحابہ کرام صلح حدیبیہ اور بیعتِ رضوان کو ہی فتح مبین شمار کرتے تھے۔ امام بخاری روایت کرتے ہیں کہ حضرت برا ابن عازب فرمایا کرتے تھے:

تعدّون انتم الفتح فتح مكة وقد كان فتح مكة فتحاً ونحن نعدّ الفتح بيعت الرّضوان يوم الحديبية. (صحيح بخارى كتاب المغازى باب غزوة الحديبية)

''فرمایا تم فتح مکہ کو فتح شمار کرتے ہو، فتح مکہ بھی فتح ہے لیکن ہم تو غزوہ حدیبیہ کے موقع پر ہونے والی بیعتِ رضوان کو فتح شمار کرتے ہیں۔''

امام ابن الجوزیہ صلح حدیبیہ کو فتح مکہ کا پیش خیمہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

انها كانت مقدمة بين يدى الفتح الاعظم الذى اعز الله به رسوله وجنده ودخل الناس به فى دين الله افواجاً فكانت هذى الهدنة باباً لهٗ مفتاحاً ومؤذناً بين يديه.

(زاد المعاد ج ۲ ص ۱۸۲)

''یہ صلح اس عظیم فتح کا پیش خیمہ تھی جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور لشکر کو غالب کیا اور لوگ اللہ کے دین میں گروہ درگروہ داخل ہوئے، پس یہ صلح اس عظیم فتح کا دروازہ، چابی اور اس کی طرف اشارہ تھا۔''

بادشاہوں کو خطوط

صلح حدیبیہ اسلامی دعوت اور تحریکِ جہاد کا وہ اہم اور تاریخی موڑ ہے جہاں سے اسلام کی وسعت و اشاعت اور فتح و غلبے کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ صلح حدیبیہ کے ذریعے قریش نے آپ کی حیثیت و مرتبے کو بادل نخواستہ تسلیم کرلیا تھا اور آپ اور آپ کے اصحاب کو ایک فریق مان لیا تھا بلکہ انہوں نے بالواسطہ آپ کی قوت و اقتدار کو بھی تسلیم کرلیا تھا۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد آپ نے متمدن دنیا کے بادشاہوں اور حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دینے کا ارادہ فرمایا، امام مسلمؒ نے حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کیا ہے کہ:

ان نبى صلى الله عليه وسلم كتب إلى كسرىٰ وإلى قيصر وإلى النجاشى وإلى كل جبار يدعوهم إلى الله. (صحيح المسلم كتاب الجهاد والسير باب كتب النبى

صلی ا للہ علیہ وسلم انی ملوک الکفار ایضاً المنتظم ج ۳ ص ۲۸۹)

''رسول اللہ ﷺ نے کسریٰ، قیصر، نجاشی اور ہر ایک سرکش (حاکم) کو مکتوب بھیجا۔''

حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھویؒ لکھتے ہیں:

''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مہر کے بنوانے سے فارغ ہوئے تو اسی (چھٹے) سال ذی الحجہ میں اپنے قاصدوں کو خطوط دے کر بادشاہوں کی طرف روانہ کیا جس میں آپ نے انہیں اسلام کی دعوت دی۔ آپ نے ذی الحجہ کے مہینے میں ایک ہی دن میں چھ قاصد (خطوط سمیت) روانہ فرمائے۔'' (بذل القوۃ ص ۱۷۹)

نجاشی کی طرف لکھے گئے خط میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

انّی ادعوک وجنودک الی اللہ عزوجل. (زاد المعاد ج ۳، ص ۸۹)

''میں تمہیں اور تمہاری افواج کو اللہ وعزوجل کی طرف بلاتا ہوں۔''

عمان کے دو حکمران بھائیوں جیفر اور عبد کی طرف لکھے گئے مکتوب گرامی میں آپ نے انہیں فرمایا:

فانکما اِن اقررتما بالاسلام ولیتکما واِن ابیتما ان تقرّا بالاسلام فان ملککما زائلٌ عنکما و خیل تحلّ بسا حتکما و تظھر نبوتی علیٰ ملککما.

(زاد المعاد ج ۳، ص ۸۱)

''اگر تم نے اسلام قبول کرلیا تو میں تمہیں حکمران بنادوں (برقرار رکھوں) گا، اگر تم نے قبولِ اسلام سے انکار کیا تو یاد رکھو تمہاری بادشاہت ختم ہونے والی ہے، میرے گھوڑے تمہارے ملک میں داخل ہوں گے اور میری نبوت تمہاری بادشاہت پر غالب آ کر رہے گی۔''

اس مکتوب گرامی میں آپ نے مخاطب پر واضح فرمادیا کہ تم بہر صورت مغلوب ہونے والے ہو، اگر اسلام قبول کرلو گے تو بادشاہت واقتدار بھی محفوظ رہے گا ورنہ بادشاہت بھی جاتی رہے گی اور آپ کی نبوت ان کی دنیاوی حکمرانی وبادشاہت کی جگہ لے لے گی۔

آپ نے یمامہ کے بادشاہ ھوذہ بن علی کو مکتوب بھیجا جس میں آپ نے سلام کے بعد لکھا:

اعلم ان دینی سیظھر الیٰ منتھی الخف والحافر فاسلم تسلم واجعل لک ماتحت یدیک (زادالمعاد ج ۳ ص ۸۳)

''جان لو! عنقریب میرا دین جہاں تک انسان اور جانور پہنچ سکتے ہیں وہاں تک پہنچے گا، تم اسلام

قبول کرلو با سلامت رہو گے اور میں تمہیں تمہارے اقتدار پر برقرار رکھوں گا۔''

ابو حاتم بن حبان نے اپنی صحیح میں انس بن مالک سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر کی طرف خط روانہ کرنے کا ارادہ کیا تو فرمایا ''کون میرے اس مکتوب کو قیصر کے پاس لے جائے گا، اس کیلئے جنت کا وعدہ ہے، ایک صحابی نے عرض کیا اگر چہ وہ اسے قبول نہ کرے؟ آپ نے فرمایا ہاں اگر چہ وہ اسے قبول نہ کرے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصرِ روم کی طرف خط روانہ کیا، جب اس نے یہ خط پڑھا تو اپنے دل میں قبولِ حق کا فیصلہ کیا اور اپنے وزراء، علماء اور مقربین کو بھی راضی کرنے کے لئے ان کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کیا:

یا معشر الروم هل لكلم فی الفلاح والرشدوان يثبت ملككم فتبايعوا هذاالنبی(صحيح البخاری باب كيف كان بدئو الوحی)

اے رومیو! کیا تم بھلائی، ہدایت اور یہ چاہتے ہو کہ تمہارا ملک باقی رہے تو اس نبی کی پیروی کرلو۔''

تمام لوگوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ہم نصرانیت کو چھوڑ سکتے ہیں اور نہ دوسروں کی غلامی قبول کر سکتے ہیں۔'' جب ھرقل نے یہ صورت حال دیکھی تو ان کے اسلام قبول کرنے سے مایوس ہو گیا اور وہ ان سے اپنی جان اور اپنی بادشاہت کے بارے میں خوفزدہ ہو گیا۔''

(الطبقات الكبری ج ۱ ص ۲۵۹)

قیصر نے ان کے منفی ردعمل سے مایوس ہوا اور اپنی بادشاہت کے بچاؤ کیلئے کہا کہ میں تو محض دین میں تمہاری استقامت کا امتحان لینا چاہ رہا تھا۔ ابن الدیبع الشیبانیؒ اس کے اس طرزِ عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لاتخفی سياسة هرقل وقوة ادراكه وثقوب فهمه بمااستدل به علىٰ صحة نبوة محمدصلی الله عليه وسلم وصدقه من البراهين الاقناعية لوسوعد بالتوفيق ولكن غلب عليه حب الرئاسة وهذاالدء العُضا الذی عكب علی ابليس فابی واستكبر مع سبق الشقاة.(حدائق الانوار ج ۲ ص ۶۳۹)

''ھرقل کی سیاست، قوت ادراک اور روشن فکر مخفی نہیں کہ اس نے اس کے ذریعے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی حقانیت پر استدلال کیا اور براہین کے ساتھ اس کی تصدیق کی۔ اگر اسے توفیق

ہوتی (تو وہ ایمان لے آتا) لیکن اس پر اقتدار کی محبت غالب آ گئی اور یہی وہ عاجز کرنے والا مرض ہے جو ابلیس پر غالب آیا تو اس نے انکار اور تکبر کیا کیونکہ بدبختی ازل سے اس کا مقدر تھی۔''

کسریٰ کی طرف عبداللہ بن حذافہ السہمی کو بھیجا گیا اس نے خط سننے کے بعد اسے پھاڑ دیا۔ قاصد نے واپسی پر بتایا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللهم مزق ملكه.

''اے اللہ! اس کے ملک اور بادشاہت کو برباد کر دے۔''

چنانچہ آپ کی یہ دعا پوری ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بادشاہت اور اس کی قوم کے ملک کو تباہ و برباد کر دیا۔ یمن کے حاکم باذان نے کسریٰ کے حکم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گرفتاری کے لئے دو آدمی بھیجے وہ مدینہ آئے تو آپ نے دوسرے دن ملنے کا کہا۔ دوسرے دن آپ نے انہیں کسریٰ کے اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں کسریٰ کے ہلاک ہونے کی خبر دیتے ہوئے فرمایا:

قولا له ان ديني وسلطاني سيبلغ مابلغ ملك كسرىٰ وينتهي الى منتهى الخف والحافر. (المنتظم ج ۳ ص ۲۸۳)

''اس سے کہو کہ یقیناً میرا دین اور میرا اقتدار عنقریب وہاں تک پہنچے گا جہاں تک کسریٰ کی بادشاہت ہے، اور وہاں تک بھی پہنچے گا جہاں تک انسان اور جانور پہنچ سکتے ہیں''۔

غزوۂ خیبر

مدینہ سے آٹھ منزل پر واقع خیبر کا علاقہ جزیرۂ عرب میں یہود کی طاقت کا مرکز تھا۔ سردارانِ بنو نضیر مدینہ سے جلاوطن ہو کر خیبر جا بسے تھے۔ انہوں نے اپنی سرشت کے مطابق یہودِ خیبر کو خصوصاً اور تمام قبائل عرب کو عموماً اسلام کی مخالفت اور مسلمانوں سے جنگ کرنے پر بھڑکا دیا تھا۔ جنگ احزاب کے محرک بھی یہی تھے۔ قریش سمیت تمام حلیف قبائل کو لے کر مدینہ پر چڑھ دوڑے تھے۔ غزوۂ خندق میں تو شکست سے دوچار ہوئے تھے، لیکن اپنے ازلی بغض وحسد کی بنا پر عداوت سے باز نہ آتے تھے اور وقتاً فوقتاً سازشیں تیار کرتے اور مختلف قبائل کو آمادۂ جنگ کرتے تھے۔ صلح حدیبیہ میں قریش سے دس سالہ معاہدہ کے بعد مسلمانوں کو اطمینان حاصل ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے فتنہ کا استیصال ضروری سمجھا، چنانچہ لشکرِ اسلام خیبر کی طرف روانہ ہوا۔

خیبر کے یہودیوں کو اپنے علاقہ اور مضبوط قلعوں پر بڑا ناز تھا۔ وہ انہیں ناقابلِ تسخیر سمجھتے تھے۔

اس لئے انہیں مکمل اطمینان تھا کہ رسول اللہ (ﷺ) ان پر حملہ آور نہیں ہو سکتے۔

(کتاب المغازی للواقدی ج ۲ ص ۶۳۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طریقہ سے لشکرِ اسلام لے کر پہنچے کہ انہیں معلوم بھی نہ ہوا کہ افواج اسلام ہم پر حملہ آور ہوا چاہتی ہیں۔ صبح کے وقت لوگ اپنے کام کاج کیلئے گھروں سے نکل کر روانہ ہو رہے تھے کہ اچانک لشکرِ اسلام کے ظہور سے بدحواس ہو کر واپس گھروں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے اور قلعہ بند ہو گئے لیکن ایک ایک کر کے تمام قلعے فتح ہوئے گئے اور بالآخر یہود نے مجاہدینِ اسلام کے ہاتھوں شکست کھائی۔

فتح مکہ کی راہ ہموار ہوتی ہے

جب اللہ تعالیٰ کی نصرت اور جہاد کی بدولت دینِ اسلام اور مسلمانوں کے پاؤں جم گئے اور اسلام کے مرکز مدینہ کی بنیادیں اچھی طرح مستحکم ہو گئیں، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو آزمالیا اور ان کے دلوں اور نیتوں کا پورا امتحان کر لیا۔ قریش کے ظلم و سرکشی، قبولِ حق سے انکار بلکہ راہِ حق میں رکاوٹیں کھڑی کرنے اور مسلمانوں سے مسلسل جنگیں کرنے کے باعث مشیتِ الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان مکہ میں فاتح بن کر داخل ہوں اور مکہ اور بیت اللہ کو پوری انسانیت عامہ کے لئے سرچشمۂ ہدایت و برکت بنائیں اور اس کے فیضانِ رحمت کو دنیا کے تمام انسانوں کے لئے عام کر دیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے خاص اسباب پیدا فرمائے اور خود قریش کو نادانستہ طور پر اس کا باعث اور محرّک بنا دیا اور ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا جو فتح مکہ کا باعث بن گیا۔ صلح حدیبیہ کے معاہدہ کی ایک دفعہ یہ تھی کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد و پناہ میں آنا چاہے وہ ایسا کر سکتا ہے اور جو شخص قریش کی پناہ اور عہد قبول کرنا چاہے وہ اس میں آزاد ہوگا چنانچہ بنو بکر نے قریش کی حمایت اور پُشت پناہی قبول کی اور خُزاعہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیف بننا پسند کیا۔ بنو بکر اور خُزاعہ میں بہت پرانی دشمنی تھی اور انتقامی کاروائیوں کا ایک سلسلہ جاری تھا کہ اسلام نے آ کر ان دونوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی۔ جب صلح حدیبیہ ہوئی اور یہ دونوں قبیلے دو مخالف کیمپوں میں تقسیم ہو گئے تو بنو بکر نے اس موقع پر غنیمت جان کر خُزاعہ سے اپنا حساب بے باق کرنا چاہا، بنو بکر کے کچھ لوگوں سے ساز باز کر کے خُزاعہ پر شبخوں مارا، لڑائی ہوئی اور خُزاعہ کے متعدد آدمی مارے گئے۔ قریش نے بنی بکر کی ہتھیاروں سے مدد کی اور قریش کے بڑے سردار اس جنگ میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر عمرو بن سالم

الخزاعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آ کر ملے اور آپؐ کے اور خزاعہ کے درمیان جو عہد و پیمان تھا اس کا واسطہ دے کر آپ کی حمایت و اعانت کے طالب ہوئے۔ نیز آپ کو بتلایا کہ قریش نے عہد شکنی کی ہے اور آپؐ کے عہد نامہ اور میثاق کو ختم کر دیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا ''عمرو بن سالم! تمہاری ضرور مدد ہو گی۔''

ابوسفیان کی صلح کیلئے مدینہ آمد

مشرکینِ مکہ اپنے حلیف قبیلے کا ساتھ دے کر معاہدۂ حدیبیہ توڑ چکے تھے۔ ان کے حریف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف بنوخزاعہ کا نمائندہ آپؐ کے پاس مدد و نصرت کیلئے پہنچ چکا تھا۔ اب قریش کو خطرہ لاحق ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ پر ضرور حملہ آور ہوں گے۔ اس لئے ابوسفیان معاہدہ کی مدت بڑھانے اور صلح کرنے کیلئے بھاگم بھاگ مدینہ آئے۔ ابن کثیر لکھتے ہیں:

خرج ابو سفیان من مکة الی رسول اللہ ﷺ وتخوف الذی کان.

(السیرة لابن کثیر ۳/ ۵۳۲)

''ابوسفیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کیلئے مکہ سے روانہ ہوئے، وہ ہونے والے واقعہ سے خوفزدہ ہو گئے تھے۔''

ابوسفیان رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صلح کی درخواست لیکن آپ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ پھر ابوبکر، عمر اور علی کے پاس آئے اور کوئی مثبت جواب نہ پا کر ناکام ہو کر واپس مکہ چلے گئے۔

فتح مکہ

بالآخر عرب کے مرکزی شہر اور قریش کے گڑھ مکہ کی فتح کا وقت آ گیا۔ یہ وہ فتح ہے جس سے فتوحات کا دروازہ کھلا اور اس کے بعد اسلام پورے جزیرۂ عرب پر چھا گیا بلکہ جزیرۂ عرب کی حدود سے نکل کر دنیا کے دیگر علاقوں اور ممالک میں پھیلتا گیا۔ امام ابن القیم الجوزیہ اس عظیم الشان فتح سے متعلق لکھتے ہیں:

الّذی اعز اللہ بہ دینہ ورسولہ وجندہ وحزبہ الامین واستنقذ بہ بلدہ و بیتہ الذی جعلہ ھدیً للعالمین من ایدی الکفار والمشرکین. (زاد المعاد ۳/ ۳۹۴)

''اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے دین، رسول، لشکر اور اپنی جماعت کو غالب کیا، اس کے ساتھ کفار اور مشرکین کے قبضے سے اپنے شہر اور گھر جسے اس نے عالمین کیلئے ہدایت کا ذریعہ بنایا ہے، آزاد کروایا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار صحابہ پر مشتمل لشکر تیار کر کے مکہ پر حملے کے لئے روانہ ہوئے۔ لشکرِ اسلام مکہ میں اس شان سے داخل ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ ابوسفیان کو دستوں کے گزرنے کے مقام پر لے جاؤ تا کہ وہ انہیں دیکھ سکیں۔

''قبائل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گزرنے لگے، ابوسفیان کے سامنے ایک ایک دستہ گزرنے لگا۔'' (صحیح بخاری کتاب المغازی باب این رکز النبی ﷺ الرایۃ)

جب بھی کوئی قبیلہ گزرتا تو ابوسفیانؓ حضرت عباسؓ سے اس کی بابت ضرور دریافت کرتے اور جب وہ اسے بتاتے تو وہ کہتے کہ مجھے فلاں سے کیا واسطہ؟ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دستے کے جلو میں تشریف لائے۔ آپ مہاجرین وانصار کے درمیان فروکش تھے۔ ابوسفیانؓ نے کہا: سبحان اللہ! اے عباسؓ یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ انصار ومہاجرین کے جلو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ ابوسفیان نے کہا: بھلا ان سے محاذ آرائی کی کسے طاقت ہے؟ اس کے بعد اس نے مزید کہا:

واللّٰه یاابا الفضل لقد اصبح ملک ابن اخیک الغداۃ عظیماً

''ابوالفضل! اللہ کی قسم تمہارے بھتیجے کی بادشاہت تو بڑی زبردست ہوگئی۔''

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا:

یااباسفیان انها النبوۃ (السیرۃ لا بن هشام ج ۳، ص ۲۰۷)

''ابوسفیان! یہ (بادشاہت نہیں) نبوت ہے۔''

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ صلح حدیبیہ ہی فتح مکہ کی ابتداء تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو سورۃ الفتح تلاوت فرما رہے تھے۔ امام بخاری، عبداللہ بن مغفلؓ سے روایت کرتے ہیں:

''فتح مکہ کے روز میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ اونٹنی پر سوار ہیں اور سورۃ الفتح ترجیع کے ساتھ پڑھ رہے ہیں۔'' (بخاری کتاب المغازی باب این رکز النبی ﷺ الرایۃ)

فاتح کی شانِ تواضع

حضرت انسؓ سے روایت ہے:

دخل رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم مکة یوم الفتح وذقنه علیٰ رحله متخشعاً. (السیرۃ لا بن کثیر ۵۵۵/۳)

''فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں اس حالت میں داخل ہوئے کہ تواضع اور خشیتِ الٰہیہ کی وجہ سے آپ کی ٹھوڑی آپ کی اونٹنی کے کجاوے سے لگ رہی تھی۔''

آثارِ شرک کا خاتمہ

لشکرِ اسلام فاتحانہ مکہ میں داخل ہو چکا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ تشریف لائے اور شرکیہ عقائد کے خاتمہ کے ساتھ آثار و علاماتِ شرک کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا۔ امام بخاریؒ حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں:

دخل النبی ﷺ مکة یوم الفتح وحول البیت ستون وثلث مائة نصب فجعل یطعنها بعود فی یده ویقول جاء الحق وزهق الباطل وما یبدئ الباطل وما یعید. (صحیح بخاری کتاب المغازی باب این رکز النبی ﷺ الرایة ایضا،مسند الحمیدی رقم الحدیث ۸۶ ص ۴۶)

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فتح کے موقع پر مکہ میں داخل ہوئے تو بیت اللہ کے اردگرد تین سو ساٹھ بت نصب تھے، آپ کے ہاتھ میں جو عصا تھا آپ نے اس سے ان پر مارنا شروع کیا اور یہ فرماتے جاتے تھے کہ ''حق آ چکا اور باطل رسوا ہوا، باطل نہ ظاہر ہوگا اور نہ لوٹے گا۔''

حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھویؒ لکھتے ہیں:

''اس سال فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ دستے مکہ کے اطراف میں موجود بتوں کو توڑنے اور اسلام قبول نہ کرنے والوں پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیے۔''

(بذل القوة ص۲۲۴،۲۲۵)

فاتح کا مفتوحین سے خطاب

ابن کثیر، ابن اسحاق کی روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باب الکعبہ پر کھڑے ہوکر ارشاد فرمایا:

لا اله الا الله وحده لاشریک لهٗ صدق وعده ونصر عبده و هزم الاحزاب وحده الاکل مأثرةٍ او دم او مال یدّعی فهو موضوع تحت قدمیّ هاتین الّا سدانة البیت وسقایة الحاج...... یامعشر قریش ان الله قد ذهب عنکم نخوة الجاهلیة وتعظمها بالآباء، الناس من آدم و آدم من تراب ثم تلاهذه الآیة یایها الناس انّا خلقنکم من

ذکر و انثیٰ الآیة کلها ثم قال یامعشر قریش ماترون انی فاعل فیکم؟ قالوا خیراً اخ کریم وابن اخ کریم قال اذهبوا فانتم الطلقاء. (السیرة لا بن کثیر ۳/ ۵۷۰)

''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ۔وہ تنہا ہے ،اس کا کوئی شریک نہیں ۔اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا۔اپنے بندے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کی اور تنہا سارے جتھوں کو شکست دی۔سنو! بیت اللہ کی کلید برداری اور حاجیوں کو پانی پلانے کے علاوہ سارا اعزاز ،یا کمال یا خون میرے قدموں کے نیچے ہے ...... اے گروہ قریش! اللہ تعالیٰ نے تمہاری جاہلیت والی نخوت اور آباؤ اجداد کے ذریعے تفاخر ختم کر دیا ہے۔تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم (علیہ السلام) مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔(پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی)''اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے، پھر فرمایا ''اے گروہ قریش! تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کروں گا، کہنے لگے: اچھا برتاؤ کرو گے کیونکہ تم نیک دل ہو اور نیک دل کے فرزند ہو'' آپ نے فرمایا'' جاؤ تم آزاد ہو۔''

مکہ، جزیرۂ عرب کا مذہبی اور سیاسی مرکز

مکہ چونکہ جزیرۂ عرب کا مذہبی اور سیاسی مرکز تھا۔اس لئے قبائل عرب مستقبل پر نظر رکھے ہوئے تھے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ فتح کر لیتے ہیں اور قریش پر غالب آ جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ سچے نبی ہیں، لہٰذا ہم بھی اسلام قبول کر لیں گے۔اگر مکہ فتح نہیں ہوتا اور یہ مرکزی شہر مشرکین کے قبضہ میں رہتا ہے تو پھر قبولِ اسلام کی ضرورت نہ پڑے گی۔امام بخاری عمرو بن مسلمۃ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم ایسی جگہ رہتے تھے جہاں لوگوں کا راستہ تھا اور قافلے گزرتے تھے، ہم ان سے قبائل عرب کے حالات کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی پوچھا کرتے تھے اور قبائل عرب کا یہ حال تھا:

کانت العرب تلوم باسلامهم الفتح فیقولون اترکوه و قومه فانه ان ظهر علیهم فهو نبی صادق فلمّا کانت وقعة اهل الفتح بادر کل قوم باسلامهم وبدر ابی قومی باسلامهم (صحیح بخاری کتاب المغازی باب مقام النبی ﷺ بمکة)

''قبائل عرب قبول اسلام کیلئے فتح کا انتظار کر رہے تھے،وہ کہتے تھے اس (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور اس کی قوم کے معاملے کو چھوڑ دو، اگر وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ان (اہل مکہ) پر غالب آ گیا تو یہ برحق نبی ہوگا۔چنانچہ جب فتح ہو چکی تو ہر قوم اسلام قبول کرنے لگی ،میرے والد نے میری قوم میں سب

سے پہلے اسلام قبول کیا۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ انقلابی تحریک کو چاہیے کہ وہ علاقے اور ملک کے مرکزی شہر پر قبضہ اور کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کرے تا کہ اس کے ذریعے دیگر شہروں کو کنٹرول میں لایا جا سکے اور جو لوگ ابھی تک گومگو کی کیفیت میں ہیں وہ اس سے نکلیں اور دعوتِ حقہ اور کامل و مکمل نظام کو قبول کر لیں۔

نئے مفتوحہ علاقوں کا انتظام اور استحکام

نئے مفتوحہ علاقوں کا نظم مضبوط بنانا اور اپنی حکومت کو مستحکم کرنا ضروری ہوتا ہے خصوصاً جب وہ مرکزی شہر اور دارالحکومت ہو تو اس میں استحکام حاصل کئے بغیر دوسرے شہروں پر قبضہ کرنا اور ان پر حکومت برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ عروہ بن زبیر روایت کرتے ہیں:

''حنین کی طرف روانہ ہوتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کیلئے معاذ بن جبل کو اپنا نائب مقرر کیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ اہل مکہ کو قرآن کی تعلیم دیں اور دین کے احکام سکھائیں۔''

(مغازی رسول اللہ ﷺ لعروۃ بن الزبیر ص ۲۱۳)

غزوۂ تبوک

ابن کثیر، ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، قتادہ اور دیگر حضرات کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ جب مشرکین کو حج اور دیگر مواقع پر حرم مکی میں داخلے سے روک دیا گیا تو قریش کہنے لگے کہ اس طرح تو ہمارا عرب کے تاجروں اور بازاروں سے تعلق ختم ہو جائے گا۔ اس کے بدلے میں اللہ تعالی نے جو انتظام فرمایا۔ اس سے متعلق ابن کثیر لکھتے ہیں:

فعوضهم الله عن ذلک بالامر بقتال اهل الكتاب حتى يسلموا او يعطوا الجزية عن يدوهم صاغرون قلت فعزم رسول الله ﷺ على قتال الروم لانهم اقرب الناس اليه و اولى الناس بالدعوة الى الحق لقربهم الى الاسلام واهله وقدقال الله تعالى "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ. (التوبه: ۱۲۳)(السيرة لا بن كثير ۴/ ۲)

''اس کے عوض اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے قتال کا حکم دیا تا آنکہ وہ مسلمان ہو جائیں یا رسوا ہو کر جزیہ دیں، میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں سے لڑائی کا عزم کیا اس لئے کہ وہ لوگوں میں اس کے سب سے زیادہ قریب تھے اور دعوتِ حق دیے جانے کے لوگوں میں سب سے زیادہ

مستحق تھے کیونکہ وہ اسلام اور اہل اسلام کے زیادہ قریب تھے (اہل کتاب ہونے کی بنا پر) جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''اے مومنو! اپنے قریبی کفار سے قتال کرو، چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں، جان لو! اللہ (کی مدد) متقین کے ساتھ ہے۔''

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع پہنچی کہ رومیوں نے ایک بہت بڑی جمعیت شام میں تیار کر لی ہے اور ہرقل (قیصر روم) نے اپنی افواج کو ایک سال کا راشن دے دیا ہے۔''

(طبقات ابن سعد ۲/ ۱۶۵)

امام بخاری روایت کرتے ہیں جب بھی رسول للہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ کا ارادہ کرتے تو توریہ (واضح نہیں بلکہ مبہم اشارے) کرتے لیکن غزوہ تبوک میں اس کے برعکس طرزِ عمل اختیار کیا:

''جب آپ نے اس غزوہ (غزوہ تبوک) کا ارادہ کیا جو سخت گرمی میں تھا اور آپ نے بہت دور مسافت، صحرائی علاقے اور کثیر تعداد رکھنے والے دشمن کا ارادہ کیا تو مسلمانوں کے سامنے معاملہ بالکل واضح کر دیا تاکہ وہ اس کیلئے خوب تیاری کر لیں، چنانچہ انہیں اپنا ارادہ بتا دیا۔ اس وقت آپ کے ساتھ مسلمانوں کی کثیر تعداد تھی۔'' (صحیح بخاری کتاب المغازی باب حدیث کعب بن مالک)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ:

(الف) جہاں توریہ کرنے اور اپنے لائحہ عمل کو چھپانے اور مبہم رکھنے میں بہتری اور جماعت اور تحریک کا مفاد ہو وہاں ایسا ہی کیا جائے۔

(ب) لیکن جب اس طرح کا موقع ہو کہ دشمن سے کھلم کھلا اور سخت لڑائی لڑی جانی ہو تو امیر اپنے ماتحت مجاہدین پر معاملے کو بالکل واضح کر دے تاکہ

(۱) مجاہدین اس کے لئے بھرپور تیاری کر لیں اور اپنی جان، مال اور گھر بار قربان کر کے پیش قدمی کریں بالفاظ دیگر کشتیاں جلا کر۔

(۲) جو لوگ مفادات کے حصول اور تحفظ کیلئے تحریک میں شامل ہو گئے ہیں ان کا نفاق بھی ظاہر ہو جائے گا۔ اس طرح کہ وہ اس موقع پر ہچکچائیں گے اور جہاد میں شریک ہونے سے بچنے کے لئے بہانے تراشیں گے۔

انفاق کی ترغیب

چونکہ اس عسرت اور تنگی کے زمانے میں ایک دور دراز علاقے میں جنگ لڑنے کے لئے ہر طرح

سے بھرپور تیاری کی ضرورت تھی اس لے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو جہاد اور انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دی۔ حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھویؒ لکھتے ہیں:

فیھا فی ایام خروجه ﷺ الی غزوة تبوک حث رسول الله ﷺ المؤمنين على الصدقات وعلىٰ تجهيز جيش تبوک. (بذل القوۃ ص ۲۶۴)

''غزوہ تبوک کیلئے روانگی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو صدقہ کرنے اور تبوک کیلئے جانے والے لشکر کو تیار کرنے کی ترغیب دی۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ امیر اہم اجتماعی مواقع پر اپنے ساتھیوں کو صدقہ کرنے کی ترغیب دے اور انہیں اجتماعی امور میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے پر ابھارے، تا کہ ان امور کو بھرپور تیاری کے ساتھ انجام دیا جا سکے۔

تبوک پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر کو خط لکھا۔ ہرقل قیصر روم نے اپنے علماء و درباریوں کو دربار میں جمع کر کے کہا: ''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاملے کو تم جانتے ہو۔ اس نے تین باتوں کی دعوت دی ہے یہ کہ میں اس کا دین قبول کرلوں، یا اس کو جزیہ دوں یا پھر جنگ کروں۔'' پھر درباریوں سے مخاطب ہو کر کہا:

والله قد عرفتم فيما تقرأون من الكتب ليأخذن ارضنا فهلمّ فلنتبعه علىٰ دينه او نعطيه مالنا علىٰ ارضنا. (السيرة لا بن كثير ۴/۲۷)

''اللہ کی قسم! تم جانتے ہو (جیسا کہ تم کتابوں میں پڑھتے آئے ہو) کہ وہ ہماری سرزمین ہم سے ضرور چھین لے گا، پس آؤ ہم اس کے دین کی اتباع کریں یا اسے جزیہ دیں۔''

رومیوں نے اسلام قبول کرنے اور جزیہ دینے سے انکار کر دیا۔ لشکرِ اسلام نے تبوک میں بیس روز تک پڑاؤ کیا لیکن رومیوں کو حملے کی ہمت نہ ہوئی، البتہ ایلہ کے حاکم یحنہ بن روبہ، جرباء اور اذرح کے باشندوں نے خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر جزیہ دینا منظور کیا اور دومۃ الجندل کے حاکم اکیدر نے گرفتاری کے بعد جزیہ دینا منظور کیا۔ (طبقات ابن سعد ۲/۱۶۶)

غزوہ تبوک آخری غزوہ تھا جس میں امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس شرکت فرمائی، یوں اسلامی ریاست کی حدود کو روم کی سرحدوں کے ساتھ ملا دیا اور اسلام کے مکمل و اکمل نظام کو جزیرہ عرب سے باہر دنیا کے دیگر ممالک میں بھی نافذ کرنے کی بنیاد رکھ دی، جس پر آپ کے جانشین خلفا نے ایک عظیم الشان قصرِ خلافت قائم کیا جس میں پوری انسانیت نے پناہ لے کر دنیا و آخرت کی سعادتیں

حاصل کیں۔

مسجد ضرار کا انہدام

ابو عامر نے منافقین سے کہا:

ابنو مسجد کم واستمدوا مااستطعتم من قوة وسلاح فانی ذاهب الی قیصر ملک الروم فاتی بجند الروم فاخرج محمداً واصحابه .(زاد المعاد ۳ ص ۱۳)

''تم اپنی مسجد بناؤ اور جس قدر طاقت اور اسلحہ جمع کر سکتے ہو جمع کرو۔ میں روم کے بادشاہ قیصر کے پاس جا رہا ہوں، میں رومی لشکر لاؤں گا اور محمد اور اس کے اصحاب کو نکال باہر کروں گا۔''

منافقین نے ابو عامر کے کہنے پر مسجد بنالی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک پر جانے کی تیاری کر رہے تھے تو اس کے بنانے والے آپ کے پاس آئے اور عرض کرنے لگے ''یارسول اللہ! ہم نے مسافروں اور اندھیری اور جاڑے کی رات کے چلنے والوں کے آرام کے لئے ایک مسجد بنائی ہے۔ آپ اُس میں تشریف لاکر ایک دفعہ نماز پڑھائیے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اب تو میں سفر کی تیاری میں مشغول ہوں۔ ہاں جب (انشاء اللہ تعالیٰ) واپس آؤں گا تو وہاں نماز پڑھوں گا۔ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس آتے ہوئے مقام ذی آوان میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے اس مسجد کی حقیقت سے آپ کو مطلع کیا۔ اور آپؐ نے مالک بن خشم اور معن بن عدی کو حکم دیا کہ تم جا کر ان ظالموں کی مسجد کو جلا دو اور مسمار کر دو۔ دونوں نے مل کر اس مسجد میں آگ لگائی اور اس کو بالکل گرادیا۔ جو لوگ اُس وقت مسجد میں تھے سب بھاگ گئے۔ قرآن کریم کی اس آیت میں اس مسجد کا بیان ہے:

﴿الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (التوبه :۱۰۷)

''اور جنہوں نے اس غرض سے مسجد بنائی کہ ضرر پہنچائیں اور کفر کریں اور مومنوں میں تفرقہ ڈالیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ حکم سے استدلال کرتے ہوئے ابن القیم الجوز یہ لکھتے ہیں:

کل مکان هذاشأنه فواجب على الامام تعطیله امّا بهدم وتحریق وامّا بتغییر صورته واخراجه عماوضع له .(زاد المعاد ج۳ص ۲۲)

''ہر وہ عمارت جس کی یہ صورت حال ہو امام (امیر المؤمنین) پر لازم ہے کہ وہ اسے گرا کر یا جلا کر ختم کر دے یا اس کی صورت تبدیل کر دے اور اسے پہلی والی وضع پر نہ باقی رہنے دے۔''

یعنی اگر مخالفین اور منافقین اسلامی حکومت کو نقصان پہنچانے کے لیے اس طرح کا مرکز بناتے ہیں

تو اس کا ختم کرنا ضروری ہے تاکہ فتنوں اور سازشوں کا سدِ باب کیا جا سکے۔

حجۃ الوداع

جب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے مقاصد کی تکمیل ہوگئی، لوگوں کے دل ودماغ شرک وبُت پرستی کی آلودگیوں اور جاہلیت کی فاسد عادتوں سے پاک اور ایمان و اسلام کی روشنی سے منور ہو گئے، فتحِ مکہ کے بعد بیت اللہ بھی بتوں کی گندگی سے پاک وصاف ہوگیا اور اللہ کا دین غالب آگیا اور بیت اللہ اسلام کا مرکز بن گیا، مسلمانوں کو حج بیت اللہ کئے ہوئے بہت عرصہ ہوگیا تھا چنانچہ ان کے اندر حج کا نیا شوق پیدا ہوا اور محبت اور عشق کا جام چھلکنے لگا، جدائی کی گھڑی بھی بہت قریب آگئی اور حالات کا تقاضہ ہوا کہ امت کو الوداع کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حج کی اجازت عطا فرمائی۔

خطبہء حجۃ الوداع

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلمنے عرفہ کے روز جو خطبہ دیا تھا، اس کا متن اور ترجمہ درج ذیل ہے:

ان دمائکم واموالکم حرام علیکم کحرمة یومکم هذا فی شهرکم هذا فی بدلکم هذا. الا! کل شیء من أمر الجاهلیة تحت قدمی موضوع، ودماء الجاهلیة موضوعة وإن اول دم أضعه من دماء نادم ابن ربیعة بن الحارث کان مسترضعا فی بنی سعد فقتله هذیل وربا الجاهلیة موضوع واول رباأضع من ربانارباعباس بن عبدالمطلب فإنه موضوع کله .... وقدترکت فیکم مالن تضلوا بعده ان اعتصمتم به کتاب الله وانتم تسئلون عنی فاذاأنتم قائلون؟ قالوا: نشهدانک قدبلغت واڈیت ونصحت فقال باصبعه السبابة یرفعها الی السماء وینکتها الی الناس اللهم اشهد اللهم اشهد ثلاث مرات.(صحیح مسلم کتاب الحج باب حجة النبی صلی الله علیه وسلم)

''تمہارا خون اور تمہارا مال اسی طرح حرام ہے جس طرح یہ دن اس مہینہ میں اور اس شہر میں حرام ہے یادرکھو کہ ہر جاہلی امر باطل ہے اور جاہلیت کے تمام خون (یعنی انتقامی خون) باطل کر دیئے گئے! اور سب سے پہلے میں (اپنے خاندان کا خون) ابن ربیعہ بن الحارث کا خون باطل کر دیتا ہوں جس نے بنی سعد میں پرورش پائی اور اس کو ہُذیل نے قتل کر ڈالا۔ جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیئے گئے اور سب سے پہلے اپنے خاندان کا سود عباس بن عبدالمطلب کا سود باطل کرتا ہوں، یہ سب کا سب باطل

ہے۔۔۔میں تم میں ایک چیز چھوڑ جاتا ہوں اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو گمراہ نہ ہو گے وہ چیز کیا ہے ؟ کتاب اللہ تم سے خدا کے ہاں میری نسبت پوچھا جائے گا تم کیا جواب دو گے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ ہم کہیں گے کہ آپ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا، اپنا فرض ادا کر دیا آپ نے شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور تین مرتبہ فرمایا ''اے اللہ تو گواہ رہنا۔''

تکمیلِ دین

فرائضِ نبوت ادا کر دیئے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقاصد رسالت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اللہ کے دین کی عمارت کا آخری حصہ پایۂ تکمیل کو پہنچا اور عمارت ہر لحاظ سے مکمل ہو گئی تب اللہ تعالیٰ نے تکمیل دین کی بشارت سناتے ہوئے فرمایا:

﴿الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا﴾ (سورہ ۵ آیت ۳)

'' آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام پسند کر لیا۔''

مکہ معظّمہ سے واپسی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کرام حج کے فرائض وواجبات سے فارغ ہو گئے تو ۱۴ ذی الحجہ کو مکہ سے مدینہ واپس ہوئے۔

آخری لشکر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کے علاقے میں جہاد کے لیے ایک لشکر ترتیب دیا، جس کا امیر اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو بنایا اور انہیں حکم دیا کہ ان کے گھوڑے ''بلقا'' اور داروم کی سرزمین تک ضرور جائیں جوارض فلسطین کا حصہ ہے۔ اس لشکر میں آپ نے مہاجرین وانصار کے چیدہ چیدہ اور جلیل القدر اصحاب کو شامل فرمایا جن میں سب سے نمایاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے، آپ نے ان کو سخت بیماری کی حالت میں وہاں پہنچنے کا حکم دیا۔ بعض لوگوں نے اس طرح کی باتیں کی تھیں کہ ایک نوعمر لڑکے کو جلیل القدر صحابہ، مہاجرین وانصار کا امیر بنایا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درد کی حالت میں سر پر پٹی باندھے ہوئے باہر تشریف لائے اور منبر پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی، پھر فرمایا:

'' لوگو! اسامہ کے لشکر کو روانہ کرو، اگر آج تم ان کی امارت کے بارے میں چہ میگوئی کرتے ہو

تو کل تم نے ان کے والد کی امارت پر بھی اعتراض کیا تھا، بے شک وہ امارت کے لائق اور اس کے مستحق ہیں، جیسے ان کے والد اس کے مستحق تھے۔''

اتنا فرمانے کے بعد آپ منبر سے نیچے اتر گئے اور صحابہ کرامؓ تیزی کے ساتھ تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علالت پہلے سے بہت بڑھ گئی، دوسری طرف اسامہ اس لشکر کو لے کر روانہ ہو گئے اور مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ''جُرف'' میں اپنا پڑاؤ ڈالا۔ اسامہ اور ان کے ساتھ لشکر اسلام یہاں رکا ہوا تھا کہ دیکھئے اللہ تعالیٰ کو کیا منظور ہے۔ آپ نے اسی مرض میں مسلمانوں کو وصیت فرمائی کہ:

''وہ اس لشکر کو اس طرح روانہ کریں جیسے آپ ان کو روانہ فرمایا کرتے تھے اور جزیرۃ العرب میں دو مذہب باقی نہ چھوڑیں اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ''مشرکین کو یہاں سے نکال دیا جائے۔''

اعلامِ رخصت

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیئیس سالہ محنت کے نتائج وثمرات اپنی مبارک آنکھ سے دیکھ چکے اور دعوت وجہاد کے ذریعے ایک عظیم الشان انقلاب برپا کر کے اللہ کے پسندیدہ اور منتخب دین اور نظام کو عملاً نافذ کر دیا اور اس نظام کو چلانے اور اسے جزیرۃ العرب سے باہر دنیا کے دیگر حصوں میں توسیع دینے والے اصحاب کرام تیار ہو چکے تو اب آپ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو گئے، چنانچہ درج ذیل آیات نازل ہوئیں:

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجاً فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا﴾ (النصر)

''جب آپہنچے خدا کی مدد اور فتح اور آپ لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہوتا ہوا دیکھ لیں تو اپنے رب کی تسبیح وتحمید کیجئے اور اس سے مغفرت کی درخواست کیجئے، وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس سورت کے نزول کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کا اعلامیہ قرار دیا، کیونکہ مقاصد رسالت پوری طرح مکمل ہو چکے اور آپ اپنے فرائض ادا کر چکے تھے، لہٰذا خالق ارض وسماء سے ملاقات کا وقت قریب آ چکا تھا اور اس ذوق شوق میں بے چینی بھی شامل ہو رہی تھی، چنانچہ آپ رفیق اعلیٰ تشریف لے گئے۔

غلبۂ اسلام اور اظہارِ دین

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق اعلیٰ تشریف لے جانے کے بعد آپ کے جانشین خلفاء

راشدین نے آپ کے مشن اور مقصد ''اظہارِ دین'' کے عالمی حصہ کی تکمیل کی۔ حضرت ابوبکر الصدیق ؓ کے مبارک دور اور اس کے بعد خلافتِ فاروقی اور خلافتِ عثمانی میں اس کا کامل ظہور ہوا۔ خلفائے راشدین کے جہادِ مسلسل سے قیصر و کسریٰ کی شہنشاہیت کا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہوگیا، ان کا جبر و استحصال پر مبنی نظام درہم برہم ہوا، شیطانی و طاغوتی معاشرہ ختم ہوا، انسانوں کے بنائے ہوئے ظلم وستم پر مبنی اصول وضوابط کالعدم کردیئے گئے، انسانیت نے امن وسکون کا سانس لیا اور دورِ جاہلیت ختم ہو اجبکہ اسلامی نظامِ خلافت کا شاندار اور سنہری دور شروع ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ خلفائے راشدین کے دور کو زمانۂ نبوت کا حصہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایام خلافت بحقیقت ایام نبوت بود۔ (ازالۃ الخفاء ج ا ص ۱۰۰)

''دراصل (ان خلفاء کا) زمانہ خلافت (تتمۂ) زمانہ نبوت تھا۔''

چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے اس وقت کی دو بڑی طاقتوں روم و فارس کو فتح کرنا بھی شامل تھا، جیسا کہ امام ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''پس این ہمہ نعم الٰہی است و وجود این امور معجزۂ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و بعثت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم متضمن است فتح فارس را'' (اِزالۃ الخفاء:۱۹۲/۳)

''یعنی یہ سب (روم و فارس کی فتوحات) اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں اور ان امور کا وجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت فارس کی فتح کو متضمن ہے۔''

اسلام کے مکمل غلبہ اور اظہارِ دین کا اظہار حضرت عمر فاروقؓ کے مبارک دور میں ہوا۔ امام ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں:

'' سالِ پانزدہم و سالِ شانزدہم فرقانِ اکبر درمیانِ اسلام وکفر بسعی واہتمام اورضی اللہ عنہ بظہور پیوست و اینجا واضح گشت کہ تسمیۂ خلیفۂ ثانی بفاروقِ اعظم بچہ وجہ بودہ است۔'' (إزالۃ الخفاء: ۱۹۱/۳)

''یعنی پندرہویں اور سولہویں سال میں ان (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کی مساعی اور اہتمام سے اسلام اور کفر کے درمیان فرقانِ اکبر (یعنی کامل امتیاز و فرق) کا پورا پورا ظہور ہوگیا اور اس موقع پر یہ واضح ہوگیا کہ خلیفۂ ثانی کو فاروقِ اعظم لقب دینے کی وجہ کیا ہے؟''

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں فارس، عراق جزیرہ خراسان، بلوچستان، شام، فلسطین، مصر، آرمینیا وغیرہ کے علاقے فتح ہوئے اور دنیا کی دو بڑی طاقتوں روم و فارس پر اسلامی پرچم لہرادیا گیا۔

حصہ چہارم

عصرِ حاضر میں
نبوی طریقۂ کار
کیوں اور کیسے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ
يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

(آل عمران: ۳۱)

''اے نبی کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت
رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تا کہ خدا بھی تم سے
محبت کرے اور تمہارے گناہ بھی معاف کر دے
اور اللہ تو بخش دینے والا مہربان ہے۔''

فصل اوّل:

اقامتِ خلافت کی شرعی حیثیت

گذشتہ صفحات میں اسلامی معاشرے کی تشکیل اور غلبۂ دین کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اختیار کردہ طریقے اور ترتیب کو بیان کیا گیا ہے۔ آئندہ سطور میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ موجودہ اور آیندہ زمانے میں نبوی طریقۂ کار کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں کس طرح اسلامی نظام کے نفاذ اور غلبۂ دین کا عظیم مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے۔

جب دینِ اسلام غالب ہوتا ہے اور اسلام بطور ریاستی نظام کے نافذ ہوتا ہے تو اسے ''خلافت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گویا غلبۂ دین کی عملی شکل ''نظامِ خلافت'' کا قیام ہے، لہٰذا غلبۂ دین سے مراد اسلامی نظامِ خلافت کا قیام ہے کیونکہ نظام خلافت کا مقصد اللہ تبارک وتعالیٰ کے عطا کردہ دین اسلام کو غالب کرنا ہے۔ اس لیے خلافت کے قیام اور امیر المؤمنین اور خلیفۃ المسلمین کے تقرر کو فرض قرار دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات میں انسان کو اپنا جانشین اور نائب بنایا ہے اور جب آدم علیہ السلام کی تخلیق کرنا چاہی تو اسے اپنا خلیفہ قرار دیا۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ إِنِّيْ جَاعِلٌ فِيْ الْأَرْضِ خَلِيْفَةً ﴾ [البقرة : ۳۰]

''یقیناً میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔''

امام قرطبی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" هـٰذه الآيةُ أَصْلٌ فِي نَصْبِ إمامٍ وَخَلِيفة يُسْمَعُ لهُ ويُطَاعُ لتجتمع به الكلمة وتَنْفُذُ بِهِ احكام الخَلِيْفَةِ ولا خلافَ في وُجوبِ ذٰلِكَ بَيْنَ الأمةِ ولَا بَيْنَ الأئمة.

(الجامع لاحكام القرآن ج ا ص ۲۵۱)

''یہ آیت امام وخلیفہ کے تقرر کے بارے میں قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسا امام جس کی بات سنی جائے اور اس کی اطاعت کی جائے تاکہ کلمہ (اسلام کی شیرازہ بندی) اس سے مجتمع رہے اور خلیفہ کے احکام نافذ ہوں۔ امت اور آئمہ میں خلیفہ کے تقرر کے واجب (فرض کفایہ) ہونے میں کوئی

اختلاف نہیں ہے۔''

مندرجہ بالا آیت کی تفسیر سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ امام اور خلیفہ کا تقرر واجب ہے جس کے بارے میں فقہاء کرام کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

وہ تمام آیات احکام جن کا تعلق حکومت وریاست کے ساتھ ہے۔ ان کا نفاذ اور اجراء حاکم وخلیفہ کے وجود پر موقوف ہے۔ جب تک نظامِ خلافت کا قیام اور خلیفہ کا تقرر نہیں ہوتا اور اس کے تحت اسلامی عدالتی نظام قائم نہیں ہوتا تب تک ان قرآنی احکام پر عمل درآمد نہیں ہوسکتا۔ امام عبدالقاہر البغدادی لکھتے ہیں:

وقد وردت الشريعة باحكام لا يتولاها الا امام او حاكم من قبله كا قامة الحدود على الاحرار ...... الخ .(اصول دين ٢٧٢)

''شریعت میں ایسے احکامات وارد ہوئے ہیں جن کو امام یا اس کی طرف سے مقرر کردہ حاکم ہی سرانجام دے سکتا ہے جیسے آزاد لوگوں پر حدود کا قیام وغیرہ۔''

ان احکام کے نفاذ کی فرضیت سے حاکم وخلیفہ کے تقرر کی فرضیت ثابت ہوتی ہے۔

علامہ تفتازانیؒ لکھتے ہیں:

إن الشارع امر باقامة الحدود وسد الثغور وتجهيز الجيوش للجهاد وكثير من الأمور المتعلقة بحفظ النظام وحماية بيضة الإسلام مما لا يتم الا بالإمام وما لا يتم الواجب المطلق الا به وكان مقدورا فهو واجب .(شرح المقاصد ج٥ ص ٢٣٦-٢٣٥)

''شارع نے حدود کے قائم کرنے، سرحدوں کی حفاظت، جہاد کے لیے لشکر کو تیار کرنے اور بہت سے ایسے امور کا حکم دیا ہے جو نظام کی حفاظت اور مرکزِ اسلام کے تحفظ سے متعلق ہیں جو کہ امام (خلیفہ) کے بغیر ادا نہیں ہو سکتے ہیں اور جو مطلق فریضہ جس چیز کے بغیر پورا نہ ہوسکتا ہو تو وہ چیز واجب ہے۔''

اسی چیز کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے امام ابنِ تیمیہؒ لکھتے ہیں:

" ولانّ اللهَ تعالى اوجب الامر بالمعروف والنهى عن المنكر ولا يتم ذلک الابقوة وامارة وكذلک سائر ما اوجبه من الجهادو العدل واقامة الحج والجمع والا عياد ونصرا لمظلوم و اقامة الحدود لاتتم الابالقوة والا مارة .

(مجموعه فتاوى لابن تيميةؒ ج٢٨ ص ٣٩٠)

''اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو واجب (فرض کفایہ) کیا ہے اور یہ

طاقت و امارت کے بغیر پورا نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح تمام وہ احکام جن کو اللہ نے واجب کیا ہے یعنی جہاد، عدل کا قیام، حج وجمعہ وعیدین کی اقامت، مظلوم کی مدد اور اقامت حدود، طاقت و امارت کے بغیر پورے نہیں ہوتے ہیں۔''

امام نسفیؒ مسلمانوں کے لیے قرآن وسنت کے مطابق حکمرانی کرنے والے امام وخلیفہ کی ضرورت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

والمسلمون لابد لهم من امام يقوم بتنفيذ احكامهم وإقامة حدودهم وسدّ ثغورهم وتجهيز جيوشهم واخذ صدقاتهم وقهر المتغلبة والمتلصصة وقطاع الطريق وإقامة الجمعة والاعياد ...... (شرح العقائد النسفية ص ١٥٣)

''مسلمانوں کے لیے ایسے امام کا ہونا ضروری ہے جو احکامات کو نافذ کرے، حدود کو قائم کرے، سرحدوں کی حفاظت کرے، صدقات وصول کرے، سرکشوں، چوروں اور ڈاکوؤں پر قابو پائے اور جمعہ و عیدین کو قائم کرنا وغیرہ۔''

رسول اللہ ﷺ نے خلیفہ کے وجود کو فرض قرار دیا ہے۔

'' مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ عَلَيه اِمَامٌ مَاتَ مِيْتَةً جاهلية . (كتاب السنة ج ٢ ص ٥٠٣)

''جو شخص اس حال میں مرا کہ اس پر کوئی امام (خلیفہ کی حکومت) نہیں تو وہ جاہلیت کی (سی) موت مرا۔''

ہر مسلمان پر خلیفہ کی بیعت فرض ہے، جیسا کہ ارشادِ نبوی ہے:

'' مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِی عُنُقِهِ بَيعَةٌ مَاتَ مَيتَةً جاهليةً .

(صحيح المسلم كتاب الامارة باب وجوب الوفاء ببيعة الخلفاء)

''جو شخص اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں (کسی خلیفہ کی) بیعت نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔''

اس حدیث میں رسول ﷺ نے خلیفہ کی بیعت کو فرض قرار دیا ہے اور خلیفہ کی بیعت اس کے تقرر کے بغیر نہیں ہو سکتی ہے لہٰذا خلیفہ کا تقرر فرض ہوا۔

ملا علی القاریؒ شرح الفقہ الاکبر میں لکھتے ہیں:

'' فقد اجمعو اعلى وجوبِ نصبِ الامام . (شرح الفقه الاكبر ص ١٤٦)

''یعنی آئمہ کا اجماع ہے کہ امام کا تقرر واجب (فرضِ کفایہ) ہے۔''

امام الماوردی لکھتے ہیں:

''وعقدها لمن يقوم بها فی الامة واجب بالاجماع .(الاحكام السلطانيه ص ۵)

''اور امامت کا عقد اس شخص کے لیے جو امت میں اس کا قیام کر سکے بالاجماع واجب ہے۔''

علامہ ابن حزم الظاہری لکھتے ہیں:

اتفق جميع اهل السنة وجميع المرجئة وجميع الشيعة وجميع الخوارج على وجوب الامامة .(الفصل ج ۴ ص ۸۷)

''تمام اہل سنت، مرجئہ، شیعہ، خوارج سب کا اتفاق ہے کہ نصبِ امام (امام کا تقرر) واجب (فرض کفایہ) ہے۔''

فقہاء کے نزدیک خلافت کا قیام اور خلیفہ کا تقرر ابتدائی طور پر فرضِ کفایہ ہے، لیکن اگر اسے مقررہ وقت میں ادا نہ کیا جائے تو فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ علماء اصول کا یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ فرض کفایہ مقررہ مدت میں ادا نہ کیا جائے تو وہ فرض عین ہو جاتا ہے خلافت کا قیام ابتداً فرض کفایہ ہے، لیکن اگر مقررہ مدت (تین دن) کے اندر کچھ لوگ (جو اس کے مکلّف ہیں) اسے ادا نہ کریں گے تو فرض عین ہو جائے گا۔ جیسے نماز جنازہ فرضِ کفایہ ہے، لیکن مقررہ مدت میں کچھ لوگ اسے ادا نہ کریں تو فرض عین ہو جاتی ہے اور تمام لوگ گناہگار ہوتے ہیں۔ امام الحرمین اس اصول سے متعلق لکھتے ہیں:

''ولو فرض تعطيل فرض من فروض الكفايات لعم المأثم على الكافة على اختلاف الرتب و الدرجات ..... ثم مايقضی عليه بانه من فروض الكفايات قديتعين على بعض الناس فی بعض الاوقات فان من مات رفيقه فی طريقه ولم يحضر موتهٗ غيره تعين عليه القيام بغسله ودفنه وتكفينه .(غياث الامم ص ۳۵۹)

''اگر بالفرض فروضِ کفایہ میں سے کوئی فرضِ کفایہ معطل ہو جائے تو تمام لوگ حسبِ مراتب گناہگار ہوں گے ..... فروض کفایہ بعض اوقات، بعض لوگوں پر فرض عین ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ جس شخص کا شریکِ سفر راستے میں فوت ہو جائے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا آدمی موجود نہیں تو اس پر اس کے غسل، تجہیز اور تکفین کا انتظام کرنا فرضِ عین ہو جاتا ہے۔''

بیسویں صدی عیسوی کے پہلے ربع میں خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد سے آج تک نظامِ خلافت معطل ہے اور خلیفہ کا تقرر نہیں ہو سکا ہے۔ مذکورہ دلائل کی روشنی میں نظامِ خلافت کا احیاء اور خلیفہ کا تقرر اس وقت سے آج تک فرضِ عین ہے جس کا جلد از جلد ادا کرنا تمام مسلمانوں کے ذمہ باقی ہے۔

کتنے وقت میں خلیفہ کا تقرر کیا جا سکتا ہے؟ اس کے متعلق نظامِ خلافت کا یہ اصول ہے کہ زیادہ سے زیادہ تین دن کے اندر خلیفہ کا تقرر ضروری ہے۔ حضرت عمر الفاروقؓ نے چھ افراد پر مشتمل شوریٰ بنائی کہ ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ مقرر کر لیا جائے اور انہیں تین دن کے اندر اندر خلیفہ کے انتخاب کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

" فاذا متّ فتشاور وا ثلاثة ايّام و لا ياتينّ اليوم الرابع الا وعليكم امير منكم .

(تاريخ الامم والملوک ج٣ص ٣٩٣)

''جب میں فوت ہو جاؤں تو تین دن تک مشورہ کرو اور چوتھا دن نہ آنے پائے کہ تمہارا ایک امیر مقرر ہو۔''

حضرت عمرؓ کے حکم پر اس طرح عمل کیا گیا کہ امام بخاری روایت کرتے ہیں کہ جب عبد الرحمٰن بن عوف ان (چھ حضرات) کے معاملے کے ذمہ دار ہوئے تو لوگوں نے عبد الرحمٰن کی طرف رجوع کیا یہاں تک کہ میں نے کسی کو ان لوگوں کا پیچھا کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ عبد الرحمٰن نے لوگوں سے ان تینوں راتوں میں مشورہ کیا حتیٰ کہ جس صبح ہم نے حضرت عثمان سے بیعت کی اسی رات کا ایک حصہ گزرنے کے بعد میرا دروازہ کھٹکھٹایا تو میں بیدار ہوا اور دروازہ کھولا تو انہوں نے مجھ سے کہا:

اراک نائما فوالله ما اكتحلت هذه الثلث بكثير نوم .

(صحيح البخاری كتاب الاحكام باب كيف يبايع الامام الناس)

''آپ سو رہے ہیں اللہ کی قسم! میں ان تینوں راتوں میں زیادہ نہیں سو سکا ہوں۔''

امام ابن حزم الظاہری لکھتے ہیں:

" ولا يجوز التردد بعد موت الامام فی اختيار الامام اكثر من ثلاث .

(المحلی لابن حزم ج ا ص ٣٥)

''امام (خلیفہ) کی وفات کے بعد تین دن سے زیادہ (تذبذب وتاخیر) جائز نہیں ہے۔''

خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد آج تک نظامِ خلافت کا قیام ہوا اور نہ خلیفہ کا تقرر رہا ہے، لہٰذا تب سے آج تک امتِ مسلمہ پر یہ فرض عین باقی ہے اور ایسے ہی فرض ہے جیسے نماز اور روزہ۔

عصرِ حاضر کا معروفِ اعظم

قرآن وسنت کے تمام احکام وفرامین معروف ہیں اوران سے اعراض وانحراف اوران کے خلاف کرنا منکر ہے۔ تمام معروف تب قائم ہو سکتے ہیں جب اسلامی نظامِ خلافت قائم ہو کیونکہ اسلامی خلافت کے قیام کی صورت میں ہی امت کے دینی ودنیاوی اجتماعی امور بہتر طور پر سرانجام دیے جا سکتے ہیں۔عصر حاضر کا سب سے بڑا معروف اسلامی نظامِ خلافت کا قیام ہے جبکہ سب سے بڑا منکر نظامہائے باطلہ ہیں۔اس منکرِ اعظم کی نکیر وتغییر یعنی کفریہ وباطل نظاموں کوختم کرنا اوران کے مقابلے میں معروفِ اعظم کا امر (یعنی اسلامی نظام کا قیام) امت کا فریضہ ہے۔جیسا کہ فرمانِ نبوت ہے:

مَنْ رَأى منكم منكراً فَلْيُغَيِّره بيده فَاِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه وذلک اضعف الايمان. (صحيح المسلم كتاب الامارة باب اذابويع الخليفتين)

''تم میں سے جوکوئی منکرکو دیکھے تواس کو چاہیے کہ وہ اس کو اپنے ہاتھ سے ختم کردے۔اگراس کی طاقت نہ ہوتو زبان کے ساتھ۔اگراس کی طاقت نہ ہوتو دل میں برا سمجھےاور یہ ایمان کاانتہائی کمزور درجہ ہے۔''

نظامِ خلافت امت مسلمہ کی حیات اوراس کا سقوط اورنافذ نہ ہونا اس کی موت کی مانند ہے۔ جب تک امتِ مسلمہ اسے زندگی وموت کا مسئلہ سمجھ کراس کیلئے بھرپور جدوجہد نہیں کرتی اوراس کے لیے اپنا سب کچھ نہیں لٹاتی تب تک اس کے مسائل حل ہو سکتے ہیں، اور نہ اسلامی نظام کے نفاذ کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے،لہٰذا مسلمانوں کا یہ فریضہ ہے کہ معروفِ اعظم کے امر اورمنکرِ اعظم کی نہی کیلئے علَم جہاد بلند کرتے ہوئے اپنی جان، مال اوروقت اس کیلئے صرف کریں۔

فصل دوم:

نبوی طریقہء کار کے دو بنیادی اصول

پوری امت مسلمہ عموماً اور علماً کرام پر خصوصاً یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو زوال وپستی سے نکالنے اور اسلامی نظامِ خلافت کے قیام کیلئے قرآن وسنت پر انتہائی غور وفکر کر کے ایسا منہج اختیار کریں جو (۱) قرآن وسنت کے موافق (۲) اور وقت کے تقاضے کے مطابق ہو۔

احیاء خلافت کے لیے ان دو بنیادی اصولوں کے پیش نظر ہی طریقۂ کار اختیار کرنا لازم ہے۔ ان دو اصولوں پر عمل پیرا نہ ہونے بلکہ انہیں نظر انداز کرنے اور پس پشت ڈالنے کی صورت میں کامیابی حاصل ہونا ممکن نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقامتِ خلافت کیلئے اسوۂ نبوی ہمارے پاس مکمل اور واضح طور پر موجود ہے جیسا کہ تفصیل گذر چکی ہے، عصر حاضر میں غلبۂ دین کے لیے نبوی طریقہ کار پر عمل کرنا ہمارے اوپر فرض ہے۔ خلافت کا قیام فرض قرار دیا گیا ہے تو اس کی فرضیت کے ساتھ اس کا منہج اور طریقۂ کار بھی واضح کر دیا گیا ہے، جس کا عملی نمونہ خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کر دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفریہ نظام کے خاتمے اور اسلامی نظام کے قیام کے لئے جدوجہد کی، آپ کی دعوت باقاعدہ ترتیب وتنظیم کے ساتھ تھی اور کئی مراحل سے گزر کر ایسے موڑ پر آئی جہاں پہنچ کر آپ نے اسلامی نظام قائم کیا اور جزیرۂ عرب میں اسے غالب کرنے کے بعد دنیا کے دیگر علاقوں میں اس کی توسیع کے لیے اور اسے ادیانِ باطلہ پر غالب کرنے کی راہ ہموار کی، پھر آپ کے تربیت یافتہ جانشین خلفاء راشدینؓ نے آپ کے مشن کی تکمیل کی، الغرض آپ نے اسلامی نظام کے قیام کے لئے ایک ترتیب اور طریقہء کار اختیار کیا جس کے ذریعے آپ اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، لہٰذا احیاء خلافت کے لیے سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بنیادی اصولوں کی اتباع فرض ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (آل عمران: ۳۱)

''اے نبی کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تا کہ خدا بھی تم سے محبت کرے اور تمہارے گناہ بھی معاف کر دے اور اللہ تو بخش دینے والا مہربان ہے۔''

امام ابن کثیر مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

هذه الآية الكرية حاكمة على من ادعى محبة الله وليس هو على الطريقة المحمدية فانه كاذب فى دعواه فى نفس الامر حتى يتبع الشرع المحمدى والدين النبوى فى جميع اقواله وافعاله. (تفسیر ابن کثیر، تفسیر سورة آل عمران)

''جو آدمی اللہ کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے لیکن محمدی طریقے پر عمل پیرا نہیں یہ آیت اس پر یہ حکم لگا رہی ہے کہ ایسا آدمی درحقیقت اپنے دعوے میں جھوٹا ہے جب تک کہ وہ اپنے تمام اقوال اور افعال میں شریعت محمدیہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین پر عمل پیرا نہیں ہوتا۔''

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یعنی اگر دنیا میں آج کسی کو اپنے مالک حقیقی کی محبت کا دعویٰ ہو تو لازم ہے کہ اس کو اتباع محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لے، سب کھرا کھوٹا معلوم ہو جائے گا۔ جو شخص جس قدر حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ چلتا اور آپ کی لائی ہوئی روشنی کو مشعلِ راہ بناتا ہے، اسی قدر سمجھنا چاہئے کہ خدا کی محبت کے دعوے میں سچا اور کھرا ہے اور جتنا اس دعوے میں سچا ہو گا اتنا ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں مضبوط و مستعد پایا جائے گا۔'' (موضح فرقان، تفسیر سورۃ آل عمران)

مذکورہ بالا آیت کی تفسیر سے واضح ہو گیا کہ جب تک سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار نہیں کیا جاتا تب تک اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ مبنی بر حقیقت نہیں ہے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ قرآن کی عملی صورت تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے ہر حکم پر عمل پیرا ہونے کے لیے آپ کی حیات مبارکہ کو اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے، فرمانِ الٰہی ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوْ اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْراً (الاحزاب: ٢١)

''البتہ تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے، اس کے لیے جو اللہ اور قیامت کی امید رکھتا اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہے۔''

امام ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

هذه الآية الكريمة اصل كبير في التأسي برسول الله صلى الله عليه وسلم في اقواله وافعاله واحواله ولهذا امرتبارك وتعالىٰ الناس التأسي بالنبي صلى الله عليه وسلم يوم الاحزاب في صبره ومصابرته ومرابطته ومجاهدته وانتظاره الفرج من ربه عزوجل صلوات الله وسلامه عليه دائماً الى يوم الدين.

(تفسير ابن كثير ،تفسيرسورة الاحزاب)

''یہ آیت کریمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال ،افعال اوراحوال کی پیروی کرنے کے بارے میں ایک بڑے اصول کا درجہ رکھتی ہے،اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے لوگوں کوغزوہ احزاب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ثابت قدمی پر ابھارنے ،خود ڈٹے رہنے،مجاہدہ کرنے اوراللہ کی طرف سے تنگی کے خاتمے کا انتظار کرنے کے امور میں آپ کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے۔''

مندرجہ بالا آیات سے واضح ہوگیا کہ ہر عمل میں رسول ﷺ کی اتباع لازم ہے۔جس طرح رسول ﷺ نے نماز پڑھ کر دکھائی ہے اسی طرح نماز پڑھنا فرض ہے۔جس طرح حج کر کے دکھایا ہے،اسی طرح حج کرنا فرض ہے۔یہی حال خلافت کے نظام کے قیام کا ہے کہ جس منہج اور طریقۂ کار کے ذریعے رسول ﷺ نے بھرپور جدوجہد کرکے اسلامی معاشرہ اورریاست قائم فرمائی ،امت پر بھی لازم ہے کہ وہ آپ کی اتباع کرتے ہوئے اسی منہج اورطریقۂ کار کے بنیادی اصولوں کواختیار کرتے ہوئے اسلامی نظام قائم کرے،امام ابوبکر الجصاص الحنفی لکھتے ہیں:

فاذا وجدنا النبي صلى الله عليه وسلم قد فعل فعلاً فعلينا اتباعه فيه على الوجه الّذي فعلهٗ الاترى انّ قوله '' خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ ''(التوبة: ١٠٣) لم يوجب كون النبي صلى الله عليه وسلم مخصوصاً به دون غيره من الأئمة بعده و كذلك قوله '' اِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ'' (الممتحنة: ١٢) وكذلك قوله ''وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ'' (المائده: ٤٩) وقوله ''فَاِنْ جَاؤُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ'' (المائده: ٤٢) فيه تخصيص النبي صلى الله عليه وسلم بالمخاطبة والأئمة بعدهٗ مرادون بالحكم معه(احكام القرآن للجصاص ج ٢ ص ٣٢٨،٣٢٩)

''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کام کیا تو ہم پر لازم ہے کہ ان کی اتباع کرتے ہوئے اسی طرح انجام دیں جس طرح آپ نے انجام دیا ہے،ارشادِ خداوندی ملاحظہ ہو کہ ''ان کے اموال

میں سے صدقہ لیجئے جوان کے اموال کو پاکیزہ کردے گا'' یہاں اس سے یہ مراد نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس حکم میں مخصوص ہیں اور آپ کے بعد آنے والے امت کے امام (خلیفہ) مراد نہیں ہیں۔ اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''جب آپ کے پاس مؤمن عورتیں آئیں تو ان سے بیعت لیجئے'' اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''آپ ان کے مابین اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ کیجئے۔'' ان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی طور پر مخاطب کیا گیا ہے اور آپ کے بعد آنے والے امام بھی آپ کے ساتھ اس حکم میں مراد ہیں۔''

یعنی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنائے ہوئے طریقے پر چلنا اور آپ کی سیرت کی پیروی کرنا لازم ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی حکم پر عمل کرنے کا جو طریقہ بتایا ہے، آپ کے بعد آنے والے لوگوں کو بھی یہی طریقہ اپنانا ہوگا۔ گویا جن آیات میں آپ کو مخاطب کیا گیا ہے، بعد میں آنے والے لوگ بھی اس کے مخاطب ہے، لہٰذا انہیں بھی آپ کے طریقے پر ہی چلنا ہوگا۔ اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب آپ کی سنت کی بعینہٖ اقتداء کی جائے اور اس سے سرمو انحراف نہ کیا جائے۔

اقامت خلافت کیلئے اسوۂ نبوی کے علاوہ دوسرا کوئی طریقہ کار درست نہیں ہے۔ اگر کوئی دوسرا طریقہ کار اختیار کیا گیا تو وہ غیر شرعی ہونے کے ساتھ ساتھ غیر فطری بھی ہوگا۔ غیر شرعی اور غیر فطری طریقۂ کار سے منزل کا حصول ممکن نہیں ہے کیونکہ غلط راستہ کبھی بھی قافلے کو منزل تک نہیں پہنچا سکتا، اسی طرح غیر شرعی اور سنت وسیرت کے برعکس اختیار کیا جانے والا راستہ کبھی بھی اسلامی نظام کے نفاذ کی منزل تک نہیں پہنچا سکتا بلکہ وہ اس راستے پر چلنے والوں کو منزل سے دور بلکہ بہت دور لے جاتا ہے، حتی کہ بسا اوقات قافلے کے ارکان کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ منزل کے قریب ہونے کی بجائے دور ہوتے جارہے ہیں۔ وہ اسی خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ منزل کی طرف رواں دواں ہیں اور منزل کے قریب پہنچنے والے ہیں۔ پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ منزل بھی ذہنوں سے نکلتی جاتی ہے اور اس راستے کے دیگر عارضی فوائد پر نظر ٹھہر جاتی ہے جہاں سے گم راہی کا سلسلہ ہوتا ہے اور ارکان قافلہ منزل فراموش کر کے راستے کے عارضی ذاتی فوائد کے لیے ڈیرے ڈال لیتے ہیں۔ اب ان کی حالت ؎

نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن

کے مصداق ہوتی ہے۔

ناکامی کی وجہ

گزشتہ صدی عیسوی میں مغربی سامراجی طاقتوں سے مسلم ممالک کی آزادی کے بعد مذکورہ ممالک میں احیاء اسلام کے حوالے سے کئی طریقے اپنائے گئے جن میں سے کوئی ایک بھی کامیاب نہیں ہوا کیونکہ ان میں سے بیشتر غیر شرعی اور سنتِ نبوی کے مطابق نہیں تھے، بلکہ ایسے ایسے طریقے بھی اپنائے گئے جن کا باطل اور غیر شرعی ہونا بدیہی امر تھا، ایسے میں کیونکر احیاء اسلام اور اقامتِ خلافت کا مقصد حاصل ہوسکتا تھا۔

احیاءِ اسلام کے لئے جدوجہد کرنے والی بیشتر دینی سیاسی جماعتوں نے احیاءِ اسلام کے لئے اسوۂ رسولِ اکرم اور منہجِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار کرنے کی بجائے باطل نظامِ جمہوریت کا انتخابی راستہ منتخب کیا۔ نام نہاد مغربی جمہوریت کی بنیاد سرمایہ دارانہ نظام ہے اور جمہوریت کا ڈھانچہ ہی ایسا ہے کہ اس میں جاگیردار، تاجر، سرمایہ دار، صنعت کار، امراء، وڈیرے، سردار، سابق بیوروکریٹ وغیرہ ہی ایوانِ اقتدار تک پہنچ سکتے ہیں۔ کوئی قانون یا بل پاس کرانے کے لئے کم از کم دوتہائی اکثریت کی حمایت ضروری ہے۔ سامراجی طاقتوں سے آزادی کے بعد سے آج تک جن مسلم ممالک میں جمہوری نظام ہے، دینی جماعتوں کو مرکز میں دوتہائی اکثریت کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ اگر حاصل بھی ہوئی تو ان کا مینڈیٹ تسلیم کرنے سے انکار کر کے حکومت تشکیل دینے پر پابندی لگادی گئی یا اسمبلیاں برخاست کردی گئیں، جیسا کہ حماس کو فلسطین میں کامیابی حاصل ہوئی اور اس نے حکومت بھی تشکیل دی لیکن اسے چلنے نہیں دیا گیا۔ متعدد مسلم ممالک میں دینی جماعتیں کئی دہائیوں سے انتخابات میں شریک ہورہی ہیں جس کے نتیجے میں چند امیدوار منتخب ہوجاتے ہیں، لیکن اسلامی نظام کے نفاذ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا البتہ مسلسل انتخابی راستے کو اختیار کئے رکھنے اور منہج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ اپنانے کی وجہ سے حکومتِ الٰہیہ کی منزل دور ہوتی جارہی ہے۔

استعماری طاقتوں سے آزادی کے بعد ہمارے بعض اکابر رحمہم اللہ نے یہ سمجھا کہ چونکہ ملک میں جمہوری نظام رائج ہے، لہٰذا ہمیں بھی اسی انتخابی راستے سے اسلامی نظام کے نفاذ اور خلافِ اسلام سازشوں کی روک تھام کے لئے کوشش کرنی چاہیے، چنانچہ انہوں نے اسلامی نظام کے نفاذ کے مقصد کے پیشِ نظر انتخابی راستہ منتخب کیا، لیکن یہی حضرات اس بات پر یقین رکھتے اور اس کا برملا اعتراف اور اظہار بھی کرتے تھے کہ اسلامی نظام کے نفاذ کا اصل راستہ ''اسلامی انقلابی جد و جہد'' ہے۔ نیز انہوں نے

اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے جمہوری سیاست کو اضطراراً محض ایک ذریعے اور راستے کے طور پر اختیار کیا تھا۔ انتخابی سیاست میں شرکت ان کا مقصد تھا اور نہ منزل۔ لیکن افسوس! بعد میں آنے والوں نے انتخابی راستے کو مستقل طور پر اپنا لیا اور اسی کو مقصد کے حصول کا واحد ذریعہ باور کیا جانے لگا۔

سالہا سال کے تجربے کے باوجود مقصد حاصل نہ ہونے کے بعد چاہیے تو یہ کہ انتخابی راہ میں حیران و سرگراں رہنے کی بجائے اسے ترک کر کے کوئی دوسرا ایسا راستہ اپنایا جائے جس سے حصولِ مقصد ممکن ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ انتخابی سیاست نظامِ اسلام کے نفاذ کی راہ میں حائل ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ایسے راستے کو ترک کر دیں جو بظاہر سیدھا، آسان اور مختصر معلوم ہوتا ہے جبکہ درحقیقت یہ راستہ منزل کی طرف جاتا ہی نہیں اور ایسی راہ منتخب کریں جو اگرچہ نسبتاً طویل، کٹھن اور مصائب و آلام سے بھری ہو لیکن آخر کار اس کے ذریعے قافلہ منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہو۔ جس راستے پر کئی دہائیوں تک چلنے کے باوجود ہم آج بھی نقطۂ آغاز پر کھڑے ہیں تو کیا ہم اس کی بجائے ایسا راستہ منتخب نہ کریں جس کے ذریعے ہم گرتے پڑتے منزلِ مقصود کو پالیں؟

الغرض اگر اسلامی نظامِ خلافت کے احیا کا عظیم مقصد حاصل کرنا اور پوری دنیا میں غلبۂ دین کی منزل تک پہنچنا ہے تو اس کے لئے وہی راستہ اپنانا ہوگا جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بطور اسوۂ حسنہ ہمارے لئے پیش کر چکے ہیں۔ اگر آج اسی راستے کی طرف رجوع نہیں کیا جاتا اور اسوۂ حسنہ کو مشعلِ راہ نہیں بنایا جاتا تو اسلامی نظام کے قیام کی منزل تک پہنچنا ناممکن ہے جیسا کہ تاریخ ثابت کر چکی ہے ، بلکہ یہ کہنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ آئندہ آنے والا مؤرخ یہ تحریر کر سکتا ہے کہ اسلامی نظام کو لانے والے اور اسے عملی شکل دینے والے امام الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو چھوڑ کر باطل طریقوں کے ذریعے اسلامی نظام نافذ کرنے کے اپنے دعوے میں سچے نہ تھے، کیونکہ اگر وہ سچے ہوتے تو جو طریقۂ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا تھا، اسے چھوڑ کر اغیار کے طریقوں کو نہ اپناتے۔

فصل سوم:

جماعت کا قیام

اسلامی نظامِ خلافت امت کے دینی و دنیاوی اجتماعی امور کو سرانجام دینے کا ایک مستقل نظام ہے اس لئے اس کا قیام امت کا اجتماعی فریضہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے خیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کو سرانجام دینے کے لئے جماعت کے قیام کو فرض قرار دیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (آل عمران ۱۰۴)

''اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک ایسی جماعت جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کرے برائی سے اور وہی پہنچے اپنی مراد کو۔''

امام جوزیؒ ایک دوسرے مقام پر ''امت'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

والامة ھاھنا الصنف الواحد علیٰ مقصد واحد .(زاد المیسر جز ا ،ص ۱۹۵)

''یعنی امت سے ایک مقصد پر متفق رہنے والے ایک قسم کے لوگ مراد ہیں۔''

امام قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

فمعنی امة مقصدھم واحدٌ(قرطبی جز ۳، ص ۱۳)

امت کے معنی ہیں جن کا مقصد ایک ہو۔''

حضرت شاہ ولی الدھلویؒ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

یعنی واجب بالکفایہ است کہ جمعی بامر معروف و نہی از منکر قیام نمایند۔ (فتح الرحمٰن)

''مطلب یہ ہے کہ ایک ایسی جماعت جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے، اس کا قیام فرض کفایہ ہے۔''

حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''بعد از اں ارشاد می فرماید کہ سبب ایں اجتماع بحسب جری سنۃ اللہ آنست کہ جماعہ از یشاں باحیاء

علوم دین وقیام بجہاد وا قامت حدود وامر معروف ونہی منکر قائم شوند ودیگراں امتثال امر ایشاں کنند وایں یکے از واجبات بالکفایہ اسلام است وعادۃ اللہ آن است کہ امر ایں امت مفلحہ بدون تصدی شخصے مسلم الفضل فیما بینہم بریں اقامت صورت نگیرد۔'' (ازالۃ الخفاء:۲/ ۲۵)

''اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ اس اجتماع کا سبب اس بناء پر کہ سنت اللہ (قانونِ الٰہی) اسی طرح جاری ہے، یہ ہے کہ ان میں سے ایک ایسی جماعت قائم ہو جائے جو علوم دین کے احیاء (یعنی ان کی تعلیم ونشر واشاعت) پر کمر بستہ ہو اور جہاد اور حدودِ شرعیہ کو قائم کرے۔ لوگوں کو نیک کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے اور دوسرے لوگ (یعنی عوام) اُن کے احکام کی تعمیل کریں اور یہ (یعنی ایسی جماعت کا قیام) دین کے فرائض کفایہ میں سے ہے اور عادت (قانونِ) الٰہی یہ ہے کہ اس امتِ مرحومہ کا یہ امر (یعنی نظم مذکور) قیام پذیر نہیں ہوگا جب تک کوئی ایسا شخص جس کی فضیلت سب میں مسلّم ہو ایسی جماعت کے قائم کرنے کا کام اپنے ہاتھ میں نہ لے لے۔''

یعنی سنتِ الٰہیہ یہی ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو سرانجام دینے کے لئے باقاعدہ جماعت کا قیام ضروری ہے جو باقاعدہ منظّم ومرتب اور ایک لائحہ عمل کے تحت مذکورہ فریضے کو ادا کرے۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے جماعت کا وجود لازم قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کام جماعت اور نظم چاہتا ہے کیونکہ کسی بھی مقصد کے لیے جماعت اُسی وقت وجود میں آتی ہے جب اس کی تکمیل کے لیے جماعت کو ضروری سمجھا جائے۔ جو کام انفرادی طور پر پورا ہوسکتا ہو اس کے لیے جماعت کبھی وجود میں نہیں آتی۔ اگر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی انفرادی طور پر ہوسکتی تو اس کے لیے ایک ''امت'' کیوں کھڑی کی گئی اور صرف افراد کو اس کا حکم کیوں نہیں دیا گیا؟ لہٰذا امت کو مخاطب کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے جماعت کا قیام فرض ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حالتِ سفر میں بھی امیر کے تقرر کو لازمی قرار دیا ہے۔

اذاخرج ثلاثہ فی سفر فلیئومروا احدھم (سنن ابی داؤد کتاب الجہاد باب ۸۷)

''جب تین آدمی سفر کو نکلیں تو انہیں چاہیے کہ ایک کو امیر بنالیں۔''

اسی طرح دوسری حدیث میں فرمایا:

''لایحل لثلاثہ یکونون بفلاۃ من الارض الاامروا علیھم احدھم. (ایضاً)

''نہیں ہے حلال (جائز) تین آدمیوں کے لیے جو کسی خطہ زمین میں (سفر میں) ہوں مگر یہ کہ اپنے اوپر ایک امیر کو مقرر کر لیں۔''

جب تین آدمیوں کے اجتماع کی صورت میں امیر کو مقرر کرنا لازمی ہے تو دین و دنیا کے اجتماعی امور اورامر بالمعروف اورنہی عن المنکر جیسے اہم فریضہ کی ادائیگی کے لیے جماعت کا قیام اور ایک امیر کا تقرر بطریق اولیٰ فرض ہوگا۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ مندرجہ بالا حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فقداوجب صلواۃ اللہ وسلامه عليه وعلىٰ آله تأمير الواحد فى الاجتماع القليل العارض فى السفر منبها بذلك علىٰ سائر انواع الاجتماع.....فاذاوجب فى اقل الجماعات واقصر الاجتماعات ان يولى احدهم كان هذا تنبيها على وجوب ذالك فيماهو اكثرمن ذلك. (السياسة الشرعية ص ١٦١)

''یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قلیل (تعداد رکھنے والی) اجتماعیت جو سفر میں پیش آجائے، میں امیر بنانے کو لازمی قرار دیتے ہوئے اجتماعیت کی تمام اقسام پر تنبیہ فرمائی۔ جب چھوٹی سی جماعت اور انتہائی کم اجتماع میں کسی ایک کو امیر بنانا واجب ہے تو یہ اس سے بڑی اجتماعیت میں، اس کے وجوب پر تنبیہ ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلیٰ صفات والے جانثاروں اور سرفروشوں کی جماعت عطا کی گئی جن کے ساتھ مل کر آپؐ نے اپنی رسالت کے مقاصد کو حاصل کیا اور اولاً جزیرۂ نماعرب پر، پھر باقی دنیا پر آپ کی زندگی میں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اور خلفاء راشدین کے دور میں اللہ کا دین غالب ہوا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾. (الفتح)

''وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام ادیان پر غالب کردے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرنے والے ہیں''۔

ایک دوسری جگہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کی تائید اور کامیابی کی وجہ نصرت الٰہی اور جماعت صحابہؓ کی حمایت ٹھہرائی ہے۔

﴿هُوَ الَّذِيْۤ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الانفال)

''اللہ وہ ذات ہے جس نے اپنی نصرت اور مومنین (صحابہ کرامؓ) کی جماعت) ہی کی وجہ سے تمہیں مضبوط کر دیا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت کے برعکس حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت پر قوم بنی اسرائیل تیار ہوئی اگر چہ ان کی تعداد تو بہت بڑی تھی لیکن ناپختہ لوگ تھے۔ آپ مصر میں دعوت وتبلیغ اور بنی اسرائیل کی تعلیم وتربیت میں مشغول رہے حتی کہ فرعون سے تنگ آ کر ہجرت کا موقع آیا تو بنی اسرائیل کی یہ بڑی جماعت بھی ساتھ تھی۔ صحرائے سینا میں قیام کے دوران جب دین کے قیام، غلبہ اور نفاذ کے لیے آخری مرحلہ جہاد وقتال کا پیش آیا تو قوم نے صاف انکار دیا:

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ (المائدة:)

''جاؤ تم اور تمہارا رب قتال کرو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔''

ان کے انکار کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ارض مقدس جو انہیں دی جا چکی تھی اللہ تعالیٰ نے ان کی بزدلی کی پاداش میں چالیس برس تک ان پر حرام کر دی۔ اگر اقامت دین اور غلبہ، دین کا کام اجتماعی قوت اور منظم جماعت کے بغیر ممکن ہوتا تو اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ کے ہاتھوں سے تکمیل پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ اپنی آنکھوں سے اپنی زندگی میں اپنی اس جدوجہد کو پایۂ تکمیل تک پہنچتا نہ دیکھ سکے۔

اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت (صحابہ کرامؓ) ایسی نہ تھی انہوں نے دعوت الی اللہ، اشاعت دین، اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامت دین کے لیے انتہائی سخت مشکلات ومصائب، فقر وفاقہ، جہاد وقتال کے مراحل میں جان نثاری، قربانی وایثار اور استقامت کی وہ مثالیں قائم کیں کہ جن کی نظیر تاریخ انسانی آج تک پیش کر سکی ہے اور نہ آئندہ پیش کر سکے گی۔ غزوہ بدر کے موقع پر حضرت مقداد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا:

لانقول كما قال قوم موسىٰ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ، ولكنا نقاتل عن يمينك و عن شمالك و بين يديك و خلفك. (صحيح بخارى كتاب المغازى باب قول الله ﴿اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ﴾

''ہم قومِ موسیٰ کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ ''جاؤ تم اور تمہارا رب قتال کرو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں'' بلکہ ہم تو آپ کے دائیں، بائیں، آگے پیچھے رہ کر قتال کریں گے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر قیادت جو جماعت وجود میں آئی وہ فکری ونظریاتی، سیاسی، اقتصادی

اورتہذیبی انقلاب لانے میں کامیاب رہی کیونکہ اس انقلاب کے لیے جتنے اونچے درجے کے باصلاحیت اور ذی استعداد رجالِ کار مطلوب تھے وہ سب اس جماعت سے فراہم ہونے لگے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت غالب ہوئی اور اسلامی معاشرے اور ریاست کی تشکیل ہوئی تو معلوم ہوتا تھا کہ اس کے چلانے کے لئے پوری طرح تربیت یافتہ معلم، مدرس اور داعی بھی ہیں، قاضی اور جج بھی، گورنر اور حکام بھی، فوج اور اس کے سپہ سالار بھی، سفیر اور ترجمان بھی، سیاست دان اور حکمران بھی تھے۔ غرض پوری جماعت تھی جو معاشرے اور ریاستی نظام کی ہر ضرورت پوری کر سکتی تھی۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے تو جماعتِ صحابہ ہر لحاظ سے منظم اور متحد تھی اور اس نے اسلام کی زبردست خدمات انجام دیں، دور دراز ملکوں میں اسلام کی دعوت اور دین کی اقامت اور غلبے کے لیے بھرپور جہاد کیا۔ یہاں تک کہ متمدن دنیا کے ایک بڑے حصے میں اسلام کی حکومت قائم کر دی۔

اسلام میں ایمان اور عقیدے کے بعد عبادات میں پہلا حکم نماز کا ہے، پھر مردوں کے لیے فرض نمازیں باجماعت ادا کرنا لازم کیا گیا ہے۔ جماعت کی شکل میں نماز ادا کرنا دراصل اس امر کی ایک علامت اور سبق ہے کہ اسلام تمام معاملات میں ایک طرح کا عمومی نظم اور جماعت چاہتا ہے۔ باجماعت نماز میں امام کی شکل میں ایک امیر ہوتا ہے جس کی تمام نمازیوں کو پیروی اور تابعداری کرنی ہوتی ہے۔ ایک امیر (امام) کی تکبیر پر تمام مقتدی اتفاق واتحاد سے جماعت کی شکل میں اٹھتے بیٹھتے اور اللہ کے ہاں جھکتے ہیں۔ کسی مقتدی کو اجازت نہیں کہ وہ نماز کا کوئی رکن امام سے پہلے ادا کرے۔ اگر کوئی شخص امام سے پہلے اپنا سر سجدے سے اٹھالے تو اس کی نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ حتی کہ اگر امام نماز پڑھانے میں کوئی غلطی کر بیٹھتا ہے تو مقتدی کو اس کی اجازت تو ہے کہ سبحان اللہ کہہ کر اسے متوجہ کرے لیکن اگر وہ اپنی غلطی پر قائم رہتا ہے تو مقتدی کو جماعت چھوڑ دینے کی ہرگز اجازت نہیں۔ اسی طرح نماز جمعہ اور عیدین کی نمازیں تو بغیر جماعت کے ادا ہی نہیں ہوسکتیں۔ پھر ہر مسلمان پر سال کے کسی مہینے میں ایک ماہ کے روزے فرض نہیں کئے گئے بلکہ پوری امت کے لیے ماہ رمضان کے روزے فرض ہوئے تاکہ اجتماعیت کی شان قائم رہے۔ باقی رہا حج کا فریضہ تو وہ تو سراسر اجتماعی عبادت ہے۔

جماعت کے بغیر انفرادی سطح پر بعض کام مثلاً عبادت وریاضت، درس وتدریس، تربیت، تزکیہ واصلاح، تعلیم وتعلم اور تصنیف وتالیف کے علاوہ کچھ نہ کچھ دعوت بھی ہوسکتی ہے، لیکن انقلاب، اقامت

دین اور غلبہ دین کی جدوجہد جماعت کے بغیر ہرگز نہیں ہوسکتی۔ کسی بھی دعوت اور تحریک کے لیے تنظیم کی بڑی اہمیت ہے اس لیے عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ غلبہء دین کے لیے جماعت کو اہم ہونا چاہیے۔ اس حقیقت سے کوئی فاتر العقل شخص ہی انکار کرسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مختلف لوگوں کو مختلف صلاحتیں دی ہیں۔ کسی کو گفتگو اور تقریر کی صلاحیت دی ہے تو کسی کو تحریر کی، کسی کو بھاگ دوڑ کی قوت تو کسی کو غور وفکر اور تدبر وتفکر کی، کسی کو جسمانی طاقت اور کسی کو مالی وسعت سے نوازا ہے، اسی طرح کسی کو علوم دینیہ اور کسی کو دنیاوی تعلیم ومعلومات سے بہرہ ورفرمایا ہے۔ مختلف صلاحتیوں اور قوتوں سے مسلح اور منظم افراد کے منظم اور متحد ہوکر کام کرنے سے ہی کوئی جامع، ہمہ گیر اور نتیجہ خیز کام سرانجام دیا جاسکتا اور انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔

عمارت بنانے کے لیے اینٹوں کی ضرورت ہوتی ہے جب تک یہ اینٹیں ایک خاص ترتیب اور نظم کے بغیر صرف ایک ڈھیر کی شکل میں ہوں تو ان میں وہ مضبوطی نہیں ہوتی جو دیوار میں ہوتی ہے اور نہ ہی اس میں وہ خوبصورتی ہوتی ہے جو ایک عمارت میں ہمیں نظر آتی ہے لیکن جب معمار ان اینٹوں کو ایک خاص ترتیب اور نظم کے ساتھ رکھ کر لگاتا ہے تو اس سے ایک خوبصورت اور مضبوط عمارت وجود میں آتی ہے۔ اس عمارت اور دیوار کی ہر اینٹ دوسری اینٹ کے لیے سہارا ہوتی ہے۔ اگر ان اینٹوں میں سے کوئی کمزور ہو تو وہ دوسری اینٹوں کے سہارے سے دیوار میں مضبوط لگ جاتی ہے۔ دیوار میں اینٹ لگاتے لگاتے کبھی ایسا موقع بھی آجاتا ہے کہ وہاں پوری اینٹ کی جگہ آدھی اینٹ کی ضرورت پڑ جاتی ہے جس کو ڈھونڈ کر اُس جگہ لگا دیا جاتا ہے اگر کہیں آدھی اینٹ نہ ملے تو معمار پوری اینٹ کو توڑ کر اس آدھی اینٹ کی ضرورت کو پورا کرتا ہے، جس سے دیوار مکمل ہوجاتی ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی یادرکھنے کے قابل ہے کہ جماعت کا کوئی رکن بھی بے کار نہیں۔ ہر ایک فرد کام کا ہے اور وہ اپنی اپنی جگہ فٹ اور ضروری ہے۔ چاہے کم سے کم صلاحتیوں والا کیوں نہ ہو۔ جماعت میں کسی کم صلاحیتوں والے ساتھی یا رکن کو بھی بے کار نہ سمجھا جائے نہ ہی اسے ضائع کیا جائے کہیں اور کبھی تو وہ کام آجائے گا۔

تنظیم کے پاس ہر طرح کی صلاحیت کے لوگ ہوتے ہیں جس کام کے لیے جن صلاحیتوں کے انسان کی ضرورت ہے وہ ان ہی صلاحیتوں کے انسان کو اس مشن پر لگا سکتی ہے۔ اس میں یہ بھی ممکن ہے کہ جس محاذ پر ایک شخص ناکافی ہے وہاں وہ دس اشخاص کو بھیج دے۔ تنظیم اور جماعت مختلف افراد کو جمع کرکے ایک ایسا مجموعہ بناتی ہے جس کے ذریعہ وہ کام کیا جاسکتا ہے جو ہر فرد الگ الگ نہیں کرسکتا۔ نیز اس کے

اندر اتنی قوت پیدا کرتی ہے جو صرف افراد کے مجموعے سے حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔ جماعت اور نظم صرف صلاحیتوں کو جمع نہیں کر دیتی بلکہ ان کو دگنا کر کے ان کے اندر کئی گنا زیادہ اضافہ کرتی ہے۔

یہ امر مسلم ہے کہ بہت سے لوگوں کے علیحدہ علیحدہ کام کرنے اور ان سب کے مل کر اور اجتماعی طور پر کام کرنے میں نتائج کے اعتبار سے بہت بڑا فرق واقع ہوتا ہے۔ کسی بھی فرد کے اندر بہت سے کاموں کی صلاحیت نہیں بلکہ وہ ایک دو یا زیادہ سے زیادہ چند کام کر سکتا ہے اور جو بھی کام کرے گا وہ اتنے بڑے پیمانے پر نہیں کر سکتا کہ اس سلسلے میں دعوت وتحریک کی تمام ضرورتیں اور تقاضے پورے ہو جائیں، لیکن ایک اچھی جماعت سے یہ سب کچھ ممکن ہے۔ پانی کی ایک بوند سے سیلاب نہیں آتا لیکن جب ایک ایک بوند جمع ہو کر دریا کی شکل اختیار کر لے تو وہ زمین کو چیرتا اور جنگلوں کو کاٹتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح فرد کی صلاحیتیں گو بہت محدود ہیں لیکن انہی افراد کے اجتماع سے ایک ایسی جماعت وجود میں آ سکتی ہے جو مخالف نظریات کو اکھاڑ پھینکے اور صالح معاشرہ اور نظام تشکیل دے۔

دنیا میں غلط اور صحیح ہر طرح کے نظریات سامنے آتے رہے ہیں اور آتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض نظریات نے بڑے زبردست انقلابات پیدا کئے ہیں لیکن پوری انسانی تاریخ میں کوئی ایسا انقلاب نہیں جو غیر منظم اور منتشر افراد کی کوششوں سے آیا ہو۔ اگر مختلف نظریات کے آغاز اور ارتقاء کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ نظریات بالعموم افراد کے ذہنوں میں پیدا ہوئے ہیں اور افراد ہی لوگوں کو ان کی طرف دعوت دیتے ہیں لیکن جب رفتہ رفتہ اس نظریے کو کچھ لوگ قبول کر لیتے ہیں تو ان کی ایک تنظیم اور جماعت بن جاتی ہے۔ اگر کسی دعوت اور تحریک کے پیچھے مضبوط جماعت اور تنظیم نہ ہو تو اس کی آواز غیر موثر ہو جاتی بلکہ فضا میں تحلیل ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ مروجہ افکار وخیالات اور معاشرے اور نظام میں کوئی تبدیلی لائے بغیر ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ غلط نظریات کو بھی اگر پھیلانے اور اسے عام کرنے کی منظم کوشش کی جائے تو کامیاب ہو جاتے ہیں اور صحیح فکر بھی بعض اوقات اس وجہ سے غالب نہیں ہو پاتی کہ اس کو اچھی جماعت میسر نہیں آتی۔

بعض حضرات اشاعت وغلبۂ دین کی جدوجہد کے لیے جماعت کے قیام کو ضروری سمجھتے ہی نہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اس کام کے لیے جماعت اور تنظیم کی اہمیت وضرورت اور اسے ناگزیر قرار دینا دراصل غیر اسلامی تحریکات سے متاثر ہونے کی وجہ سے ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اندازِ فکر عقلی اور نقلی لحاظ سے بھی غلط ہے۔ قرآن وسنت اور اسلامی تاریخ میں اس خیال کے لیے کوئی بھی دلیل

نہیں۔ موجودہ دور کی تحریکیں اگر تنظیم کو ضروری سمجھتی ہیں تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام جماعت اور تنظیم کا مخالف ہے۔ یہ مسلم حقیقت ہے کہ دعوت وتحریک خواہ حق کی ہو یا باطل کی دونوں کے لیے تنظیم ناگزیر ہے۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں برائیاں اور منکرات پھیلانے والے تو منظم اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ اپنا کام کررہے ہیں۔ لوگوں کی جیبیں کاٹنے والے جیب کتروں اور ڈاکوؤں کی بھی تنظیم ہوتی ہے حتی کہ تخریب کاری اور معاشرے میں ڈنگا فساد پھیلانے کے لیے بھی تنظیمیں قائم ہیں۔ مسلم ممالک میں اشتراکی، سیکولر انقلاب چاہنے والے یا فحاشی وعریانی معاشرے میں عام کرنے والوں اور اسلام کے خلاف کام کرنے والوں کی بھی باقاعدہ تنظیمیں اور NGO,S موجود ہیں۔ آج اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے، مسلم حکومتوں اور اس میں موجود تیل معدنیات کو اپنے قبضے میں لانے کے لیے عالمِ کفر خصوصاً مغرب کے یہود ونصاریٰ بھی متحد اور منظم ہیں جو مسلمانوں کو ایک ایک کرکے مارنے اور ان کے وسائل پر قبضہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

دین ومذہب کے مخالف اور لادینیت کے علمبرداروں کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ پوری طرح منظم ہوکر کام کررہے ہیں اور ان کے مختلف گروہ اور جتھے مختلف اطراف سے پوری تنظیم اور منصوبہ بندی کے ساتھ دینی قوتوں پر یلغار کررہے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ تنظیم وجماعت کا مقابلہ انفرادیت سے نہیں کیا جاسکتا اس کے لئے جماعت اور نظم ہی کی ضرورت ہے۔

عجیب بات ہے کہ ہمارے ہاں بعض حلقوں میں غلبہء دین کے لیے جماعت اور نظم کی اہمیت محسوس نہیں کی جاتی۔ دنیا کے ہر صحیح وغلط نظریے کی اساس پر اٹھنے والی دعوت وتحریک تو اپنی تنظیم قائم کرسکتی ہے لیکن غلبہء دین کے لیے اگر کوئی جماعت اور تنظیم وجود میں آئے تو بعض حضرات کو اس پر سخت اعتراض ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ حضرات فی نفسہ غلبۂ دین کی دعوت وتحریک کے مخالف ہیں اور اس کی اشاعت ان کو ناپسند ہے بلکہ ان کے نزدیک اسلام کی دعوت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس میدان میں جو شخص جو کام انجام دے سکتا ہے بطور ایک فرد انجام دے۔ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ بوقت ضرورت کچھ افراد عارضی طور پر مل جل کر دین کے کسی شعبے میں خدمت انجام دیں لیکن وہ اس بات کو صحیح نہیں سمجھتے کہ محض اس غرض سے ایک مستقل جماعت وجود میں آئے جو اسلام کی دعوت اور اس کے غلبہ کی تدابیر سوچے، اس کے لیے کوئی منصوبہ تیار کرے، اس منصوبے کے تحت افراد کو کام میں لائے اور وہ اس طرح

سے کام کریں جس طرح دیگر افکار و نظریات پر مبنی دوسری جماعتیں کام کرتی ہیں۔

اس طرح جو لوگ اپنے ذوق کے مطابق انفرادی طور پر اسلام کی کوئی خدمت مثلاً اسلام پر ریسرچ کریں، تحقیقی مقالے تصنیف کریں، اسلام کے عقائد و نظریات کو برحق ثابت کریں، غیر اسلامی عقائد و افکار پر تنقید کریں اور ان کی خامیاں واضح کرنے میں پیش پیش ہوں تو وہ لوگ ان کی حوصلہ افزائی اور تحسین کرتے ہیں اور ان کے ساتھ تعاون کرنے میں بھی انہیں دریغ نہیں ہوتا، لیکن غلبہء دین کی جدوجہد اگر کوئی جماعت کی صورت میں کرنا چاہے تو اس کا سارا کام ان کی نظر میں غلط قرار پاتا ہے اور وہ اس کے ساتھ کسی بھی قسم کا تعاون نہیں کرتے۔ گویا ان کے خیال میں افراد کا اپنی شخصی حیثیت میں اسلام کے لیے جدوجہد کرنا تو صحیح ہے لیکن ان کا اپنی قوتوں کو یکجا کر کے جماعت کی صورت میں اس راہ میں لگانا صحیح نہیں۔

کبھی کہا جاتا ہے کہ بلاشبہ غلبۂ دین کے لئے جماعت ضروری ہے لیکن موجودہ حالات میں اس طرح کی تنظیم سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوگا۔ کیونکہ ہم ایسے ماحول میں گھرے ہوئے ہیں جہاں غیر اسلامی افکار و نظریات کا دور دورہ ہے اور فساق و فجار اور کفار کا غلبہ ہے۔ اس ماحول میں اسلام کو پھیلانے اور اس کو غالب کرنے کی منظّم جدوجہد میں اس بات کا خطرہ ہے کہ مخالف طاقتیں اس کو اپنا حریف سمجھ بیٹھیں اور ارباب تحریک کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ اس خطرے سے اس طرح بچا سکتا ہے کہ افراد اپنے طور پر دعوت کا فرض انجام دیتے رہیں۔ اور اسے کسی ایسی منظّم کوشش میں تبدیل نہ کریں جس سے مقتدر طاقتوں، معاشرہ کے بااثر طبقات اور عوام سے تصادم پیدا ہو، اس لیے حکمت و دانائی کا تقاضا یہ ہے کہ کام کی وہی صورت اختیار کی جائے جس کے جاری رہنے کے امکانات ہوں اور اس طریقے کو اختیار نہ کیا جائے جو کام ہی کو سرے سے ختم کر دے۔

اس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی دعوت اور غلبۂ دین کے لیے اگر جماعت ضروری ہے اور بغیر جماعت کے اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا تو لازماً جماعت کو وجود میں لانا ہوگا خواہ حالات سازگار ہوں یا نہ ہوں۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ صرف منظّم دعوت کی مخالفت ہوگی اور انفرادی کوشش کی نہیں ہوگی کیونکہ اسلام کی دعوت ایک انقلابی دعوت ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ، عبادت اور بندگی کے لائق، حاکم، قانون دان نہیں۔ اللہ کے اقتدار کے سواء کسی کا اقتدار جائز نہیں ہے البتہ انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے اور خلیفہ ہونے کی صورت میں وہ اللہ تعالیٰ کا جانشین اور نائب ہے۔ ان باتوں کا

جب بھی اعلان کیا جائے گا اور انہیں عملی شکل پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی خواہ ایسی زبان اور اس کے لئے جدوجہد کرنے والی شخصیت ایک ہی کیوں نہ ہو، مقتدر طبقات اس کو اپنے خلاف بغاوت سمجھیں گے اور اُس کے ساتھ وہی معاملہ کریں گے جو کسی باغی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے، نیز عوام و جہال کا بھی وہی رویہ ہوگا جو قوموں نے انبیاء علیہم السلام اور داعیانِ حق کے ساتھ کیا تھا۔ تاریخ کسی ایسے دور کی نشان دہی نہیں کر سکتی جس میں دعوتِ حقہ اٹھی ہو اور مقتدر طبقے اور عوام نے آگے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس راستے میں بڑی سخت آزمائشیں ہیں۔ قرآن انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے واقعات سے بھرا پڑا ہے اور اسلافِ امت کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ اس راستے پر چلنے کا حوصلہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن میں مقتدر طبقے کے غیض وغضب کو برداشت کرنے اور اس راہ میں پیش آنے والے مشکلات برداشت کرنے کی ہمت ہو۔

ایک عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ معاشرے میں اتنی گمراہی پھیلی ہوئی ہے اور اس کے لیے ایسی منظم تحریکیں اور کوششیں جاری ہیں جن کے مقابلے میں ہماری انفرادی یا جماعتی دعوت اور محنت کوئی اثر نہیں رکھتی، ہم محنت کر کے لوگوں کو جتنا راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے ہیں وہ برے معاشرے اور منکرات کی منظم کوشش کی وجہ سے اتنا ہی دور بھاگتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس بات کا مکلّف نہیں کیا ہے کہ ہم لازماً لوگوں کو اس راستے پر لائیں بلکہ ہماری ذمہ داری دعوت اور محنت ہے ۔ لوگوں پر اثر کرنے یا نہ کرے ہمیں اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنی دعوت اور نہی عن المنکر کا صلہ ملے گا انشاءاللہ۔ باقی محنت کا ثمرہ دنیا میں اگر ہم زیادہ نہیں دیکھ سکتے تو اگر تھوڑا بہت بھی کام ہو جائے تو یہ بھی غنیمت ہے۔

فصل چہارم:

دعوت خاصہ

جماعت کی سب سے بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ دعوتِ خاصہ شروع کرے۔ دعوتِ خاصہ کا مطلب یہ ہے کہ جماعت سب سے پہلے ان طبقات کو مخاطب کرے جو اسلامی نظام کے نفاذ کی ضرورت واہمیت اور اس حوالے سے عائد ہونے والے فریضے کو سمجھتے اور مانتے ہوں، ان کے اندر دین کے تحفظ اور اس کے غلبے کا جذبہ اور تڑپ موجود ہو اور وہ اس کے لئے اپنی جان، مال وقت الغرض سب کچھ لٹانے کیلئے تیار ہوں، کیونکہ کسی بھی تحریک کے بنیادی ارکان کا ان اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے کیونکہ یہی افراد اس تحریک کے اعضاء وجوارح ہوتے ہیں اور انہیں کی صلاحیت واستعداد، فکر وشعور، ایثار وقربانی اور دین کیلئے مر مٹنے اور سب کچھ لٹا دینے کے جذبۂ صادقہ پر ہی تحریک کی وسعت وترقی اور کامیابی کا انحصار ہوتا ہے۔ الغرض یہ جماعت خواص میں سے سب سے پہلے علماء کرام کے طبقے کو مخاطب کرے، کیونکہ علماء کرام ہی اسلامی نظام کی حقیقت اور اس کی اہمیت سے کما حقہ واقف ہیں۔ وہی یہ جانتے ہیں کہ امتِ مسلمہ کی پریشانیوں اور مسائل کا حل اسلامی نظام کے نفاذ میں ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے علماء کرام سے ملاقاتیں اور ان سے حکمت وموعظت کے ساتھ بات چیت اور مذاکرے کا سلسلہ شروع کیا جائے، انہیں خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی انتہائی سعی کی جائے۔ انہیں ان کی بنیادی ذمہ داری کا احساس دلایا جائے، ان میں اس بات کا شعور بیدار کیا جائے کہ امت کے مسائل کا حل صرف اسلامی نظام میں ہے تو اس کے نفاذ کیلئے جدوجہد بھی ان کا فریضہ ہے۔ نیز اقامتِ خلافت کیلئے منہجِ نبوی سے بھی علماء حضرات ہی واقف ہیں، لہٰذا یہ اٹھیں، امت کی راہنمائی وقیادت کریں، عوام کے سامنے اسلامی نظام کی حقیقت واہمیت کو اجاگر کریں اور ان کو اپنے ساتھ ملا کر اقامتِ خلافت کی جدوجہد میں سرعت وتیزی پیدا کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر آج علماء کرام خلافت کے قیام کیلئے جدوجہد کرتے ہیں اور اس کیلئے اپنی جان، مال اور وقت قربان کرتے ہیں تو اسلامی نظام کے احیاء اور نفاذ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے

گی۔اس دعوت وتحریک کو درپیش تمام مسائل ومشکلات آہستہ آہستہ ختم ہو جائیں گی اور خلافت کے قیام کی منزل قریب ہوتی جائے گی۔ جب علماء کرام اقامتِ خلافت کی جدوجہد کو آگے بڑھائیں گے تو اسی صورت میں ہی یہ حضرات

''العلماء ورثة الانبياء''

کا کامل مصداق ٹھہریں گے۔ان کی تحریر، تقریر اور تدریس تبھی صحیح طور پر بارآور ثابت ہوگی جب خلافت کا قیام ہوگا اور فقہ کی کتابوں میں پڑھایا جانے والا نصاب (اسلامی نظام) عملی شکل اختیار کرے گا۔

دعوت خاصہ میں دوسرے درجے میں ان حضرات کو مخاطب کیا جائے جو دین کے کسی نہ کسی شعبے سے وابستہ ہیں، خطباء، آئمہ، مؤذنین ہوں یا دینی مدرسے اور دینی خیراتی ادارے سے متعلق ہوں انہیں بھی دعوت دی جائے اور انہیں یہ احساس دلایا جائے کہ جو خدمت وہ انجام دے رہے ہیں اس کی اہمیت، ضرورت اور فوائد سے انکار نہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلامی نظام کے نفاذ اور خلافت کے احیاء کے لیے جدوجہد کرنا بھی ان کا بنیادی فریضہ ہے، نیز یہ ایسی محنت اور جدوجہد ہے جس کے نتیجے میں پورے دین کا نہ صرف تحفظ ہوتا ہے اور اس کی اشاعت ہوتی ہے بلکہ وہ دیگر ادیان اور نظامہائے باطلہ پر بھی غلبہ حاصل کرتا ہے، اس کے علاوہ بہت سے ایسے امور جو اس وقت انفرادی، شخصی اور جماعتی بنیادوں پر کیے جارہے ہیں دراصل اسلامی ریاست (خلافت) کے بنیادی فرائض میں شامل ہیں مثلاً علوم وفنون کی اشاعت وفروغ، لوگوں کو بنیادی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی، نت نئے اٹھنے والے فتنوں کا سدباب وغیرہ، مسلمانوں کو درپیش دیگر مسائل مثلاً تفریق وانتشار، اغیار کی سیاسی، معاشی، عسکری، فکری ونظریاتی غلامی، جگہ جگہ مسلمانوں پر ہونے والا ظلم وستم وغیرہ۔ یہ تمام امور ایسے ہیں جو خلافت قائم نہ ہونے کی وجہ سے درپیش ہیں اور جب اس کے احیاء کے لیے بھرپور جدوجہد کر کے اسے عملی شکل میں لایا جائے گا تو یہ تمام امور خود بخود حل ہو جائیں گے کیونکہ ان کا حل کرنا نظام خلافت کی بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہے تو خلیفہ وقت انہیں حل کرے گا، یاد رہے کہ یہ کوئی خیالی باتیں نہیں ہیں۔ مسلمانوں کی کم از کم بارہ صدیوں کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے۔

جب جماعت وجود میں آچکی تو اس کا اظہار ضروری نہیں ہوتا بلکہ ابتدائی زمانے میں تو اسے مخفی رکھنا ہی دعوت کے لئے مفید اور کارآمد ہوتا ہے کیونکہ اس وقت دعوت کی زیادہ اشاعت نہیں ہوئی ہوتی اور اس کے اظہار کے لئے فضا سازگار نہیں ہوتی اس لئے مصلحت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ اس مختصر

جماعت کا اظہار نہ کیا جائے ،البتہ دعوت کا کام جاری وساری رہے اور اس میں کسی قسم کی کمی ،کوتاہی یاسستی وکاہلی نہ کی جائے۔جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ ''فعل جماعت'' اور ''اظہارِ جماعت'' دوالگ الگ چیزیں ہیں۔اگر جماعت وجود میں آجائے تو اس کا اظہار ضروری نہیں ہے بلکہ حکمت ومصلحت کے تحت ایک مدت تک اسے مخفی رکھا جاسکتا ہے کیونکہ جب ایک انقلابی دعوت منظرِ عام پر آتی ہے تو چونکہ اس کو قبول کرنے والے افراد کم اور مخالفت کرنے والے زیادہ ہوتے ہیں،اس لئے اس قلیل اور محدود جماعت کا اظہار کیا جائے تو اس کے ارکان کیلئے مسائل ومشکلات میں اضافہ ہوجاتا ہے جو ان کے لئے ناقابل برداشت ہوتے ہیں۔

دراصل جس طبقے کے عقائد وافکار اور ،مروج نظام سے وابستہ سیاسی واقتصادی مفادات پر ضرب پڑتی اور مستقبل تاریک ہوتا نظر آتا ہے تو وہ اس کے درپے ہوجاتے ہیں اور اپنے شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے داعیوں پر جبر وتشدد ڈھاتے ہیں،اس لئے حکمت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ دعوت کا کام تو جاری رہے،البتہ بحیثیت جماعت اس کا اظہار نہ کیا جائے اور انتظار کیا جائے ،پھر مناسب وقت پر اس کا اظہار کیا جائے ،لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ ''حالات کے ناسازگار'' ہونے اور مخالفین کے ''شدید ردعمل اور مخالفت'' کے پیش نظر دعوت کو ترک کردیا جائے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر حالات کے سازگار ہونے کا انتظار کیا جائے ،نہیں بلکہ حالات ناسازگار ہونے اور مخالفین کے شدید ردعمل اور مخالفت کے یقینی امکان کے باوجود اظہارِ جماعت کے بغیر دعوت اور جماعتی کام کو جاری رکھا جاسکتا ہے۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ بہت سی دعوتوں اور تحریکوں پر مخالفین خصوصاً صاحبانِ اختیار واقتدار کی طرف سے پابندیاں لگادی گئیں اور اربابِ دعوت وتحریک کے لئے زمین تنگ کردی گئی تو وہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ نہیں رہے بلکہ انہوں نے ''زیرزمین'' یا کسی دوسری متبادل ترتیب یا نظم کے ساتھ اپنی دعوت اور جماعتی کام کو جاری رکھا،پھر جب ظلم وجبر کے بادل چھٹ گئے تو دوبارہ اظہارِ جماعت کے ساتھ زور وشور سے کام شروع کردیا گیا۔الغرض ایک انقلابی دعوت کبھی رکتی ہے اور نہ اربابِ دعوت تھکتے اور حالات سے مایوس ہوتے ہیں بلکہ وہ ہر قسم کے حالات میں اپنی دعوت جاری رکھتے ہیں،کبھی ''اظہارِ جماعت'' کے بغیر اور کبھی اظہارِ جماعت کے ساتھ۔

دعوت خاصہ کے زمانے میں تصادم سے گریز

جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ دعوت خاصہ کے زمانے میں کافی سلیم الفطرت حضرات نے اسلام قبول

کرلیا اور ایک مختصر جماعت قائم ہوگئی تھی لیکن جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ دعوت کی طرح عبادت بھی خفیہ کی جاتی تھی اور صحابہ کرامؓ گھاٹیوں میں جا کر چھپ کر نماز ادا کرتے تھے، جب مخالفین دعوت کو پھیلتا اور مقبولیت حاصل کرتا ہوا دیکھتے ہیں تو اس پر اپنا شدید ردعمل ظاہر کرتے ہیں جس سے داعیوں اور مخالفین کے درمیان تصادم کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ چونکہ تصادم ولڑائی اور جوابی کاروائی کا ابھی وقت نہیں آیا ہوتا بلکہ عفوودرگذر اور پہلوتہی کرنے اور ہاتھ نہ اٹھانے کا وقت ہوتا ہے اس لئے تصادم وتشدد سے بچنا ضروری ہوتا ہے تا کہ مخالف قوتوں کو ابتدائی مراحل ہی میں دعوت وتحریک کو کچلنے کا موقع نہ ملے۔

فصل پنجم:

نصابِ تعلیم وتربیت

دعوت خاصہ کے ساتھ ساتھ جماعت پر دوسری اور بڑی ذمہ داری یہ عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے ارکان کی تعلیم وتربیت اور دیگر طبقات کی ذہن سازی کیلئے باقاعدہ نصاب تیار کرے۔ کتاب (لٹریچر) کی اہمیت مسلمہ حقیقت ہے۔ ہر مفکر اور داعی اپنے افکار،نظریات اور خیالات کو قلم بند کر کے لوگوں کے سامنے کتاب کی شکل میں پیش کرتا ہے تا کہ لوگ اس کے افکار،نظریات اور خیالات کو پڑھیں اور انہیں قبول کریں۔ چونکہ کوئی مفکر اور داعی نہ تو خود ہر آدمی سے ملاقات کرسکتا ہے اور نہ بالمشافہ ہر شخص اس کے افکار ونظریات اور خیالات سے مستفید ہوسکتا ہے۔اس لیے وہ کتاب (لٹریچر) کے ذریعے اپنے افکار ونظریات کی اشاعت کرتا ہے۔جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ

اللہ تبارک وتعالٰی نے بھی اپنے ہر نبی ورسول کو ایک صحیفہ یا کتاب دی جسے انہوں نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا اور اسے اس میں بیان کردہ عقائد واعمال کو قبول کرنے کی دعوت دی۔ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو کتابِ ہدایت عطا کی گئی بلکہ آپ کا سب سے بڑا معجزہ ہی کتاب یعنی''قرآن کریم'' ہے،جیسا کہ ہم ماقبل میں بیان کر چکے ہیں کہ وحی کی ابتداء ہی اِقْرَاْ (پڑھ) سے کی گئی۔اولین وحی اور اس کے متصل بعد نازل ہونے والی سورتیں دعوتِ نبوی کے نصاب کا ابتدائی حصہ تھیں۔اس کے بعد رفتہ رفتہ نازل ہونے والی سورتیں بھی آپ کی دعوت کے نصاب کا حصہ بنتی گئیں۔ کتنے ہی لوگ محض اس نصاب یعنی قرآن کریم کو پڑھنے اور اس کی تلاوت سننے سے مسلمان ہوئے اور دعوت اسلام کی اشاعت وتبلیغ اور اس کی وسعت وغلبے کیلئے مرکزی کردار ادا کیا، لہٰذا قرآن کریم کو دعوت کے نصاب کا حصۂ اول قرار دینا ناگزیر ہے۔

اسلامی نظامِ خلافت کے سقوط کے بعد امتِ مسلمہ میں اجنبی افکار ونظریات اور باطل احساسات و جذبات اور خیالات سرایت کر چکے ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت اسلامی افکار ونظریات سے بالکل ناآشنا ہے،اسلامی نظام ان کے لئے نامانوس اور خلافت کا لفظ ان کے اذہان سے محو ہو چکا ہے۔مغربی

مفکرین اور مستشرقین کے گمراہ کن پروپیگنڈے کی وجہ سے خود مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا موجود ہے جو اسلامی نظام کو (نعوذ باللہ) پرانے وقتوں کا سسٹم اور صحرائے عرب کے بدوؤں کا ضابطۂ حیات سمجھتا ہے۔ نظامِ خلافت کو جدید ترقی یافتہ سائنسی و صنعتی دور میں ناموزوں اور ناقابلِ عمل تصور کیا جاتا ہے۔ یہ گمراہ کن فکر اس قدر پھیل چکی ہے کہ اس کے اثرات دینی علوم کے حامل طبقے پر پڑنے لگے ہیں اور ان میں بھی ایک معقول تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہو چکی ہے جو نظامِ خلافت کے احیاء اور اس کے موجودہ دور میں کامیابی کے ساتھ چلنے کو انتہائی مشکل بلکہ ناممکن سمجھتے ہیں۔ امتِ مسلمہ پر طاری عمومی زوال اور کفار کے ظاہری غلبے کی وجہ سے ان میں مایوسی اور مرعوبیت اس قدر پیدا ہو چکی ہے کہ وہ اس حوالے سے قرآن کی واضح تعلیمات کو بالکل فراموش کیے ہوئے ہیں جس کے نتیجے میں وہ حرکت و عمل اور قیام پر تیار ہی نہیں ہوتے۔ ان حالات میں جماعت کیلئے انتہائی ضروری ہے کہ وہ باقاعدہ طور پر ایسا جاندار اور مؤثر نصاب تیار کرے، جو اسلامی نظام خلافت کی حقیقت، اس کی اہمیت، ماضی میں اس کی کامیابی کے سنہری دور کی تاریخ، جدید دور میں اس کی کامیابی کے امکانات، کفریہ و باطل نظاموں سے اس کا تقابل، ماضی اور حال میں باطل نظاموں کی ناکامی، خلافت کے قیام سے مسلمانوں کو حاصل ہونے والی دنیوی و اخروی کامیابیاں اور اس کے انسانیت کو ملنے والے فوائد، سقوطِ خلافت سے انسانیت پر پڑنے والے منفی اثرات، اقامتِ خلافت کا منہج قرآن وسنت کی روشنی میں، غیر اسلامی طریقۂ کار سے ناکامی اور دیگر جدید موضوعات پر مشتمل ہو۔

یہ نصاب مختصر و مفصل ہر دو قسم کا ہوتا کہ تحریک میں شمولیت اختیار کرنے والوں اور وہ حضرات جن کے پاس وقت ہے انہیں تفصیلی طور پر پڑھایا جائے اور جن کے پاس وقت کم ہے انہیں اختصار کے ساتھ پڑھایا جائے۔ تحریک چونکہ تمام شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کو مخاطب کرے گی اور انہیں اسلامی نظام کے نفاذ کیلئے جاری جدوجہد میں شرکت کی دعوت دے گی، اس لئے تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق قرآن وسنت کی روشنی میں مخاطب کی ذہنیت اور اس کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر لٹریچر تیار کیا جائے، تاکہ انہیں سمجھنے میں آسانی ہو اور وہ تحریک کے افکار و نظریات پر غور و فکر کر سکیں۔

مرکز کا قیام

کسی بھی تحریک اور جماعت کے لئے مرکز کا قیام انتہائی ضروری اور بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ احیاء خلافت کیلئے جاری تحریک کو چاہئے کہ وہ سیاسی، جغرافیائی اور اقتصادی طور پر اہم مقامات پر اپنے

مراکز قائم کرنے کی کوشش کرے۔ تحریک کے مراکز سیرت و سنتِ نبوی کے مطابق مساجد و مدارس ہونے چاہئیں کیونکہ اسلام کا مرکز مسجد و مدرسہ ہے، اسلام کی روشنی انہی دو جگہوں سے محلّہ، گاؤں، قصبہ، شہر، ملک، پھر پوری دنیا میں پھیلتی ہے، لہٰذا مساجد و مدارس کو مرکز بنانا اور دیگر مقامات کو مرکز کے طور پر اختیار نہ کرنا ناگزیر ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ عرصہ مقام قباء مقیم رہے۔ اس دوران آپ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مرکزِ تعلیم و تربیت قائم فرمایا یعنی قباء میں مسجد تعمیر کروائی جو کہ اسلام کی پہلی باقاعدہ مسجد تھی۔ اسی طرح شہر مدینہ تشریف لانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ روز مسجد کے بغیر نماز ادا فرماتے رہے پھر مسجدِ نبوی تعمیر کی گئی جسے اسلام کے عالمی مرکزِ تعلیم و تربیت کی حیثیت حاصل تھی۔

اسلام میں مسجد کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تمام دینی اور دنیاوی امور یعنی اسلامی نظام کا مرکز مسجد ہی تھی، اس کے اندر نماز باجماعت ادا کی جاتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو وعظ وارشاد فرمایا کرتے تھے، مسجد سے متصل ''صفہ'' میں باقاعدہ تعلیم وتربیت اور درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہتا تھا، زکوٰۃ وصدقات کی تقسیم یہیں ہوتی تھی خصومات اور تنازعات کے فیصلے یہی ہوتے تھے اور مجرموں کو سزا بھی یہی دی جاتی تھی، کسی شخص کو سماجی یا معاشی مسئلہ درپیش ہوتا تو آپ کے پاس یہیں حاضر ہو کر عرض کرتا اور آپ اس کا مسئلہ حل فرماتے تھے، باہر سے آنے والے وفود بھی مسجد میں ہی آ کر آپ سے ملاقات کرتے، یہیں بیٹھ کر آپ قبائل کے سرداروں، اپنے متعین کردہ امراء اور عمال اور بادشاہوں کو خطوط روانہ فرماتے تھے، یہیں صحابہ کرام عسکری تربیت کے لئے مشقیں کرتے تھے، آپ جہاد کے لئے لشکر یہیں سے روانہ فرماتے اور واپس آنے والوں کا استقبال اور ان سے ملاقات کر کے کارگزاری بھی یہیں سنا کرتے تھے، مال غنیمت، جزیہ اور خراج بھی یہی تقسیم کیا جاتا تھا۔

الغرض مسجدِ نبوی عبادت خانہ بھی تھی، خانقاہ اور جامعہ بھی تھی، عدالت بھی تھی اور سفارت خانہ بھی، مرکز فلاح و بہبود اور وزارت خزانہ بھی تھی اور چھاؤنی بھی، گویا اجتماعی نظام سے متعلق تمام شعبے اور محکمے یہاں قائم تھے اور یہ گویا ''دارالخلافہ'' تھا۔ اگرچہ بعد کے ادوار میں شعبہ جات میں وسعت کی وجہ سے الگ الگ شعبے اور محکمے قائم کئے گئے لیکن اس کی مرکزی حیثیت پھر بھی بحال رہی، لیکن افسوس! آج

مسجد کو عبادت خانہ یا جائے نماز کی حیثیت دے دی گئی ہے اور اس کے کردار کو محض نماز پڑھنے تک محدود کر دیا گیا ہے اور اس کا ''مسجد نبوی'' والا تصور ختم ہو کر رہ گیا ہے حتی کہ وہ حضرات جو علوم اسلامیہ کے حامل ہونے کی بنا پر وراثت نبوی کے حامل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ خود بھی مسجد کو نماز تک محدود رکھنا چاہتے ہیں یا ایسا چاہتے تو نہیں لیکن عملی طور پر اس کے کردار کو وسعت نہیں دے رہے۔

مذکورہ وجوہ کی بنا پر ارباب دعوت کو چاہئے کہ وہ اپنی دعوت اور دعوتی سرگرمیوں کا مرکز مساجد کو ہی بنائیں۔ مساجد سے ہٹ کر دیگر مقامات (مثلاً دفاتر) کو مرکز بنانے کی فکر اور روش کی پیروی ہرگز نہ کریں۔ وہ ماضی قریب کے حوالے سے بھی مساجد سے جڑنے اور انہیں مراکز بنانے کے فوائد اور ثمرات اور ان سے ہٹنے کے نقصانات اپنے سامنے رکھیں۔

مرکز بنانے کے حوالے سے مساجد و مدارس کو نظر انداز کر کے سیاسی جماعتوں کی طرح دفاتر بنانے سے ایک اسلامی دعوتی، انقلابی، جہادی اور اسلامی نظام کی علمبردار تحریک میں شرعی، اخلاقی اور دیگر کئی پہلوؤں سے خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا مشاہدہ گزشتہ تقریباً ایک صدی سے کیا جا رہا ہے۔ مساجد و مدارس کو چھوڑ کر دفاتر بنانے کے منفی اثرات و نتائج بالکل واضح ہیں۔ اس کے برعکس جن جماعتوں نے اپنی دعوت کا مرکز مسجد و مدرسہ کو بنایا ہے انہیں اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیابی ملی ہے اور وہ انہی مراکز کے ذریعے ہی پوری دنیا میں اپنی دعوت کی توسیع و اشاعت کر رہی ہیں۔ اگر اسلامی نظام کے احیا کی علمبردار جماعتوں کے پیش نظر نبوی منہج نہیں ہے تو انہیں ایسی جماعتوں کی ہی تقلید کر لینی چاہئے اور اپنا طریقہ کار تبدیل کرنا چاہئے۔

تحریک اپنی دعوت کا آغاز مساجد و مدارس سے کرے پھر تدریجاً اس کو عوامی سطح پر پیش کرے تاکہ اس کا حلقہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک وسیع ہوتا جائے اور ہر طبقے کے افراد اس میں داخل ہوں۔ یہ مراکز ہمہ جہت مراکز ہوں، یعنی یہاں اسلامی علوم کی تعلیم و تدریس ہو، ارکان کی تعلیم و تربیت کا باقاعدہ نظم ہو، تحریک کے ارکان کو تحریک کا نصاب باقاعدہ پڑھایا جائے۔ ارکانِ تحریک کے اجتماعات و جوڑ یہیں ہوں، یہیں سے داعی حضرات کی تشکیل ہو اور دعوتی امور کی انجام دہی کے بعد اس کی کارگزاری سنی جائے، اس سے متعلق ہدایات جاری کی جائیں اور جو تقاضے سامنے آئیں ان سے متعلق غور و فکر اور مشاورت ہو۔ تحریک کے مرکزی راہنما ان مراکز میں بیٹھ کر مشورے کریں اور تحریک کیلئے لائحہ عمل تیار کریں، الغرض ان مراکز میں ان تمام امور کو سرانجام دیا جائے جو ایک نظریاتی اور انقلابی تحریک کیلئے ضروری ہوں۔

فصل ششم:

دعوتِ عامہ

جب دعوتِ خاصہ سے معتد بہ رجالِ کار تیار ہو جائیں تو اربابِ تحریک کو چاہیے کہ وہ تدریجاً زور و شور کے ساتھ عمومی دعوت شروع کریں۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ ابن ہشام لکھتے ہیں:

وکان بین ما اخفی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم امرہ واستتر بہ الی ان امرہ اللّٰہ تعالیٰ باظہار دینہ ثلاث سنین فیما بلغنی من مبعثہ ثم قال اللّٰہ تعالیٰ لہ ﴿فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ﴾ (الحجر: ۹۴)

(السیرۃ لابن ھشام ج ۱، ۱۶۸)

''مجھے جو روایت پہنچی ہے اس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کو مخفی رکھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اظہار کا حکم دیا بعثت سے لے کر اظہار تک اس کے درمیان تین سال کا عرصہ ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''پس جو حکم تم کو (خدا کی طرف ملا ہے وہ لوگوں کو سنادو اور مشرکوں کا (ذرا) خیال نہ کرو۔'' اور فرمایا'' اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈر سنادو اور جو مؤمن تمہارے پیرو ہو گئے ہیں ان سے متواضع پیش آؤ۔''

جب داعی دعوت لے کر اٹھتا ہے تو وہ اکیلا ہوتا ہے لیکن بتدریج اس دعوت کو قبول کرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ایک عرصے بعد اس قدر لوگ اس دعوت پر اکٹھے ہو جاتے ہیں کہ انہیں ''جماعت'' کہا جا سکتا ہے۔ دعوتِ خاصہ کے بعد جب معتد بہ افراد دعوت قبول کر لیں اور اس کے اعلانیہ اظہار کی راہ ہموار ہو جائے تو تمام شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد سے ملاقاتیں کر کے انہیں دعوت دینے کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ ان سے انفرادی و اجتماعی مذاکرہ کیا جائے۔ خواص کے ساتھ ساتھ عوام میں بھی بھرپور طریقے سے دعوت چلائی جائے۔ خاص مقامات (ہال، ہوٹل وغیرہ) کے علاوہ عوامی مقامات (مارکیٹ، پارک، بازار وغیرہ) پر بھی دعوت دی جائے۔ تمام چھوٹے بڑے شہروں، قصبات اور دیہاتوں میں اجتماعات اور جوڑ منعقد کیے جائیں اور لوگوں کو کھلم کھلا اور اعلانیہ دعوت دی جائے۔

عمومی دعوت کیلئے ضروری ہے کہ اسے آسان سے آسان اور قابلِ فہم بنایا جائے اور مخاطب کے شعبۂ زندگی اور اس کی ذہنی سطح کو سامنے رکھتے ہوئے گفتگو کی جائے تا کہ لوگ اسے اچھی طرح سمجھ کر قبول کریں اور انہیں تحریک کے مقاصد اور منہج وطریقۂ کار کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔اس کے لیے ارکان کی تعلیم وتربیت کے دوران دعوت، خطاب، مباحثہ اور مذاکرہ کی تربیت دی جائے اور باقاعدہ مشق کروائی جائے۔

فصل ھفتم:

قوت نافذہ کے حصول کے لیے جدوجہد

تحریک جہاں خواص وعوام میں اپنی دعوت پھیلائے اوران کواپنے گردجمع کرے۔ وہاں اس پر یہ بھی انتہائی اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مروج باطل نظام کے خاتمے اوراسلامی نظام کے نفاذ کے لیےقوتِ نافذہ کےحصول کی تیاری جاری رکھے۔اس کے لیے ریاستی وحکومتی ڈھانچے میں موجودافراد اورجن کے بارے میں امید ہوکہ وہ آئندہ اس مرتبے پر پہنچنے والے ہیں،ان میں دعوت چلاکران کو اپنے ساتھ ملانے کی بھرپورکوشش کرے،کیونکہ مقتدرطبقہ کے پاس ریاستی امورکوکنٹرول کرنے کے لیے بھرپورطاقت موجود ہے۔ نیا نظام تب نافذ ہوسکتا ہے جب پہلے سے نافذ وباطل نظام کوختم کیا جائے۔پہلے نظام کونافذ کرنے والا مقتدرطبقہ ہے جواس کی پشت پرکھڑااس کی حفاظت کررہا ہے، لہٰذاباطل نظام کی پشت پناہی کرنے اوراسلامی نظام کے نفاذ میں عملی طور پررکاوٹ بننے والے مقتدر طبقے کو ہٹائے بغیراسلامی نظام کا نفاذممکن نہیں اورمقتدرطبقہ طاقت اورریاستی قوت(فوج،پولیس اور دیگراداروں) کےذریعےموجودہ نظام کادفاع کرتااورانقلابی تحریک کوبہرصورت کچلنےاورمٹانے کی کوشش کرتا ہے۔اس لئے جب تک اس سے طاقت چھین نہ لی جائے گی تب تک وہ باطل نظام کی حفاظت کرتااورانقلاب کوناکام کرنے کی مذموم سعی کرتارہےگا،لہٰذانئے نظام کےنفاذ اورباطل نظام کےانہدام کیلئے طاقت کاحصول اوراس کااستعمال ناگزیرہے۔

تحریک کوچاہئے کہ وہ اپنی دعوت ہراس شعبے میں وسیع سے وسیع ترکرے،جس سے اس موجودہ نظام کوتقویت حاصل ہوتی ہو،اسی طرح ان شعبوں سے تعلق رکھنے والےافراد کی حمایت حاصل کی جائے تاکہ وہ اس انقلابی تحریک کے راستے میں رکاوٹ بننے کی بجائے اس کیلئے راستہ صاف کریں۔ اربابِ دعوت ہراس شعبہ میں اپنی فکرکوعام کریں جوکسی بھی صورت میں موجودہ نظام کےانہدام وسقوط میں معاون ومددگارثابت ہوسکتا ہے کیونکہ اس شعبے سے تعلق رکھنے والےافراد کی حمایت حاصل کئے بغیرموجودہ نظام کومنہدم کرناممکن نہیں ہے۔اس لئے ایسے شعبوں میں اثرورسوخ حاصل کرنا ناگزیر

ہے۔اس کے بغیر تحریک کو کامیابی ملنا انتہائی مشکل ہے۔ اربابِ تحریک جن اہلِ قوت کو اپنے ساتھ شامل کریں ان کیلئے ضروری ہے کہ وہ:

۱۔ تحریک کے فکر ونظر کو مکمل طور پر اور دل ودماغ سے قبول کرتے ہوں اور وہ امیرِ دعوت کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت کر چکے ہوں۔

۲۔ یہ حضرات مکمل طور پر جماعت کے ماتحت ہوں،اس سے علیحدہ ہرگز نہ ہوں۔ یعنی جماعت کے احکام پر عمل پیرا ہوتے ہوں اور اس سے سرموانحراف نہ کرتے ہوں۔

۳۔ جماعت جس وقت جو حکم دے اس پر عمل پیرا ہوں،اس سے اعراض ہرگز نہ کریں۔

باطل نظام کا انہدام

جب دعوت عمومی طور پر پھیل جائے،عوام اور خواص کی ایک معقول تعداد اس کو قبول کر کے اس میں شامل ہو جائے۔اسی طرح اہلِ قوت کی نصرت وتعاون سے تحریک کو اس قدر طاقت حاصل ہو جائے کہ موجودہ نظام کو منہدم کیا جا سکے تو تحریک موجودہ کفریہ و باطل نظام منہدم کرنے کیلئے اقدام کرے،جس کی سیرت کی روشنی میں ممکنہ تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

1۔ پہلی یہ کہ انصارِ مدینہ کی طرح لوگ دعوت قبول کر لیں اور معاشرے کے تمام طبقات مجموعی طور پر اسلام کی حاکمیت وسیادت اور نظام کو قبول کر لیں۔ سب سے بہتر صورت یہی ہے کیونکہ اس صورت میں تصادم،ٹکراؤ اور قتل وغارت گری کی نوبت نہیں آتی اور مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔اربابِ دعوت وتحریک کو چاہیے کہ وہ حتی الامکان اس بات کی کوشش کریں کہ پرامن طور پر باطل نظام کا خاتمہ اور اسلامی نظام کا نفاذ ہو جائے کیونکہ مقصد اعلاکلمۃ اللہ اور غلبۂ دین ہے نہ کہ قتل وغارت۔

2۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مخالفین مشرکین مکہ کی طرح ایک عرصے تک مخالفت اور تصادم کی راہ اختیار کیے رکھیں لیکن جب دعوت وتحریک زور پکڑ جائے اور انہیں یقین ہو جائے کہ اس تحریک کو روکنا ان کے بس سے باہر ہے بلکہ اربابِ دعوت پوری طاقت وقوت کے ساتھ ان کے سر پر آ پہنچیں تو وہ اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے راستہ خالی کر دیں تو تصادم ولڑائی کے بغیر اسلامی نظام نافذ کر دیا جائے۔

3۔ تیسری صورت یہ ہے کہ مخالف قوتیں دعوت وانقلاب کے مقابلے میں اٹھ کھڑی ہوں اور اپنی پوری حربی وعسکری طاقت کے ساتھ میدان میں آ جائیں تو اس وقت انقلابیوں اور مجاہدین کے

لیے طاقت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے جیسا کہ روم و فارس کی طاقتیں مجاہدین اسلام کے مقابلے میں میدان کارزار میں صف آراء ہوئی تھیں۔

اس صورت میں انقلابی اور مجاہد طاقت کے استعمال میں توکل علی اللہ کرتے ہوئے کسی قسم کا خوف اور ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہ کریں، حتی الامکان قتل و غارت سے بچنے کی کوشش کی جائے، تاکہ عمومی فتنہ وفساد نہ پھیلے اور خانہ جنگی کی صورتحال پیدا نہ ہو اور نہ اغیار کو سازشوں کا موقع ملے، کیونکہ کسی نظام کے اجراء اور اس کے استحکام کے لئے عوام کا ساتھ اور ایک حد تک ان کی ہمدردی ضروری ہے۔ اگر بے جا قتل و غارت کی نوبت آتی ہے تو عوام تحریک سے متنفر ہو کر اس سے علیحدہ ہو جائیں گے بلکہ مخالفت پر اتر آئیں گے اور ایسے ہی اہم مواقع پر داخلی اور خارجی سطح پر مخالف قوتوں کو سازشوں اور پروپیگنڈہ کا موقع ملتا ہے جس سے وہ فائدہ اٹھا کر اسلامی تحاریک کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، لہٰذا اس موقع پر خوب احتیاط و ہوشیاری اور دانشمندی کا مظاہرہ کرنا انتہائی ضروری ہے تاکہ اسلامی نظام کے نفاذ کا مقصد بھی حاصل ہو جائے اور داخلی اور خارجی سطح پر دشمنوں کی سازشوں کو بھی کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔

تتمہ

محترم قارئین کرام! جیسا کہ آپ گزشتہ صفحات میں ملاحظہ کر چکے ہیں کہ کتاب کے پہلے حصے میں احیاءِ اسلام کے لیے مختلف ممالک میں کی جانے والی کوششوں کا تعارف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے اختیار کردہ طریقۂ ہائے کار پر بھی تبصرہ وتجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اختیار کردہ منہج سے معلوم ہونے والے بنیادی اصولوں کو واضح کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں سیرت کو بیان کیا گیا ہے، جس میں ان اہم اور بنیادی حالات وواقعات کو لیا گیا ہے جو آپ کے اختیار کردہ منہج کی ترتیب اور بنیادی اصولوں کو واضح کرتے ہیں اور ان میں احیائے خلافت اور غلبۂ دین کے لئے باقاعدہ دعوت وتحریک کی شکل میں جدوجہد کرنے والوں کے لئے دروس وعبر ہیں، پھر چوتھے اور آخری حصے میں نبوی طریقۂ کار کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں عصر حاضر میں کام کی ترتیب اور طریقۂ کار کے بنیادی اصول بیان کئے گئے ہیں۔

محترم قارئین! اللہ تبارک وتعالیٰ نے دیگر دینی ودنیوی معاملات کی طرح احیاءِ خلافت کے لیے امام الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہمارے لیے پیش فرمایا ہے، آج اور قیامت تک آنے والے ہر زمانے میں غلبۂ دین اور خلافت کے نظام کے نفاذ کے لیے منہج نبوی کو اختیار کرنا لازم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اپنی دعوت کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے، آج اسی منہج کے بنیادی اصولوں کو وقت کے تقاضوں اور حال کے امر کے مطابق اپنا کر اسی جدوجہد کو آگے بڑھانا لازم ہے۔

آج پوری دنیا میں مسلمان جس حالت زار میں ہیں وہ امت مسلمہ کے ہر باشعور فرد کے سامنے ہے، ان کے مصائب، مسائل اور پریشانیوں سے کون واقف نہیں؟ امتِ مسلمہ جس طرح آج اغیار کی فکری ونظریاتی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی غلام ہے، اس سے پہلے ایسا کبھی نہ ہوا تھا، آج مسلمان دنیا کے ہر خطے میں جس طرح کفریہ طاقتوں کے ہاتھوں پٹ رہے ہیں کئی صدیوں پر مشتمل تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا، کیا مسلمان اب مزید ذلت، خواری، محکومی، بے وقعتی، بے بسی اور بیچارگی دیکھنا چاہتے ہیں؟ کیا مسلمانوں کی آنے والی نسلیں بھی اسی کرب واذیت میں مبتلا رہیں گی؟ نہیں ہرگز نہیں۔

میرے مسلمان بھائیو! ہمیں آج سے ہی اپنے سابقہ گناہوں، کوتاہیوں، غفلتوں اور لاپرواہیوں

سے توبہ کر کے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم آیندہ امتِ مسلمہ کے دکھوں کے مداوے کے لیے حسب استطاعت سعی کریں گے، امت کے اجتماعی مفادات کو عیش وعشرت اور نفسانی خواہشات اور ذاتی مفادات پر ترجیح دیں گے، آج امت مسلمہ کے ہر فرد کو یہ عزمِ مصمم کرنا ہوگا کہ وہ اغیار کی مادر پدر آزاد اور عریاں تہذیب ومعاشرت اور فرسودہ نظامِ حیات کو اپنانے اور اس کی سیاسی، عسکری، اور اقتصادی محکومی کو اپنائے رکھنے کی بجائے اسلامی تعلیمات اور تہذیب ومعاشرت کو اپنائیں گے، امتِ مسلمہ کے دینی ودنیاوی اجتماعی مسائل کے حل، غلبہء دین اور خلافت کے احیاء کے لیے نبوی طریقہء کار کے مطابق عملی جدوجہد کریں گے اور اس کے لیے ہر وقت ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار رہیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ غلبہء دین اور نظامِ خلافت کی اہمیت، ضرورت اور اس کی اقامت کی فرضیت اور اس کے طریقہء کار کو جاننے اور سمجھنے کے بعد ہمارے لیے اس بات کا کوئی جواز نہیں کہ ہم اس عظیم الشان مقصد کے لیے کھڑے نہ ہوں اور اب بھی گوشہ نشینی اور لاتعلقی کی زندگی اختیار کیے رکھیں۔ کیا اس اہم دینی فریضے کو ترک کرنے کے نتیجے میں اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن ہم سے اس حوالے سے پوچھ گچھ نہ کریں گے؟ کیا ہم اس فریضے کو چھوڑنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے محبوب، انسانیت کے محسن اعظم خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں سرخرو ہوسکیں گے؟

امتِ مسلمہ کا درد رکھنے والو! ہمیں اب بہرصورت بیدار ہونا ہوگا، نظامِ خلافت کے احیاء ونفاذ اور باطل نظاموں کے انہدام کے لیے اٹھ کھڑا ہونا ہوگا، اگر آج ہم نے اس کے لیے قیام نہ کیا تو نہ صرف اقامتِ خلافت کے فریضے کو ترک کرنے والے قرار پائیں گے بلکہ اس کے نتیجے میں ہمارے اوپر جو مزید تباہی وبربادی آئے گی اور جن مسائل ومشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا، اس کے ذمہ دار بھی ہم خود ہوں گے، لہٰذا آج ہمیں اس فریضے کی انجام دہی اور نظامِ خلافت کے احیاء کے لیے نہ صرف خود متحرک ہونا ہوگا بلکہ دوسروں کو بھی اس کے لیے تیار کرنا ہوگا تاکہ ایک منظم جماعت جامع منصوبہ بندی اور ٹھوس لائحہ عمل کے ساتھ اس جدوجہد کو آگے بڑھا کر پایہء تکمیل تک پہنچائے۔

رب ذوالجلال سے دعا ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کو امتِ مسلمہ کے دینی ودنیاوی اجتماعی مسائل کے حل، غلبہء دین اور خلافت کے احیاء کے لیے نبوی طریقہء کار کے مطابق عملی جدوجہد کرنے اور اس کے لیے ہر وقت ہر قسم کی قربانی دینے کی توفیق عطا فرمائیں اور اس عظیم مقصد کے لیے غیب سے نصرت عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین

مصادر و مراجع

۱۔ القرآن الکریم

۲۔ فتح الرحمن (ترجمہ قرآن وحواشی فارسی)الشاہ ولی اللہ الدھلوی،مطبوعہ مجمع الملک فھدلطباعۃ المصحف الشریف، المدینہ المنورۃ

۳۔ موضح فرقان (ترجمہ ء قرآن) لشیخ الھندمولانا محمودحسن دیوبندیؒ

۴۔ فتح المجید(ترجمہ ء قرآن)لمولانا فتح محمدجالندھری

۵۔ تفسیر الحسن البصری،ناشر الجامعۃ العربیۃ احسن العلوم گلشن اقبال کراچی ۔ایڈیشن ۱۴۱۳ھ، ۱۹۹۳ء

۶۔ تفسیرالقرآن العظیم لابنِ کثیر

۷۔ الجامع لاحکام القرآن

۸۔ معالم التنزیل

۹۔ احکام القرآن للجصاص

۱۰۔ روح المعانی للعلامہ آلوسی

۱۱۔ زاد المیسر

۱۲۔ الوسیط فی تفسیر القرآن المجید للامام ابی الحسن علی بن احمدالواحدی النیشاپوری

۱۳۔ الاصابہ فی تمییز الصحابہ. مطبعۃ السعادۃ .مصر. ایڈیشن ۱۳۲۸ھ

۱۴۔ الاحکام السلطانیہ للماوردی

۱۵۔ آفتاب نبوت

۱۶۔ اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ. داراحیاء التراث العربی. بیروت لبنان.

ایڈیشن ۱۹۷۰ء
۱۷. الاستیعابفی معرفةالاصحاب. دائرة المعارف النظامیه. حیدر آباد دکن. ایڈیشن ۱۳۳۶ھ
۱۸. امتاع الاسماع.
۱۹. انسان العیون فی سیرة الامین المامون(السیرة الحلبیة) مطبع. مصطفی البابی الحلبی مصر. ایڈیشن ۱۳۴۹ھ)
۲۰. اصول الدین للامام عبد القاهر البغدادی
۲۱. إزالة الخفائعن خلافة الخلفاء
۲۲. البدایة النهایة لابن کثیر، مطبعة السعادة مصر، ایڈیشن ۱۳۵۱ھ-1932ء
۲۳. بذل القوة فی حوادث سنی النبوة. سندھی ادبی بورڈ. حیدر آباد پاکستان. ایڈیشن ۱۳۸۶ھ، ۱۹۶۶ء
۲۴. تاریخ الامم والملوک لابن جریر الطبری، مطبعة الاستقامة، قاهره مصر، ایڈیشن ۱۳۵۷ھ، 1939ء
۲۵. تاریخ الاسلام للذهبی
۲۶. تاریخ دعوت وعزیمت
۲۷. تحریکِ پاکستان اور علماء ربانی
۲۸. جوامع السیرةلابن حزم، دار المعرفة مصر
۲۹. الخصائص الکبریٰ للسیوطی
۳۰. خصائص العشرة الکرام البررة. دار الجمهوریة بغداد ایڈیشن ۱۳۸۸ھ 1968ء
۳۱. حدائق الانوار ومطالع الاسرار لابن الدیبع الشیبانی
۳۲. حیاة الصحابة، دائرة المعارف العثمانیه حیدر آباد
۳۳. الدرر فی اختصار المغازی والسیر
۳۴. دلائل النبوة للبیهقی. دارالکتب العلمیة بیروت. ایڈیشن. ۱۴۰۸ھ. ۱۹۸۸ء.

۳۵۔ الروض الانف،مطبع الجماليه. مصر. ایڈیشن ۱۳۳۲ھ، ۱۹۱۴ء

۳۶۔ زاد المعاد فی هدی خیر العباد.

۳۷۔ سنن ابی داؤد

۳۸۔ السيرة النبويه لا بن هشام. دار الفجر للتراث. ایڈیشن ۱۴۲۵ھ. ۲۰۰۴ء.

۳۹۔ السيرة لا بن كثير. مطبعه عیسیٰ البابی الحلبی. قاهره، مصر. ایڈیشن ۱۳۸۴ھ، ۱۹۶۴ء

۴۰۔ السياسة الشرعية

۴۱۔ شرح الزرقانی علی المواهب اللدنيه.

۴۲۔ شرح النووی لصحيح المسلم

۴۳۔ شرح الفقه الاكبر

۴۴۔ شرح المقاصد للعلامه تفتازانی

۴۵۔ شرح العقائد النسفيةللامام نسفی

۴۶۔ صحيح البخاری

۴۷۔ صحيح المسلم

۴۸۔ صحيح ابن حبان. دار الكتب العلمية بيروت لبنان. ایڈیشن ۱۴۰۷ھ، ۱۹۸۷ء.

۴۹۔ صحيح ابن خزيمه. المكتب الاسلامی بیروت ۱٤۰۰ھ ۱۹۸۰ء

۵۰۔ صفة الصفوة لا بن جوزی.

۵۱۔ الطبقات الكبری لابن سعد

۵۲۔ عيون الاثر فی فنون المغازی و الشمائل والسير لابن سيد الناس. مكتبه القاسمی، قاهره، ایڈیشن ۱۳۵۶ھ،

۵۳۔ عمدة القاری. داراحياء التراث العربی. بيروت لبنان

۵۴۔ علماء هند کاشاندار ماضی

۵۵۔ غياث الامم فی التياث الظلم

۵۶۔ الفصل لابن حزم الظاهری

۵۷۔ قرة العينين ،المكتبة السلفيه لاهور ایڈیشن ۱۹۷۶ء ۱۳۹۶ھ

۵۸. کتاب السنة

۵۹. المطالب العالیه. دارالمعرفة.بیروت.ایڈیشن ۱۴۱۴ھ،۱۹۹۳ء

۶۰. المواهب اللدنیه

۶۱. المعارف لابن قتیبه ، مطبعه دارالکتب ایڈیشن ۱۹۴۰ء

۶۲. المحلی لابن حزم

۶۳. مسند الحمیدی. دارالکتب العلمیه،بیروت لبنان، ایڈیشن ۱۴۰۹ھ،۱۹۸۸ء

۶۴. مغازی رسول اللہ لعروة بن الزبیر،ناشر من منشورات مکتب التربیة العربی لدول الخلیج الریاض ۱۴۰۱ھ ۱۹۸۱ء

۶۵. معارج النبوةفی مدارج النبوة(فارسی)

۶۶. مدارج النبوة(فارسی)

۶۷. مجموعه فتاوٰی لابن تیمیہ

۶۸. النعمة الکبریٰ علی العالم

۶۹. الوفا لابن جوزی. المکتبة النوریه رضویه فیصل آباد پاکستان ایڈیشن ۱۳۸۶، ۱۹۶۶ء)

۷۰. وفاء الوفاء باخبار دارالمصطفیٰ

دورہ سیاسیاتِ شرعیہ

اسلامی نظامِ خلافت

(۱) اسلام کا معاشرتی نظام

(۲) اسلام کا عدالتی نظام

(۳) اسلام کا سیاسی نظام

(۴) اسلام کا اقتصادی نظام

(۵) اسلامی سیاست خارجہ

نظامہائے باطلہ

(۱) سرمایہ دارانہ نظام (۲) اشتراکیت

(۳) جمہوریت (۴) سیکولرازم

(۵) نیشنل ازم

منہجِ انقلاب

(۱) غلبہء دین کا نبوی طریقہء کار (نبوی طریقہء کار کیوں ناگزیر ہے؟)

(۲) تحریکِ انقلاب (انقلاب کیوں اور کیسے؟ مراحلِ انقلاب)

متفرقات

(۱) سیاسیات (تعریف، مقاصد، جدید وقدیم تصورات ونظریات)

(۲) اقتصادیات (جدید وقدیم تصورات ونظریات، ورلڈ بینک، آئی ایم ایف، ڈبلیو ٹی او، ملٹی نیشنل کمپنیاں)

(۳) بین الاقوامی تعلقات (تعریف، جنگ اور امن، نظریہء طاقت، ڈپلومیسی وغیرہ)

نوٹ:- وفاق المدارس کے سالانہ امتحانات کے بعد ملک کے مختلف شہروں میں دورے کا انعقاد کیا جائے گا۔ انشاءاللہ

0322-5823877